اقبال متین کی ادبی خدمات کا تنقیدی مطالعہ

مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی

مقالہ نگار

احمد علی جوہر

نگراں

پروفیسر معین الدین جینا بڑے

ہندوستانی زبانوں کا مرکز

اسکول آف لینگویج، لٹریچر اینڈ کلچرل اسٹڈیز

جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی–110067

2017

जवाहरलाल नेहरू विश्वविद्यालय
JAWAHARLAL NEHRU UNIVERSITY
भारतीय भाषा केन्द्र
Centre of Indian Languages
भाषा, साहित्य एवं संस्कृति अध्ययन संस्थान
School of Language, Literature & Culture Studies
नई दिल्ली–110067, भारत NEW DELHI-110067, INDIA

Dated: 18 /07/2017

DECLARATION

I hereby declare that the research work done in this Ph.D thesis entitled "*Iqbal Mateen ki Adabi Khidmat ka Tanqeedi Mutala*" *(A Critical Study of Iqbal Mateen's Literary Contribution)* by me is an original research work and it has not been previously submitted for any other degree in this or any other University/ Institution.

18/07/2017
Ahmad Ali Jauher
(Research Scholar)

18/7/17
Prof. Moinuddin A. Jinabade
(Supervisor)
CIL/SLL&CS/JNU

Prof. Gobind Prasad
(Chairperson)
CIL/SLL&CS/JNU

GRAM: JAYENU, Tel.: (91-011) 26741557, 26742676 Extn.: 4217, (D) 26704217; Telefax: (91-011) 26704217
Email: chair_cil@mail.jnu.ac.in, jnucil@gmail.com

انتساب

والدین کی بے لوث اور بے پایاں محبتوں کے نام

مشمولات

پیش لفظ ۵-۹

باب اول: اقبال متین: شخص و ادیب

(الف) سوانحی کوائف ۱۱-۱۸

(ب) ادبی خدمات ۱۹-۲۸

باب دوم: اقبال متین کی فکشن نگاری

(الف) اقبال متین کی افسانہ نگاری کا موضوعاتی جائزہ ۳۰-۹۶

(ب) اقبال متین کی افسانہ نگاری کا فنی جائزہ، پلاٹ،
کردار، زبان و بیان اور اسلوب کے حوالے سے ۹۷-۱۳۸

(ج) اقبال متین کی ناولٹ نگاری کا موضوعاتی جائزہ ۱۳۹-۱۵۸

(د) اقبال متین کی ناولٹ نگاری کا فنی جائزہ ۱۵۹-۱۸۳

باب سوم: اقبال متین کی غیر افسانوی نثر

(الف) اقبال متین کی خاکہ نگاری کا فنی مطالعہ ۱۸۵-۲۱۵

(ب) اقبال متین کی یاد نگاری کا فنی مطالعہ ۲۱۶-۲۴۵

(ج) اقبال متین کی مضمون نگاری کا موضوعاتی مطالعہ ۲۴۶-۲۶۲

(د) اقبال متین کی مضمون نگاری کے فنی محاسن ۲۶۳-۲۷۳

باب چہارم: اقبال متین کی شعر گوئی
(الف) اقبال متین کی غزلوں کا تنقیدی مطالعہ ۲۷۵-۲۹۲
(ب) اقبال متین کی نظموں کا تنقیدی مطالعہ ۲۹۳-۳۰۵
باب پنجم: معاصرین میں اقبال متین کا مقام ومرتبہ ۳۰۶-۳۵۴
ماحصل ۳۵۵-۳۶۸
کتابیات ۳۶۹-۳۷۴

پیش لفظ

اردو کے عصری منظرنامے پر جن ادیبوں اور تخلیق کاروں نے اپنی ایک منفرد شناخت قائم کی ہے،ان میں اقبال متین کا نام نہایت اہم ہے۔ان کی ادبی و تخلیقی شخصیت کی مختلف جہتیں ہیں۔اقبال متین نے ادب کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے لیکن ان کی بے پناہ شہرت ومقبولیت کی اصل وجہ ان کی افسانہ نگاری ہے۔افسانہ نگاری کے علاوہ انھوں نے ناولٹ شاعری اور خاکہ نگاری کے میدان میں بھی اپنی فن کارانہ صلاحیت کا مظاہرہ کیا ہے۔اقبال متین نے متعدد اہم افسانے لکھے۔ان کا پہلا افسانہ بعنوان ''چوڑیاں'' ۱۹۴۵ء میں شائع ہوا۔انھوں نے سماجی ومعاشرتی زوال، جنسی واخلاقی انتشار، تہذیبی و ثقافتی شکست و ریخت اور انسانی زندگی کے تلخ حقائق کو کلیدی اہمیت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ انہوں نے موضوعات ومسائل کے دوش بہ دوش افسانے کی فنی و جمالیاتی قدروں کو بھی خاطر خواہ اہمیت دی ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی تخلیقات میں فکر وفن کا حسین امتزاج موجود ہے۔بطور فکشن نگار اقبال متین نے انسانی سماج ومعاشرے کے کئی تاریک پہلوؤں کو بے نقاب کیا ہے۔ان کے افسانوی مجموعوں میں ''اجلی پرچھائیاں'' ''نچا ہوا البم'' ''خالی پٹاریوں کا مداری'' ''آگہی کے ویرانے'' ''مزبلہ'' ''میں بھی فسانہ تم بھی کہانی'' اور ''شہر آشوب'' بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

اقبال متین ترقی پسند تحریک سے وابستہ افسانہ نگار ہیں لیکن ان کی یہ وابستگی صرف نظریاتی سطح تک ہے۔ادب کے تئیں ان کے افکار ونظریات نہایت وسیع اور متنوع ہیں۔ان کے یہاں کسی قسم کی مقصدیت اور ادعائیت نظر نہیں آتی۔انھوں نے ہمیشہ اپنے ذہن ودل کے دریچوں کو کھلا رکھا اور ادب کے فنی تقاضوں کو ملحوظ رکھا۔یہی وجہ ہے کہ ان کے فن میں وسعت و گہرائی پائی جاتی ہے۔

اقبال متین اردو کے ایک نمائندہ افسانہ نگار ہیں۔ان کا شمار آزادی کے بعد کے ان ممتاز اور باکمال

افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنہوں نے روایت اور جدّت کے درمیان صحت مند توازن کو برقرار رکھا اور اردو افسانہ کو انحطاط سے بچانے، اسے فروغ دینے اور ثروت مند بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کے بیشتر افسانے عصری ماحول اور حالات میں رونما ہونے والے مختلف النوع مسائل کے عکاس ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں ایک مخصوص عہد کی زندگی اور اپنے گردوپیش کے حالات و واقعات مثلاً حیدرآباد کا زوال پذیر جاگیردار معاشرہ، اس کی مٹتی ہوئی تہذیب، اس کا جارحانہ اور استحصالی رویّہ، اور چند دوسرے پہلوؤں کو موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کے افسانوں میں متوسط اور نچلے طبقات کے مسائل کا بیان بھی پراثر انداز میں ہوا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے ہم عصر سماج میں بڑھتی ہوئی مادّیت پرستی، انسانی بے حسی، سنگدلی، بے ضمیری، بے رحمی، فساد اور اس کے نتیجہ میں ہونے والی قتل و غارت گری، عام انسانوں کی بے بسی، مجبوری و محرومی، انسانیت کی ناقدری اور اس طرح کے مختلف مسائل کی عکاسی اس فنکارانہ انداز میں کی ہے کہ ان کے افسانوں میں ان کا عہد اور ان کا معاشرہ جیتا جاگتا نظر آتا ہے۔

دوسرے فن کاروں کی طرح اقبال متین کی بھی ساری تحریریں یکساں نوعیت کی نہیں ہیں۔ ان کے ابتدائی افسانے فنی اعتبار سے کمزور ہیں جن میں پلاٹ، کردار، اسلوب اور زبان و بیان کی خامیاں نظر آتی ہیں۔ اقبال متین نے کچھ افسانے معاوضے کے حصول کے لیے لکھے تھے۔ ان کے ایسے افسانے بھی فنی لحاظ سے لائق اعتناء نہیں ہیں لیکن ایسے افسانوں کی تعداد کم ہے۔ اس کے برعکس ان کے یہاں اچھے افسانوں کی تعداد زیادہ ہے جن میں پلاٹ، کردارنگاری، منظرنگاری، اسلوب اور زبان و بیان کے خوبصورت نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ان کے اچھے افسانوں میں موضوعات کا تنوع، فن کا گہرا شعور، تخلیقی بصیرت، عصری حسّیت، احساس کی شدّت، زبان کا غیرمعمولی تخلیقی استعمال، غرض وہ تمام فکری و فنی خوبیاں پائی جاتی ہیں جو انھیں ایک منفرد اور صاحب طرز افسانہ نگار کی حیثیت سے ہم عصر اردو افسانہ نگاری میں اہم مقام عطا کرتی ہیں۔ اقبال متین نے اپنے طویل افسانوی سفر میں اردو کو کئی نمائندہ اور اہم افسانے دیے۔ انھوں نے بیش بہا افسانوی تخلیقات کی بنیاد پر ہی افسانہ نگاری کے میدان میں اپنی شناخت قائم۔ انھوں نے اردو فکشن کو ''چراغ تہہ داماں'' کے عنوان سے ایک ناولٹ بھی دیا۔ فکشن کے علاوہ اقبال متین نے خاکہ نگاری اور یادنگاری کے ذریعے بھی ادبی خدمات انجام دیں جن کی بنا پر وہ اردو

ادب میں بے حد اہمیت کے مالک ہیں لیکن ان کی ادبی اہمیت پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔

اقبال متین کی ادبی و تخلیقی خدمات نیز ان کی فکری و فنی انفرادیت کے پیش نظر ہی میں اس جانب متوجہ ہوا اور اقبال متین کی ادبی خدمات کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا۔

میرا یہ مقالہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں اقبال متین کی شخصیت، سوانحی کوائف اور ان کی ادبی خدمات کا اجمالی جائزہ پیش کیا گیا۔

مقالے کا دوسرا باب چار ذیلی ابواب پر مشتمل ہے۔ ان ذیلی بواب کے تحت اقبال متین کی افسانوی خدمات مثلاً ان کے افسانوں اور ناولٹ کے موضوعات و مسائل نیز ان کی فنی خوبیوں پلاٹ، کردار، زبان و بیان اور اسلوب کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے فکشن نگاری میں ان کے انفراد و امتیاز کو اُجاگر کیا گیا ہے اور ہم عصر اردو فکشن میں ان کے مقام کے تعین کی کوشش کی گئی ہے۔

مقالے کا تیسرا باب بھی چار ذیلی ابواب پر مشتمل ہے۔ ان ابواب کے تحت اقبال متین کی غیر افسانوی نثر مثلاً خاکہ نگاری، یادنگاری اور مضمون نگاری کے اسلوب اور زبان و بیان کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے اور غیر افسانوی نثر میں اقبال متین کی ادبی حیثیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

مقالے کا چوتھا باب اقبال متین کی شاعری پر مشتمل ہے۔ اس میں اقبال متین کی غزلوں اور نظموں کو موضوع بحث بنا کر اس کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے اور اس جائزے کی روشنی میں ان کی شاعری کی قدر و قیمت کے تعین کی کوشش کی گئی ہے۔

مقالے کا آخری باب ''معاصرین میں اقبال متین کا مقام و مرتبہ'' کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں اقبال متین اور ان کے چند معاصر افسانہ نگاروں کے فکر و فن کا جائزہ لیتے ہوئے اقبال متین کی انفرادیت و اہمیت اور مقام و مرتبہ کو اجاگر کرنے کی ہر ممکن سعی کی گئی ہے۔

مذکورہ پانچ ابواب کے بعد ''ماحصل'' ہے۔ اس میں پانچوں ابواب کا نچوڑ / نتائج کو پیش کیا گیا ہے۔ آخر میں کتابیات ہے۔ اس میں بنیادی ماخذ کے تحت اقبال متین کی تخلیقات اور ثانوی ماخذ کے تحت موضوع سے متعلق معاون کتابیات کی فہرست شامل مقالہ ہے۔

اس موقع پر سب سے پہلے میں اپنے رب العزت کا شکریہ ادا کرتا ہوں جس نے مجھے فہم و شعور بخشا

اور حصول علم کی توفیق دی۔ بعدازاں میں اپنے استاد محترم پروفیسر معین الدین جینابڑے صاحب کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرنا اپنا خوش گوار فریضہ سمجھتا ہوں۔ان کی پدرانہ ومربیانہ شفقت کو تاعمر بھلا پانا ممکن نہیں۔ان کے توسط سے مجھے موضوع سے متعلق سارا مواد دستیاب ہوا۔اس تعاون کے علاوہ انھوں نے اپنے مفید مشوروں سے نوازا اوران کی رہنمائی اورنگرانی میں میرا تحقیقی سفر خوش اسلوبی سے پایۂ تکمیل تک پہنچا۔میں ایک بار پھر سے آپ کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہوں۔

میں اپنے شعبہ کے دیگر اساتذہ پروفیسر انوار عالم انور پاشا، پروفیسر مظہر مہدی، پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین، ڈاکٹر توحید خاں اور ڈاکٹر آصف زہری کا بھی شکرگزار ہوں جن سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا اور جنھوں نے اپنے مفید مشوروں سے نوازا۔

اس موقع پر مجھے مشہور فکشن نگار نورالحسنین صاحب بے طرح یاد آتے ہیں جن کی مرتبہ کتاب ''اقبال متین سے انسیت'' میری اس تحقیقی کاوش میں بے حد معاون ثابت ہوئی۔انھوں نے اقبال متین کے کئی افسانوں کی تفہیم میں مدد کی اور اپنے مفید مشوروں سے نوازا۔اللہ ان جیسے ادیبوں کا سایہ ہم طالب علموں کے سروں پر قائم رکھے۔آمین۔

میں اپنے احباب میں ڈاکٹر رغبت شمیم ملک، ڈاکٹر شاداب عالم، ڈاکٹر محبوب حسن اور ڈاکٹر شیو پرکاش کا بے حد ممنون ہوں کہ ان لوگوں نے مجھے علمی وادبی تعاون دیا۔علاوہ ازیں میں اپنے ان تمام مخلص دوستوں اور ساتھیوں کا بھی بے حد ممنون ومشکور ہوں جنھوں نے کسی نہ کسی صورت میں میری مدد کی اور میرا اعتبار بحال کیا۔

میں اپنے والدین محمد زبیر عالم اور بی بی حسن آرا کے لیے شکریے کے الفاظ ناکافی پاتا ہوں۔ان عظیم ہستیوں کی دعاؤں کا ثمرہ ہے کہ میں آج کسی لائق بن سکا۔ان کی بے لوث محبتیں اور عنایتیں مجھے ہمیشہ علمی سرگرمیوں پر آمادہ کرتی رہتی ہیں۔بڑے بھائی محمد اویس عالم مرحوم کی یاد بہت ستاتی ہے۔انھوں نے ہم چھوٹے بھائی بہنوں کی تعلیم کے لیے بڑی قربانیاں دیں۔میری ہر ایک سانس ان کا مقروض ہے۔اللہ ان کی روح کو چین وسکون نصیب فرمائے اور انھیں اپنی جوار رحمت میں جگہ دے۔آمین۔بھائی اصغر رضا صاحب نے مجھ خاکسار پر ہمیشہ ہی اپنی شفقت ومحبت کا مظاہرہ کیا اور اپنی ہمدردانہ باتوں سے

حوصلہ بخشا۔ ان کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میں اپنے چھوٹے بھائیوں میں تبریز حسن (جوائنٹ سکریٹری، جواہرلال نہرو یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین) اور مختار حسن (سول انجینئر) اور بہنوں میں ترنم ناز، طلعت جبیں اور رخسار خاتون کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں جن کی نیک خواہشات مجھے تازہ دم رکھتی ہیں۔

میں اس خوشگوار موقع پر اپنی شریک حیات غازیہ جوہر کو کیسے بھول سکتا ہوں جس نے مجھے تمام ذمہ داریوں سے آزاد رکھا، سکون و اطمینان کے لمحات میسر کیے اور میں یکسوئی کے ساتھ اپنا تحقیقی کام پورا کرسکا۔ اریبہ جوہر کا بھی شکریہ جس کی کلکاریاں طمانیت کا باعث ہیں۔ میں شکرگزار ہوں ان تمام اعزہ و اقارب کا جو مجھ سے بے لوث محبت کرتے ہیں اور میری کامیابی کے لیے دل سے دعا گو ہیں۔

احمد علی جوہر
E-236، برہمپترا ہاسٹل
جے، این، یو، نئی دہلی

باب اول

اقبال متین: شخص و ادیب

(الف)　　سوانحی کوائف

(ب)　　ادبی خدمات

سوانحی کوائف

نام، حسب ونسب، پیدائش:

اقبال متین کا اصل نام ''سید مسیح الدین خاں'' عرف 'اقبال' اور تخلص 'متین' ہے۔ اقبال متین ان کا قلمی نام ہے۔ یہی نام ان کے تعلیمی سرٹیفکٹ میں درج ہے۔ اس کی تائید خود اقبال متین کے درج ذیل بیان سے ہوتی ہے:

> ''میرا اصلی نام ''سید مسیح الدین'' عرف اقبال ہے اور تخلص متین ہے۔ بعد میں اپنا نام میں نے اقبال متین رکھ لیا۔ میٹرک کا امتحان چوں کہ میں نے اسی نام سے کامیاب کیا، سو یہی نام میرا قانونی نام بن گیا۔'' (۱)

اقبال متین کے والد کا نام سید عبدالقادر تھا۔ وہ شاعر تھے اور ناصر تخلص کرتے تھے۔ ڈاکٹر محمد علی اثر کے مطابق: ''ان کا غیر مطبوعہ کلام اب بھی متین صاحب کے یہاں موجود ہے''۔ (۲)

کہکشاں فرخ ان کے کلام کے بارے میں لکھتی ہیں:

> ''جذبات ناصر' کے عنوان سے انھوں نے اپنا قلمی دیوان ایک سو گیارہ غزلوں پر مشتمل چھوڑا ہے جو اقبال متین کے چھوٹے بھائی سید مصلح الدین سعدی تسکین نے چھپوانے کا ارادہ کیا تھا لیکن یہ منصوبہ شاید ابھی تک پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچا''۔ (۳)

سید عبدالقادر ناصر کا تعلق جاگیردار گھرانہ سے تھا۔ وہ وضع دار شخصیت کے مالک تھے۔ آسمان جاہی پائیگاہ نظام سرکار کے زمانے میں وہ مختلف مقامات پر تحصیل داری اور پھر تعلق داری کی خدمات پر مامور رہے۔ ان خدمات کو انجام دینے کے ساتھ وہ اپنے گھر پر شعر وادب کی محفلیں بھی منعقد کرتے تھے جس کے سائے میں اقبال متین کی پرورش اور ان کی ذہنی نشو ونما ہوئی۔ ان کی ننھیال مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ ان کے دادا سید مسیح الدین خاں بقول یوسف سرمست:

''بڑے معین الدولہ والی پائیگاہ آسمان جاہی کے سگے ماموں اور سرپرست تھے۔نواب معین الدولہ کے والد نواب آسمان جاہ بشیرالدولہ کا انتقال اس وقت ہوا جب معین الدولہ بہت کم عمر تھے۔اس لیے نواب مسیح الدین خاں کو ان کا سرپرست اور نگراں مقرر کیا گیا تھا۔''(۴)

اپنے دادا ہی کے نام پر اقبال متین کا نام سید مسیح الدین خاں رکھا گیا تھا۔کہکشاں فرخ کے درج ذیل بیان سے اسی امر کی توثیق ہوتی ہے۔وہ لکھتی ہیں:

''ان کے دادا نہ صرف جاگیردار تھے، بلکہ معین الدولہ کے سگے ماموں اور اتالیق بھی تھے۔ساتھ ہی میر مجلس پائیگاہ آسمان جاہی کی حیثیت سے سب سے اعلیٰ ترین عہدہ پر فائز تھے۔چنانچہ جب تک معین الدولہ اس قابل نہ ہوئے کہ انتظام اپنے ہاتھ میں لے سکیں، سارا انصرام سید مسیح الدین خاں صاحب ہی کے پاس رہا۔اقبال متین کا نام سید مسیح الدین خاں ان ہی کے نام پر رکھا گیا۔''(۵)

پیدائش:

اقبال متین کی پیدائش حیدرآباد کے محلّہ رام کوٹ (فرحت منزل) میں ہوئی۔اس سلسلے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔البتہ ان کے سنہ پیدائش کے متعلق اختلاف پایا جاتا ہے۔عام طور پر۲/فروری ۱۹۲۹ء ان کی تاریخ پیدائش بیان کی جاتی ہے۔ان کی دوسری تاریخ پیدائش ۴/اکتوبر ۱۹۲۴ء کا حوالہ ان کی تصنیف ''سوندھی مٹی کے بت'' کے آخر میں 'لیل ونہار' کے ذیلی عنوان 'تعارف نامہ' سے ملتا ہے۔ان کی ایک اور تاریخ پیدائش آندھرا پردیش کے اردو مصنفین کی ڈائرکٹری میں ۱/۵ اکتوبر ۱۹۲۴ء درج ہے۔اتفاق کی بات ہے کہ ان تینوں میں سے کسی بھی تاریخ پیدائش کی تصدیق مستند ذرائع سے نہیں ہوتی۔ان کی تاریخ پیدائش کے متعلق ڈاکٹر محمد علی اثر کا بیان ہے:

''ان کی صحیح تاریخ پیدائش کا ریکارڈ متین صاحب کے یہاں محفوظ نہیں۔جب انھوں نے ایم۔اے۔انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے پنجاب میٹرک لاہور کے امتحان میں شرکت کی تو انسٹی ٹیوٹ والوں نے امتحان کے قواعد وضوابط کی روشنی میں ان کی تاریخ پیدائش ۲/فروری ۱۹۲۹ء درج کردی، یہی تاریخ ان کے انٹرمیڈیٹ کی سند اور شادی کے دونوں سیاہ ناموں

(کذا)اور کتابوں میں بھی درج ہے۔.......سلطانہ مہر کے مرتبہ تذکرے
''گفتنی دوم'' میں ''سید مسیح الدین'' کو متین صاحب کا تاریخی نام بتایا گیا
ہے جو اس لئے محل نظر ہے کہ اس سے 287 کے اعداد برآمد ہوتے ہیں۔
آندھراپردیش کے اردو مصنفین کی ڈائرکٹری میں نہ جانے کس طرح ان کی
غیر مصدقہ تاریخ پیدائش ۱/۵ اکتوبر ۱۹۲۴ء شائع ہوگئی۔ (ص،۴۵) جہاں
تک متین صاحب کی ابتدائی تعلیم کے صداقت ناموں کا تعلق ہے، میڈل
اسکول کی تعلیم انھوں نے مدرسہ وسطانیہ بشیر آباد اور مدرسہ فوقانیہ چنتا پور
میں حاصل کی تھی۔ وہاں کیا تاریخ درج تھی اور پھر اس کے بعد انھوں نے
سٹی کالج میں داخلہ لیا تو یہاں کے داخلہ رجسٹر میں تاریخ پیدائش کا کیا
اندراج ہوا ہے، جب تک ان امور کی تحقیق و تنقیح نہ کی جائے اقبال متین کی
صحیح تاریخ پیدائش کا تعیّن دشوار ہے۔'' (٦)

درج بالا اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ اقبال متین کی مذکورہ تاریخ پیدائش میں کسی بھی تاریخ کا معتبر حوالہ موجود نہیں ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ عموماً ان کی تاریخ پیدائش ۱۲/فروری ۱۹۲۹ء بتلائی جاتی ہے لیکن تحقیق کی رو سے اس کو بھی صحیح نہیں مانا جاسکتا۔ ان کی صحیح تاریخ پیدائش اب بھی تحقیق طلب امر ہے۔ جب تک مستند و معتبر ذرائع سے اس کا پتہ نہیں چلتا، اس سلسلہ میں کوئی فیصلہ کن رائے نہیں دی جاسکتی۔

تعلیم، ملازمت:

اقبال متین کے تعلیمی سفر کا آغاز مدرسہ وسطانیہ بشیر آباد سے ہوا جو مختلف تعلیم گاہوں سے گزر کر اختتام پذیر ہوا۔ دراصل ان کے والد سید عبدالقادر ناصر تحصیل دار تھے۔ ان کے تبادلوں کے ساتھ ساتھ اقبال متین کے مدارس بھی بدلتے رہے۔ انھوں نے اپنی تعلیم کا آغاز مدرسہ وسطانیہ بشیر آباد سے کیا۔ میڈل اسکول تک ان کی تعلیم مدرسہ فوقانیہ، چنتا پور میں ہوئی جہاں ان کے والد تحصیل دار تھے۔ کچھ دنوں تک ان کی تعلیم سٹی ہائی اسکول۔ حیدرآباد، اور ایم۔اے۔او۔انسٹی ٹیوٹ، عابڈس، حیدرآباد میں ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے سٹی کالج، حیدرآباد میں داخلہ لیا جہاں مخدوم محی الدین انھیں اردو پڑھاتے تھے۔ سٹی کالج سے ان کی جماعت کو کسی وجہ سے دارالعلوم کالج، حیدرآباد منتقل ہونا پڑا جہاں ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ پرنسپل تھے۔ عام طور پر اسی کالج سے اقبال متین کا انٹرمیڈیٹ کا امتحان کامیاب

کرنا بتایا جاتا ہے جیسا کہ ڈاکٹر حسن الدین احمد (۷) اور کہکشاں فرخ (۸) نے بیان کیا ہے۔ جب کہ صحیح یہ ہے بقول ڈاکٹر محمد علی اثر: ''جب چادرگھاٹ کالج کا قیام عمل میں آیا تو اقبال متین نے انٹرمیڈیٹ کا امتحان اسی کالج سے ۱۹۴۵ء میں کامیاب کیا۔ اس کالج میں بھی زوؔر صاحب پرنسپل تھے۔'' (۹) انٹرمیڈیٹ کا امتحان کامیاب کرنے کے بعد جب اقبال متین کسی ملازمت سے وابستہ نہیں ہو سکے تو ڈاکٹر محمد علی اثر کے بیان کے مطابق: ''کسی ملازمت کے لیے وقت ضائع کئے بغیر گھر والوں کی مخالفت کے باوجود انھوں نے پان کی دکان لگائی تھی۔....... پان کی دکان تو زیادہ نہیں چلی لیکن اسی دوران حیدرآباد کے جاگیرایڈمنسٹریشن آفس میں بحیثیت (صعفدار کلرک) ان کا تقرر عمل میں آیا۔'' (۱۰)

یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے کہ اقبال متین نے جاگیراڈمنسٹریشن سے پہلے محکمۂ آبکاری میں ملازمت اختیار کی اور یہ ان کی پہلی ملازمت تھی۔ پولیس ایکشن کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہو گیا تو جاگیرایڈمنسٹریشن میں ملازم ہوئے۔(۱۱) یہاں ان کا تقرر کلرک کی حیثیت سے ہوا تھا۔ ترقی کرکے وہ نائب تحصیل دار کے عہدہ پر فائز ہوئے اور اسی عہدہ پر خدمات انجام دیتے ہوئے سبکدوش ہوئے۔ کہکشاں فرخ اس سلسلے میں لکھتی ہیں:

> ''اقبال متین نے اپنی ملازمت کا آغاز محکمہ آبکاری سے کیا لیکن بہت جلد وہ جاگیراڈمنسٹریشن سے وابستہ ہوگئے۔ جاگیرایڈمنسٹریشن جب محکمہ بندوبست میں ضم ہوگیا تو اقبال متین کی خدمات محکمہ مال کے سپرد کردی گئیں۔ اس محکمہ میں ملازمت کے ضمن میں وہ بہت زیادہ عرصہ تک نظام آباد میں رہے اور وہیں سے نائب تحصیلدار کے عہدہ پر سبکدوش ہوئے۔'' (۱۲)

ازدواج، آل واولاد:

اقبال متین کی دو شادیاں ہوئیں۔ پہلی شادی کس سن میں ہوئی، اس کی کوئی تفصیل نہیں ملتی، مگر ان کی پہلی شادی اتنی ہنگامہ خیز طریقہ سے ہوئی کہ اس پر انھوں نے ''اُجلی پرچھائیاں'' کے عنوان سے ایک افسانہ لکھ ڈالا جس میں انھوں نے اپنی آپ بیتی کو اس دردانگیز پیرائے میں بیان کیا ہے کہ اس میں جگ بیتی کی شان پیدا ہوگئی ہے۔ اقبال متین کی پہلی شادی اپنی پھوپھی زاد بہن سیدہ بدرالنساء بیگم منیر سے ہوئی۔ پہلی بیوی کے انتقال کے بعد ان کا دوسرا عقد شاہ جہاں بیگم رابعہ سے ہوا۔ یہاں ڈاکٹر محمد علی اثر

کا درج ذیل بیان ملاحظہ کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ وہ لکھتے ہیں:

''نوجوانی کے زمانے میں اقبال متین کو اپنی پھوپھی زاد بہن سے اُنسیت پیدا ہوگئی تھی لیکن ان کی والدہ چاہتی تھیں کہ وہ اپنی بھانجی کو بہو بنائیں۔ بالآخر متین صاحب کی پہلی اور آخری محبت رنگ لائی اور پھوپھی زاد بہن سیدہ بدرالنساء بیگم منیر ان کی شریک حیات بن گئیں۔ اقبال متین کا دوسرا عقد شاہ جہاں بیگم رابعہ سے ہوا۔'' (۱۳)

اقبال متین کو کل ۹/اولادیں ہوئیں جن میں ۷/لڑکے اور ۲/لڑکیاں شامل ہیں۔ ان میں سے تین لڑکوں کا انتقال ہو چکا ہے۔ اقبال متین نے اپنی تصنیف ''سوندھی مٹی کے بت'' کے آخر میں 'دلیل ونہار' کے ذیلی عنوان 'تعارف نامہ' کے تحت اپنا تعارف پیش کیا ہے۔ اس سے ان کے سوانحی گوشوں کو اختصار کے ساتھ جاننے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ اسی اہمیت کے پیشِ نظر 'تعارف نامہ' کا ایک حصّہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

تعارف نامہ

نام: سید مسیح الدین

عرف: اقبال

تخلص: متین

قلمی نام: اقبال متین

والد کا نام: سید عبدالقادر ناصؔر صاحب (مرحوم)

حقیقی والدہ: سیدہ اصفیاء بیگم صاحبہ مرحوم

علاتی والدہ: محبوب بیگم صاحبہ مرحوم جو مجھے حقیقی والدہ کے برابر تھیں

تاریخ پیدائش: ۴/اکتوبر ۱۹۲۴ء

مقام پیدائش: فرحت منزل، رام کوٹ، شہر حیدرآباد (بھارت)

تعلیم: انٹرمیڈیٹ

درسگاہیں: مدرسہ وسطانیہ بشیرآباد (نادندگی) (کذا)

مدرسہ فوقانیہ، چیتا پور

سٹی ہائی اسکول، حیدرآباد

ایم۔اے۔او۔انسٹی ٹیوٹ، عابڈس، حیدرآباد

سٹی کالج، حیدرآباد

دارالعلوم کالج، حیدرآباد

چادرگھاٹ کالج، حیدرآباد

شریک حیات: سیدہ بدرالنساء بیگم منیر مرحوم

(پہلا اور آخری معاشقہ)

دوسرا عقد: شاہ جہاں بیگم رابعہ

اولاد سید فرید اقبال مرحوم

سید نوید اقبال

سیدہ ماریا شہناز

سید نشید اقبال مرحوم

سید معید اقبال مرحوم

شبانہ اقبال

سید مجید اقبال

سید وحید اقبال

سید سدید اقبال (۱۴)

اقبال متین کی زندگی کا ایک قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ ان کے والد تحصیل دار اور تعلقدار تھے اور وہ خود بھی نائب تحصیل دار کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ اپنی ملازمت کے سلسلہ میں ان کے والد اور خود ان کا مختلف مقامات پر تبادلہ ہوا۔ اس لیے انھیں متعدد جگہوں پر رہائش اختیار کرنی پڑی۔ ان متعدد رہائش گاہوں کی سنہ وار فہرست انھوں نے ''سوندھی مٹی کے بت'' کے آخر میں 'دلیل ونہار' کے ذیلی عنوان

''بسیرے'' کے تحت درج کی ہے۔ اپنی ملازمت کے سلسلے میں اقبال متین کو نظام آباد بھی منتقل ہونا پڑا تھا جہاں انھوں نے ایک رہائشی مکان تعمیر کروایا اور اس کا نام ''کہانی'' رکھا۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد اقبال متین نے حیدرآباد کو اپنا مستقل مسکن بنایا اور وہیں قیام پذیر ہوئے۔

ادبی شخصیت کی تعمیر و تشکیل:

اقبال متین کا گھرانہ علمی و ادبی گھرانہ تھا۔ ان کے والد سید عبدالقادر ناصرؔ شاعر تھے۔ ان کے دو چچا سید قادرالدین تمکین سرمست (پدر یوسف سرمست) اور نسیم قاسمی کا شمار خوش فکر غزل گو شعراء میں ہوتا تھا۔ تیسرے چچا دستگیرالدین ڈرامہ نویس تھے۔ ان کے گھر شعروادب کی محفلیں منعقد ہوتی رہتی تھیں۔ ایسے ادبی ماحول میں اقبال متین کی ذہنی نشو ونما ہوئی تھی۔ ان کے ادبی شعور کو جلا بخشنے میں سٹی کالج، حیدرآباد میں مخدوم محی الدین اور دارالعلوم کالج، حیدرآباد اور چادرگھاٹ کالج، حیدرآباد میں محی الدین قادری زورؔ کا بھی ہاتھ تھا۔ ان کے علاوہ اقبال متین کی ذہنی آبیاری میں ان کے استاد حضرت مفتوںؔ اجمیری کا بھی بڑا حصّہ تھا جنھوں نے ان کی پہلی نظم ''یتیم کی عید'' کی اصلاح کی اور پیٹھ تھپک کر شاباشی دی تھی۔ اپنے گھریلو ماحول کے متعلق اقبال متین نے بیان کیا ہے:

> ''گھر کا ماحول ادبی تھا۔ چناں چہ بچپن ہی سے شعر کہنے کا چسکا لگ گیا۔ بچوں کے رسالوں ''پیامِ تعلیم''، ''غنچہ''، ''ہونہار''، ''سب رس'' وغیرہ میں نظمیں شائع ہوئیں۔ ''پیامِ تعلیم'' میں چھپی نظم ''یتیم کی عید'' نے میری بہت چاہنے والی امی کو مجھ سے خفا کر دیا کہ میں منحوس ہوں۔ نظم لکھی نہیں۔ اور لکھی تو یتیموں کی بات لے بیٹھا۔ اللہ نے میرے امی ابا کو بہتر (۷۲) سال سے زیادہ عمر دی ورنہ نحوست کا یہ کانٹا مجھے بے آرام رکھتا۔ وہ میری بچوں کے لیے پہلی نظم تھی جس پر میں نے حضرت مفتوںؔ اجمیری سے اصلاح لی تھی۔ پوری نظم میں انھوں نے دو لفظوں کی اصلاح کی اور پیٹھ تھپک کر شاباشی دی تھی۔ بے وطن تھے۔ مخلص آدمی تھے۔ ابا نے تحصیل داری کے بنگلے میں رہنے کے لیے ایک کمرہ دے دیا تھا۔''(۱۵)

درج بالا اقتباس سے اس امر پہ روشنی پڑتی ہے کہ اقبال متین کے گھر کی فضا ادبی تھی۔ ان کے والد کے احباب و متعلقین میں شعراء و ادباء تھے جن سے انھیں بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملتا تھا۔ دراصل اقبال

متین کے والد تحصیل دار ضرور تھے لیکن اس کے ساتھ وہ شاعر بھی تھے اور شعر و ادب کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ وہ اپنے گھر پر ادبی محفلیں بھی سجاتے تھے۔ ۱۹۳۹ء میں جب اقبال متین چودہ پندرہ سال کے تھے، ان کے والد سید عبدالقادر ناصؔر نے چیتا پور میں ایک مشاعرہ منعقد کیا جس میں اس وقت کے بائیں بازو کے شعراء لطیف ساجد، سلیمان اریب، نظر حیدرآبادی، تمکین سرمست اور مخدوم محی الدین وغیرہ شریک ہوئے۔ اس مشاعرہ کی روداد کو اقبال متین نے ''سوندھی مٹی کے بت'' میں شامل ''شعور کی شخصیت مخدومؔ'' کے عنوان سے لکھے خاکے میں اس خوبصورتی سے بیان کیا ہے کہ پورے مشاعرہ کو جیتا جاگتا بنا دیا ہے۔ اس مشاعرہ کے جملہ انتظامات میں اقبال متین اپنے بزرگوں کے ساتھ پیش پیش رہے۔ یہاں اقبال متین کو شعراء سے بڑی قربت رہی اور بہت کچھ دیکھنے، سننے اور سیکھنے کے مواقع حاصل ہوئے۔ اپنے گھریلو ماحول اور شعراء و ادباء کی رفاقت کے زیر اثر بچپن ہی سے اقبال متین کا فطری میلان ادب کی طرف ہو گیا اور کم سنی ہی میں انھوں نے منٹو، عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی، ممتاز شیریں، اختر اورینوی اور دیگر کہانی کاروں کی کہانیوں کا گہرا مطالعہ کر لیا تھا۔ اس طرح اقبال متین کی ذہنی تربیت اور ان کی ادبی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں ان کے گھر کی شعری و علمی فضا، حیدرآباد کا ادبی ماحول، کہنہ مشق اساتذہ سخن کی صحبت و رفاقت اور ادباء کی تحریروں کے گہرے مطالعے نے مل جُل کر حصّہ لیا تھا۔ رفتہ رفتہ ان کی ادبی شخصیت نکھرتی رہی اور اس میں پختگی پیدا ہوتی گئی اور آگے چل کر وہ ایک اہم نمائندہ ادیب کی شکل میں سامنے آئے۔

اقبال متین نے زندگی کی طویل عمر پائی اور چھیاسی برس تک جیے۔ اخیر عمر میں وہ بیمار رہنے اور کم سننے لگے تھے لیکن اس عمر میں بھی وہ لوگوں سے زندہ دلی اور شگفتگی سے ملتے تھے۔ ان سے میری ملاقات تو نہیں ہوئی مگر فون پر مسلسل بات ہوئی۔ وہ اس پیار بھرے انداز میں بات کرتے تھے کہ ان سے مسلسل بات کرتے رہنے کو جی چاہتا تھا۔ کسے معلوم تھا کہ وہ اچانک ہم سے جُدا ہو جائیں گے۔ ان کے بیٹے سید سدید اقبال کے مطابق موت سے تین چار دن پہلے سر میں چکر آنا شروع ہوا اور بالآخر اردو ادب کا یہ ستارہ ۵/ مئی ۲۰۱۵ء کی صبح نو بج کر بیس منٹ سے تیس منٹ کے درمیان زندگی کی آخری سانس لے کر غروب ہو گیا۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے اور اپنی جوار رحمت میں جگہ دے۔ آمین۔

ادبی خدمات

اقبال متین اردو ادب میں کثیر الجہات شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ ایک مستند افسانہ نگار، ناولٹ نگار، شاعر، خاکہ نویس اور مضمون نگار ہیں۔ ادب کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی نے ان کی شخصیت کو بوقلموں بنا دیا ہے۔

اقبال متین کی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے ہوا۔ ابتداءً انھوں نے بچوں کے لیے ہلکی پھلکی نظمیں کہیں جو اس وقت کے بچوں کے رسائل ''پیامِ تعلیم''، ''غنچہ''، ''ہونہار''، ''سب رس''، ''پھول'' اور ''نونہال'' وغیرہ میں شائع ہوئیں۔ ادبی زاویۂ نگاہ سے ان نظموں کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ اس لیے ان کی پہلی نظم ''کب تلک'' کو مانا جاتا ہے جو ''سب رس'' حیدرآباد میں ۱۹۴۲ء میں شائع ہوئی۔ اس وقت 'سب رس' کے مدیر خواجہ حمید الدین شاہد تھے۔ اسی سال ان کی دوسری نظم حیدرآباد ہی کے رسالہ 'ارم' میں ''کیوں؟'' کے عنوان سے منظرِ عام پر آئی۔ ان چند نظموں کی اشاعت کے بعد اقبال متین نے اپنا رُخ شاعری سے کہانی کی طرف کیا اور اسے اپنے ادبی اظہار کا ذریعہ بنایا۔ شاعری سے کہانی کی طرف مائل ہونے کی وجہ کیا تھی۔ اس سلسلہ میں خود اقبال متین کا درج ذیل بیان ملاحظہ ہو۔ وہ کہتے ہیں:

> ''یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ میں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز شاعری سے کیا لیکن جلد ہی افسانے کا ہو کر رہ گیا۔ اس کی وجہ شاید یہی ہو کہ جو (Talent) اپنے تجربے سے گزر کر موضوع کی روح اپنی تخلیق میں سمیٹ نہیں سکتا وہ فن کا کوئی معیار قائم نہیں کر سکتا۔ میرا افسانہ اظہار کے در و بست میں میری شاعری سے زیادہ خوشی و انبساط فراہم کرتا رہا ہے۔ میں افسانے کا ہو رہا۔ اور یہ خوشی کسی فنکار کو اُسی وقت حاصل ہوتی ہے جب کہ موضوع اور موضوع کو پیدا کرنے والے معروضی حالات سے تخلیق کار کا (Involvement) اٹوٹ ہو۔''(۱)

اس اقتباس سے اس امر کا انکشاف ہوتا ہے کہ اقبال متین نے اپنے تجربات ومشاہدات اور اپنی ادبی صلاحیتوں کے اظہار کے لیے صنف افسانہ کو سب سے زیادہ موزوں پایا، اسی لیے وہ اس کی طرف مائل ہوئے۔ انھوں نے پہلی کہانی ''چوڑیاں'' کے عنوان سے ۱۹۴۳ء میں لکھی جب وہ نویں جماعت کے طالب علم تھے۔ یہ کہانی جون ۱۹۴۵ء میں ادبِ لطیف میں شائع ہوئی۔ اس وقت ادبِ لطیف کے ایڈیٹر احمد ندیم قاسمی تھے۔ اس کہانی اور احمد ندیم قاسمی صاحب سے ملاقات کے تعلق سے ایک دلچسپ لطیفہ ہے جسے اقبال متین نے اپنے مضمون ''کہانی کی کہانی'' میں بیان کیا ہے۔ اس کہانی کی اشاعت کے متعلق عابد سہیل کا کہنا ہے:

> ''اقبال متین کا پہلا افسانہ ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا تھا اور وہ بھی ادب لطیف میں جس کے ایڈیٹر احمد ندیم قاسمی تھے۔ اس وقت اقبال متین کی عمر صرف ۱۵ سال تھی اور وہ نویں درجے کے طالب علم تھے۔''(۲)

اس اقتباس میں کہانی کی سنہ اشاعت کے علاوہ عابد سہیل کی ساری باتیں صحیح ہیں۔ صرف سنہ اشاعت درج کرنے میں ان سے سہو ہوا ہے۔ کہانی کی صحیح سنہ اشاعت جون ۱۹۴۵ء ہے۔ اس کی تصدیق خود اقبال متین کے درج ذیل بیان سے ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

> ''چوڑیاں'' میری پہلی کہانی تھی۔ یہ کہانی میں نے ۱۹۴۳ء میں لکھی تھی جب میں نویں جماعت کا طالب علم تھا۔ اس کی اشاعت جون ۱۹۴۵ء کے ادبِ لطیف میں ہوئی۔ احمد ندیم قاسمی اُن دنوں ادبِ لطیف کے ایڈیٹر تھے۔ دوسری کہانی ''سنہری لکیریں'' فروری ۱۹۴۶ء میں ''ادبی دنیا'' میں چھپی تھی۔ صلاح الدین احمد اُس کے مدیر تھے۔ ''چوڑیاں'' پھر 'نگار' میں نیاز فتح پوری کی ادارت میں چھپی۔ نیاز صاحب سے ''ہیرو'' کے مکالموں کے تعلق سے خط وکتابت بھی ہوئی تھی اور انہوں نے میری بات مان لی تھی۔ تیسری اور چوتھی کہانیاں بھی ادبِ لطیف اور ممتاز شیریں والے ''نیا دور'' میں چھپی تھیں۔ میری ابتدائی کاوشوں کی پذیرائی جب ایسے موقر جریدوں میں ایسے ایسے جیّد مدیروں نے کی تو میرے اعتماد کو بڑی تقویت ملی۔''(۳)

اس اقتباس سے اقبال متین کی دوسری، تیسری اور چوتھی کہانیوں کی اشاعت کا پتہ چلتا ہے اور اس امر کی بھی وضاحت ہوتی ہے کہ اہم ادبی جرائد ورسائل میں ابتدائی کہانیوں کی اشاعت نے انھیں بڑا

حوصلہ عطا کیا۔ یہ ابتدائی کہانیاں اگرچہ ان کے پہلے افسانوی مجموعہ ''اُجلی پرچھائیاں'' میں شامل نہیں ہیں، لیکن ان ابتدائی کہانیوں کی اشاعت ہی سے اقبال متین کو شہرت و مقبولیت حاصل ہونی شروع ہو گئی تھی، جیسا کہ قمر رئیس کے درج ذیل بیان سے پتہ چلتا ہے۔

''ادبِ لطیف'' میں اقبال متین کی کہانی ''مرگھٹ'' جون ۱۹۴۶ء میں کیا چھپی کہ ان کی شہرت کے پر لگ گئے۔ ''ادبی دنیا''، ''نیا دور'' جیسے رسائل میں بھی ان کی کہانیاں شائع ہونے لگیں اور اقبال متین بہت تیزی سے شہرت کے دریا پار کرنے لگے۔'' (۴)

ان ابتدائی کہانیوں کے لکھنے کے بعد اقبال متین نے تقریباً ۶/۵ سال تک لکھنا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ اس کی متعدد وجوہات تھیں۔ درج ذیل اقتباس میں اقبال متین نے اس طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''کچھ نجی حالات کا سبب تھا، ذہنی الجھنیں تھیں، زندگی اداسیوں میں گھر گئی تھی۔ کچھ منٹو، اور اختر اور ینوی، سے بچ کر اپنا الگ سے راستہ بنانے کی لگن۔ میں نے اپنی ابتدائی کہانیوں میں محسوس کیا تھا کہ میرے افسانے پر کہیں کہیں اُن کی چھاپ ہے۔'' (۵)

مذکورہ بالا بیان سے پتہ چلتا ہے کہ اقبال متین کو اپنی ذاتی و سماجی زندگی میں پے درپے کئی حوادث پیش آئے تھے۔ اپنی مرضی سے اپنی پھوپھی زاد بہن سے شادی کرنے کی وجہ سے ان کی ذاتی زندگی مشکلات میں گھر گئی تھی اور وہ ذہنی الجھنوں میں گرفتار ہو گئے تھے۔ اسی دوران تقسیمِ ہند کا خونیں سانحہ پیش آیا تھا۔ اس واقعہ نے دیگر ادیبوں کی طرح اقبال متین کو بھی بہت مغموم کیا تھا اور ان کی زندگی اُداسیوں و مایوسیوں میں گھر کر رہ گئی تھی۔ کچھ اپنا الگ اسلوب اور اندازِ بیان متعیّن کرنے کی فکر بھی انھیں اندر سے پریشان کیے ہوئے تھی۔ چنانچہ چند سال وہ اپنے من کی دنیا میں ڈوبے رہے۔ کچھ برسوں کی خاموشی کے بعد وہ پھر افسانہ کی دنیا میں جلوہ گر ہوئے اور ''گریویارڈ''، ''اجنبی''، ''جھگن چاچا'' جیسی خوبصورت کہانیاں لکھ کر ایک بار پھر سنجیدہ ادبی حلقے کو متوجہ کیا۔ ''گریویارڈ'' کہانی نے مرزا ادیب کو اس حد تک متاثر کیا تھا کہ 'ادبِ لطیف' کا پورا اداریہ انھوں نے اس کہانی کے لیے صرف کر دیا تھا۔ اپنی کہانیوں کی ایسی مقبولیت و شہرت سے اقبال متین کا اعتماد و حوصلہ بڑھتا گیا اور وہ پیہم تواتر کے ساتھ کہانیاں لکھتے رہے اور ہندو پاک کے بڑے اور معیاری رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے۔ آگے چل کر جب ان کی

خاصی کہانیاں منظرعام پر آ کر اہلِ ذوق وشوق سے داد وتحسین وصول کر چکیں تو انھیں اپنے افسانوں کا مجموعہ لانے کا خیال پیدا ہوا۔ اسی خیال کے تحت انھوں نے اپنا پہلا افسانوی مجموعہ ''اُجلی پرچھائیاں'' کے عنوان سے ۱۹۶۰ء میں شائع کیا۔ اس کے فلیپ پر مخدوم اور مرزا ادیب نے تعریفی وتوصیفی کلمات لکھے۔ سلیمان اریب نے اس میں ''چہرہ نما'' کے عنوان سے چھوٹا سا مقدمہ لکھا جس میں سلیمان اریب نے اقبال متین کے بارے میں لکھا:

> ''اقبال متین فکر کے لحاظ سے رومانی اور عقیدے کے لحاظ سے ترقی پسند ہے لیکن وہ ادب میں کسی ازم کا قائل نہیں۔ اس کا خیال ہے کہ ادب کو پہلے ادب ہونا چاہئے....... یوں اقبال متین کہانی کی کسی بندھی ٹکی تکنیک کا پابند نہیں لیکن وہ کہانی کو ایک مشاق مشاطہ کی طرح بنا سنوار کر اور نوک پلک سے آراستہ کر کے اہلِ نظر کے سامنے لاتا ہے۔ وہ کہانی کے ضروری اجزاء کے ساتھ دوسرے فنی نکات پر بھی پوری توجہ صرف کرتا ہے اور خاص طور پر کردار نگاری اور جزئیات نگاری میں تو اسے یدِ طولیٰ حاصل ہے۔''(۶)

اس مجموعہ میں کل ۱۴ افسانے شامل ہیں۔ ان افسانوں کے عنوانات اس طرح ہیں۔ ''جھگن چاچا''، ''گرتی دیواریں''، ''دامِ ہرموج''، ''بیمار''، ''برہان قاطع''، ''ملبہ''، ''آدمی اور آدمی''، ''اجلی پرچھائیاں''، ''سہارے''، ''سمجھوتہ''، ''اجنبی''، ''روزنِ در''، ''گریویارڈ''، ''ہیں کواکب کچھ''۔

اس پہلے مجموعہ کی اشاعت کے بعد اقبال متین کا شمار بڑے اور اہم افسانہ نگاروں میں ہونے لگا۔ ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''نچا ہوا البم'' کے عنوان سے پہلی بار جون ۱۹۷۲ء میں پھر ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا۔ یہ مجموعہ بالترتیب ۱۵ افسانوں پر مشتمل ہے۔ ''ایک پھول ایک تتلی''، ''پچھلا دروازہ''، ''شعورِ سفر منزل''، ''پانی کے چراغ''، ''ساحی''، ''تین مسافر''، ''کینڈل کالونی''، ''اندھیروں کی لاج''، ''کتاب سے کتبے تک''، ''شکن در شکن''، ''چور''، ''نچا ہوا البم''، ''بہادر''، ''ایک سوال''، ''سنگِ آستاں''۔ اس مجموعہ میں شامل کچھ کہانیاں مثلاً ''تین مسافر''، ''کتاب سے کتبے تک''، ''نچا ہوا البم''، ''سنگِ آستاں'' وغیرہ خاصی مقبول ہوئیں۔ ۱۹۷۶ء میں ان کا منفرد ناولٹ ''چراغ تہہ داماں'' چھپ کر آیا تو ادبی حلقوں میں ایک دھوم مچ گئی۔ نہایت جرأت آزما موضوع پر لکھے گئے اس ناولٹ نے بڑے بڑے نقادوں کو چونکایا۔ اس ناولٹ کی غیر معمولی شہرت سے اقبال متین کے حوصلے بے حد بلند ہوئے اور وہ پورے طور پر

افسانہ نگاری میں مصروف ہو گئے۔ ۱۹۷۷ء میں ان کا تیسرا افسانوی مجموعہ ''خالی پٹاریوں کا مداری'' منظر عام پر آیا۔ اس میں بالترتیب ۱۵ افسانے شامل ہیں۔ ''پو پھٹنے تک''، ''ننگے زخم''، ''شرمیلا''، ''خالی پٹاریوں کا مداری''، ''بہروپ''، ''مورنی''، ''شیبا''، ''رات کے راہی''، ''مسدود راستے''، ''مہمان''، ''ہم سفر''، ''درد کا رشتہ''، ''من مول''، ''رابی اپیا''، کھنڈر''۔ ان کے چوتھے افسانوی مجموعہ ''آ گہی کے ویرانے'' کی اشاعت ۱۹۸۰ء میں عمل میں آئی۔ اس میں ''سانپوں کی پٹاری''، ''آ گہی کے ویرانے''، ''بیر بہوٹی''، ''پانچویں عورت اٹھارواں مرد''، کاٹا ہوا نام''، ''تین پتھر ڈھونے والا مسافر''، ''بچھڑا''، ''سڑک''، ''پنجرے کا آدمی'' افسانے شامل ہیں۔

''مزبلہ'' ان کا پانچواں افسانوی مجموعہ ہے۔ اسے اردو اکیڈمی حیدر آباد نے ۱۹۸۹ء میں شائع کیا۔ یہ درج ذیل افسانوں پر مشتمل ہے۔

''اتھل پانیوں کے سودائی''، ''دریدہ''، ''شعلہ پوش''، ''مزبلہ''، ''بھیگے دن بھیگی راتیں''، ''سناٹے کی آواز''، ''ماں''، ''کانپتی لرزتی لو''، ''بوند بوند لہو''، ''گریزپا''، ''پل صراط''، ''چار درویش نئے نویلے''، ''دستک''، ''واپسی''۔ اس کے بعد ان کا چھٹا افسانوی مجموعہ ''میں بھی فسانہ تم بھی کہانی'' کے عنوان سے ۱۹۹۳ء میں شائع ہوکر سامنے آیا۔ اس میں ۱۴ افسانے شامل ہیں جن کی ترتیب یوں ہے۔ ''یہ کس کی تصویر ہے''، ''کھڑکیاں''، ''کنول اور گندم''، ''گھڑی''، ''جہاں میں ہوں''، ''میں بھی فسانہ تم بھی کہانی''، ''گنجا مسیح''، ''جھوٹی سچائی''، ''زمین کا درد''، ''دھوپ''، ''انکشاف''، ''ایک طوفان دو بوندیں''، ''ادھورا سوئٹر''، ''ایک خط یادوں کے نام''۔

''شہر آشوب'' اقبال متین کا ساتواں اور آخری افسانوی مجموعہ ہے۔ یہ ۲۰۰۳ء میں شائع ہوا۔ یہ درج ذیل افسانوں پر مشتمل ہے۔

''شہر آشوب''، ''تارتار''، ''سلورفش''، ''چھت''، ''بے دلی اپنا پتہ پوچھے ہے''، ''تعویذ''، ''ہمزاد''، ''سنگ پشت''، ''زبوں آثار''، ''اونچ نیچ''، ''آنگن میں سہاگن''، ''ڈورتھی''۔

افسانوں اور ناولٹ کے علاوہ اقبال متین نے خاکے بھی لکھے ہیں۔ ''سوندھی مٹی کے بُت'' ان کے لکھے خاکوں کا مجموعہ ہے۔ یہ ۱۹۹۵ء میں شائع ہوا۔ اس میں چند ایسے خاکے ہیں جو انتہائی اہم

خاکوں کے ذیل میں رکھے جاسکتے ہیں۔ یادنگاری میں بھی اقبال متین نے اپنے کمال کا مظاہرہ کیا ہے۔ ''باتیں ہماریاں'' ان کی یادوں کا مجموعہ ہے۔ یہ ۱۹۹۸ء میں شائع ہوکر منظرعام پر آیا۔اس میں اقبال متین نے ماضی کی دلچسپ یادوں کے سہارے ایسی رنگارنگ دنیا آباد کی ہے جو بڑی خوبصورت ہے۔ یہ یادیں حسین تو ہیں ہی، ساتھ ہی ان یادوں کو جس دلکش پیرائے میں بیان کیا گیا ہے،اس نے اسے دلکشی سے پُر اور اثرانگیز بنادیا ہے۔ ان یادوں میں حظ وانبساط کی کیفیت بھی ہے اور ذوقِ حُسن کی تسکین کا سامان بھی۔ادبی زاویۂ نگاہ سے یہ یادیں خاصی اہمّیت کی حامل ہیں۔

اقبال متین نے مضامین بھی سُپردِقلم کئے ہیں۔''اعتراف وانحراف'' ان کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کی اشاعت ۲۰۰۶ء میں عمل میں آئی۔ اس میں اقبال متین کے وہ مضامین ہیں جو انھوں نے ادبی شخصیات اوران کے فن کو محور بنا کر تخلیقی انداز میں لکھے ہیں۔ ان مضامین میں تنقیدی شعور کی جھلک بھی ہے۔ یہ مضامین ادباء وشعراء کی شخصیت کے دلچسپ پہلوؤں کو بھی اُجاگر کرتے ہیں اوران کے فن پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ تخلیقی حسّیت سے پُر یہ مضامین، دلچسپ اندازِ بیان اور دلکش اسلوب کی وجہ سے وقیع اہمّیت کے حامل ہیں۔ اقبال متین کے بارے میں شروع میں عرض کیا جاچکا ہے کہ انھوں نے اپنی ادبی زندگی کی ابتدا شاعری سے کی۔ پھر جلد ہی وہ شاعری سے افسانہ نگاری کی طرف آ گئے۔ اپنے افسانوی سفر کے دوران انھوں نے شاعری کو یکسر ترک نہیں کردیا بلکہ ان کے اندر کا شاعر زندہ رہا اور وہ وقتاً فوقتاً شاعری بھی کرتے رہے۔ اخیر عمر میں شاعری کی طرف ان کا میلان بڑھ گیا اور انھوں نے بہت سی نظمیں اور غزلیں کہیں۔ ایسی ہی نظموں اور غزلوں پر مشتمل ان کا شعری مجموعہ ''صریرجاں'' ہے جو ۲۰۰۶ء میں شائع ہوکر منظرعام پر آیا۔

اس طرح اقبال متین نے افسانہ نگاری کے ساتھ ساتھ اردو ادب کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی۔ انھوں نے خاکے، یادیں، مضامین لکھے اور شاعری بھی کی لیکن اردو ادب میں ان کی شناخت افسانہ نگاری کے ذریعے قائم ہوئی۔ افسانہ نگاری میں انھوں نے اپنی فکری وفنّی مہارت کا ایسا خوبصورت مظاہرہ کیا کہ وہ اپنے بعض معاصرین سے بھی ممتاز دکھائی دینے لگے اور ایک مایہ ناز افسانہ نگار کی شکل میں سامنے آئے۔

اقبال متین نے اپنی افسانوی تخلیقات، خاکوں، یادوں، مضامین اور شاعری کے ذریعے اردو ادب کی ایسی گراں قدر خدمات انجام دیں کہ انھیں ایک اہم ادیب کی حیثیت حاصل ہوئی۔ ان کی ادبی شخصیت اور ان کے ادبی کارناموں کا اعتراف بھی کیا گیا اور انھیں چھوٹے بڑے مختلف ادبی ایوارڈس اور اسنادِ توصیف سے نوازا گیا۔ سب سے پہلا ایوارڈ آندھرا پردیش ہندی ساہتیہ اکیڈمی نے انھیں ان کی پہلی تصنیف ''اُجلی پرچھائیاں'' پر دیا۔ دوسرا ایوارڈ اتر پردیش اردو اکیڈمی نے انھیں ان کے دوسرے افسانوی مجموعہ ''نچا ہوا البم'' کی اشاعت پر دیا۔ ۱۹۷۶ء میں جب ان کا ناولٹ ''چراغ تہہ داماں'' شائع ہوا تو حیدرآباد کے کچھ نام نہاد اُدباء نے اُسے فحش قرار دیا۔ اسی لیے آندھرا پردیش اردو اکیڈمی نے اسے انعام سے محروم رکھا۔ اکیڈمی کے اس نامناسب اقدام پر بڑا احتجاج ہوا اور ہندوستان کے بیشتر ادبی جرائد میں احتجاجی اداریے اور مضامین لکھے گئے۔ یہ ناولٹ نئے موضوع پر ضرور تھا مگر اسے فحش قرار دینے کی کوئی معقول وجہ نہیں تھی، بلکہ اچھوتے موضوع، دلچسپ اندازِ بیان اور موثر اسلوب کی وجہ سے یہ ناولٹ خصوصی توجہ کا مستحق تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اُدباء نے اسے بے حد پسند کیا اور اس کی فکری وفنّی خوبیوں سے بحث کرتے ہوئے اسے معنویّت واہمیّت کا حامل بتایا۔ آگے چل کر اس ناولٹ پر حلقہ اربابِ ذوق اور سنگیت اکیڈمی شکاگو نے اقبال متین کو ایوارڈ اور کیسۂ زر سے نوازا۔ ۱۹۷۷ء میں ''خالی پٹاریوں کا مداری'' کی اشاعت پر آندھرا پردیش اردو اکیڈمی نے اور ۱۹۸۰ء میں ''آگہی کے ویرانے'' پر اتر پردیش اردو اکیڈمی نے انھیں ایوارڈ دیا۔ ۱۹۸۹ء میں جب آندھرا پردیش اردو اکیڈمی نے ان کی کہانیوں کا مجموعہ ''مزبلہ'' شائع کیا تو اقبال متین کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ایک خیر مقدمی تقریب منعقد کی گئی جس میں ہم عصر ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں نے تقریریں کیں اور انھیں گراں قدر کیسۂ زر پیش کیا گیا۔ ۱۹۸۹ء ہی میں انھیں ادبی ٹرسٹ کے تحفہ اعتراف سے بھی نوازا گیا۔ اس مجموعہ پر ۱۹۹۰ء میں انھیں اتر پردیش اردو اکیڈمی نے بھی ایوارڈ دیا۔ ۱۹۹۳ء میں ''میں بھی فسانہ تم بھی کہانی'' کی اشاعت پر آندھرا پردیش اردو اکیڈمی اور اتر پردیش اردو اکیڈمی دونوں کی جانب سے انھیں ایوارڈ دیا گیا۔ ایوارڈس کے ساتھ ساتھ اقبال متین کو توصیف نامے (اسنادات) سے بھی نوازا گیا جس کی تفصیل یوں ہے۔

اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنو، سند اور رقم (۳۰۰۰) روپئے، مارچ ۱۹۹۰ء

سلطان العلوم ایوارڈ، سند اور مومنٹو برائے سال ۱۹۹۰ء

آندھرا پردیش اردو اکیڈمی، ادبی خدمات توصیف نامہ اور مومنٹو (۵۰۰۰) روپئے ۱۹۹۳ء

اتر پردیش اردو اکیڈمی، توصیف نامہ اور مومنٹو ۱۹۹۴ء (۷)

اقبال متین کی مجموعی ادبی خدمات پر اتر پردیش اردو اکیڈمی نے ۲۰۰۹ء میں انھیں اپنا سب سے گراں قدر اور بڑا ایوارڈ ''مولانا ابوالکلام آزاد ایوارڈ'' سے نوازا۔ یہ ایوارڈ پانچ لاکھ روپے اور سند پر مشتمل ہے۔ ان کی مجموعی ادبی خدمات کے اعتراف میں آندھرا پردیش اردو اکیڈمی نے بھی ان کی خدمت میں 'ایک لاکھ روپے اور سند' پر مشتمل اپنا اہم اور بڑا ایوارڈ ''مخدوم ایوارڈ'' پیش کیا۔

اقبال متین کی ادبی خدمات کے اعتراف میں کچھ رسائل و جرائد کی طرف سے ان کی شخصیت وفن پر خصوصی گوشے اور نمبر شائع کیے گئے۔ ماہنامہ ''صبا'' حیدرآباد نے ۱۹۵۸ء میں ماہنامہ ''سب رس'' حیدرآباد نے ستمبر ۱۹۹۰ء اور جنوری ۱۹۹۵ء میں ماہنامہ ''قومی محاذ'' اورنگ آباد نے اکتوبر ۲۰۰۴ء میں ماہنامہ ''حیات'' دہلی نے ۲۰۰۶ء میں اور ماہنامہ ''تمہید'' نظام آباد نے جولائی ۲۰۱۳ء میں ان کی شخصیت وفن پر خصوصی گوشے شائع کیے۔ ماہنامہ ''قومی زبان'' حیدرآباد نے اکتوبر ۲۰۱۲ء میں اور ماہنامہ ''تمہید'' نظام آباد نے جنوری ۲۰۱۳ء میں 'اقبال متین نمبر' ترتیب دیے۔ اقبال متین پر سب سے ضخیم، معلوماتی اور کارآمد نمبر ''بادبان'' کراچی کا 'اقبال متین نمبر' جولائی تا ستمبر ۲۰۱۰ء ہے جو ناصر بغدادی کی ادارت میں شائع ہوا۔ ان کی شخصیت وفن پر نورالحسنین نے بھی ''اقبال متین سے اُنسیت'' کے عنوان سے ایک جامع کتاب ترتیب دی جو ۲۰۱۲ء میں شائع ہوئی۔ اس طرح اقبال متین کی ادبی خدمات کے اعتراف میں مختلف تحریریں سامنے آئیں جس میں ان کے ادبی کارناموں کا جائزہ لیا گیا اور جس سے ان کی ادبی شخصیت مزید نکھر کر سامنے آئی۔

اقبال متین نے تحریروں کے ساتھ ساتھ اپنی فعالیت سے بھی ادبی خدمت گذاری میں حصّہ لیا۔ وہ کئی ادبی انجمنوں کے نائب صدر اور صدر رہے۔ انھیں انجمن معمار ادب، حیدرآباد کا نائب صدر اور انجمن ترقی پسند مصنفین آندھرا پردیش کا نائب صدر پھر صدر بنایا گیا۔ انھیں ماہنامہ 'گلبانگ ادب'

(بمبئی) کی نگرانی 'جنوبی ہندسہ ماہی تناظر (فکشن انتھالوجی) اور 'افسانوی انتخاب' (دہلی) کی ادارت کی ذمّہ داری سونپی گئی۔ یہاں بھی اقبال متین نے اپنی فکر ونظر اور سوجھ بوجھ سے کام لیا اور بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ انھوں نے صدر اور مدیر کی حیثیت سے بھی ادب کی خدمات انجام دینے میں خاصا سرگرم کردار ادا کیا۔

اقبال متین کی ادبی تخلیقات کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ انھوں نے چھ دہائیوں سے زیادہ اردو ادب کی خدمت کی ہے۔ اردو ادب خصوصاً اردو افسانہ کی تاریخ میں ان کی اہمّیت وعظمت سے انکار ممکن نہیں جس کا اعتراف کیا جانا چاہئے۔

حوالے:

(الف)

(۱) انٹرویو، دانش اقبال، مشمولہ، ماہنامہ 'تمہید' نظام آباد، جلد ۳، شمارہ: ۱، جنوری ۲۰۱۳ء، ص ۵۳۔

(۲) اقبال متین۔ شخصیت اور فن کے چند زاویے، ڈاکٹر محمد علی آثر، مشمولہ، اقبال متین سے اُنسیت، مرتب: نور الحسنین، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۲ء، ص ۲۸۱۔

(۳) سید مسیح الدین خاں سے اقبال متین تک، کہکشاں فرخ، مشمولہ، اقبال متین سے اُنسیت، مرتب: نور الحسنین، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۲ء، ص ۳۲۴۔

(۴) اقبال متین۔ صاحبِ طرز ادیب، یوسف سرمست، مشمولہ، اقبال متین سے اُنسیت، مرتب: نور الحسنین، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۲ء، ص ۵۳۔

(۵) سید مسیح الدین خاں سے اقبال متین تک، کہکشاں فرخ، مشمولہ، اقبال متین سے اُنسیت، مرتب: نور الحسنین، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۲ء، ص ۳۲۳۔

(۶) اقبال متین۔ شخصیت اور فن کے چند زاویے، ڈاکٹر محمد علی آثر، مشمولہ، اقبال متین سے اُنسیت، مرتب: نور الحسنین، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۲ء، ص ۲۸۱۔

(۷) اقلیم نثر جس کی قلمرو میں ہے شامل، ڈاکٹر حسن الدین احمد، مشمولہ، اقبال متین سے اُنسیت، مرتب: نور الحسنین، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۲ء، ص ۱۷۲۔

(۸) سید مسیح الدین خاں سے اقبال متین تک، کہکشاں فرخ، مشمولہ، اقبال متین سے اُنسیت، مرتب: نور الحسنین، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۲ء، ص ۳۲۴۔

(۹) اقبال متین۔شخصیت اور فن کے چند زاویے، ڈاکٹر محمد علی آثر، مشمولہ، اقبال متین سے اُنسیت، مرتب: نورالحسنین، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۲ء، ص، ۲۸۲۔

(۱۰) ایضاً۔

(۱۱) اقلیم نثر جس کی قلمرو میں ہے شامل، ڈاکٹر حسن الدین احمد، مشمولہ، اقبال متین سے اُنسیت، مرتب: نورالحسنین، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۲ء، ص، ۱۷۲۔

(۱۲) سید مسیح الدین خاں سے اقبال متین تک، کہکشاں فرخ، مشمولہ، اقبال متین سے اُنسیت، مرتب: نورالحسنین، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۲ء، ص، ۳۲۴۔

(۱۳) اقبال متین۔شخصیت اور فن کے چند زاویے، ڈاکٹر محمد علی آثر، مشمولہ، اقبال متین سے اُنسیت، مرتب: نورالحسنین، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۲ء، ص، ۲۸۲۔

(۱۴) تعارف نامہ، مشمولہ، سوندھی مٹی کے بت، اقبال متین، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۰ء، ص، ۱۴، ۳۱۳۔

(۱۵) گفتنی اقبال متین حیدرآباد، آندھراپردیش، ہندوستان، سلطانہ مہر، مشمولہ، اقبال متین سے اُنسیت، مرتب: نورالحسنین، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۲ء، ص، ۹، ۴۷۸۔

(ب)

(۱) انٹرویو، دانش اقبال، مشمولہ، اقبال متین سے اُنسیت، مرتب: نورالحسنین، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۲ء، ص، ۳۰۹۔

(۲) اقبال متین کے تین افسانے (ایک غیر رسمی سا تنقیدی مطالعہ)، عابد سہیل، مشمولہ، بادبان، کراچی، اقبال متین نمبر، جولائی تا ستمبر ۲۰۱۰ء، شمارہ نمبر: ۱۳، ص، ۶۶۔

(۳) انٹرویو، دانش اقبال، مشمولہ، اقبال متین سے اُنسیت، مرتب: نورالحسنین، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۲ء، ص، ۱۱، ۳۱۰۔

(۴) ترقی پسند ادب کے معمار، قمر رئیس، مشمولہ، اقبال متین سے اُنسیت، مرتب: نورالحسنین، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۲ء، ص، ۴۷۴۔

(۵) انٹرویو، دانش اقبال، مشمولہ، اقبال متین سے اُنسیت، مرتب: نورالحسنین، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۲ء، ص، ۳۱۱۔

(۶) بحوالہ، اقبال متین سے اُنسیت، مرتب: نورالحسنین، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۲ء، ص، ۴۷۴۔

(۷) تعارف نامہ، مشمولہ، سوندھی مٹی کے بُت، اقبال متین، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۰ء، ص، ۳۱۶۔

باب دوم

اقبال متین کی فکشن نگاری

(الف) اقبال متین کی افسانہ نگاری کا موضوعاتی جائزہ

(ب) اقبال متین کی افسانہ نگاری کا فنی جائزہ، پلاٹ، کردار، زبان و بیان اور اسلوب کے حوالے سے

(ج) اقبال متین کی ناولٹ نگاری کا موضوعاتی جائزہ

(د) اقبال متین کی ناولٹ نگاری کا فنی جائزہ

اقبال متین کی افسانہ نگاری کا موضوعاتی جائزہ

اقبال متین کے بارے میں اس سے پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ وہ اردو ادب میں مختلف حیثیتوں سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ وہ افسانہ نگار، ناولٹ نگار، خاکہ نگار اور مضمون نگار ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر بھی ہیں مگر ادبی دنیا میں ان کو جو شہرت و مقبولیت اور شناخت فکشن نگار کی حیثیت سے ملی وہ کسی اور حیثیت سے حاصل نہیں ہوئی۔ وہ اردو کے ایک منفرد اور نمائندہ افسانہ نگار ہیں۔ ترقی پسند افسانہ نگار کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو اور احمد ندیم قاسمی وغیرہ کے بعد جو اہم اور ممتاز افسانہ نگار سامنے آئے، ان میں وہ نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ان کی پہلی کہانی ''چوڑیاں'' آزادی سے دو سال قبل ۱۹۴۵ء میں احمد ندیم قاسمی کی ادارت میں شائع ہونے والے رسالہ ''ادبِ لطیف'' میں شائع ہوئی لیکن ان کو افسانہ نگار کی حیثیت سے نمایاں شناخت آزادی کے بعد ملی۔ اس لیے ان کا شمار آزادی کے بعد اُبھرنے والے قد آور افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ واضح ہو کہ آزادی کے بعد دو طرح کے افسانہ نگار سامنے آئے۔ ایک وہ جو ترقی پسندی کے کٹّر مخالف اور جدیدیت کے تصوّر سے شدید طور پر وابستہ تھے۔ ایسے افسانہ نگاروں میں بلراج مین را، سریندر پرکاش، بلراج کومل، کلام حیدری، قمر احسن، انور قمر اور کمار پاشی وغیرہ کا نام قابل ذکر ہے۔ دوسرے وہ افسانہ نگار جن کی ذہنی نشو و نما اور ادبی و فکری تربیت ترقی پسندوں کے زیر اثر ہوئی، جو ترقی پسند تحریک اور اس کے افکار و خیالات سے خاصے متاثّر تھے اور بیانیہ انداز کے ساتھ ساتھ علامتی، تمثیلی اور تجریدی انداز میں بھی کہانیاں لکھ رہے تھے۔ ایسے افسانہ نگاروں میں جوگیندر پال، غیاث احمد گدّی، قاضی عبدالستار، اقبال مجید، رتن سنگھ، جیلانی بانو اور واجدہ تبسم وغیرہ آتے ہیں۔ اقبال متین کا شمار اسی قبیل کے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔

اقبال متین کے بارے میں جیسا کہ سوانحی باب میں ذکر کیا گیا کہ ان کو ادبی ماحول ورثے میں ملا تھا۔ وہ سٹی کالج، حیدر آباد میں مشہور ترقی پسند اور انقلابی شاعر مخدومؔ محی الدین کے شاگرد رہ چکے تھے۔ مخدومؔ نے ان کی ہر قدم پر رہنمائی کی تھی۔ ان کے زیر سایہ ان کی ادبی وفکری تربیت ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ ان کے ملنے جلنے والوں میں لطیفؔ ساجد، سلیمان اریبؔ، نظرؔ حیدر آبادی، علی صائبؔ میاں، نذیرؔ دہقانی، صاحبزادہ میکشؔ، صمد رضوی سازؔ اور شعیب حزیںؔ جیسے ترقی پسند شعراء واُدبا کی ایک بڑی تعداد تھی۔ چنانچہ ترقی پسند تحریک سے ذہنی یگانگت اور فکری وابستگی کے سبب وہ اس تحریک سے ایک اٹوٹ رشتہ قائم کر چکے تھے۔ وہ ۱۹۸۹ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین، آندھرا پردیش کے صدر منتخب ہوئے۔

اقبال متین ترقی پسند تحریک کے اہم اور فعّال کارکن ضرور تھے لیکن وہ اس کی ادعائیت اور پروپیگنڈے کے سخت مخالف تھے۔ انھوں نے اپنی کہانیوں کو ترقی پسندی کی اشتہاریت، سطحیت اور نعرہ بازی سے بچائے رکھنے کی حتی الامکان کوشش کی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی بیشتر اہم کہانیاں ان منفی خصوصیات سے بڑی حد تک پاک ہیں۔ ان کے نزدیک ترقی پسندی کا مطلب ادب کے ذریعے ظلم واستحصال، سماجی ناانصافی اور انسانی تفریق وامتیاز کے خلاف آواز اُٹھانا اور انسانی مساوات، اُخوّت وبھائی چارگی پر زور دیتے ہوئے محبّت اور انسان دوستی کے جذبوں کو فروغ دینا ہے مگر ادب وفن کو مجروح کئے بغیر۔ ترقی پسندی کا یہی وہ صحّت مند تصوُّر رہے جس کے تحت ترقی پسند دور میں بہت سے شاہکار افسانے لکھے گئے اور اُردو افسانہ ترقی کی بلندیوں پر پہنچ گیا۔ اسی لیے اقبال متین ترقی پسند دور کو اُردو افسانہ کا سنہرا دَور مانتے ہیں۔ وہ ایک انٹرویو میں کہتے ہیں:

> ''ترقی پسند تحریک نے اردو افسانے کو اس درجہ گراں قدر بنادیا کہ زندگی کے کم وبیش ہر سماجی رشتے کو سمجھنے اور اُس کا تجزیہ کرنے کی خلاّقانہ اہلیت ترقی پسند افسانے کے حصّہ میں آئی اور سماجی شعور ان تخلیقات میں ایک منظّم شکل اختیار کر گیا۔ یہاں وقت نہیں ہے کہ بڑی کہانیوں کا نام لے کر ہم اُن پر بات کر سکیں۔ صرف اتنا کہنے پر اکتفا کروں گا کہ اردو کہانی منٹو، بیدی، کرشن، عصمت، غلام عباس اور اختر اور ینوی سے آگے نہیں گئی ہے اور میں ترقی پسندی کے دور کو اردو افسانے کا سب سے زیادہ زرّیں دور سمجھتا ہوں۔''(۱)

ترقی پسندی کے برعکس جدیدیت کے دور کو اقبال متین اردو افسانہ کے لیے انحطاط کا دور خیال

کرتے ہیں۔ جدیدیت کے زیرِاثر اردو افسانہ میں نت نئے تجربے ضرور کئے گئے اور کچھ اچھے افسانے بھی لکھے گئے لیکن زیادہ تر اس رجحان کے تحت فیشن زدہ علامت نگاری، تجرید نگاری اور بے جا اور مہمل ابہام پرستی نے کہانی سے بیانیہ اور کہانی پن چھین کر اس کا حُلیہ بگاڑ دیا۔ اس سلسلہ میں اقبال متین کا کہنا ہے کہ ''جدیدیوں نے ترقی پسندی کی مخالفت میں ایسے پینترے کاٹے کہ کہانی نے اپنا چہرہ اُن کے ہاتھوں مسخ کر لیا اور اس طرح اپنی ہی شناخت کھو دی۔''

یہ امر واقعہ ہے کہ جدیدیت کے دور میں غیر ضروری تجربوں سے اردو افسانہ کو فائدہ کم اور نقصان زیادہ پہنچا اور اردو کہانی کے لیے آزمائش کا وقت آن پڑا۔ اس آزمائش کے دور میں جن افسانہ نگاروں نے اردو افسانہ کی آبرو بچائے رکھنے کی سعی کی، اعتدال و توازن سے کام لے کر کہانی میں کہانی پن اور بیانیہ پر زور دیا اور اردو افسانہ کو صحیح سمت و رفتار دینے کی کوشش کی، ان میں اقبال متین، جوگیندر پال، غیاث احمد گدّی، قاضی عبدالستار، اقبال مجید، رتن سنگھ، جیلانی بانو اور عابد سہیل وغیرہ کے نام بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس ضمن میں مشہور فکشن ناقد پروفیسر قمر رئیس کا درج ذیل بیان ملاحظہ ہو۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''قرۃ العین حیدر، اقبال متین، جوگیندر پال اور اقبال مجید نے جس جادۂ اعتدال کو اپنایا، موضوع اور ٹکنیک میں جس ہم آہنگی پر زور دیا، علامتی اظہار میں جس چابکدستی کا رویّہ اختیار کیا اور افسانے میں افسانویت کے جوہر کو مختلف وسائل سے جس طرح قائم رکھا، وہی جدید افسانہ کی صحیح سمت تھی اور آخر آخر ان کے اس رویّے نے نوجوان افسانہ نگاروں کو متاثر کیا اور وہ ارادی ابہام کی شب خونی ڈگر سے ہٹ کر صحیح راستہ پر آ گئے۔''(۲)

اقبال متین جدید دور کے افسانہ نگار ضرور ہیں اور ترقی پسند تحریک سے ان کی ذہنی ہم آہنگی بھی ہے لیکن افسانہ نگاری میں کسی تحریک و رجحان کا دباؤ قبول کئے بغیر انھوں نے اپنے انفرادی تخلیقی انداز کو اہمیت دی اور صنف افسانہ میں انھوں نے اپنی راہ خود بنائی۔ یہ ضرور ہے کہ انھوں نے مختلف ادبی تحریکات و رجحانات جیسے رومانیت، حلقہ اربابِ ذوق، ترقی پسندی اور جدیدیت کے عروج و زوال کا دَور دیکھا اور کہیں کہیں وہ اس سے متاثر بھی ہوئے اور ان کے فکر و فن پر اس کی ہلکی سی چھاپ بھی دیکھی جا سکتی ہے لیکن وہ ادب و فن کو کسی ادبی یا سیاسی نظریہ یا کسی مخصوص فکر و فلسفہ کا پابند بنانے کے حق میں کبھی

نہیں رہے۔ دراصل وہ ادب میں کسی ''اِزم'' کے قائل نہیں تھے۔ انھوں نے ہمیشہ ادب میں ادبیّت کو اوّلیت دی اور فن میں اس کے فنّی لوازمات کو ملحوظ رکھنے کی بھرپور کوشش کی۔ حیدرآباد کے منفرد ترقی پسند شاعر سلیمان اریبؔ نے ان کے پہلے افسانوی مجموعہ ''اُجلی پرچھائیاں'' کا مقدمہ ''چہرہ نما'' کے عنوان سے لکھا تھا جس میں انھوں نے ان کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''اقبال متین فکر کے لحاظ سے رومانی اور عقیدے کے لحاظ سے ترقی پسند ہے لیکن وہ ادب میں کسی ازم کا قائل نہیں۔ اس کا خیال ہے کہ ادب کو پہلے ادب ہونا چاہئے پھر سب کچھ اور جو اچھا ادب ہوگا وہ کسی ''رنگ'' کا ہوتے ہوئے بھی سب کے لئے قابل قبول ہوگا۔ اس میں دردمندی بھی ہوگی اور انسان دوستی بھی اور اس میں غم ذات سے لے کر غم کائنات تک ہر غم کے لئے گنجائش ہوگی۔ اگر ادب کی متذکرہ بالا تعریف کی تائید میں اقبال متین کی کوئی کہانی پیش کی جائے تو آپ کو اس میں اچھے ادب کی بہت سی خوبیاں مل جائیں گی۔''(۳)

اردو کی مشہور افسانہ نگار جیلانی بانو اقبال متین کے تعلق سے رقم طراز ہیں:

> ''اقبال متین کے فن کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ کسی ازم کا پرچار کئے بغیر ایک صحت مند نقطہ نظر کے حامی ہیں۔ ان کی کہانیاں پڑھنے کے بعد جہاں انسان کی جدّ وجہد پر یقین ملتا ہے وہاں ان کی فنکارانہ خوبیوں کا بھی معترف ہونا پڑتا ہے۔''(۴)

اقبال متین کی افسانہ نگاری کے سلسلہ میں ایک قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ جب انھوں نے افسانہ لکھنا شروع کیا تو اس وقت تک اردو افسانہ کئی منزلوں سے گذر چکا تھا۔ سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری اور ل۔احمد اکبرآبادی کی رومانیت، سلطان حیدر جوش کی اصلاح پسندی اور پریم چند، سدرشن وغیرہ کی مثالیت وحقیقت پسندی سے نکل کر اردو افسانہ ترقی پسند عہد میں داخل ہوگیا تھا اور ترقی کی بلندیوں پر پہنچ گیا تھا۔ اس میں ہیئت وتکنیک کے نئے نئے تجربے کیے جاچکے تھے۔ کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی اور سعادت حسن منٹو جیسے بلند پایہ افسانہ نگار اپنا لوہا منوا چکے تھے اور قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین جیسے افسانہ نگار اپنے قدم جمانے میں مصروف تھے۔ ایسے دور میں کسی نئے افسانہ نگار کے لیے اپنی ایک الگ پہچان قائم کرنا دشوارترین مرحلہ تھا۔ اقبال متین نے اس مرحلہ کو بھی سر کیا۔ انھوں نے

اپنے افسانوں کے اسلوب کی انفرادیت اور اپنے مخصوص انداز کے ذریعے اپنی الگ پہچان بنائی اور بہت جلد وہ ایک منفرد افسانہ نگار کی حیثیت سے سامنے آئے۔ وہ اپنے معاصر افسانہ نگاروں جوگیندر پال، غیاث احمد گدّی، قاضی عبدالستار، رتن سنگھ، اقبال مجید، جیلانی بانو اور عابد سہیل وغیرہ میں اپنی منفرد شناخت رکھتے ہیں۔ عصر حاضر کے ممتاز فکشن نگار نورالحسنین اپنے مضمون ''میں اقبال متین ہوں'' میں اقبال متین کی انفرادیت پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''اردو افسانہ نگاروں کی وہ نسل جو رام لعل، اقبال متین، غیاث احمد گدی، قاضی عبدالستار، رتن سنگھ، اقبال مجید، جوگیندر پال اور جیلانی بانو وغیرہ پر مشتمل ہے، ان میں اقبال متین کی شناخت قدرے مختلف ہے کیوں کہ ان کے افسانے نہ تو محض داخلیت کی بھول بھلیوں میں گردش کرتے ہیں اور نا ہی تجربات کی بھٹی میں جھلس جھلس کر قاری سے اس کی قابلیت کا امتحان لیتے ہیں۔ البتہ ان کے افسانے نہاں خانۂ دل کے تاروں کو چھیڑتے ہیں، روح کی گہرائیوں میں اتر آتے ہیں۔ عصری آگہی کے ویرانوں میں اس پہاڑ کی مانند جل اُٹھتے ہیں جس کا دھواں تو نظر نہیں آتا لیکن روشنی کی ایک لکیر بن کر احساسات کو خیرہ کر دیتے ہیں۔''(۵)

ڈاکٹر مثنی رضوی کا خیال ہے:

''اقبال متین اردو کے ان افسانہ نگاروں میں سے ہیں جنہوں نے موضوعات کے تنوع اور اسلوب کی تازہ کاری سے اپنی کہانیوں کو ایک منفرد شناخت اور الگ مزاج کا حامل بنا دیا ہے۔''(۶)

اقبال متین اردو کے ایک منفرد اور اہم افسانہ نگار ہیں۔ ان کی ابتدائی کہانیاں اُردو کے مستند اور معروف ترین ادبی رسالوں کی زینت بنیں۔ ان کی پہلی کہانی ''چوڑیاں'' جون، ۱۹۴۵ء، میں مشہور افسانہ نگار احمد ندیم قاسمی کی ادارت میں نکلنے والے ادبی رسالہ 'ادبِ لطیف' میں شائع ہوئی۔ دوسری کہانی ''سنہری لکیریں'' فروری، ۱۹۴۶ء میں صلاح الدین احمد کی ادارت میں شائع ہونے والے ادبی مجلّہ 'ادبی دُنیا' میں چھپی۔ تیسری کہانی ''مرگھٹ'' کی اشاعت جون، ۱۹۴۶ء میں 'ادب لطیف' میں عمل میں آئی۔ اس وقت اس رسالہ کے مدیر فکر تونسوی تھے۔ ان کی چوتھی کہانی ''تانبہ اور پانی'' ممتاز شیریں کے نیا دور میں شائع ہو کر منظر عام پر آئی۔ ان کی پہلی کہانی ''چوڑیاں'' دوبارہ نیاز فتح پوری کے 'نگار' میں شائع

ہوئی۔اس طرح اردو ادب کے مستند اور معروف ترین رسالوں میں ابتدائی کہانیوں کی اشاعت سے اقبال متین کے اعتماد کو بڑا حوصلہ ملا۔ان کہانیوں کے علاوہ اس دور میں ان کی دو تین اور کہانیاں بھی شائع ہوئیں۔ ویسے ان کہانیوں سے پہلے بھی اقبال متین کی کچھ کہانیاں بچوں کے رسالوں ''پھول''، ''پیام تعلیم'' اور ''غنچہ'' وغیرہ میں شائع ہوئی تھیں لیکن چوں کہ وہ کہانیاں دستیاب نہیں ہیں، اس لیے ''چوڑیاں'' باقاعدہ ان کی پہلی کہانی اور مذکورہ کہانیاں ان کی ابتدائی کہانیاں تسلیم کی جاتی ہیں۔خود افسانہ نگار کا بھی یہی خیال ہے۔ان ابتدائی کہانیوں کی اشاعت کے بعد اقبال متین نے افسانہ لکھنا ترک کر دیا اور تقریباً پانچ سال تک خاموش رہے۔اس کی وجوہات مصنف کی ذاتی الجھنیں اور کچھ دوسرے حالات تھے۔اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ اقبال متین نے اپنے افسانوں پر اپنے بزرگ افسانہ نگاروں اختر اورینوی، اور منٹو وغیرہ کی چھاپ محسوس کی تھی جب کہ انھیں اپنے منفرد اسلوب کی تلاش تھی۔اس ضمن میں وہ دانش اقبال کو انٹرویو دیتے ہوئے بتاتے ہیں:

> ''کچھ نجی حالات کا سبب تھا، ذہنی الجھنیں تھیں، زندگی اداسیوں میں گھر گئی تھی۔ کچھ 'منٹو' اور 'اختر اورینوی' سے بچ کر اپنا الگ سے راستہ بنانے کی لگن۔ میں نے اپنی ابتدائی کہانیوں میں محسوس کیا تھا کہ میرے افسانے پر کہیں کہیں اُن کی چھاپ ہے۔''(۷)

اقبال متین کے افسانوں پر اختر اورینوی، منٹو، بیدی اور کرشن چندر وغیرہ کی چھاپ پڑنے کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے بچپن ہی میں ان افسانہ نگاروں کا بہت گہرائی و گیرائی سے مطالعہ کیا تھا۔چنانچہ مذکورہ افسانہ نگاروں کے اثر سے نکلنے اور اپنے اسلوب کو منفرد بنانے کے لیے انھوں نے بڑی خاموشی سے جدّ وجہد کی اور جب انھیں اپنے اسلوب اور انداز بیان پر پختہ ایقان واعتماد ہو گیا تو ایک مختصر سے وقفہ کے بعد وہ پھر افسانہ نگاری کی طرف مائل ہوئے اور پورے طور سے افسانے لکھنے میں منہمک ہو گئے۔ان کا افسانوی سفر چھ دہائیوں سے زیادہ عرصہ پر محیط ہے۔اس طویل عرصہ میں ان کے افسانوں کے سات مجموعے منظر عام پر آئے۔ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''اُجلی پرچھائیاں'' کے عنوان سے ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا۔ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''نچا ہوا البم'' ہے۔تیسرا ''خالی پٹاریوں کا مداری''، چوتھا ''آگہی کے ویرانے''، پانچواں ''مزبلہ''، چھٹا ''میں بھی فسانہ تم بھی کہانی'' اور ساتواں ''شہرِ آشوب''

ہے۔ یہ افسانوی مجموعے بالترتیب ۱۹۷۲ء، ۱۹۷۷ء، ۱۹۸۰ء، ۱۹۸۹ء، ۱۹۹۳ء اور ۲۰۰۳ء میں شائع ہوئے جو اردو کے افسانوی سفر میں سنگِ میل ثابت ہوئے۔ ان کے افسانوں کا کلیات بعنوان ''اقبال متین کے افسانے'' (جلد اول) (جلد دوم) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی سے ۲۰۰۹ء اور ۲۰۱۰ء میں شائع ہوا ہے۔

اقبال متین نے اپنے طویل افسانوی سفر میں سو سے زائد افسانے لکھے۔ ان میں ان کے نمائندہ افسانوں کی تعداد بھی خاصی ہے۔ ان کے نمائندہ افسانے ''اجنبی''، ''گریو یارڈ''، ''اجلی پرچھائیاں''، ''بیمار''، ''ملبا''، ''گرتی دیواریں''، ''برہان قاطع''، ''چھگن چاچا''، ''کینڈل کالونی''، ''نچا ہوا البم''، ''کتاب سے کتبے تک''، ''مسدود راستے''، ''پانی کے چراغ''، ''اندھیروں کی لاج''، ''درد کا رشتہ''، ''شیبا''، ''خالی پٹاریوں کا مداری''، ''یہ کس کی تصویر ہے؟''، ''میں بھی فسانہ تم بھی کہانی''، ''زمین کا درد''، ''ادھورا سوئٹر''، ''ایک خط یادوں کے نام''، ''آگہی کے ویرانے''، ''کاٹا ہوا نام''، ''دریدہ''، ''مزبلہ''، ''شعلہ پوش''، ''اتھل پانیوں کے سودائی''، ''بھیگے دن بھیگی راتیں''، ''ماں''، ''شہر آشوب''، ''اونچ نیچ''، ''ڈورتھی'' اور ''آنگن میں سہاگن'' وغیرہ ہیں۔

اقبال متین حقیقت پسند افسانہ نگار ہیں۔ ان کا تصورِ حقیقت زندگی کی طرح سرگرم و متحرک ہے۔ مشہور ترقی پسند ادیب ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اقبال متین کے تصورِ حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''اقبال متین کا تصورِ حقیقت کوئی ساکن و جامد تصور نہیں۔ اس کی حقیقت زندگی کے ساتھ متحرک ہے۔ اس نے اطراف و اکناف کی زندگی کی چہل پہل سے چلتی پھرتی حقیقتوں کو چنا ہے پھر اپنی تخلیقی صلاحیتوں اور تخیل کے نقش و نگار سے انہیں سجا کر، بنا سنوار کر کہانی کے قالب میں ڈھالا ہے۔''(۸)

اقبال متین اپنے افسانوں میں لفظی صنّاعی اور عبارت آرائی پر پوری توجّہ دینے اور تخیّلی دنیا کی مصوّری کے بجائے حقائق زندگی سے سروکار رکھتے ہیں۔ حقائق چاہے کتنے ہی تلخ ہوں، وہ انہیں خوبصورت پیرایے میں بیان کر دیتے ہیں۔ وہ رومانی افسانہ نگاروں کی طرح خواب و خیال کی دنیا میں رہ کر قلم اُٹھانا پسند نہیں کرتے۔ پروفیسر سلیمان اطہر جاوید ان کی افسانہ نگاری پر اظہار خیال کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''اقبال متین ہمارے ان قلم کاروں میں شامل ہیں جو خواب وخیال کی دنیا میں رہ کر قلم نہیں اٹھاتے بلکہ آس پاس جو ہوتا ہے اس کو محسوس کر کے دیکھتے ہیں، جن حقائق سے دوچار ہوتے ہیں، معاشرہ میں جو عمل اور ردعمل ہوتا ہے، جن نشیب وفراز اور خوب وخراب سے آپ ہم گزرتے ہیں، ان کو افسانوں کا پیرہن دے دیتے ہیں۔ اچھا افسانہ نگار حقیقتیں تلخ بھی ہوں تو انہیں خوشگوار پیرایہ میں پیش کر دیتا ہے۔ اقبال متین کے افسانوں میں یہی رویہ ملتا ہے۔''(۹)

اقبال متین کی افسانہ نگاری کے تعلق سے وحید اختر کا خیال ہے:

''اقبال متین کے افسانوں کی بنیاد حقیقت پر ہے۔ اور وہ اپنے ماحول، اپنے دفتر، اپنے خاندان، اپنے دوست احباب، مخالفوں اور دشمنوں ہی کی زندگی سے اپنے افسانوں کے پلاٹ چنتا ہے۔ اسے اپنے خاندان والوں اور اپنے دوستوں اور ان کے بزرگوں کے چہرے سے نقاب الٹتے ہوئے ذرا بھی جھجک نہیں ہوتی۔''(۱۰)

پروفیسر محمد علی اثر اقبال متین کی افسانہ نگاری پر اپنے تاثرات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

''اقبال متین کے افسانے انسان دوستی اور حقیقت نگاری کی عمدہ مثال ہیں۔ ان کی دروں بینی سماجی زندگی کے تلخ حقائق اور نفسیاتی کشمکش کے ادراک کا گہرا شعور رکھتی ہے۔''(۱۱)

اقبال متین نے اپنے گرد وپیش کی زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ ان کا مشاہدہ وتجربہ بہت گہرا ہے۔ وہ اپنے گرد وپیش کی زندگی سے اپنے افسانوں کے موضوعات چنتے ہیں اور اپنے عمیق مشاہدات وتجربات پر اس کی بنیاد رکھتے ہیں۔ وہ فرد اور سماج اور اس کے بنتے بگڑتے رشتوں سے اپنے افسانوں کا تانا بانا بُنتے ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں گونا گوں سماجی مسائل اور عصری حقائق کو پیش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں بڑی رنگارنگی اور موضوعات میں تنوع پایا جاتا ہے۔ مشہور افسانہ نگار عابد سہیل اقبال متین کی افسانہ نگاری کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''اقبال متین اپنی کہانی کا مواد براہِ راست زندگی سے حاصل کرتے ہیں۔ اسی سبب ان کے یہاں موضوع اور کرداروں میں بلا کا تنوع ملتا ہے۔ اور ان کے کسی افسانے پر اپنے کسی دوسرے افسانے کی پرچھائیں نظر نہیں

آتی۔''(۱۲)

پروفیسر محمد علی اثر لکھتے ہیں:

''اقبال متین کی کہانیوں میں بڑی رنگارنگی اور بوقلمونی نظر آتی ہے۔ وہ اپنے افسانوں کا مواد براہ راست زندگی کے روشن اور تاریک پہلوؤں سے حاصل کرتے ہیں۔ ان کی کہانیوں میں فرد کی بے بسی، محرومی، مایوسی اور لایعنیت کے علاوہ روح کے کرب واضطراب اور کائنات کے اضمحلال کا برملا اور موثر اظہار ملتا ہے۔''(۱۳)

اقبال متین کے افسانوں کے موضوعات حقیقی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے موضوعات عموماً سماجی اور نفسیاتی نوعیت کے ہوتے ہیں جو ہمارے سماجی دکھ درد اور عام زندگی کی شکست وریخت سے ماخوذ ہیں۔ وہ بڑے موضوعات کے پیچھے نہیں بھاگتے بلکہ وہ زندگی کی چھوٹی چھوٹی حقیقتوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بناتے ہیں اور اپنے حُسنِ بیان سے اسے دلکش بنا دیتے ہیں۔ اس تعلق سے نورالحسنین رقم طراز ہیں:

''اقبال متین کو افسانہ لکھنے کے لیے کبھی بہت بڑے موضوع کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ زندگی کے پیچ سے یا کرداروں کی داخلیت سے وہ ایک ایسا موضوع تراشنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں جو ان کے ہاتھ لگ کر کندن بن جاتا ہے۔''(۱۴)

اقبال متین کے افسانوں کے موضوعات حقیقی اور فطری ہیں۔ وہ زیادہ عجیب وغریب یا چونکا دینے والے موضوعات نہیں اپناتے۔ وہ ایسے موضوعات کو بھی ہاتھ نہیں لگاتے جن سے ان کی شناسائی نہیں ہوتی۔ وہ انہیں موضوعات کو اختیار کرتے ہیں جن پر ان کی گرفت مضبوط ہوتی ہے اور جن سے انھیں دلچسپی بھی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جس موضوع پر افسانہ لکھتے ہیں، اس کے اہم گوشوں کو سمونے اور اس کی ضروری تفصیلات وجزئیات کو پیش کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ یہ ان کی ایسی انفرادیت ہے جو انھیں اپنے ہم عصروں میں ممتاز کرتی ہے۔ سلیمان اریبؔ ان کے اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس کے ہاں موضوع کی یکسانیت بھی نہیں ملتی اور ہر طرح کے موضوعات پر خامہ فرسائی کرنے کا شوقِ فضول بھی نہیں پایا جاتا۔ وہ ایسے ہی موضوعات کا انتخاب کرتا ہے جن سے وہ بوجوہ احسن عہدہ برآ ہوسکتا ہے۔ یہ احتیاط یہ

سنبھلا سنبھلا ہوا انداز دراصل اقبال متین کا مزاج ہے جو زندگی کے ہر شعبے میں اس کی آبرو بچائے ہوئے ہے۔''(۱۵)

اقبال متین اپنے افسانوں میں ایسے موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں جو روزمرّہ کی زندگی اور عام انسانوں سے متعلق ہیں۔ وہ اپنی کہانیوں کے ذریعے سماج کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھتے ہیں۔ وہ سماجی برائیوں کو کچھ اس انداز میں بے پردہ کرتے ہیں کہ ہم چاہ کر بھی اس سے منہ نہیں پھیر سکتے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں حیدرآباد کے متوسط طبقہ کے مسلمان گھرانوں کے بنتے بگڑتے حالات، نچلے طبقات کے مسائل، اپنے عہد کے سماجی، سیاسی، معاشی اور تہذیبی پس منظر کی عکاسی کرنے کے ساتھ، اپنے عہد کے تلخ اور پے چیدہ مسائل پر قلم اُٹھایا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے عام انسانوں کی بے بسی و مجبوری، ان کی محرومیوں و ماسیوں اور سماجی رشتوں کا بغور مطالعہ کیا ہے اور ان کی سچی تصویریں اپنے افسانوں میں پیش کی ہیں۔ ان کے افسانوں میں معمولی واقعات کو بھی اس خوبی سے بیان کیا گیا ہے کہ وہ غیر معمولی اور دل کش معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی افسانہ نگاری کی خصوصیت بیان کرتے ہوئے مشہور ترقی پسند شاعر مخدوم محی الدین نے لکھا ہے:

''اقبال متین اپنے گردوپیش کی زندگی سے واقعات اور کردار چنتا ہے۔ قدرتِ بیان اور تیز قوتِ مشاہدہ کی مدد سے ان میں ایسا رنگ بھرتا ہے کہ معمولی واقعات اور کردار، غیر معمولی اور دل کش بن جاتے ہیں۔ ''اجنبی''، ''ملبا''، ''گریویارڈ''، گرتی دیواریں''، ''بیمار'' اور ''برہان قاطع'' اس کی بے شمار کامیاب اور مشہور کہانیوں میں سے چند ایسی کہانیاں ہیں جن میں زندگی کے حسن اور اس کی ڈھکی چھپی قباحتوں اور فرد اور سماج کی کشمکش کی نقاشی اور پردہ کشائی بڑی چابک دستی سے کی گئی ہے۔ اس کی کہانیاں سماجی ناانصافیوں سے نفرت، انسان سے ہمدردی اور زندگی سے پیار کرنا سکھاتی ہیں۔''(۱۶)

اقبال متین کے افسانوں میں مختلف طرح کے موضوعات ملتے ہیں۔ ان کے افسانوں کا ایک اہم موضوع قدروں کی شکست و ریخت اور رشتوں کی بدلتی نوعیت ہے۔ پروفیسر محمد حسن لکھتے ہیں:

''اقبال متین نے اپنی کہانی میں دائرہ آتشیں پر کرتب دکھانے والے ایک کھلاڑی کی زبان میں شکست ہونے والی اقدار کی اس صورت حال میں دیانت دارانہ وجود کو بیان کیا ہے اور بدلتے ہوئے انسانی رشتوں کی نوعیت کو افسانے کا موضوع بنایا ہے۔''(۱۷)

اقبال متین کے افسانوں کے موضوعات فرد سے بھی متعلق ہیں اور سماج سے بھی۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں فرد کی انفرادیت اور سماج کے اجتماعی شعور دونوں کا خیال رکھا ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں سماج کے دردناک مسائل کی عکّاسی اور اس کی غلاظتوں اور گندگیوں کا بیان انسانی محبت وہمدردی کے پیشِ نظر کیا ہے۔ اس لیے ان کے افسانے سماج کے بُرے پہلوؤں اور گندگیوں سے نفرت کا احساس دلانے کے باوجود، انسانی محبت وہمدردی کے جذبہ کو تقویت دیتے ہیں۔ دراصل اقبال متین نے فرد اور سماج دونوں کو محبّت کی نگاہ سے دیکھا ہے کیوں کہ ان کا فلسفۂ حیات محبت پر مبنی ہے۔ محبت ہی ان کے افسانوں کا محور ہے۔ اس سلسلہ میں نورالحسنین لکھتے ہیں:

> ''موضوعاتی سطح پر اگر ان کے افسانوں کا تجزیہ کیا جائے تو ان کے افسانوں کا محور بلکہ بنیادی محور 'محبت' ٹھہرتا ہے۔ محبت کے اس سفر میں ان کے ساتھ ایک کارواں ہے جس میں رشتے اپنے تقدس کے ساتھ، مسائل تمام تر حشر سامانیوں سے لدے اور حالات اپنی پیچیدگیوں کے ساتھ موجود ہیں۔'' (۱۸)

اقبال متین نے اپنے افسانوں میں فرد اور سماج کے ظاہری و باطنی دونوں پہلوؤں پر نگاہ ڈالی ہے۔ انھوں نے فرد کی داخلی کشمکش اور سماج کی ان حقیقتوں کی طرف بھی ہماری توجّہ مبذول کی ہے جن سے ہم سرسری گزر جاتے ہیں لیکن جو در حقیقت پیچیدہ اور سنگین نوعیت کی ہوتی ہیں۔ اس طرح انھوں نے اپنے افسانوں میں زندگی کے مختلف مسائل اور نت نئے تجربوں کو پیش کیا ہے۔ اس لیے ان کے افسانوں میں موضوعات کا خاصا تنوّع نظر آتا ہے۔ ان کے افسانوں کے موضوعات حیدرآباد کا زوال پذیر جاگیردار معاشرہ، اس کا ظالمانہ، جارحانہ اور استحصالی رویّہ اور اس کی ٹوٹتی بکھرتی قدریں، متوسط اور نچلے طبقات کے مسائل، کسی عزیز کے بچھڑنے کا دُکھ درد اور غم والم، انسانی نفسیات، جنسی پیچیدگیاں، مامتا کا جذبہ، عشق کی ناکامی کا المیہ، معاشی محرومی، عصرِ حاضر کا جبر، پیچیدہ اور سنگین حالات کے شکار عام انسانوں کی بے بسی، مجبوری ومحرومی، جدید شہروں کو تباہ و برباد کرنے والی مادّی تہذیب اور اس کے مختلف مظاہر، شریف آدمیوں کا دوسروں اور خود اپنے قریب ترین رشتہ داروں کے ہاتھوں استحصال، خودغرضی، مفاد پرستی، تملق وچاپلوسی، سماجی ابتری، معاشرتی، تہذیبی واخلاقی زوال، قدروں کی شکست وریخت، انسانی بے حسی، سنگدلی، بے ضمیری، بے رحمی، فساد اور اس کے نتیجہ میں ہونے والی قتل وغارت گری،

حیوانیت و درندگی اور بدلتے سماج کے مختلف مسائل وغیرہ ہیں۔

جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ اقبال متین حیدر آباد کے رہنے والے تھے۔ ایک زمانہ میں یہ شہر نوابوں اور جاگیرداروں کا مسکن تھا۔ اقبال متین نے جب آنکھ کھولی تو یہ طبقہ زوال کی طرف گامزن تھا۔ اس طبقہ کو انھوں نے بہت قریب سے دیکھا تھا۔ بقول پروفیسر یوسف سرمست:

> ''ان کے دادا نواب مسیح الدین خاں بڑے معین الدولہ والی پائیگاہ آسمان جاہی کے سگے ماموں اور سرپرست تھے۔ نواب معین الدولہ کے والد نواب آسمان جاہ بشیر الدولہ کا انتقال اس وقت ہوا جب معین الدولہ بہت کم عمر تھے اس لیے نواب مسیح الدین خاں کو ان کا سرپرست اور نگراں مقرر کیا گیا تھا۔ اس سے اقبال متین کو جاگیرداروں کو بھی بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا''۔(۱۹)

اقبال متین نے حیدر آباد کے زوال پذیر جاگیردار معاشرہ کی زندگی، شب و روز، عادات واطوار، رہن سہن، دلچسپیوں اور اس کے اخلاق و کردار کا بہت گہرا مشاہدہ کیا تھا۔ اپنے مشاہدات کی روشنی میں انھوں نے اس طبقہ کی زندگی اور اس ماحول کو اپنے افسانوں میں بھی سمویا۔ مشہور فکشن نگار نور الحسنین رقم طراز ہیں:

> ''اقبال متین نے آصف جاہی سلطنت کے کروفر کو بھی دیکھا، جاگیردارانہ ٹھاٹھ باٹ کو بھی جیا، اور پھر جب وقت بدلا تو انھوں نے شاہی کو عوامی اقتدار میں منتقل ہوتے ہوئے بھی دیکھا۔ جاگیرداروں کو لٹتے ہوئے بھی دیکھا۔ امارات کے سرنگوں ہونے کے گواہ بھی بنے۔ قدیم اور جدید تہذیبوں کے تصادم کو بھی بھوگا، قدروں کو پائمال ہوتے ہوئے بھی دیکھا، اور قدروں کے پاسبانوں کو اپنی آبرو کی مٹتی سسکتی آن بان کی پرورش کرتے ہوئے بھی دیکھا۔ اس لیے ان کا قلم ایک مخصوص روایت کا امین بھی ہے، جدید سفر کا آشنا بھی۔ ان کے کردار اعلیٰ اقدار کے پروردہ بھی ہیں اور بدلتے زمانے سے اس طرح آنکھیں بھی چار کرتے ہیں کہ عزت سادات کو بہر حال کسی صورت محفوظ بھی رکھنا ہے۔ جن ادیبوں نے محض سنی سنائی کہانیوں پر خیالی گھوڑے دوڑاتے ہوئے جاگیرداروں کے ظلم، ان کی بے راہ روی اور ان کی عیاشیوں کو گرفت کیا ہے، انھیں اقبال متین کے ان افسانوں کو بھی ایک بار ضرور پڑھ لینا چاہئے جو حقیقت کا آئینہ بھی ہیں اور ماضی کی معاشرتی تاریخ بھی۔ ان افسانوں میں 'ملبا'، 'گرتی دیواریں'، 'پانی کے چراغ'، 'آدمی اور آدمی'، 'کتاب

سے کتبے تک'، اور'اندھیروں کی لاج' وغیرہ شامل ہیں جن کے کردار مٹی تہذیب وتمدن کے نمائندے بھی ہیں جن میں انسانیت کی شمع بھی روشن ہے اور آن بان کی چمک بھی اور اپنی گرتی بگڑتی تباہ ہوتی ہوئی ساکھ کی آبروؤں کا احساس بھی ہے، ان کی مسکراہٹوں میں ان کے چھپے ہوئے غم بھی ہیں اور ان کے غم میں ماضی کی شاندار روایتیں بھی ہیں، ان کی آنکھوں میں جلال و جمال بھی ہے اور حال کی بے بسی بھی۔''(۲۰)

اقبال متین کی حیدرآباد کے زوال پذیر جاگیردار معاشرہ کی مثبت ومنفی قدروں پر بڑی گہری نظر تھی۔ وہ اس طبقہ کی مٹتی ہوئی تہذیب، اس کی خامیوں اور اس کی ایک ایک چیز سے بڑی گیرائی سے واقف تھے۔ اس کا اندازہ اس موضوع پر لکھے گئے ان کے افسانوں سے لگایا جاسکتا ہے۔ اس موضوع پر انھوں نے کئی افسانے لکھے ہیں۔''ملبا'' ان کا ایسا ہی ایک افسانہ ہے۔

اس افسانے میں اقبال متین نے جاگیردارانہ ماحول میں غریب و بے بس خواتین کے جنسی استحصال کو دکھایا ہے۔ افسانہ کے مرکزی کردار نواب صاحب کی نگاہ آئے دن کسی نہ کسی غریب حسین وجمیل لڑکی پر پڑتی اور ٹھہر جاتی ہے جسے ان کے چہیتے اور وفادار ملازم سرفراز علی خاں ان کی خواب گاہ میں پہنچانے کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ نواب صاحب اتنے بوالہوس ہوتے ہیں کہ ایک دن ان کی نگاہ اپنے ہی وفادار ملازم سرفراز علی کی چہیتی بیوی گلبدن بوا پر ٹک جاتی ہے اور وہ گلبدن بیگم بن جاتی ہیں۔ اپنی پیاری بیوی کے چھن جانے کے غم میں سرفراز علی دم توڑ دیتے ہیں۔ اس کی بیوی جب نواب صاحب کے عقد میں آکر دس مہینے بعد بالکل ہو بہو نواب صاحب کی ہی طرح نواب قلندر حسین خان کو جنم دیتی ہیں تو وہ نواب صاحب کی سب سے چہیتی بیگم بن جاتی ہیں۔ لیکن کچھ ہی دنوں بعد اپنی عادت کے مطابق نواب صاحب بمبئی کی فلمی دنیا سے لائی گئی ایک نوخیز لڑکی کو اپنا لیتے ہیں اور گلبدن بیگم سے نظریں پھیر لیتے ہیں۔ اب گلبدن بیگم کا حشر دوسری بُواؤں سے کچھ زیادہ ہی بُرا ہوتا ہے۔ وہ نواب صاحب کی توجہ سے محروم تو ہوتی ہی ہیں، ان کے بیٹے نواب قلندر حسین خان بھی ان کا خیال نہیں رکھتے۔ نواب قلندر حسین خان رات دن اپنے والد نواب صاحب کی خدمت میں لگے رہتے ہیں۔ اس کی وجہ سے وہ اپنی دلہن کو بھی وقت نہیں دے پاتے اور ان کے ارمانوں کا گلا گھوٹتے ہیں۔ ان کی دلہن تنہائی ومحرومی کے مارے یوں سوچتی ہیں:

''تم ڈیوڑھی کے طول طویل احاطے میں بھٹکتی ہوئی زخمی روحوں سے واقف

> ہوگئی ہو۔ایسی روحوں سے جن کے ماضی کو۔۔۔ بڑے نواب صاحب نے حرفِ غلط کی طرح محو کروا دیا ہے۔ان روحوں کا نہ کوئی ماضی ہے اور نہ کوئی مستقبل۔لوح پاک میں ان کے ناموں کے متوازی ان کی تقدیر صرف تین لفظوں میں لکھی گئی ہے۔ پیدائش، عقد، موت۔ پیدائش سے لے کر موت اتنی لمبی پوری مدت میں ان کو نہ کوئی نیکی کرنی ہے اور نہ کسی بدی سے ان کا واسطہ ہے۔اللہ نے اشرف المخلوقات کو پیدا کیا اور بہت سے کام اس کے تفویض کیے لیکن اللہ نے انھیں صرف ایک ہی کام دیا اور وہ تھا نواب سے عقد کر لینا۔ اس کے بعد اللہ نے اور کوئی کام سونپنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ درودیوار چیخ رہے تھے۔تم نے بھی نواب ابن نواب سے عقد کر لیا ہے دلہن! تمہاری زندگی کا مقصد بھی پورا ہو گیا۔تم جس لیے پیدا ہوئی تھیں وہ تم کر چکیں۔اب اپنے مستقبل کو نواب صاحب کے قدموں میں رکھ کر بالکل بھول جاؤ۔اب تمہیں مستقبل کے گھٹاٹوپ اندھیروں میں کچھ نہیں ملے گا۔ اس لیے کہ ماضی کی یادوں کے سہارے زندہ رہنا چاہو گی تو یہ بھی ممکن نہ ہوگا۔اس لیے ماضی کی دل خوش کن یادیں بھی حویلی کی اونچی اونچی دیواریں پھلانگ کر تم تک نہیں آسکیں۔‘‘(۲۱)

دلہن کی اس سوچ کے ذریعے دلہن اور جاگیردارانہ سماج میں اس جیسی مظلوم و مجبور عورتوں کی روح کا کرب اور ان کی حالت زار کی پوری تصویر سامنے آ جاتی ہے۔دلہن اور نواب قلندر حسین کی ماں گلبدن بیگم دونوں اس حویلی کے بے رحم ماحول میں اپنی محرومیوں کا ماتم کرتے ہوئے گھٹ گھٹ کر اور سسک سسک کر جینے پر مجبور ہوتی ہیں۔نواب قلندر حسین خان اپنے والد کی خدمت تو کرتے ہیں لیکن اس کا انھیں یہ صلہ ملتا ہے کہ ایک دن حویلی میں یہ خبر گشت کرنے لگتی ہے کہ نواب قلندر حسین خان چھوٹی بیگم کے ساتھ پکڑے گئے اور نواب صاحب نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔نواب قلندر حسین خان پر یہ الزام لگا کر انھیں راستے سے ہٹا دیا جاتا ہے تاکہ نواب صاحب کی عیاشی کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔یہ ہے جاگیردارانہ سماج کا وہ ماحول جہاں جنسی خواہشات کی خاطر انسانیت اور اس کے جذبوں کی کوئی قدر نہیں ہوتی۔افسانہ میں ایک جگہ اس بات کا بھی اشارہ ملتا ہے کہ جاگیردارانہ معاشرہ میں بواؤں کے بیگم بننے کے بعد ان کے بطن سے پیدا ہونے والے بچوں کے متعلق اگر نواب صاحب کو کسی طرح کا شبہ ہوتا تو

وہ ان بچوں کی ذمہ داری بھی اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہوتے اور انھیں ویران حویلی کے کونوں میں پڑے مرنے کے لیے چھوڑ دیتے۔ یہ پوری کہانی جاگیردارانہ سماج میں غریب و بے بس خواتین پر ہونے والے مظالم، ان کے جنسی استحصال، ان کی مظلومی و محرومی اور انسانیت کی تذلیل و تحقیر ان تمام پہلوؤں کو بڑی خوبصورتی سے اُجاگر کرتی ہے۔ ڈاکٹر مثنیٰ رضوی لکھتے ہیں:

> ''' ملبا' اقبال متین کی جاں گسل کہانی ہے جس میں جاگیردارانہ ماحول کے جبر و استبداد کے ایک مخصوص پہلو کو بڑی نزاکت اور چابکدستی سے ابھارا گیا ہے۔ اقبال متین کا تعلق ہندوستان کے اس علاقہ سے ہے جس نے جاگیردارانہ سماج کا درخشاں عروج اور تاریک زوال دونوں دیکھا ہے۔ انھوں نے اس ماحول کو اتنے قریب سے دیکھا ہے اور اتنی گہری نگاہ سے اس کے پیچ و خم کا مطالعہ کیا ہے کہ اس کا باریک سے باریک گوشہ بھی ان کی نظروں سے مخفی نہیں رہ سکا۔ اس ماحول کی چیرہ دستیوں نے ان کے دل میں درد کا جو طوفان اٹھایا اسے نہایت صبر و ضبط کے ساتھ انھوں نے اس خوبصورت اور درد انگیز کہانی میں منتقل کر دیا۔ ان کی داد دینی پڑتی ہے کہ ظلم و استحصال کے اس ماحول کی عکاسی اور پیشکش میں بھی انھوں نے اپنے جذبات اور احساسات پر قابو رکھا اور رقیق جذباتیت (Sentimentality) کے شکار نہیں ہوئے''۔ (۲۲)

وحید اختر رقم طراز ہیں:

> ''متین کا تازہ ترین افسانہ 'ملبا' بھی حیدرآباد کے جاگیردارانہ ماحول کی مٹتی ہوئی قدروں پر اچھا طنز اور موجودہ مسائل کے شعور کا عمدہ نمونہ ہے''۔ (۲۳)

اس افسانے میں اقبال متین نے جاگیردارانہ سماج کے زوال کی اس قدر متحرّک اور جاندار تصویر پیش کی ہے کہ اس سماج کا پورا نقشہ نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ یہ ان کے سماجی اور تہذیبی شعور اور فن کارانہ بصیرت کی دلیل ہے۔

حیدرآباد کے زوال پذیر جاگیردارانہ معاشرہ کے ضمن میں ''گرتی دیواریں'' بھی اقبال متین کا نمائندہ افسانہ ہے۔ اس میں انھوں نے جاگیردار طبقہ کی جھوٹی شان و شوکت اور مٹتی ہوئی عزت و آبرو کو

دکھایا ہے۔ افسانہ کے مرکزی کردار 'نادومیاں' کی دلہن ذراسی بات پر غصہ ہوکر میکے چلی جاتی ہیں۔ پھر دونوں خاندان کی انانیت اور ضد کی آگ میں 'نادومیاں' کی زندگی اجیرن بن جاتی ہے۔ وہ دلہن کی جدائی میں رات دن تڑپتے رہتے ہیں۔ جب انھیں راستہ ہموار ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تو وہ اپنے چھوٹے بھائی نواب رمضان علی خان کو سسرال بھیجتے ہیں جو پہلی ہی نظر میں دلہن پر فریفتہ ہو بیٹھتے ہیں۔ اس کے بعد وہ مسلسل دلہن کے پاس جاتے اور ملتے رہتے ہیں۔ اسی درمیان 'نادومیاں' کو دلہن کا محبت آمیز خط موصول ہوتا ہے جس میں دلہن اپنی پشیمانی کا اظہار کرتے ہوئے ان سے چھپ کر ملنے کی خواہش کا اظہار کرتی ہے۔ نادومیاں پہلے سے بے قرار رہتے ہیں۔ رات میں چھپ کر جب وہ دلہن سے ملتے ہیں تو وہ دلہن کی حالت بدلی ہوئی پاتے ہیں۔ وہ مشکل سے دو چار بار ہی چوری چھپے دلہن سے ملتے ہیں کہ یہ خبر مشہور ہوجاتی ہے کہ دلہن حاملہ ہیں کیوں کہ چوری چھپے نادومیاں دلہن سے ملتے رہے ہیں۔ یہ خبر سن کر نادومیاں کو بڑا غم ہوتا ہے لیکن حقیقت سے بے خبر ان کی ماں 'بی اماں' خوشی کے مارے پھولے نہیں سماتیں۔ وہ بڑے اہتمام سے دلہن کو اپنے یہاں لاتی ہیں اور اب ان کے سارے ناز ونخرے اٹھاتی ہیں۔ جب ننھے کی پیدائش ہوتی ہے تو اس موقع پر شاندار تقریب منعقد کی جاتی ہے۔ اس تقریب میں بے چارے نادومیاں کی حالت ملاحظہ ہو:

> ''ننھا پیدا ہوا تو شادیانے بجائے گئے، کپڑے تقسیم کیے گئے۔ مبارک بادیوں کے جواب میں شکریہ ادا کرتے کرتے نادومیاں کی زبان سوکھ گئی۔ وہ باوجود یہ سوچتے رہنے کے کہ بچّہ ابھی تین ماہ بعد تولد ہونا چاہیے تھا، مبارک باد پر اس طرح شکریہ ادا کرتے جیسے رٹا ہوا طوطا ہر منٹ دو منٹ بعد شکریے کی رٹ لگائے۔ نادومیاں ننھا مبارک ہو، شکریہ۔ نادومیاں ننھے کا کیا نام سوچا ہے؟ شکریہ۔ نادومیاں آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ شکریہ۔ نادومیاں آپ پاگل تو نہیں ہوگئے؟ شکریہ۔ غرض کہ نادومیاں کچھ اسی طرح شکریہ شکریہ کہتے رہے۔ اگر انھیں مبارک باد کی بجائے گالی دی جاتی تو بھی وہ نہایت اطمینان سے مری ہوئی آواز میں شکریہ ادا کرتے۔'' (۲۴)

اس اقتباس سے نادومیاں کی دردناک حالت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ نادومیاں عزت وآبرو کے مٹ جانے کے خوف سے حقیقت کو زبان پر نہیں لاتے ہیں اور اندر ہی اندر غم میں گھلتے رہتے ہیں۔ لیکن

حقیقت حال سے بے خبران کی ماں 'بی اماں' تقریبات منعقد کرتی اور خوشیاں مناتی رہتی ہیں۔ ننھے کی پیدائش کے بعد جب دلہن کا چلہ ہوتا ہے تو اس موقع پر بھی تقریب منعقد کی جاتی ہے۔ اسی تقریب کی رات کو جب نادو میاں اپنی دلہن کے ساتھ شب گزار رہے ہوتے ہیں تو انھیں دلہن کے پاس کوئی چوری چھپے آتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ وہ کچی نیند سے چیختے ہوئے اُٹھتے اور پیچھا کرنے لگتے ہیں۔ اندھیرے میں وہ دیکھ نہیں پاتے ہیں اور تخت سے ٹکرا جاتے ہیں۔ تخت کا کونہ ان کے پیٹ میں دھنس جاتا ہے اور وہ اپنی عزت و آبرو لیے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ یہ ہے جاگیردارانہ معاشرہ کا وہ ماحول جہاں نادو میاں جیسے شریف آدمی کی زندگی جھوٹی شان و شوکت کی نذر ہو جاتی ہے۔ اس افسانہ میں اقبال متین نے بگڑی نواب زادیوں کی جھلک دکھانے کے ساتھ اس طبقہ کی جھوٹی انانیت، ضد، کھوکھلی شان و شوکت اور مٹتی ہوئی عزت و آبرو کی پرزور عکاسی کی ہے۔

اس طبقہ سے متعلق ''کتاب سے کتبے تک'' بھی اقبال متین کا نمائندہ افسانہ ہے۔ اس میں انھوں نے جاگیردار طبقہ کی بے عملی اور رعونت پسندی کو دکھایا ہے۔ افسانہ کے مرکزی کردار منور میاں خاندان بھر میں لائق و فائق عالم و فاضل کی حیثیت سے مشہور ہیں لیکن ان کی شخصیت بے عملی کی شکار ہے۔ ان کی متضاد شخصیت کا تعارف افسانہ نگار نے اپنے مخصوص طنزیہ انداز میں اس طرح کرایا ہے:

> ''منوّر میاں خاندان بھر میں لائق فائق مشہور تھے۔ عربی، فارسی، انگریزی تینوں زبانیں جانتے تھے اور جاننا بھی کیسا، عالموں فاضلوں کے کان کاٹتے تھے۔ بحث و تمحیص ہوتی، مکالمے و مجادلے ہوتے تو منور میاں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔ بس مجبوری تھی سو اتنی ہی کہ خیالات کی وسعتوں کا زبان ساتھ نہ دے پاتی۔ رک رک کر، تھم تھم کر، چبا چبا کر کچھ اس طرح بحث کرتے کہ موضوع کتنا ہی جان دار ہو منور میاں کی زبان پر آ کے دم توڑتا ہوا سا محسوس ہوتا''۔ (۲۵)

منور میاں کوئی کام نہیں کرتے ہیں۔ وہ اپنی کمزوریوں کو چھپانے کے لیے رات دن اپنے آپ کو کتابوں کے مطالعہ میں غرق رکھتے ہیں۔ وہ بڑی چالاکی سے شادی کے بعد سسرال کو اپنا مسکن بناتے ہیں اور اپنی اور اپنی بیوی بچوں کی ذمہ داری ساس سسر پر ڈال دیتے ہیں۔ وہ اچھا کھانے، پہننے اور بیوی سے جنسی خواہشات پوری کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں برتتے ہیں۔ وہ حصول علم کے لیے لندن بھی جاتے ہیں مگر ان پر فالج کا حملہ

ہوتا ہے اور وہ ناکام لوٹتے ہیں۔ لندن سے واپسی کے بعد بھی ان میں کوئی تبدیلی نہیں آتی ہے۔ وہ اب بھی بے عملی کے شکار، گھمنڈ میں چور رہتے ہیں اور حالات سے بالکل سمجھوتہ نہیں کرتے ہیں۔ وہ آئی ہوئی چھوٹی موٹی نوکریوں کو بھی ٹھکرا دیتے ہیں اور ایک وقت ایسا آتا ہے کہ وہ کسی لائق، یہاں تک کہ وہ اپنی بیوی بچوں سے بھی آنکھ ملانے کے قابل نہیں رہتے ہیں اور دردناک حالت میں ان کی موت ہوتی ہے۔ ان کی بے عملی کو مشہور فکشن ناقد مہدی جعفر نے بے زمینی سے تعبیر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''جاگیردارانہ ماحول کی پیدا کردہ بے زمینی 'کتاب سے کتبے تک' میں بھی نظر آتی ہے۔ یہ بے زمینی 'منور میاں' کی غیر عملی زندگی کی صورت میں نمایاں ہوئی ہے۔ اپنی بڑھتی پھیلتی عمر کے سائے میں منوّر میاں ذہنی طور پر عالم و فاضل تو بن گئے اور پڑھتے رہنا ان کا مشغلہ تو ہو گیا لیکن ان کی بے عمل زندگی جو جاگیردارانہ نظام کی پروردہ تھی گزرے ہوئے وقت کی صورت میں بے زمینی کا احساس بن کر کاٹنے لگی''۔(۲۶)

اقبال متین کی یہ پوری کہانی طنز میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اس میں افسانہ نگار نے جاگیردارانہ نظام کے پروردہ کردار منوّر میاں کے عادات و اطوار اور اس کی اصول پسندی پر گہرا طنز کیا ہے اور ان کی بے عمل اور مضرّت رساں شخصیت کا طنزیہ خاکہ کھینچتے ہوئے اسے اس خوبی سے پیش کیا ہے کہ یہ کردار ایک پورے طبقہ کی نمائندگی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ فنی و تکنیکی اعتبار سے یہ جاندار افسانہ ہے جو قاری کو مکمل طور سے اپنی گرفت میں رکھتا ہے۔

''آدمی اور آدمی'' بھی جاگیردارانہ سماج کی خامیوں کو اُجاگر کرنے والا افسانہ ہے۔ اس میں اقبال متین نے جاگیردارانہ سماج کے ریاکارانہ اور منافقانہ چہرے کی قلعی کھولی ہے۔ اسلم خان کے والد بہت ہی لالچی، خودغرض، تنگدل اور ریاکار قسم کے آدمی ہیں۔ ان کے نزدیک صرف اور صرف دولت کی اہمیت ہے۔ انھوں نے چالاکی سے امیر گھرانے میں شادی کی اور خسر کی بدولت محکمہ پولیس میں نوکری حاصل کر کے خوب دولت بٹوری اور شہر کے متمول آدمی میں ان کا شمار ہونے لگا۔ انھوں نے چاہا کہ ان کا بیٹا بھی ان ہی کے راستے پر چلے۔ اس لیے انھوں نے رشوت دے کر اسے محکمہ پولیس میں نوکری دلوا دی لیکن قسمت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ ان کا بیٹا اسلم خاں اپنے والد کے برعکس انسانیت و محبت پر یقین کرنے والا اور انقلابی خیالات رکھنے والا نوجوان تھا۔ چنانچہ اس نے پولیس کی نوکری سے استعفی دے دیا۔ اس

کے علاوہ اس نے اپنے والد کی مرضی کے خلاف ایک غریب گھرانے کی لڑکی سے شادی کی۔ جب اسلم خان اپنے والد کے اصولوں پر نہیں چل سکا تو والد نے اسے اپنی جائداد سے بے دخل کر دیا۔ اسلم خان کے یہ جملے ملاحظہ ہوں:

> ''میرا دوش صرف اس قدر ہے کہ میں نے اپنے اصولوں کو اپنے نظریات کو اپنے باپ سے شکست کھا کر اس کے آگے سپر ڈال دینے سے بچا رکھا ہے۔ میرا قصور یہی ہے کہ میں نے اپنے ضمیر کو زندہ رکھنے کے لیے اپنے باپ سے بغاوت کی ہے''۔(۲۷)

اسلم خان اپنے والد سے بغاوت کر کے زندگی کے محاذ پر بری طرح ناکام رہتا ہے۔ وہ اس قدر مفلس ہو جاتا ہے کہ اپنی بچی جسے شدید عارضہ لاحق ہو جاتا ہے، کا علاج تک نہیں کرا پاتا ہے۔ مجبور ہو کر وہ اپنی بچی کے لیے اپنے والد سے رحم کی بھیک مانگتا ہے لیکن ایسے عالم میں بھی اس کے والد کا دل نہیں پسیجتا۔ وہ علاج و معالجہ میں ہاتھ بٹانے اور مدد کرنے کے بجائے اسے دین کی تلقین کرنے لگتے اور خدا پر بھروسہ رکھنے کے لیے کہنے لگتے ہیں۔ بالآخر بچی مر جاتی ہے۔ مارے غم کے اسلم خان کو ہوش نہیں رہتا اور وہ اتفاق سے چیختا ہوا والد کے وظیفہ کے کمرے کی طرف بھاگنے لگتا ہے جہاں وہ الماری سے ٹکرا جاتا ہے۔ الماری سے ٹکراتے ہی اس سے مہنگی مہنگی شراب کی بوتلیں نیچے گرنے لگتی ہیں اور اس کے والد کی دینداری کا سارا ڈھونگ سامنے آ جاتا ہے کہ وہ کس طرح ریٹائرمنٹ کے بعد شرعی لباس پہن کر اور ڈاڑھی رکھ کر دوسروں کو توکل، قناعت اور دین و ایمان کی تلقین کرتے رہتے ہیں اور خود سر سے پیر تک گناہوں اور جرائم میں ملوث رہتے ہیں۔ کہانی میں خاں صاحب کی جوانی کی زندگی کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ گوری فرنگن کے ساتھ ان کی جوانی بڑی رنگین گزرتی ہے۔ اس کردار کے ذریعے افسانہ نگار نے جاگیردارانہ معاشرہ کے ریاکار، منافقانہ اور بے رحم ماحول کو بڑی خوبصورتی سے اُجاگر کیا ہے۔ فنی اعتبار سے یہ بھی جاندار افسانہ ہے۔

''اندھیروں کی لاج'' اور ''پانی کے چراغ'' بھی جاگیردار معاشرہ سے متعلق افسانے ہیں۔ 'اندھیروں کی لاج' میں نوابوں کی کھوکھلی شان اور دم توڑتی ہوئی تہذیب کو دکھایا ہے۔ نواب صاحب طوائفوں کے پیچھے دولت لٹاتے لٹاتے اتنے مقروض اور کنگال ہو جاتے ہیں کہ حویلی کے فانوس تک کے

بکنے کی نوبت آجاتی ہے۔نواب صاحب جب مختلف قرض خواہوں کا قرض ادانہیں کر پاتے ہیں تو حکومت ان کی زمینیں اپنی تحویل میں لے کر قرض خواہوں کا قرض چکاتی ہے۔نواب صاحب کی سماجی حیثیت بھی اتنی کمزور پڑنے لگتی ہے کہ جان کلفٹن جیسا معمولی آدمی انھیں عدالت آنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ نواب صاحب کے پاس اپنی گاڑی نہیں ہوتی ہے۔اس لیے وہ اپنی جھوٹی شان بچانے کی خاطر ٹیکسی میں پرائیویٹ نمبر ڈال کر چلتے ہیں تاکہ کسی کو یہ نہ پتہ چلے کہ یہ کرائے کی ٹیکسی ہے یا عام لوگوں کی سواری کی گاڑی ہے۔

''پانی کے چراغ'' میں طوائفوں کے لیے نوابوں کو آپس میں لڑتے ہوئے اوران پر فریفتہ ہوتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔نواب لوگ طوائفوں کے عشق کا دم بھرتے اور انھیں رجھاتے ہیں۔ وہ انھیں باعزت زندگی کا خواب دکھا کر اپناتے ہیں اور بھر پور جنسی تلذذ کے حصول کے بعد انھیں بے سہارا چھوڑ دیتے ہیں۔اسی پہلو کو اس افسانہ میں اجاگر کیا گیا ہے۔ان تمام افسانوں میں افسانہ نگار اقبال متین نے حیدرآباد کے زوال پذیر جاگیردارانہ معاشرہ کی مٹتی ہوئی قدروں اوراس کے مختلف گوشوں کی بڑی اچھی تصویر کشی کی ہے۔حفظ الکبیر قریشی لکھتے ہیں:

> ''اقبال متین نے حیدرآباد کی جاگیردارانہ زندگی کے تضاد اوراس کی جدلیاتی قدروں کی بہت اچھی تصویر کشی کی ہے۔''اندھیروں کی لاج'' اور'' پانی کے چراغ'' اس کے ایسے افسانے ہیں جن میں مرحوم حیدرآباد کی کھوکھلی اور زوال پذیر جاگیرداری کا وہ طنطنہ نظر آتا ہے جو رسی جل جانے کے بعد بھی بل کی صورت میں دکھائی دیتا ہے۔لیکن ظاہر ہے کہ راکھ بنی ہوئی رسی کا کس بل تو فریب نظر بھی نہیں ہوسکتا۔متین کے یہ افسانے اس طبقہ کی جھوٹی شان اور خالی خولی رعونت کے اظہار کی نفسیات کا بڑا ہی خوبصورت تجزیہ ہیں''۔(۴۸)

اقبال متین نے ان افسانوں میں بڑی خوبی سے دیانت دارانہ انداز میں جاگیردارانہ نظام کا جائزہ لیا ہے اوران کا انداز بھی متوازن رہا ہے۔قیصر سرمست اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''ملبا''، ''گرتی دیواریں'' اور''اندھیروں کی لاج'' میں اقبال متین نے بڑی عمدگی اور دیانت دارانہ انداز میں جاگیردارانہ نظام کا جائزہ لیا ہے۔ان کا انداز ان افسانوں میں بڑا ہی متوازن رہا ہے۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے

> نہ تو انتقاماً نواب صاحب کو ''اُترن'' پہنانے کی کوشش کی اور نہ ہی عامیانہ زبان میں اور دکنی بول چال جو عموماً حیدرآباد کے نچلے طبقات میں مروج ہے، نواب صاحب یا شہزادی بیگم کی زبان سے ادا کروائی ہے اور نہ معاندانہ اسلوب ان افسانوں سے مترشح ہے۔ انھوں نے ان افسانوں میں ایک نباض کا رول ادا کیا ہے''۔(۲۹)

اقبال متین نے ان افسانوں میں حقائق کو رومانوی انداز میں پیش کرنے کے بجائے حقیقت پسندانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ پروفیسر عالم خوندمیری اس پہلو پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> '' اقبال متین کے فن میں جو حقیقت کی ترجمانی ہے یا بھرپور رئیل ازم REALISM ہے وہ واقعہ یہ ہے کہ اردو ادب میں ایک بہت بڑا اضافہ ہے۔ ایک بات میں بطورِ خاص کہوں کہ اقبال متین نے حقیقت کو کبھی ROMANTICISE کرنے کی کوشش نہیں کی۔ سب سے زیادہ ان کی جو کامیابی ہے کہ وہ بڑی بے رحمی سے سماجی حقیقت کا اور Human Condition کا مطالعہ کرتے ہیں۔ جن لوگوں نے ان کی کہانیاں خاص طور پر 'ملبا' 'گرتی دیواریں' 'مہمان' گریویارڈ' وغیرہ پڑھی ہیں' وہ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ حقیقت کو ROMANTICISE کئے بغیر انھوں نے حقیقت کو دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ جب انھوں نے FEUDALISM جاگیریت یا حیدرآباد کے جاگیردارانہ نظام کو اپنے افسانوں کے ذریعہ پیش کیا تو اس میں غصہ، حقارت، نفرت موجود نہیں تھی اور نہ FEUDALISM کے گرنے سے یا مرجانے سے انہیں کسی قسم کا صدمہ تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ شخص ایک DETACHED OBSERVER ہے جو اپنے PERSON یا اپنی شخصیت کو الگ کر کے حقیقت کا مشاہدہ کر رہا ہے۔ اور یہ ان کی خصوصیت ہے کہ وہ اپنے شخصی میلانات یا رجحان کو الگ کر دیتے ہیں جب وہ حقیقت کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اسی لئے ان کی حقیقت کی عکاسی میں ہمیں ایک گہرا عنصر ملتا ہے اور یہی انسانی ہمدردی ان کے فن کی ایک امتیازی خصوصیت ہے۔''(۳۰)

اقبال متین نے زوال پذیر جاگیردارانہ معاشرہ کے علاوہ متوسط اور نچلے طبقہ کو بھی اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا ہے بلکہ ان کی بیشتر کہانیاں متوسط اور نچلے طبقہ کے حالات و مسائل، معاشی زبوں حالی،

مجبوریوں، محرومیوں اوران کے دکھ درد کو بنیاد بنا کر لکھی گئی ہیں۔ان طبقوں کے بیشتر لوگ اپنی معاشی تنگدستی کے سبب گھٹ گھٹ کر زندگی جینے اوراپنے ارمانوں اور آرزوؤں کا گلا گھوٹنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ معاشی زبوں حالی ان کے جذبات واحساسات کو کچل کر رکھ دیتی ہے اوران کے وجود تک کو گھائل کر دیتی ہے۔اقبال متین کی کہانی ''مسدود راستے'' اسی تلخ حقیقت کو اُجاگر کرتی ہے۔کہانی کا مرکزی کردار متوسط طبقہ کا ایک فرد ہے۔اس کے بارہ سالہ لڑکے کا انتقال ہوگیا ہے جس کی بہت سی فرمائشیں وہ اپنی معاشی تنگدستی کے سبب پوری نہیں کر سکا۔ یہ لڑکا اس کا چہیتا لڑکا تھا۔ یہ لڑکا عالیہ اسکول کے سامنے سے اسے گزرتے ہوئے دیکھتا تھا تو اس کا راستہ روک لیتا تھا اوراسے اس کی فرمائشیں پوری کرنے میں دلی سکون ملتا تھا۔اس چہیتے لڑکے کے انتقال کے بعد وہ گھر سے آفس جاتے ہوئے اس راستہ سے گزرنا اپنے بس میں نہیں پاتا۔اس لیے وہ اپنے اوپر اس راستہ کو بند کر لیتا ہے۔وہ شخص مختلف لوگوں کا مقروض ہے۔وہ اپنی زبوں حالی کے سبب جب جلد قرض ادا نہیں کر پاتا ہے تو اپنے اوپر تین راستوں کو اور بند کر لیتا ہے کیوں کہ اسے اپنی عزت وآبرو کے لٹ جانے کا ڈر ہے۔اب اسے گھر سے دفتر جانے کے لیے بڑے لمبے لمبے فاصلے طے کرنے پڑتے ہیں۔ان طویل فاصلوں کو طے کرتے ہوئے اس کے احساسات مجروح تو ہوتے ہیں مگر وہ ایسا کرنے پر مجبور ہے۔ وہ چوری چھپے مذکورہ تینوں مسدود راستوں سے بھی گزرتا ہے۔اس طرح وہ تلخ حالات سے سمجھوتہ کرتے ہوئے اپنے شب وروز گذار رہا ہوتا ہے کہ ایک دن اس کی زندگی میں اس وقت المناک لمحہ آتا ہے، جب اس کا قرض خواہ حسین سیٹھ اسے دفتر سے نکلتے ہوئے دیکھ کر اس کا پیچھا کرتا ہے اور وہ اس سے بچنے کے لیے اپنے آپ کو چھپاتے ہوئے اسی راستہ پر آجاتا ہے جس راستہ کو اس نے اپنے اوپر ہمیشہ کے لیے بند کر لیا تھا۔اس راستہ پر اسے اپنا بارہ سالہ مرحوم لڑکا نظر آتا ہے جس کا ہاتھ جھٹک کر وہ آگے بڑھ جاتا ہے۔

> ''شاید یہ وہی سڑک ہے جو عالیہ اسکول کے سامنے سے گزرتی ہے۔شاید یہ وہی لڑکا ہے جو میری تنہائیوں کا ساتھی ہے اور جس کا قرض میرے وجود پر ہے۔شاید آج بھی اس نے میرا راستہ روکنا چاہا تھا لیکن میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور آگے بڑھ گیا۔ میں نے پلکیں جھپکائیں۔ حسین سیٹھ مجھے نظر نہ آیا، لیکن یہ لڑکا برابر مجھے دیکھے جا رہا تھا۔ وہ بڑا دلگیر تھا۔ میں نے اسے پہچان

لیا۔ وہ مجھے اس طرح حیران کھڑا ہوا دیکھ کر آہستہ آہستہ میری طرف بڑھا، جب پاس آ گیا تو میں نے دیکھا اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں، ہم ایک دوسرے کو بس دیکھتے رہے، جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں لیکن جانے کیوں میری پلکیں بھی نم ہو گئیں اور اس کا چہرہ اور بھی دھندلا گیا۔ پھر میں نے ندامت سے گردن جھکا لی۔ اُف! میں کس رہ گزر کو پیچھے چھوڑ چکا تھا''۔(۳۱)

یہ اس کا وہی چہیتا لڑکا ہے جو زندگی میں اس کا راستہ روک لیتا تھا تو اس کی فرمائشیں پوری کرنے میں اسے دلی راحت کا احساس ہوتا تھا مگر آج اپنی معاشی زبوں حالی کے سبب اور اپنی عزت لٹ جانے کے خوف سے وہ اس کا ہاتھ جھٹکنے پر مجبور ہوتا ہے جس میں اس کے جذبات ہی نہیں بلکہ اس کا وجود تک زخمی ہو جاتا ہے۔ یہ ہے متوسط طبقہ کے لوگوں کی زندگی کا المیہ کہ معاشی بدحالی کے سبب ان کی زندگی درد و کرب میں گزرتی ہے۔ ڈاکٹر مثنیٰ رضوی اس افسانے کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اقبال متین کی کہانی مسدود راستے ایک ایسی کہانی ہے جس کے متعلق اگر میں یہ کہوں کہ یہ کہانی انھوں نے اپنے خونِ دل سے لکھی ہے تو مبالغہ نہیں ہوگا۔ میں نے یہ کہانی کئی بار پڑھی ہے اور سانس روک کے پڑھی ہے۔ اب آپ خود سوچئے کہ جب قاری کا یہ حال ہے تو تخلیق کار کا کیا حال رہا ہوگا۔ کیا اس کی روح قلم کی نوک میں نہیں آ گئی ہوگی؟ اس کہانی میں ان کے فن کا ایک مخصوص وصف یہ ہے کہ خارجی حقائق اور اشیاء کے ساتھ داخلی کوائف کا رشتہ احساس کی شدت اور گہرائی کو غیر معمولی قوت اظہار بخش دیتا ہے۔ قاری کو اپنے دل کی دھڑکنوں میں کبھی کہانی کہنے والے کے دل کی دھڑکنیں سنائی دینے لگتی ہیں اور کبھی کرداروں کے دل کی دھڑکنیں۔''(۳۲)

ڈاکٹر شارق ادیب اس افسانے پر اظہار خیال کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''یہ کہانی نہیں اس درد و کرب، سماجی بلکہ عصری جبر کی جیتی جاگتی، بولتی تصویر ہے جس کے بوجھ تلے نچلے متوسط طبقے کا ہر خاندان، ہر فرد دبا ہوا ہے اور کچلا جا رہا ہے۔ معاشی مجبوریاں کس طرح نہ صرف فرد کے چہرے اور اس کی شخصیت کو مسخ کر دیتی ہیں بلکہ خون کے رشتوں کی حدت کو بھی سرد اور منجمد کر کے رکھ دیتی ہیں۔ اس کامیاب ترین عکاسی میں اقبال متین کا قلم اپنے عروج پر ہے''۔(۳۳)

افسانہ ''درد کا رشتہ'' میں بھی آج کے سماج کی افلاس زدہ زندگی کو دکھایا گیا ہے۔ افسانہ کا مرکزی کردار 'راوی' اپنی غربت و افلاس سے تنگ آ کر ریس کورس کے میدان میں کود پڑتا ہے کہ شاید قسمت یاوری کرے، اسے جیت حاصل ہو اور زبوں حالی سے کچھ نجات ملے لیکن یہاں بھی اس کی قسمت اس کا ساتھ نہیں دیتی ہے اور اس کی بچی کھچی رقم بھی لٹ جاتی ہے۔ ایسے میں ایک پیشہ ور عورت تاجی اسے سہارا دیتی ہے۔ پہلی نظر میں تاجی کو دیکھ کر راوی اس کا دیوانہ ہو جاتا ہے۔ راوی کو تاجی کی حالت دیکھ کر دکھ بھی ہوتا ہے کہ تاجی جیسی حسین و جمیل عورت کو کسی کی زندگی ہونا چاہئے مگر غربت و افلاس کی وجہ سے وہ اپنے جسم کو بیچنے پر مجبور ہے۔ تاجی راوی سے جذباتی طور پر جُڑ جاتی ہے۔ راوی کو بھی تاجی سے ایسا لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے کہ جب تاجی اسے اسّی روپئے دے کر ماؤنٹ پہ منتظر یونیورسٹی میں پڑھنے والے اپنے بھائی کو پہنچانے کے لیے کہتی ہے تو وہ بڑی خوشی سے اس کام کو انجام دیتا ہے۔

افسانہ میں ڈرامائی موڑ اس وقت آتا ہے جب تاجی راوی کے جیب میں دس روپئے کا نوٹ ڈال دیتی ہے تاکہ وہ ''نان کن'' میں بیٹھ کر شراب سے دل بہلائے اور اس کا انتظار کرے۔ تاجی کی اس حرکت پر راوی کو تعجب ہوتا ہے کہ آخر اس کے حوصلے اس قدر کیسے بڑھ گئے اور اس بے تکلفی کا کیا جواز ہے لیکن وہ اپنی زبان سے کچھ نہیں کہہ پاتا ہے اور تاجی کسی کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ کر چلی جاتی ہے۔ تاجی کے جانے کے بعد راوی 'نان کن' میں بیٹھ کر شراب پینے لگتا ہے۔ اس دوران تاجی اس کے ذہن سے محو ہو جاتی ہے اور اسے گھر، بیوی بچے یاد آنے لگتے ہیں۔ وہ 'نان کن' سے نکل کر بس اسٹینڈ کی راہ لے ہی رہا ہوتا ہے کہ پیچھے سے ٹیکسی میں سوار تاجی نمودار ہوتی ہے اور اس کے ہاتھوں میں کاغذ کا ایک ٹکڑا تھما کر اس کے مکان مالک کے ساتھ واپس لوٹنے لگتی ہے۔ یہ کاغذ کا ٹکڑا سو روپئے کا نوٹ ہوتا ہے۔ راوی جب اس نوٹ کو لوٹانے کی کوشش کرتا ہے تو تاجی بھرّائی ہوئی آواز میں کہتی ہے۔ ''تمہارا مجھ سے رشتہ ہی کیا ہے''۔ راوی جب تک نوٹ کار کے اندر پھینکتا کہ تاجی بند دروازے کا شیشہ چڑھا چکی ہوتی ہے اور کار آگے بڑھ جاتی ہے۔ راوی سوچنے لگتا ہے۔ ''واقعی تاجی کا میرا رشتہ ہی کیا ہے۔ بس اسی قدر نا کہ میں ہمیشہ اس سے مل کر اداس ہو جاتا ہوں۔''

افسانہ کے اس آخری جملہ میں افسانہ کی روح سمٹ آئی ہے۔ راوی اور تاجی کی باتوں سے بظاہر ایسا لگتا ہے کہ رشتہ کا انکار ہو رہا ہے لیکن اس انکار میں اقرار کی وہ شدّت ہے جو شاید اقرار میں پیدا نہیں ہو پاتی۔

راوی اور تاجی کے درمیان یقیناً کوئی رشتہ نہیں ہے لیکن ان دونوں کے درمیان کوئی رشتہ نہ ہوتے ہوئے بھی ایسا رشتہ ہے جو تمام رشتوں سے عظیم تر ہے اور وہ ہے درد کا رشتہ جو ان دونوں کو ایک دوسرے کے قریب کرتا ہے۔ افسانہ میں بڑی خوبی سے اس پہلو کو اُبھارا گیا ہے کہ دنیا کے عام انسانوں کے درمیان دکھ درد ہی وہ رشتہ ہے جو انھیں آپس میں جوڑے رکھتا ہے۔ افسانہ میں راوی اور تاجی کا کردار غریب و مفلس انسانوں کا نمائندہ کردار ہے۔ ان دونوں کرداروں کے ذریعے افسانہ نگار نے غربت و افلاس کے مارے عام انسانوں کی کربناک زندگی کو دکھایا ہے۔ ڈاکٹر مثنیٰ رضوی اس افسانہ پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''یہ کہانی دو کرداروں کے گرد گھومتی ہے لیکن ان دو کرداروں کی زندگی لاکھوں کروڑوں افلاس زدہ دکھی انسانوں کی زندگی کا آئینہ ہے جو معاشی زبوں حالی اور تنگ دستی کے ہاتھوں اپنی پہچان اور اپنے وجود کی معنویت کھو چکے ہیں۔ ایسی زندگی جئے جا رہے ہیں جن کا کوئی حاصل نہیں۔ جب انسان اپنی زندگی کی معنویت کھودے تو سوائے درد کے اور رہ کیا جاتا ہے؟ یہی درد ہے جو مفلوک الحال انسانوں کو ایک دوسرے سے جوڑتا ہے۔ بڑا مقدس رشتہ ہے یہ درد کا رشتہ۔... اقبال متین نے ریس کورس کو اپنی کہانی کا پس منظر بنا کر اس میں گہری معنویت پیدا کر دی ہے۔ یہ دنیا بھی تو ایک طرح کی ریس کورس ہی ہے جہاں ہر شخص بازی مارنے کی دوڑ میں سرگرداں نظر آتا ہے۔ ہارنے والوں کی قطاریں ان گنت ہیں، جنہیں پوری زندگی بے معنی اور مہمل محسوس ہوتی ہے۔ بس ایک درد کا رشتہ ہے جو انھیں جوڑتا ہے اور جینے کی طاقت بخشتا ہے''۔ (۳۴)

وسیم عباس اس افسانہ کے تعلق سے لکھتے ہیں۔

> ''درد کا رشتہ'' محبت اور درد کے احساس سے جڑی ایسی تخلیق ہے جسے پڑھ کر آپ کو اس کہانی کے ایک کردار ''تاجی'' پر پیار آتا ہے۔ اس افسانے میں گھوڑ دوڑ کے میدان کا ذکر ہے جو حشر کے میدان کے ذکر سے کم نہیں ہے۔ یہاں باپ بیٹے کو پہچانتا ہے اور نہ بیٹا باپ کو۔ سب کی نظر گھوڑوں پر لگی ہوئی ہے۔ کچھ نظریں ایسی بھی ہیں جو تاجی کا تعاقب کر رہی ہیں۔ تاجی ان بوالہوس نظروں کو پہچان لیتی ہے۔ پھر ان سب سے خود کو الگ تھلگ کر لیتی ہے اور ایک ایسے معمولی شخص کا سہارا بن جاتی ہے جو تنگ دستی سے بیزار آ کر

اپنی ساری پونجی ریس کی نذر کردیتا ہے، تا کہ جیت ہونے پر قرض خواہوں سے چھٹکارا پا سکے۔ جب تاش، گھوڑے، اس کا ساتھ نہیں دیتے تب تاجی اس کے دل کا درد جان کر اس سے وہ رشتہ جوڑ لیتی ہے جو درد کا رشتہ ہے۔ افسانہ پڑھ کر ہمیں قائل ہونا پڑتا ہے کہ اقبال متین کی گہری نظر کس طرح تاجی کے اندر جنم لینے والے جذبات کو محسوس کرتی ہے اور پھر وہ کس طرح کمالِ فن سے انہیں قرطاس پر بکھیر دیتے ہیں۔'' (۳۵)

آج ہمارے سماج میں معاشی زبوں حالی اور غربت وافلاس نے مہیب شکل اختیار کر لی ہے۔ اس نے انسان کے چہرے سے اس کی خوشیاں چھین لی ہیں۔ آج تنگدستی کے سبب انسانوں کو قدم قدم پر ذلت ورسوائی اُٹھاتے ہوئے شکست وریخت سے دوچار ہونا اور محرومیوں و مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اقبال متین کے افسانوں ''ننگے زخم''، ''چوتھا دن''، ''بوند بوند لہو'' اور تین پتھر ڈھونے والا مسافر میں عام انسانوں کے اسی درد وکرب کی عکاسی کی گئی ہے۔ ''ننگے زخم'' میں چھوٹے موٹے سرکاری ملازموں کی پریشانیوں کو دکھایا گیا ہے۔ افسانہ کا مرکزی کردار 'راوی' معمولی سرکاری ملازم ہے۔ اس کی تنخواہ اس کی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے ناکافی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مہینے کی پہلی تاریخ کو جب اسے تنخواہ ملتی ہے تو اس موقع پر اسے کوئی خوشی نہیں ہوتی۔

''مہینے کی پہلی تاریخ کا تصوّر کسی کے لیے خوش آیند ہوتا ہو تو ہو، میرے لیے تو سارے سوئے ہوئے فتنوں کو جگانے کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ غلّہ والا، دودھ والا، مالک مکان، ملازم، دھوبی، بھنگی، نائی، بچوں کی فیس''۔ (۳۶)

جب تنخواہ سے اس کی ضرورتیں پوری نہیں ہوتیں تو اسے قرض کا سہارا لینا پڑتا ہے لیکن یہ قرض بھی اسے بڑی مشکلوں سے ملتا ہے۔ ''بوند بوند لہو'' میں عام انسانوں کی مجبور ومحروم زندگی کو دکھایا گیا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار سیٹھ بیگم داس ولد بازار داس کا مقروض ہے۔ وہ اسے قرض ادا نہیں کر پاتا ہے تو وہ عدالت کے ذریعے اس پر قرقی کا حکم نامہ جاری کرواتا ہے۔ جب قرقی آفس کا ایک معمولی ملازم مقروض شخص کے پاس آتا ہے تو اس کی گھگھی بندھ جاتی ہے۔ قرقی آفس کا ملازم مقروض شخص سے سیٹھ کو کسی طرح آدھی رقم ادا کرنے کے لیے کہتا ہے اور دونوں کے درمیان صلح صفائی کرانے کا وعدہ کرتا ہے۔ اس قرقی کو ٹالنے کے لیے وہ مقروض شخص سے رشوت مانگتا ہے۔ جب مقروض شخص اسے منہ مانگی رشوت نہیں

دے پاتا ہے تو اسے بڑی ذلّت اُٹھانی پڑتی ہے جس میں اس کا ضمیر مجروح ہو جاتا ہے۔

''میں نے مول تول کرنا مناسب نہ سمجھا۔ میرے خاندانی اخلاق کا جس قدر بچا کھچا زیور تھا۔ میں نے سارے کا سارا ڈھونڈ نکالا اور پہن لیا۔ جب اخلاق کے زیور سے خود کو آراستہ کر چکا تو مجھے لپ اسٹک کے طور پر اس ہنسی کی ضرورت پڑی جو مجھے خود مجھ سے ہی خریدنی تھی۔ میں نے ساری پونجی لگا کر وہ ہنسی خریدی اور اس طرح بن سنور کر خود کو بے لِف کے سامنے طوائف کی طرح پیش کیا۔ فرق یہی تھا کہ سودا جسم کا نہیں روح کا ہو رہا تھا''۔(۳۷)

مقروض شخص بہ مشکل اسے کچھ روپئے بطور رشوت دے پاتا ہے اور کچھ آئندہ دینے کا وعدہ کرتا ہے۔ آئندہ وہ ٹالتا رہتا ہے۔ ایک دن وہ اپنی پرانی لونا پہ سوار ہو کر اپنے بچے کے جوتے خریدنے بازار جاتا ہے کہ اچانک لونا راستہ میں بند ہو جاتی ہے اور قرقی آفس کا وہی ملازم اس کے سامنے آتا ہے اور اپنی بقیہ رقم کا مطالبہ کرتا ہے۔ مقروض شخص اسے جیب سے پیسے نکال کر تو دے دیتا ہے لیکن اپنے بچے کے لیے جوتے خریدنے کی حسرت اس کے دل ہی میں رہ جاتی ہے۔ ''چوتھا دن'' میں معاشی تنگدستی کے ہاتھوں عام انسانوں کو ذلتیں اُٹھاتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ ''تین پتھر ڈھونے والا مسافر'' میں غربت و افلاس اور حالات کے جبر کی عکاسی کی گئی ہے۔ ایک شخص غربت و افلاس سے تنگ آ کر اپنے باپ کو قتل کر ڈالتا ہے لیکن قتل کے بعد وہ شکست خوردگی کے احساس سے دوچار ہوتا ہے اور زندگی بھر اس سے نکل نہیں پاتا ہے۔ معاشی زبوں حالی اور مفلسی، زندگی کو کئی زاویوں سے مجروح کرتی ہے۔ یہ بچوں کے چہروں سے ان کی مسکراہٹ چھین لیتی اور ان کی زندگی کو حسرت و غم کی نذر کر دیتی ہے۔ افسانہ ''ایک سوال'' میں اسی پہلو کو اُبھارا گیا ہے۔ سجادے ایک غریب گھرانے کا لڑکا ہے۔ والدین کا انتقال ہو چکا ہے۔ اس کی بڑی بہن زینو ٹیوشن کر کے اپنے بھائی بہنوں کی پرورش کرتی ہے۔ شادی کے بعد زینو کو اس کا شوہر اسکول میں پڑھانے سے منع کر دیتا ہے۔ اس لیے اب وہ اپنے چھوٹے بھائی سجادے کی کفالت نہیں کر پاتی ہے۔ اب سجادے اپنے بہنوئی کے گھر رہتا اور اسکول میں پڑھنے جاتا ہے۔ اس کا بہنوئی اس کے بچپن کا ذرا بھی خیال نہیں کرتا۔ وہ اس سے گھر کا کام لیتا، ڈانٹتا اور اپنا بوجھ آپ اٹھانے کو کہتا ہے۔ بہنوئی کے سخت رویوں سے تنگ آ کر سجادے کسی ایرانی ہوٹل میں جز وقتی ملازمت اختیار کر لیتا ہے۔ اب وہ اسکول

سے سیدھے وہیں جاتا ہے۔ ہفتہ میں ایک دن اسے چھٹی ملتی ہے۔چھٹی کے دن وہ کالونی کے لڑکوں کے ساتھ جن کا وہ کبھی بہت پیارا دوست رہ چکا ہوتا ہے، کھیلنا چاہتا ہے تو لڑکے اس کے ساتھ کھیلنے سے انکار کر دیتے ہیں اور اسے ہوٹل کا چھوکرا کہہ کر پکارتے ہیں:

> ''دیکھیے وہ سب کے سب مجھے ہوٹل کا چھوکرا پکار رہے ہیں میں نے تو اپنا بار آپ اٹھایا تھا۔ میں نے کوئی برائی تو نہیں کی تھی۔لیکن وہ مجھ سے کھیلنا تک گوارا نہیں کرتے۔ان کے بڑوں نے انھیں منع کر دیا ہے۔ بتایئے نا اب میں کیا کروں۔ میں کہاں جاؤں۔کن سے کھیلوں''۔(۳۸)

ان جملوں کو پڑھ کر قاری کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں اور وہ سجادے جیسے بچوں کے درد وغم میں ڈوب جاتا ہے کہ غربت و افلاس کھیلنے کودنے کی عمر میں انھیں کھیلنے بھی نہیں دیتی اور ان کی خوشیوں کو بھی چھین لیتی ہے۔اقبال متین کا افسانہ ''سمجھوتا'' بھی اسی موضوع پر ہے۔اس میں بھی حسرتوں اور محرومیوں سے پُر بچپن کو دکھایا گیا ہے۔'میاں جانی' غریب ماں باپ کا بیٹا ہے۔اس کا باپ بیمار اور نکما ہے اور اس کی ماں گھر میں کھانا پکانے کا کام کرتی ہے۔ اپنی ماں کی مصروفیت کی وجہ سے وہ اپنے چھوٹے بھائی گورے جانی کو دن دن بھر گود میں رکھنے پر مجبور ہوتا ہے۔اپنے آس پاس کے بچوں کو کھیلتے ہوئے دیکھ کر اسے کھیلنے کی شدید خواہش ہوتی۔ایک مرتبہ لٹو اور غلیل اس کے ہاتھ آ جاتے ہیں۔اس دن وہ گورے جانی کو چھوڑ کر، لٹو اور غلیل لے کر کھیلنے نکل جاتا ہے۔شام کو جب وہ گھر واپس آتا ہے تو اس کے والدین اس کی خوب پٹائی کرتے ہیں اور اس وقت تک اسے کھانا نہیں دیتے ہیں جب تک کہ وہ لٹو اور غلیل کو چولہے میں جھونک نہیں دیتا ہے۔مجبوری میں وہ لٹو اور غلیل کو چولہے میں تو ڈال دیتا ہے لیکن وہ اسے جلتے ہوئے بڑی حسرت سے دیکھتا ہے۔ اسے دیکھ کر اس سے اور اس جیسے بچوں سے قاری کے دل میں ہمدردی پیدا ہونے لگتی ہے۔ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اس افسانہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''سمجھوتہ'' اس مجموعے (اجلی پرچھائیاں) کی کہانی ایک اچھی کہانی ہے۔ گھر کی ملازمہ کا لڑکا میاں جانی، سات سال کی ننھی جان، کھیلنے کودنے کی خواہش، لٹو گھمانے کے ارمان۔لیکن اگر چھوٹے بھائی گورے جانی کو گود میں لٹکائے نہ پھرے تو اس کی ماں گھر کا کام کاج کیسے کرے۔اور اپنے مریض اور نکمے شوہر اور دونوں بچوں کی پرورش کیوں کر کرے۔ میاں جانی

> کی کشمکش اور بالآخر ماں کی جیت، لٹو جلا دینے پر ماں سے سمجھوتہ۔اس کہانی میں بچے کی نفسیات، خواہش اور مجبوری کی آویزش بڑی خوبی سے بیان کی گئی ہیں۔ آپ کو میاں جانی سے اور اس کے جیسے ہزاروں بچوں سے ہمدردی ہونے لگتی ہے اور آپ ان حالات سے بیزاری محسوس کرنے لگتے ہیں جنہوں نے اس مجبوری کو جنم دیا ہے''۔(۳۹)

یہ کہانی سماج کے نچلے طبقہ سے تعلق رکھتی ہے۔اس طبقہ سے متعلق اقبال متین کا مشہور افسانہ ''آنگن میں سہاگن'' بھی ہے۔ یہ ان کا طویل اور نمائندہ افسانہ ہے۔اس میں افسانہ نگار نے بمبئ کی جھگی جھونپڑیوں میں رہنے والے لوگوں کی زندگی کو دکھایا ہے۔ یہ افسانہ واحد متکلم کی تکنیک میں ہے۔اس میں ایک نو بیاہتا لڑکی کی داستان بیان کی گئی ہے جس کی شادی یونس میاں سے ہوئی ہے۔ یونس میاں بمبئ میں ایک چھوٹی سی کھولی میں اپنے تین بھائیوں، چار جوان بہنوں اور ماں کے ساتھ رہتا ہے۔ وہ ٹھیلہ لگاتا ہے اور اپنی کمائی ہوئی رقم بازاری عورتوں پر لٹاتا ہے جن کے ساتھ وہ رات گزارتا ہے۔ وہ جنسی بے راہ روی کا شکار بگڑا ہوا آدمی ہے۔ وہ بے تحاشا شراب پیتا ہے۔اسے غلط روش سے بچانے کے لیے اس کی ماں اس کی شادی کرا دیتی ہے۔اس کی ماں سوچتی ہے کہ شادی کے بعد اس کے اندر ذمہ داری کا احساس پیدا ہو جائے گا اور وہ الگ سے کوئی کھولی کرائے پر لے کر اپنی بیوی کے ساتھ رہے گا لیکن وہ شادی کے بعد بھی نہ کوئی کھولی کرائے پر لیتا ہے اور نہ ہی ایک پیسہ گھر کو دیتا ہے۔ وہ اب بھی شراب کے نشہ میں دھت دیر رات گئے گھر آتا ہے۔اس کے پاس الگ سے کوئی کمرہ نہیں ہے جہاں وہ اپنی بیوی کے ساتھ رات گزار سکے۔اس لیے وہ کھولی کے ایک کونے میں پردہ ٹانگ کر اپنی بیوی کے ساتھ شب گزارتا ہے۔ اس طرح وہ اپنی بیوی سے جنسی تسکین تو حاصل کرتا ہے لیکن اس کی چار جوان بہنیں جو پاس ہی پڑی سو رہی ہوتی ہیں، رات بھر جنس کی آگ میں تڑپ رہی ہوتی ہیں۔

> ''بڑھیا نے دیکھا کہ دالان میں چاروں طرف چپے چپے پر پردے کھنچے ہوئے ہیں اور ان پردوں کے پیچھے اس کی بیٹیاں بہو سے زیادہ کراہ رہی ہیں''۔(۴۰)

یونس کی بوڑھی ماں سے جب اپنی جوان بیٹیوں کی حالت دیکھی نہیں جاتی تو وہ پردے کو نوچ پھینکتی ہے اور بہو کو کوسنے لگتی ہے۔اسی بات پر یونس میاں ایک دن اپنی ماں سے الجھ پڑتا ہے اور بات کافی آگے

بڑھ جاتی ہے۔

> ''چل میرے ساتھ، تجھے تیری ماں کے گھر چھوڑ آؤں۔ وہ آگئی ہے ہاسپٹل سے''۔ ''ہاں ہاں لے جا کل موہی کو۔ یہاں رہے گی تو ناس مار کر رکھ دے گی گھر بھر کا۔ آج تو پردہ باندھنے مرتا ہے، کل تیرا کوئی بھائی پردہ باندھ دے گا۔ وہ تو اپنے دیوروں کو تکتا کے ہے۔ دو مہینہ کا حمل ہے خیلو کو۔ تجھے کچھ خبر بھی ہے اور آج کتنے مہینے کے بعد تو نے پردہ باندھا ہے۔ گھر کیا ہوا رنڈی کا کوٹھا ہو گیا''۔ بہت ہو گیا، چپ کر، بنا کیوں نہیں دیتی کوٹھا۔ لگا کیوں نہیں دیتی پردے کونے کونے میں۔ سفید بازار سر عام دن دہاڑے چلتا ہے۔ تیرا کالا بازار کالی راتوں میں چلے گا۔ ماں بلک بلک کر رونے لگی۔ اپنی بہنوں کے بارے میں ایسے کلمات نکالتا ہے حرام خور۔ چھوٹے بھائیوں کے ہاتھ یونس سیٹھ کے گریباں تک اٹھ کر رہ گئے''۔ (۴۱)

اس اقتباس کو پڑھ کر قاری انگشت بدنداں رہ جاتا ہے۔ وہ سوچنے لگتا ہے کہ کھولی میں رہنے والوں کی یہ کیسی زندگی ہے جہاں رشتوں کی حرمت تک کا پاس و لحاظ نہیں ہے۔ یونس میاں اور اس کی ماں کے مکالموں سے ان کی نچلی سطح کی سوچ اور وہ جس سطح کی زندگی بسر کر رہے ہیں، اس کی پوری جھلک سامنے آ جاتی ہے۔ یونس میاں ماں سے الجھنے کے بعد غصے کی حالت میں گھر سے نکلتا ہے اور اس کی دلہن میکے چلی جاتی ہے۔ رات کو یونس میاں گھر آنے کے بجائے سسرال چلا جاتا ہے جہاں رات تو وہ بڑے مزے سے گزارتا ہے لیکن صبح ہوتے ہی دلہن کی ماں اس پر برہم ہوتی ہے اور اسے اپنی بیوی کو خرچ دینے کے لیے کہتی ہے۔ دلہن کی ماں داماد سے کھانے تک کے پیسے مانگتی ہے۔ یونس میاں ناراض ہو کر سسرال سے بھی چلا جاتا ہے۔ اب وہ سسرال جانا چھوڑ دیتا ہے اور پھر سے پہلے کی طرح بازاری عورتوں کا سہارا لیتا ہے۔ یونس میاں کی دلہن کو شوہر سے مل کر جنسی لذت کا چسکہ لگ جاتا ہے۔ اس لیے جب یونس میاں سسرال اس کے پاس جانا چھوڑ دیتا ہے تو وہ اس کی جدائی میں جنسی گھٹن کا شکار ہو جاتی ہے اور اس پر نیم جنونی کی کیفیت طاری ہونے لگتی ہے۔ دلہن کی اس حالت کو دیکھتے ہوئے اس کی ماں اس کا روحانی علاج کرانے کے لیے حاجی علی بابا کے مزار پر لے کر جاتی ہے۔ وہاں سے واپسی کے بعد وہ بڑی چالاکی سے اس بات کی تشہیر کرتی ہے کہ اس کی بیٹی کو حاجی علی بابا نے نواز دیا ہے۔ اس پر روحانی کیفیت طاری ہے

اوراس کا جھوٹا پانی پی کرعورتیں حاملہ ہوں گی اور انھیں آسانی سے بچہ ہوگا۔اس طرح دلہن کی ماں مذہب کے نام پراس کا استعمال کر کے دولت تو بٹور لیتی ہےلیکن دلہن کی زندگی بڑے درد وکرب میں گزرتی ہے۔اس کی حسرتوں اورمحرومیوں بھری زندگی کو دیکھ کر قاری کا دل درد سے تڑپ اُٹھتا ہے۔اس افسانہ میں اقبال متین نے جھگی جھونپڑی میں زندگی گذارنے والےلوگوں کی غربت وافلاس اور جنسی گھٹن سے پُر زندگی،ان کی مجبوریوں،محرومیوں اورحسرتوں کی تصویر کشی اس ہنرمندی سے کی ہے کہ اس معاشرہ کا پورا منظرقاری کی نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ڈاکٹرقمر رئیس اس افسانہ پراپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''مجموعہ (شہرآشوب) کا ایک طویل مختصر افسانہ ''آنگن میں سہاگن'' میں بیانیہ کا ایک عجیب تجربہ ہے۔کہانی مرکزی کردار کی ایک نوعمر نوبیاہتا لڑکی کی آپ بیتی کے انداز میں شروع ہوتی ہےلیکن درمیان میں بڑی خاموشی سے افسانہ نگار راوی بن کر قصّے کی کڑیوں کو جوڑتا ہے اور قاری کے تجسُّس کو تسکین دیتا اورکہیں بڑھاتا ہے۔یہ بمبئ شہر کے نچلے طبقے کی ویرانی، بے حسی، بے مائیگی اورحیوانی سطح پر جینے کی کہانی ہے جو ڈربے جیسی کھولیوں میں رہتے ہیں۔ پوری کہانی، انسانی حرمت، انسانی وقار اوراس کی سہانی خواہشوں اورخوابوں کی المناک موت کے سوگ میں ڈوبی ہوئی نظرآتی ہے''۔(۴۲)

ڈاکٹرعشرت رومانی اس افسانے کی خوبی پرروشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آنگن میں سہاگن'' ایک طویل افسانہ ہے جس میں اقبال متین نے اس انداز سے طوالت کی حدبندی کی ہے کہ وہ افسانے کے موضوع پراثراانداز نہ ہو۔ دوسری جانب میاں بیوی کے رشتے سے متعلق انہوں نے قلم کو سنبھال کرجس انداز سے افسانہ لکھا ہے اس سے ان کی ذہنی پختگی اورکشادگی کا احساس ہوتا ہے۔میرا خیال ہے کہ اقبال متین نے تخلیق کی سطح پرمحتاط رویہ اختیار کیا ہے۔یہی ان کا کمال ہے بلکہ کمال فن ہے''۔(۴۳)

وسیم عباس اس افسانے کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''آنگن میں سہاگن'' ایک طویل افسانہ ہے۔جس میں ایک سہاگن کا دل اس کے اپنے جذبات، مجبوریوں، شہوت وغربت کو چھپائے ہوئے دھڑک

رہا ہے۔ بار بار قاری کو رُک کر یہ سوچنا پڑتا ہے۔ کیا ایسی بھی سہاگنیں موجود رہی ہیں جن پر صرف اقبال متین ہی کی نظر پہنچ سکتی ہے؟ آخر میں اقبال متین ہمیں ایک اور حقیقت سے روشناس کراتے ہیں کہ اس شہوت زدہ لیکن پاک اور معصوم عورت کو اس کی مرضی کے خلاف اس کی ماں اپنے جنتر منتر سے لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکتے ہوئے محترم بنا دیتی ہے۔ سب یہی سمجھنے لگتے ہیں کہ اس سہاگن کا پیا ہوا پانی، دوسری سہاگن کو پلایا جائے تو وہ سہاگن حاملہ ہو جاتی ہے۔ اس افسانے میں اقبال متین نے جن کرداروں کے جذبات اور احساسات کی نشان دہی کی ہے یہ صرف ان ہی کا حق ہے''۔(۴۴)

افسانہ ''پو پھٹنے تک'' میں بھی اقبال متین نے جھگی جھونپڑیوں میں رہنے والے لوگوں کی زندگی کو موضوع بنایا ہے۔ جگی جھونپڑی میں رہنے والے لوگ دنیا کی نعمتوں سے تو محروم رہتے ہی ہیں، اپنی معاشی تنگدستی کے باعث رشتوں کا تقدس تک کھو بیٹھتے ہیں۔ یہ افسانہ اسی پہلو کو اُجاگر کرتا ہے۔ اس میں راملو نامی ایک غریب شخص کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ اس کے آٹھ افراد پر مشتمل خاندان کے رہنے کے لیے ایک ہی جھونپڑی ہے جس میں وہ، اس کی بیوی، بیٹی اور اس کے دو بیٹے کسی طرح گزر بسر کرتے ہیں۔ کچھ دنوں بعد اس کے بیٹے جوان ہو جاتے ہیں۔ وہ بہت متفکر رہتا ہے کہ وہ کیسے اپنے بیٹوں کی شادی کرائے اور بہو کو کہاں رکھے۔ اس کی زبوں حالی اسے اجازت نہیں دیتی ہے کہ وہ کوئی دوسری جھونپڑی بنا سکے۔ اسی تنگدستی کی حالت میں اس کے بڑے بیٹے انکیا کی شادی ہوتی ہے اور وہ اپنی بیوی بچوں کے ساتھ اسی جھونپڑی میں رہتا ہے۔ اب راملو کا دوسرا بیٹا ملیا بھی جوان ہو جاتا ہے اور وہ شادی کرنے کے لیے بے چین رہتا ہے۔ راملو اس کے مزاج کی برہمی کو دیکھ کر اس کی شادی تو کرا دیتا ہے لیکن وہ الگ سے اس کے رہنے کے لیے کوئی جھونپڑی نہیں بنا پاتا ہے۔ مجبوری میں وہ، اس کی بیوی، جوان بیٹی اور دونوں بیٹے اپنی بیویوں کے ساتھ اسی جھونپڑی میں رہتے ہیں۔ ایک رات شدید بارش ہوتی ہے اور جھونپڑی کا چھپر رسنے لگتا ہے جس کی وجہ سے زمین میں سیلن پیدا ہو جاتی ہے اور نیچے زمین پر سو رہے دونوں بھائیوں انکیا اور ملیا کو سردی لگنے لگتی ہے۔ سردی سے بچنے کے لیے اندھیری رات میں دونوں بھائی بوسیدہ کمبلوں میں لپٹے ہوئے سکڑتے سکڑتے ایک دوسرے کی بیوی کے پاس پہنچ جاتے ہیں اور

اپنی بیوی سمجھ کر دوسرے کی بیوی کے ساتھ ہی گتھم گتھا ہو جاتے ہیں۔اس طرح صبح ہوتے ہوتے تک جھونپڑی کی عزت و آبرو خاک میں مل جاتی ہے۔

''جب ڈھلے ہوئے صاف، شفاف، نکھرے ستھرے سورج نے اپنی کرنیں، اپنی روشنی، اپنی حدّت، اپنی تمازت دنیا بھر میں تقسیم کی تو بوڑھا راملو اور اس کی بیوی سسکیاں لے رہے تھے۔ کیوں کہ بھائیں بھائیں کرتے ہوئے رات کے اندھیروں نے صبح ہوتے ہوتے کٹیا کی عزت و آبرو کو چبا کر جیسے تھوک ڈالا تھا۔'' (۴۵)

اقبال متین نے ان دونوں افسانوں ''آنگن میں سہاگن'' اور ''پو پھٹنے تک'' میں جھگی جھونپڑیوں میں رہنے والے لوگوں کی غربت زدہ زندگی، حرماں نصیبی اور معاشی تنگدستی کے سبب مجروح ہوتے رشتوں کے تقدس کو اس پُر اثر اور ہمدردانہ انداز میں بیان کیا ہے کہ ان افسانوں کو پڑھ کر قاری کو جھگی جھونپڑیوں میں رہنے والے ان لوگوں سے بے پناہ ہمدردی پیدا ہونے لگتی ہے۔نورالحسنین مذکورہ دونوں افسانوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ان کا طویل افسانہ ''آنگن میں سہاگن''، ممبئی کی جھگی جھونپڑیوں میں بسنے والے ایک مسلم خاندان کی عکاسی کرتا ہے تو افسانہ ''پو پھٹنے تک'' حیدرآباد کے مضافات میں آباد ایک تلنگی خاندان کا نقشہ بھی پیش کرتا ہے۔ جھونپڑیوں میں زندگی بسر کرنے والے افراد معاشی تنگدستی کے باعث زندگی کی کتنی ہی نعمتوں سے محروم ہی نہیں رہ جاتے ہیں بلکہ کبھی کبھی ان جھونپڑیوں میں رشتوں کا وہ تقدس بھی کھو بیٹھے ہیں جو ان کی زندگیوں کا ماحصل ہوتا ہے۔ان افسانوں کی زبان و بیان، رہائش طور طریقوں پر اس قدر کامیابی کے ساتھ گرفت کی گئی کہ عقل اقبال متین کے مشاہدے پر دنگ رہ جاتی ہے۔'' (۴۶)

اقبال متین نے دلت طبقہ کی زندگی پر بھی افسانہ لکھا ہے۔اس طبقہ کا شمار ہمارے سماج کے انتہائی پسماندہ طبقے میں ہوتا ہے۔ یہ طبقہ صدیوں سے سماجی و سیاسی استحصال کا شکار رہا ہے اور اس کے ساتھ ہمیشہ سے انسانوں کے بجائے حیوانوں جیسا برتاؤ کیا جاتا رہا ہے۔آج بھی یہ طبقہ طرح طرح کے مسائل سے دوچار، حیوانوں جیسی زندگی جینے پر مجبور ہے۔جدید اردو افسانہ نے اس طبقہ کے حالات و مسائل کو

بھی موضوع بنایا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہندی، مراٹھی اور دیگر علاقائی زبانوں کی طرح اردو افسانہ نے اس طبقہ کے مسائل کا احاطہ نہیں کیا ہے لیکن بالکل اسے نظر انداز بھی نہیں کیا ہے۔ مختلف افسانہ نگاروں کے یہاں دلت طبقہ کے مسائل پر کچھ نہ کچھ افسانے مل جاتے ہیں۔ اقبال متین کا افسانہ ''بازار سے بازار تک'' اسی طبقہ کی عکاسی کرتا ہے۔ اس میں انھوں نے دلت سماج کی غربت زدہ زندگی اور اس کے ساتھ کیے گئے حیوانی سلوک کو دکھایا ہے۔ کلوا ایک غریب باپ کا بیٹا ہے۔ غربت کی وجہ سے اسے اپنے گھر میں فاقہ کرنا پڑتا ہے۔ اس فاقہ سے بچانے کے لیے اس کا باپ اسے سیٹھ چمن چوڑ کے یہاں دو سال کے لیے ملازم رکھوا دیتا ہے۔ وہ بجراج بنیے کا مقروض ہے۔ جب دو سال کی کڑی محنت کے بعد اس کے بیٹے کلوا کو کچھ روپئے ملتے ہیں تو وہ سوچتا ہے کہ پہلے بیٹے کی شادی ہو جائے پھر بعد میں بنیے کا قرض ادا کیا جائے گا۔ چنانچہ وہ اپنے بیٹے کی شادی کی تیاری شروع کر دیتا ہے۔ وہ اکیلے بازار جاتا ہے اور اپنی پیٹھ پر وزنی سامان لاد کر لاتا ہے۔ بازار سے گھر آتے ہوئے راستے میں جب اسے مرے ہوئے بچھڑے کی خوشخبری ملتی ہے تو اس کی خوشی کی انتہا نہیں رہتی ہے کہ کھانے کے لیے اتنا سارا گوشت کا بھی انتظام ہو گیا۔ وہ خوشی خوشی اپنے دوست اسواس کے ساتھ مرا ہوا بچھڑا لانے جاتا ہے۔ جب وہ اسواس کے ساتھ کندھے پر بچھڑا اور تاڑی لے کر لوٹ رہا ہوتا ہے تو اسی درمیان اسے اطلاع ملتی ہے کہ قرض ادا نہ کر پانے کے سبب بجراج بنیے نے اس کے بیٹے کلوا کو پکڑ لیا اور بیلوں کی ڈوڈی میں بند کر دیا ہے۔ یہ ہے دلتوں کے ساتھ وہ حیوانی اور بے رحمانہ سلوک جس کا یہ طبقہ صدیوں سے شکار ہوتا چلا آ رہا ہے۔ بجراج بنیے کے دل میں رحم کی اتنی گنجائش نہیں ہوتی کہ جب شادی کی ساری تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں تو وہ کلوا کو شادی کرنے دے اور بعد میں اپنا قرض وصول کر لے۔ وہ اپنی سنگدلی کا ایسا مظاہرہ کرتا ہے کہ کلوا اور اس کے باپ کی ساری خوشی ماتم میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

اقبال متین کے بارے میں عرض کیا جا چکا ہے کہ وہ ایک متنوع افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں میں موضوعات کی رنگارنگی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے عصر حاضر کے گونا گوں مسائل کو بڑی خوش اسلوبی سے اپنے فن کا موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے ان مسائل کو بھی اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے جن سے ہمارا معاشرہ جوجھ رہا ہے۔ آج ہمارے سماج میں لوگ کسی مجبور، ضرورت مند کی مدد کو آگے نہیں آتے۔

ہاں مجبوری میں اس کا استحصال کر کے اپنی ہوس ضرور پوری کرتے ہیں۔افسانہ ’’برہان قاطع‘‘ اسی پہلو کو اُجاگر کرتا ہے۔ یہ افسانہ اقبال متین کے نمائندہ افسانوں میں سے ہے۔افسانہ کا مرکزی کردار برہان قاطع ایک لنگڑا بھکاری لڑکا ہے۔وہ حالات کی مجبوریوں کے تحت بھیک مانگتا ہے۔اس کے بھیک مانگنے کا طریقہ دوسرے بھکاریوں سے بالکل الگ ہے۔ وہ شاہراہ پر چلنے والے ہرراہ گیر کا پاؤں جھٹ سے پکڑ لیتا اور پیسہ مانگنے لگتا ہے۔ایسا وہ اس لیے کرتا ہے کہ شریفوں کی طرح بھیک مانگنے پر لوگ اسے پیسے نہیں دیتے ہیں۔اس طرح وہ اپنا اور اپنی ماں کا پیٹ پالتا ہے۔وہ مجبوریوں کے تحت بھیک ضرور مانگتا ہے مگر اس کا ضمیر زندہ ہوتا ہے۔ایک مولوی صاحب اس کی ماں کی غربت و افلاس کی مجبوری کا فائدہ اٹھا کر اسے شادی کا لالچ دیتے ہیں اور اس سے جنسی تعلق قائم کر لیتے ہیں لیکن آگے چل کر وہ شادی سے انکار کر دیتے ہیں۔ برہان قاطع کو جیسے ہی یہ بات معلوم ہوتی ہے،اس کا ضمیر طیش میں آتا ہے اور وہ مولوی صاحب کو قتل کر ڈالتا ہے۔ یہاں قاری کو برہان قاطع کو دیکھ کر اس سے نفرت نہیں بلکہ ہمدردی ہوتی ہے۔
ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اس افسانہ پر اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں:

> ’’برہان ایک لنگڑا بھکاری لڑکا ہے۔کہانی کی ابتدا ہی سے آپ برہان کی ذہانت، چالاکی اور ڈھٹائی کے قائل ہوجاتے ہیں۔یہی برہان ان مولوی صاحب کو قتل کر ڈالتا ہے جنہوں نے اس کی ماں سے تعلقات پیدا کر رکھے تھے لیکن آخر کو شادی سے انکار کر دیا۔ برہان بھکاری ہے۔لوگ اسے ڈانٹتے پھٹکارتے ہیں مگر اس کا ضمیر زندہ ہے اور وہ اپنی ماں کا بدلہ لے ہی لیتا ہے۔‘‘(۴۷)

اس افسانہ میں افسانہ نگار نے آج کے بے رحم حالات کی عکاسی کرتے ہوئے برہان قاطع جیسے معمولی لوگوں کے اندر موجود زندہ ضمیر کو دکھایا ہے۔

اقبال متین نے سرکاری محکمہ کی خامیوں کو بھی موضوع بحث بنایا ہے۔آج ہمارے یہاں سرکاری محکمہ میں لوٹ کھسوٹ، بدعنوانی، عام انسانوں کا استحصال، سفاکی وسنگدلی اور بے حسی عام بات ہے۔ایسے میں ایک ایماندار آدمی اگر اپنی دیانتداری کو باقی بھی رکھنا چاہے تو اسے بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔افسانہ ’’کاٹا ہوا نام‘‘ اسی تلخ حقیقت کو اُجاگر کرتا ہے۔افسانہ کا مرکزی کردار ایک بااصول، باضمیر،

غیرت مند، حسّاس اور ایماندار ڈاکٹر ہے۔اس کی تعیناتی ایک ہاسپٹل میں انسپکشن افسر کی حیثیت سے ہوتی ہے۔وہ بڑی ایمانداری سے ڈیوٹی انجام دیتا ہے۔ڈیوٹی افسر اس کی ایمانداری کی تعریف اس طرح کرتا ہے۔''تمہارا قدم سعد ہے رائے۔جب سے تم آئے ہو اموات کی شرح کم ہے۔''

انسپکشن افسر دیانتداری سے اپنا کام انجام تو دیتا ہے مگر ہاسپٹل کے کرپٹ ماحول کو دیکھ کر اسے بڑا دُکھ ہوتا ہے۔ہاسپٹل میں ڈاکٹر،نرس اور وارڈ بوائے یعنی نیچے سے لے کر اوپر تک سارے ملازم غلط طریقے سے پیسے کمانے میں ملوث ہوتے ہیں۔وہ مریضوں سے بے دردی سے پیش آتے ہیں اور ان کی غذا اور دوا کے لیے آئے ہوئے پیسوں کو بھی ہڑپ لیتے ہیں۔وہ اتنے سنگدل،اور بے حس ہوتے ہیں کہ زندہ مریضوں کو مُردہ لکھ کر اور خانہ پری کے ذریعے لاشوں کی تعداد بڑھا کر پیسے کمانے سے بھی نہیں چوکتے۔ پورے ہاسپٹل میں بے حسی اور سنگدلی کا جو ماحول ہوتا ہے اس کی ایک جھلک آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

> ''آنسوؤں کے بالکل برابر قہقہے رکھے جاسکتے ہیں۔کسی مرنے والے کے بستر کے بالکل پاس بیٹھ کر فلمی گیت گنگنایا جاسکتا ہے۔جس میں یاہو کی آواز ذرا دب گئی ہے۔لاش لے جانے والے، بند کیریر کے برابر سے کوئی منچلا سیٹی بجاتا ہوا بہ آسانی گزر سکتا ہے۔مہکتے زخم کو پوڈر اور سینٹ کی خوشبو یہاں اس قدر آسانی سے چھپا سکتی ہے کہ خون کے دھبے گلاب کے سرخ پھولوں کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔جن پر بیتتی ہے سو بیت جاتی ہے اور جنہیں خبر نہیں ہوتی سو بہر حال نہیں ہوتی۔ یہاں ہر سکون، ہر بے اطمینانی کے منہ پر تھوک کر گزر جاتا ہے۔ یہاں غم اور خوشی کی سرحدوں کے درمیان اتنا لمبا فاصلہ ہے کہ دونوں سرحدوں پر کھڑے ہوئے آدمی نہ ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں نہ ایک دوسرے کی آواز ہی سن سکتے ہیں۔''(۴۸)

ایماندار انسپکشن افسر ہاسپٹل کے غیر دیانتدارانہ ماحول میں حتی الامکان بدعنوانی سے بچنے کی کوشش کرتا ہے لیکن جہاں نیچے سے لے کر اوپر تک سارے ملازم بدعنوانی میں ملوث ہوں،کبھی کبھی وہاں کا ماحول اس پر بھی اثر انداز ہوتا ہے اور وہ بھی دوسرے بے حس اور سنگدل ڈاکٹروں کی طرح زندہ مریض کو مُردہ لکھ دیتا ہے لیکن اس کا ضمیر جب اس پر غالب آتا ہے تو وہ پھر اس نام کو کاٹ دیتا ہے۔اس طرح ضمیر اور بے ضمیری کی کشمکش میں مبتلا ہو کر اسے بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ضمیر اور بے ضمیری کی

کشمکش کو افسانہ ''آئینہ، خضاب اور قاتل'' میں بھی دکھایا گیا ہے۔ افسانہ کا مرکزی کردار ایک باضمیر شخص ہے۔ وہ چالیس سال سچائی کی زندگی گزارتا ہے لیکن مکروفریب سے پُر اس دنیا میں اسے غم اور دکھ درد کے علاوہ کچھ نہیں ملتا۔ اسے لگتا ہے کہ اس نے چالیس سال برباد کر لیے ہیں۔ اسے اپنے اوپر افسوس آتا ہے۔ وہ اپنے ضمیر کو مارنا یا کم سے کم بدلنا چاہتا ہے۔ اس مقصد کے تحت وہ جھوٹی زندگی کا آغاز کرتا ہے۔ وہ جھوٹی زندگی کی شروعات تو کر لیتا ہے اور باہر سے خوبصورت بھی لگنے لگتا ہے لیکن اندر سے وہ بے چین ومضطرب ہو اُٹھتا ہے۔ یعنی وہ اپنے ضمیر کو مارنے یا بدلنے پر قادر نہیں ہو پاتا ہے۔ آج کی بے ضمیری کے ماحول میں ایک باضمیر شخص کے لیے زندگی گزارنا کتنا مشکل ہو گیا ہے اور اسے کن اذیتوں سے گزرنا پڑتا ہے، افسانہ میں ان پہلوؤں کی موثر عکاسی کی گئی ہے۔

آج کی بے ضمیری کے ماحول میں تملق و چاپلوسی اور خوشامد کی بڑی اہمیت ہے۔ اس کے بغیر سرکاری محکمہ میں اب ترقی کا تصور محال ہے۔ افسانہ ''چار درویش نئے نویلے'' میں اسی مسئلہ کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ افسانہ میں چار کردار ہیں۔ شاہ میر دنیا، وکیل احسن خاں، وسیم الحق اور مبین احمد۔ چاروں ساتھ پڑھتے، ساتھ کھیلتے، ساتھ جوان ہوتے ہیں اور اتفاق سے چاروں کو ایک ہی پراجیکٹ میں نوکری ملتی ہے۔ ان چاروں میں شاہ میر دنیا اپنے عہدیداروں کی بڑی چاپلوسی کرتا ہے۔ اس کے چاپلوسی کرنے کی وجہ سے اس کے ساتھی اس پر طنز کرتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ اپنی چاپلوسی سے باز نہیں آتا ہے۔ مبین احمد اسے حقارت کی نظروں سے دیکھتا ہے اور وہ کبھی کسی کی چاپلوسی نہ کرنے کی ٹھانتا ہے لیکن جب شاہ میر دنیا چاپلوسی کر کے مبین احمد کا باس بن جاتا ہے تو اب مبین احمد بھی اس کی چاپلوسی کرنے لگتا ہے۔ مبین احمد چاپلوسی تو کرتا ہے لیکن وکیل احسن خاں کی طرح وہ چاپلوسی نہیں کر پاتا ہے جس کی وجہ سے شاہ میر دنیا، وکیل احسن خاں کو اس پر ترقی دے دیتا ہے۔ اس افسانہ میں اس بات کا ادراک کرایا گیا ہے کہ آج کسی بھی سرکاری محکمہ میں یا ملازمت کے کسی بھی شعبہ میں چاپلوسی کے بغیر عموماً ترقی نہیں ہوتی۔

آج ہمارے معاشرے میں بے ضمیری، مفاد پرستی، خودغرضی اور ایک دوسرے کے استحصال کا چلن عام ہو چکا ہے۔ اخلاقی وانسانی قدریں بہت تیزی سے زوال پذیر ہو رہی ہیں۔ مادّیت اور زر پرستی کے رجحان کی وجہ سے انسانی وسماجی رشتوں میں گراوٹ پیدا ہو گئی ہے اور اس میں بے لوث محبت کا فقدان

ہے۔ اقبال متین نے ان تمام پہلوؤں کو اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ اس ضمن میں ان کے افسانے ''چھت''، ''ہمزاد''، ''زبوں آثار''، ''سنگ صدا''، ''کینڈل کالونی'' اور ''کٹھری'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

''چھت'' میں افسانہ نگار نے موجودہ مادّی تہذیب اور معاشرتی زوال کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے۔

> ''آج آنکھوں کو خیرہ کرنے والی روشنیاں شہروں کو لوٹ رہی ہیں۔ ایک دوسرے سے کٹا پھٹا سڑکوں پر بے تحاشا بھاگتا ہوا انسان شہروں کو لوٹ رہا ہے۔ دوڑتی ہوئی کاریں، اڑتے ہوئے جہاز، بڑے بڑے سنیما گھروں کے پردوں پر اسمگلنگ کا کاروبار، قتل، غارت گری جو سارے معاشرے کا گھناؤنا پہلو ہے وہی آج سب سے دلچسپ پہلو ہے۔''(۴۹)

افسانہ کا مرکزی کردار قدیم تہذیبی قدروں کا پروردہ انسان ہے۔ جدید مادّی تہذیب اور معاشرتی زوال پر وہ بے حد دکھی ہے۔ وہ خلوص و محبت کا پیکر، باضمیر اور باحمیت بھی ہے۔ وہ اپنے رشتہ داروں اور اپنے ملنے جلنے والوں کا بڑا خیال رکھتا ہے لیکن اس کے رشتہ دار اس کا خیال نہیں رکھتے بلکہ اس کا استحصال کرتے ہیں۔ یہاں تک اس کی دوسری بیوی بھی اس سے خوب فائدہ اُٹھاتی ہے اور جی بھر کے استحصال کر کے چلی جاتی ہے۔ وہ آدمی ایک عرصہ سے اپنے بچوں کے ساتھ کرائے کے مکان میں رہتا ہے۔ وہ بڑی آرزوؤں سے اپنے رہنے کے لیے ایک مکان کی تعمیر شروع کرتا ہے جو دیوار تک مکمل ہو جاتا ہے۔ اب وہ اس میں چھت ڈالنا چاہتا ہے لیکن اس کی معاشی زبوں حالی اسے اجازت نہیں دیتی۔ وہ اپنی تنگدستی کے سبب اپنے مکان میں ابھی چھت ڈال بھی نہیں پاتا ہے کہ ایک دن اچانک تیز بارش سے دیوار گر جاتی ہے۔ اس طرح اپنے مکان میں چھت ڈالنے اور اس میں رہنے کی حسرت اس کے دل ہی میں رہ جاتی ہے۔ اپنے مکان میں رہنے کی یہ حسرت صرف اسی کا المیہ نہیں بلکہ ان لاکھوں لوگوں کا المیہ ہے جو پوری زندگی کرائے کے مکان میں گزار دیتے ہیں۔ یہ افسانہ میٹرو پولیٹین شہری زندگی کے پس منظر میں لکھا گیا ہے جہاں اتنی اونچی اونچی عمارتیں ہیں کہ ہر طرف چھت ہی چھت نظر آتی ہے۔ اسی شہر کا المیہ یہ ہے کہ وہاں لاکھوں لوگ چھت سے محروم رہتے ہیں۔ یہ افسانہ آج کی سماجی زندگی کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ اس میں جدید مادّی تہذیب اور معاشرتی زوال کو بڑی خوبی سے اُجاگر کیا گیا ہے۔ فضیل جعفری اس افسانہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''چھت'' دراصل اسی معاشرے کی المناک داستان ہے جو انسانی بے چہرگی، خودغرضی اور بے حسی سے عبارت ہے۔ یہ افسانہ بھی ویسے اپنے موضوع اور افسانوی برتاؤ کے لحاظ سے ایک انوکھا افسانہ ہے جس کا کینوس بھی زیادہ وسیع ہے اور اسلوب بھی زیادہ پیچیدہ۔''(۵۰)

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید لکھتے ہیں:

> ''چھت'' معاشرے کے بکھراؤ کی داستان ہے۔ نارسائیوں کی کہانی ہے۔ آدمیت سسک رہی ہے، انسانیت سر بہ زانو ہے، اقدار گم ہیں اور بے قدری، ناداری اور افلاس معاشرہ کا مقدر بن چکا ہے۔ حسرتیں دامن پسارے ہیں، آرزوئیں تشنہ اور خواب بے منزل۔''(۵۱)

افسانہ ''ہمزاد'' کا موضوع بھی سماجی ابتری اور قدروں کا زوال ہے۔ افسانہ کا مرکزی کردار شریف، بے لوث، محبت میں اعتماد رکھنے والا ایک عام انسان ہے۔ وہ اپنے رشتہ داروں اور ملنے جلنے والوں میں سب سے محبت وشرافت سے پیش آتا ہے اور ان کی ضرورتوں میں بھی کام آتا ہے۔ اس کے دل میں انسانیت ومحبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ وہ دنیا کے کسی کونے میں انسانوں پر ہونے والے مظالم پر تڑپ اُٹھتا ہے۔ اسے انسانیت سے پیار ہے۔ وہ خلوص ومحبت کا پیکر ہے۔ ان تمام خوبیوں کے باوجود نہ تو کوئی رشتہ دار اس کا خیال رکھتا ہے اور نہ ہی اس کے بیٹے۔ آج کے مادّی سماج میں ایسے انسان کی کوئی قدر نہیں ہوتی بلکہ اسے حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ آج ہمارے معاشرے میں اچھے انسان کی قدر ہی نہیں ہوتی بلکہ اب رشتوں کا بھی پاس ولحاظ نہیں رکھا جاتا۔ ہر ایک کی نظر اب صرف مادّیت پر ہے۔ بیوی جو محبت کی دیوی کہلاتی ہے، وہ بھی اب اپنے شوہر کا استحصال کرنے لگی ہے۔ افسانہ ''زبوں آثار'' میں اسی پہلو کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ افسانہ کا مرکزی کردار خلوص ومحبت کا پیکر ایک شریف انسان ہے۔ اس کی دوسری شادی ہوتی ہے۔ وہ اپنی بیوی کی تمام فرمائشیں پوری کرتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی بیوی کی ماں بھی اس کے گھر اُٹھ آتی ہے۔ وہ اس کا بھی کفیل ہوتا ہے۔ وہ اپنی بیوی سے اٹوٹ محبت و رفاقت کا خواہشمند ہوتا ہے لیکن اس کی بیوی اس سے صرف جنسی اور مادّی ضرورت پوری کرتی ہے۔ وہ اس سے محبت نہیں کرتی ہے۔ اس کا اعتراف وہ اس کے مرنے کے بعد کرتی ہے جب وہ اس کے اخلاق سے متاثر ہوکر اپنے کئے پر پشیماں ہوتی ہے۔

''میں نے کبھی اس سے محبت نہیں کی۔ضرورت پوری کرتی رہی۔میری ماں بھی گھر اُٹھ آئی۔وہ اس کا بھی کفیل ہوا۔میرے خاندان کے بعض افراد نے بھی اپنا الو سیدھا کیا۔وہ قرض کی کیچ میں دب دب کر دھنس دھنس کر ہاتھ پاؤں مارتا رہا اور میں اس کے ذہن و دل کا امتحان لیتی رہی کہ انسانیت کی باتیں کرنے والا کتنی دور تک چلتا ہے۔میرا دل کبھی پسیجا نہیں۔'' (۵۲)

دوسری بیوی زندگی میں اپنے شوہر کا جی بھر کے استحصال تو کرتی ہے لیکن شوہر کے انتقال کے بعد وہ اس کی شرافت و محبت سے اس قدر متاثر ہوتی ہے کہ وہ اس کے چہرے کو اپنی قبر تک ساتھ لے جانا چاہتی ہے۔ یہاں افسانہ نگار نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اچھی قدریں ضائع نہیں ہوتیں وہ رنگ لا کر رہتی ہیں۔رشتوں کی پامالی اور مادیت پرستی افسانہ ''سنگ صدا'' میں بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔سید حبیب عمر عدنان بہت ہی نیک، خلیق، ملنسار اور منکسر المزاج انسان ہے۔لوگ اسے پیار سے عدّو بھائی اور عمرو بھائی پکارتے ہیں۔وہ اپنی پسند کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے لیکن اس کا باپ جبراً اس کی شادی کسی اور لڑکی سے کرا دیتا ہے۔جبراً تو اس کی شادی کرادی جاتی ہے اور اسے اپنی بیوی سے ایک بچہ بھی ہوتا ہے مگر اس کے باوجود وہ اپنی پسند کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔اس کا باپ اسے دھمکی دیتا ہے کہ اگر ایسا کیا تو جائداد سے بے دخل کر دیا جائے گا۔یہ دھمکی دے کر اس کا باپ حج پہ چلا جاتا ہے۔اسی دوران عدو کی اپنی پسندیدہ لڑکی سے شادی کی تاریخ طے ہوتی ہے۔ابھی شادی کی تاریخ آنے ہی والی ہوتی ہے کہ اس سے قبل اس کی پہلی بیوی اس کا گلا دبا کر اسے اس لیے مار ڈالتی ہے کہ وہ اور اس کا بیٹا اس کی جائداد کے وارث بن جائیں۔راوی اپنی پرانی سائیکل سے عدو بھائی کے جنازہ کی نماز میں شرکت کے لیے جاتا ہے مگر واپسی میں اس کی وہ پرانی سائیکل بھی چوری ہو جاتی ہے جو تنگدستی میں اس کی سواری کا ذریعہ ہوتی ہے۔یہ ہے عہد حاضر کی وہ مادّی تہذیب اور سنگدلانہ ماحول جہاں انسانیت و محبت کی کوئی رمق نظر نہیں آتی۔فضیل جعفری اس افسانہ کو پڑھنے کے بعد اپنے تاثرات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔''سنگ صدا'' اس حقیقت کا علامتی اظہار ہے کہ انسانیت مر چکی ہے۔انسانوں کو حقیقی انسان سمجھنے والوں سے دنیا خالی ہو چکی ہے''۔

افسانہ ''کینڈل کالونی'' بھی آج کے خود غرض اور مادیت پرست ماحول کی عکاسی کرتا ہے۔'ابا' کینڈل کالونی کے واحد مالک ہیں۔ان کی کالونی میں ان کے رشتہ دار اور کچھ دوسرے لوگ کرائے پر

رہتے ہیں۔ ان تمام لوگوں کے ساتھ 'ابا' خلوص سے پیش آتے ہیں، ان پر اپنی محبت نچھاور کرتے ہیں اور انھیں آپس میں جوڑے رکھتے ہیں۔ 'ابا' کی پرخلوص اور پرکشش شخصیت کا تعارف افسانہ نگار نے اس طرح کرایا ہے۔

> ''ابا کی شخصیت ہی کچھ ایسی من موہنی ہے کہ آپ کینڈل کالونی کا ذکر کریں تو اس کالونی کے چپے چپے پر ابا چھایا ہوا نظر آئے گا۔ گھر گھر میں ابا کی پرچھائیں دکھائی دے گی۔ ''ابا'' کی جو مرکزیت ہے وہ کچھ اس طرح کی ہے کہ ابا کے وجود کو کینڈل کالونی سے ہٹا لیجیے تو اس ساری کالونی کے یقیناً پرخچے اڑ جائیں گے۔ اس کالونی کے حدود میں ایک آدمی دوسرے آدمی کی صورت بھی نہیں پہچانے گا۔'' (۵۳)

ابا کالونی کے مالک تو ہیں لیکن ان کے اور کالونی کے دوسرے مکینوں کے درمیان مالک مکان اور کرائے دار کا رشتہ نہیں ہے۔ ابا کالونی کے تمام مکینوں کے ساتھ اس طرح گھل مل کر رہتے ہیں کہ سب ایک خاندان کے معلوم ہوتے ہیں۔ ابا ان تمام لوگوں پر اپنی محبت نچھاور تو کرتے ہیں لیکن وہ لوگ یہاں تک کہ ان کے رشتہ دار اتنے خود غرض ہوتے ہیں کہ انھیں ابا سے کوئی محبت نہیں ہوتی بلکہ وہ ابا کے مرنے کا انتظار کرتے ہیں اور ان کی نظر صرف ان کی جائداد پر ہوتی ہے۔ ابا اپنے رشتہ داروں کے ڈر سے نیکی بھی نظریں چرا کر کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ جب وہ شدید گرمی کے دنوں میں راوی کی حالت پر ترس کھا کر اسے ٹیبل فین دیتے ہیں تو وہ اس کے ساتھ یہ بھی کہہ جاتے ہیں کہ

> ''کسی سے بتانا مت کہ یہ پنکھا میں نے تمہیں دلایا ہے۔ کیوں نہیں بتاؤں گا۔ یہ تو آپ کی عنایت ہے۔ میں نے اصرار کیا۔ ''میرے لوگ برا مانتے ہیں۔'' وہ مسکرایا۔ پنکھے پر صرف کی ہوئی رقم محفوظ رکھی جاتی تو میرے بعد کل تقسیم میں انھیں کے کام آتی۔ سمجھے کچھ۔'' (۵۴)

ان جملوں کو پڑھ کر قاری کے ذہن کو شدید دھچکا لگتا ہے کہ آج کے زمانے میں نیکی کرنا اور نیک بننا کس قدر مشکل ہو گیا ہے۔ وسیم عباس اس افسانہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''کینڈل کالونی'' بھی ایک عمدہ افسانہ ہے۔ اس افسانہ میں اقبال متین نے ہماری ملاقات آج کے ہوس پرست انسانوں سے کروائی ہے۔ کینڈل کالونی کا واحد مالک ''ابا'' ہے۔ کالونی کے سارے مکین ابا سے فیض یاب

ہوتے ہیں۔ پھر بھی ابا کی درازئ عمر نہیں چاہتے۔ یہاں تک کہ رشتے داروں کی نظر بھی ابا کی دولت اور جائداد پر ہے۔اقبال متین کے تجربات و احساسات کی بہترین تصویر ''کینڈل کالونی'' خودغرضی کے جذبات سے بھرپور ایسا افسانہ میرے پڑھنے میں نہیں آیا۔''(۵۵)

رتن سنگھ لکھتے ہیں:

''کینڈل کالونی کیا ہے؟ ایک چھوٹی سی دنیا ہے اور اس چھوٹی سی دنیا میں رہنے والے باسیوں کی زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات ساری کائنات کو اپنے اندر سموئے ہیں جن کو اقبال متین نے بڑی چابکدستی سے ایک دھاگے میں پرو کر کہانی کی دنیا آباد کر دی ہے۔''(۵۶)

خودغرضی اور مفاد پرستی کی صورت افسانہ ''گٹھری'' میں بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔افسانہ کا مرکزی کردار 'نانم' ہیں۔ وہ ایک معمر خاتون ہیں جو پورے خاندان کے لیے مرکزی حیثیت رکھتی ہیں۔ وہ اچانک بیمار پڑتی اور ہمیشہ کے لیے حواس کھو دیتی ہیں۔ وہ جب ہاسپٹل پہنچائی جاتی ہیں تو شروع شروع میں خاندان کے لوگ ان کی تیمارداری کو آتے ہیں لیکن بہت جلد سب لوگ انھیں چھوڑ کر اپنے گھر کی راہ لیتے ہیں۔ کچھ لوگ ان کی تیمارداری میں اپنے مفاد کے تحت لگے رہتے ہیں۔ منجھلی آپا کو ڈاکٹر کہلانے کا شوق کچھ دنوں تک نانم کی تیمارداری میں مصروف رکھتا ہے۔ 'جونا' نانم کی تیمارداری میں اس لیے لگی رہتی ہے کہ اسے وہاں رومان کی پینگ بڑھانے کا موقع مل جاتا ہے۔اس طرح خودغرضی اور مفاد پرستی کے تحت ہی سارے لوگ نانم کی تیمارداری سے جُڑتے ہیں۔کوئی دل سے ان کی تیمارداری نہیں کرتا۔ نانم کی آخری خواہش تھی کہ وہ اپنی زندگی میں کسی طرح اپنی نواسی جونا کی شادی کرا دے لیکن ان کے بیٹے اپنی ماں کی یہ آخری خواہش پوری بھی نہیں کر پاتے ہیں کہ نانم ہاسپٹل پہنچا دی جاتی ہیں جہاں جونا کو نانم کی تیمارداری کے بہانے لڑکا تو مل جاتا ہے اور اس کی شادی بھی ہو جاتی ہے لیکن نانم کا ارمان پورا نہیں ہو پاتا ہے اور وہ بے بسی اور حسرت کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہوتی ہیں۔ایک زمانہ تھا جب نانم جیسی معمر خاتون ہمارے یہاں شجر سایہ دار کی حیثیت رکھتی تھیں اور ایسی بزرگ خاتون کی خدمت کرنے اور ان کی دلی خواہش پوری کرنے میں بیٹے، بیٹیاں اور رشتہ دار دل و جان سے لگ جاتے تھے لیکن آج کے مادّی ماحول میں ایسی خاتون کے ساتھ بھی وابستگی مفاد پر مبنی ہوتی ہے۔اس طرح یہ افسانہ جدید تہذیبی تناظر

میں انسان کی بے بسی اور مفاد پرستی کو بڑے دلکش انداز میں اُجاگر کرتا ہے۔

افسانہ ''آ گہی کے ویرانے'' میں بھی آج کے معاشرے کے تاریک ترین پہلوؤں کی عکاسی کی گئی ہے۔ یہ ایک تجریدی افسانہ ہے لیکن یہ دوسرے تجریدی افسانوں سے اس اعتبار سے مختلف ہے کہ یہ افسانہ ایک مجموعی تاثر دینے میں کامیاب ہے۔ یہ اقبال متین کا نمائندہ اور شاہکار افسانہ ہے۔ اس میں تہذیبی شکست و ریخت کی عکاسی کی گئی ہے اور بے سمتی کے شکار آج کے معاشرے کو دکھایا گیا ہے۔ اس کی ایک جھلک ملاحظہ ہو:

''ماں باپ دین کے سلطان پر سلام بھیجتے رہے۔ اولادِ عیسیٰ کے ساتھ صلیب پر چڑھتی رہی۔ معاشرے اسی طرح ٹوٹتے ہیں۔ جب لوگوں کے پاس اپنا کچھ نہیں ہوتا۔ مانگے کے ذہن، مانگے کی تہذیب تو نہیں بن سکتے۔ ان کی شکست و ریخت اصلیت سے ٹکرا کر تو ہوتی ہی ہے۔ لیکن اس میں یوں بھی تو ہوتا ہے کہ اصلیت بھی مسخ ہو جاتی ہے۔ یہی سب کچھ اس کی بیوی کے ساتھ بھی ہوا۔ پپا تو اب صرف انگریزی میں پکارے جانے کی حد تک رہ گئے تھے۔ بچے پپا اور ممی کو گڈ مارننگ کر لیتے تو پھر دوسرے دن گڈ مارننگ نہ ہوتی، بقیہ سب کچھ ڈالفن ڈیفل کرتی۔'' (۵۷)

پروفیسر عتیق اللہ اس افسانے کے بارے میں لکھتے ہیں:

''آ گہی کے ویرانے'' ایک مسائلی افسانہ ہے لیکن مجموعی طور پر اسے کسی ایک مسئلہ یا موضوع سے نسبت نہیں ہے۔ بلکہ جدید ہندوستان کے تہذیبی و اخلاقی تناظر میں یہ ان لوگوں کا قصّہ ہے جن کی اپنی راہ واضح نہیں ہے۔ ان کی آ گہی دراصل التباس ہے۔ وہ اپنے آپ کو جتنا اپنے عہد اور اس کے مذاق سے جُڑا ہوا محسوس کرتے ہیں، اتنا ہی داخلی سطح پر ان کے جوڑ کھلے ہوئے اور عہد کی اپنی زمین سے اکھڑے ہوئے ہیں۔'' (۵۸)

عابد سہیل اس افسانہ پر اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں:

''آ گہی کے ویرانے'' کا شمار اقبال متین کے اچھے افسانوں میں کیا جائے گا۔ اپنے قدرتی بہاؤ، بوجھل پن سے عاری زبان، سروکاروں کو پیش نظر میں لانے اور اپنی ترجیحات کا اشارتاً اور کنایتاً اظہار نہ کرنے کے باوجود، کرداروں کے ایک کسک چھوڑ جانے اور متعدد گرہوں کو ''سیر کے واسطے

تھوڑی سی زمیں اور سہی'' کا تاثر دینے کے باوجود افسانہ نگار نے جس
چابکدستی کا مظاہرہ کیا ہے اس کی داد نہ دینا ادبی بددیانتی ہوگی۔'' (۵۹)

افسانہ ''چھگن چاچا'' بھی عہد حاضر کے تناظر میں ایک جاندار افسانہ ہے۔ اس میں حالات کے جبر اور انسان کی بے بسی کو دکھایا گیا ہے۔ چھبیل داس عرف چھگن چاچا ہنس مکھ، کھلنڈرے اور زندہ دل انسان ہیں۔ وہ پورے گاؤں میں جھگڑے چکاتے پھرتے ہیں اور لوگوں کے درمیان میل ملاپ پیدا کرتے ہیں۔ غرض وہ بڑی خوبیوں کے مالک ہیں۔ افسانہ نگار کے لفظوں میں:

> ''چاچا کیا تھے گاؤں والوں کا دل تھے۔ ہمدرد اتنے کہ ہر کسی کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھتے۔ کبھی انھوں نے کسی کی مدد کرنے سے دریغ نہیں کیا بلکہ سچ پوچھیئے تو وہ ایسے وقت کی تلاش میں رہتے کہ انھیں کسی کی خدمت کرنے کا موقع ملے۔'' (۶۰)

چھگن چاچا اچھے اوصاف کے مالک تو ہیں لیکن ان کا مسئلہ یہ ہے کہ ان کی اکلوتی بیٹی مالتی ایک شرابی جواری سے بیاہی گئی ہے۔ وہ بیمار پڑ کر موت کے منہ میں چلی جاتی ہے۔ چاچا کو اس کے علاج کے لیے ایک ہزار روپیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ برج لال بنیے سے قرض مانگتے ہیں لیکن ان کی منت، سماجت کچھ کام نہیں آتی ہے۔ حالات انھیں ایسا مجبور کردیتے ہیں کہ وہ برج لال بنیے کے یہاں نقب لگا کر پندرہ سو روپے حاصل کرتے ہیں اور بیٹی کے پاس چلے جاتے ہیں۔ حالات کا یہی وہ جبر ہے جس کے شکار آج کے عام انسان ہیں۔ اس افسانہ میں حالات کے جبر اور انسان کی بے بسی کو بڑی خوبی سے اُجاگر کیا گیا ہے۔ افسانہ ''میں بھی فسانہ تم بھی کہانی'' بھی آج کی صورت حال کی عکاسی کرتا ہے۔ اس میں آج کے ادیبوں کے دکھ درد اور اردو زبان وادب کو درپیش مسائل کی عکاسی کی گئی ہے۔ مشہور افسانہ نگار عظیم اقبال اس افسانہ کے تعلق سے لکھتے ہیں:

> ''آپ کی حالیہ کہانی ''میں بھی فسانہ تم بھی کہانی'' ایک خوبصورت تخلیق ہے۔ اس میں آج کل کے فنکاروں کے دُکھ کا رنگ بھی ہے۔ اردو زبان و ادب کے مسائل بھی ہیں، دلوں کی کسک بھی ہے، روح کا کرب بھی، آنے والی تابناک صبح کا انتظار بھی، اُمید بھی، یقین بھی۔'' (۶۱)

ان افسانوں کے علاوہ ''یہ کس کی تصویر ہے''، ''کنول اور گندم''، ''جہاں میں ہوں'' اور ''انکشاف''

بھی سماجی مسائل سے متعلق افسانے ہیں۔ مذکورہ تمام افسانوں میں اقبال متین نے تہذیبی وسماجی قدروں کی شکست وریخت، معاشرتی زوال، تہذیبی انتشار، مادیت پرستی، رشتوں کے کھوکھلے پن، انسانی بے حسی، خودغرضی اور مفاد پرستی، حالات کا جبر، سنگدلی اور عام انسانوں کی بےبسی ومجبوری، ان تمام پہلوؤں کی تصویر کشی بڑے دلکش انداز میں کی ہے۔

اقبال متین انسانی نفسیات کا گہرا ادراک رکھتے ہیں۔ انھوں نے انسانی نفسیات کو بھی اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے اور بڑے دلچسپ انداز میں کرداروں کی نفسیاتی گرہ کشائی کی ہے۔ ''اجنبی'' ایسا ہی افسانہ ہے۔ اس میں ایک اسکول ماسٹر کی نفسیات کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ اسکول ماسٹر بڑا محنتی، ذہین، ایماندار، اصول پسند اور اخلاق مند آدمی ہے۔ وہ ایک عہدیدار کے گھر ان کے بچوں کو پڑھانے جاتا ہے۔ جب وہ عہدیدار کے سامنے ہوتا ہے تو اس پر ایسی حالت طاری ہوتی ہے کہ وہ پہچانا نہیں جاتا۔ عہدیدار کے سامنے اس کی حالت ملاحظہ ہو:

> ''بانس کے بدوں کا بنا ہوا کوئی پُتلا قسم کا آدمی۔ بے یارومددگار، مسحور وخائف اس طرح کرسی پر بیٹھ جاتا جیسے کسی نے سر پر ہاتھ رکھ کر اتنی قوت سے دبایا ہو کہ پاؤں جواب دے گئے۔ گلاس پر انگلیوں کی گرفت کچھ اس طرح رہتی جیسے گلاس توڑ کر انگلیاں لال لال شربت خود پی جانا چاہتی ہوں۔ شربت کچھ اس طرح پیتا جیسے جنم جنم کا پیاسا پانی پی رہا ہو۔ اور اس سے پہلے کہ ابا پان لینے کے لیے کہیں ان سے نظریں ملائے بغیر دوہرا ہو کر کورنش بجالاتا۔ پتلی پتلی اکڑی ہوئی انگلیاں جوار کے سوکھے ڈنٹھ کی طرح جیسے ہوا میں جھولتیں۔'' (۶۲)

یہی ماسٹر جب بچوں کے درمیان ہوتا تو وہ ان میں گھل مل جانے اور ان کا دوست نظر آنے کی کوشش کرتا۔

> ''جب وہ کمرے میں داخل ہوا تو جیسے وہ آدمی کوئی اور تھا جو نئے ماسٹر کے ساتھ ساتھ اس کو کمرے تک پہنچانے آیا تھا۔ بالکل اطمینان سے ہم بچّوں میں بیٹھا ہوا ہنس بول رہا ہے، نہایت تمکنت سے کتابیں الٹ پھیر کر دیکھ رہا ہے۔ میٹھی میٹھی باتیں کررہا ہے۔ ''دیکھو بھئی، ہم تمہارے ماسٹر نہیں ہیں، ہم تو دوست ہیں تمہارے۔'' (۶۳)

یہ اسکول ماسٹر بچوں کے سامنے پُرکشش اور بےباک نظر آنے کی کوشش ضرور کرتا لیکن اندر سے یہ

ایسا نہیں ہوتا۔ یہ ماسٹر غریب آدمی ہے اور فرائض کے بوجھ تلے اس کی انفرادیت اور خوداعتمادی کھو چکی ہوتی ہے۔ اس لیے یہ اندر سے کچھ اور ہوتا اور باہر سے کچھ اور نظر آنے کی کوشش کرتا۔ اس کی شخصیت کے ان دونوں پہلوؤں کو اُبھار کر افسانہ نگار نے اس خوبی سے اس کی نفسیاتی گرہ کشائی کی ہے کہ اس کا کردار پوری طرح قاری کے ذہن پر واضح ہو جاتا ہے۔

مشہور فکشن نگار جیلانی بانو اس افسانہ پر اس طرح اظہار خیال کرتی ہیں:

> ''اجنبی'' میں ایک اسکول ٹیچر کا بڑا خوبصورت تجزیہ ملتا ہے۔ ایک ایسا انسان جو فرائض کے انبار تلے خود اپنی انفرادیت کھو چکا ہے۔ ضرورت اور مصلحت نے اس کے اوپر کئی لبادے ڈال دیئے ہیں۔ وہ بچوں کے سامنے تو ایک پُرکشش اور بے باک ماسٹر ہے لیکن ایک اونچی پوزیشن رکھنے والے کے سامنے اسے اپنی اَنا جھٹک کر دوسرا لبادہ اوڑھنا پڑتا ہے۔'' (۶۴)

مشرقی معاشرے میں عام انسانی فطرت ہے کہ جب آدمی بہت زیادہ بیمار رہنے لگتا ہے تو وہ مذہب کا بہت زیادہ سہارا لینے لگتا ہے۔ حد سے بڑھی ہوئی مذہبیت اس کی خوداعتمادی کو ختم کر دیتی ہے اور مسلسل بیمار رہنے کے سبب اس کے اندر چڑ چڑے پن کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ دنیا سے بیزار ہو جاتا ہے۔ افسانہ ''بیمار'' میں اسی نفسیاتی گتھی کو سلجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ 'رام دیال' کسی سرکاری دفتر میں کلرک ہے۔ وہ اپنے کام اور وقت کا بڑا پابند ہے۔ اس کے اندر اور بھی بہت سی خوبیاں ہیں۔ وہ اپنی بیوی اور بھائی سروپ دیال کا بڑا خیال رکھتا ہے۔ اسے مذہبی رسوم سے بڑا لگاؤ ہوتا ہے۔ جب وہ مسلسل بیمار رہنے لگتا ہے تو وہ کٹر مذہبی بن جاتا ہے۔ حد سے بڑھی ہوئی مذہبیت اس کے اندر خوداعتمادی کو ختم کر دیتی ہے۔ مسلسل بیمار رہنے کے سبب اس کے اندر چڑ چڑے پن کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ دنیا سے بیزار ہو کر راہ فرار میں پناہ لیتا ہے۔ دفتر میں اس کی جگہ اس کا بھائی سروپ دیال امیدواری کر کے اپنی بھابی کی پرورش کرتا ہے۔ اس افسانہ میں افسانہ نگار نے مسلسل بیمار رہنے والے رام دیال کی نفسیات کا تجزیہ کر کے اس کی شخصیت کے خارجی و داخلی دونوں روپ کو بڑی خوبصورتی سے اُجاگر کیا ہے۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ لکھتے ہیں:

> ''رام دیال'' بیمار'' ہے۔ دفتر کا کلرک ہے۔ غیر معمولی ذہین اور محنتی ہے لیکن اس نے اپنی خوداعتمادی پر کٹر مذہبیت کے پہرے بٹھا دیئے تھے۔ وہ مسلسل

بیماری سے تنگ آ کر فرار میں پناہ لیتا ہے۔اس کا چھوٹا بھائی سروپ دیال
پڑھائی ترک کر دیتا ہے اور بڑے بھائی کے دفتر میں امیدواری کر کے اپنی
بھابی کی پرورش کرتا ہے۔وہ ''بیمار'' نہیں،اس کی خوداعتمادی زندہ ہے۔اس
نے زندگی کا راز پالیا ہے۔''(٦٥)

''سنگ پشت'' بھی نفسیاتی افسانہ ہے۔اس میں ایک خودغرض،شہرت وناموری کے طلبگار نودولتیے شخص اور ایک غریب، ایماندار اور باحمیت کاتب جو نودولتیے کے جھانسہ میں آ کر اپنا ضمیر بیچ لیتا ہے، کی نفسیات کا تجزیہ کیا گیا ہے۔نودولتیا شخص سرکاری عہدیدار ہے۔ملازمت کے دوران اس کی زندگی بڑی رنگین گزرتی ہے اور دس پانچ لوگ اس کے آگے پیچھے لگے رہتے ہیں۔ریٹائرمنٹ کے بعد اسے شہرت و ناموری کی خواہش ہوتی ہے۔اس کے لیے اسے سب سے آسان ترکیب یہ نظر آتی ہے کہ وہ کسی موضوع پر کتاب لکھ کر لوگوں کے درمیان مشہور ہو جائے۔چنانچہ اسی خواہش کے تحت وہ کتاب لکھتا ہے اور شہر کے مشہور کاتب سے رابطہ کرتا ہے۔کاتب ایک غریب، ایماندار اور باحمیت شخص ہے۔وہ پہلے تو نودولتیے شخص کے پاس جانے سے انکار کر دیتا ہے لیکن پھر اچھے کھانوں، شراب اور بہتر سواری کے لالچ میں وہ اس کی طرف آمادہ ہو جاتا ہے۔کاتب کے شہر کے تمام مشہور ادیبوں سے مراسم ہوتے ہیں۔اس لیے اس کے توسط سے نودولتیا شخص تمام ادیبوں کو اپنے گھر بلا کر خوب سے خوب ضیافت کرتا رہتا ہے۔وہ کاتب کے ذریعے خوبصورت انداز میں اپنی کتاب کی کتابت کرا کر اور چھپوا کر ادیبوں کے درمیان تقسیم کر دیتا ہے لیکن جب کوئی ادیب اس کی تعریف نہیں کرتا ہے تو اسے بڑی مایوسی ہوتی ہے اور وہ اُداس رہنے لگتا ہے۔اس کو غمزدہ دیکھ کر کاتب اس کی جی حضوری کرتے ہوئے اسے ایک ترکیب بتاتا ہے۔وہ کہتا ہے کہ بالکل نئے اور شاندار انداز میں کتاب چھپوائی جائے، پھر تقسیم کی جائے۔یہ ترکیب بھی آزمالی جاتی ہے۔لیکن اس کے باوجود بھی کوئی ادیب کتاب کی تعریف نہیں کرتا ہے تو نودولتیا شخص دلبرداشتہ ہو کر اپنے خول میں بند ہو جاتا ہے اور کاتب سے بے اعتنائی برتنے لگتا ہے۔اس بے اعتنائی کی وجہ سے کاتب کو شدید صدمہ پہنچتا ہے۔اس کا ضمیر پھر سے بیدار ہو کر اسے کچوکے لگاتا ہے اور نودولتیے شخص کے جھانسے میں آنے پر اسے بڑا افسوس ہوتا ہے۔اسے بے تحاشا اپنا ماضی یاد آنے لگتا ہے۔ماضی یاد آتے ہی وہ اپنی پرانی پھٹیچر جالی دار سائیکل کو صبح صبح ٹٹولنے لگتا ہے۔اسے ایسا کرتے ہوئے دیکھ کر اس کی بیٹیاں اسے

دیوانہ سمجھنے لگتی ہیں اور اسی دردناک حالت میں اس کی موت ہوتی ہے۔اس افسانہ میں شہرت و ناموری کے طلبگار نودولتیے شخص اور اس کے اچھے کھانوں اور شراب کے لالچ میں آ کر ضمیر بیچنے والے ایک غریب، ایماندار اور خوددار شخص کی نفسیاتی گرہ کشائی بڑے دلچسپ انداز میں کی گئی ہے۔

''کھڑکیاں''میں ایک نوجوان لڑکی کی نفسیاتی کیفیت پیش کی گئی ہے جو پہلی بار گاؤں سے کسی بڑے شہر میں آئی ہے اور وہ اس شہر کی زندگی کے ایک نئے تجربے سے گزرتی ہے۔ وہ اپنی نانی کے ساتھ بازار گھومنے جاتی ہے جہاں ایک نوجوان کی نگاہیں مسلسل اس کا تعاقب کرتی ہیں۔ان تعاقب کرنے والی نگاہوں سے وہ بظاہر ڈرتی ہے مگر بباطن اس کے اندر رومان اور چاہت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور وہ ان نگاہوں میں ڈوب جانا چاہتی ہے۔

> ''ایک پُل ہے اور میں بیچ پل پر تنہا کھڑی ہوں۔ نیچے ٹھاٹھیں مارتا ہوا پانی ہے پھر دیکھتے کے دیکھتے یہ پانی ساکن ہوجاتا ہے۔ پھر جیسے منجمد ہوجاتا ہے۔ پھر سب غائب ہوجاتا ہے اور دو بڑی بڑی آنکھیں اس منجمد پانی کی جگہ رُک جاتی ہیں۔ یہ بہت بڑی آنکھیں ہیں۔ پُل پر کھڑی میں جھک کر دیکھ رہی ہوں۔ سوچ رہی ہوں کہ ان آنکھوں میں کود پڑوں۔ لیکن یہ آنکھیں ڈبڈبانے لگی ہیں۔ پھر آنسو اُمڈ اُمڈ کر آنکھوں میں بھر جاتے ہیں۔ پھر آہستہ سے آنکھیں کہیں غائب ہوجاتی ہیں اور ساکن پانی پُل کے نیچے اپنی گہرائی کو چھپاتا ہوا تاحدِ نظر پھیل جاتا ہے۔ یکا یک پُل میرے پیروں کے نیچے سے کھسکنے لگتا ہے۔ کچھ ہلچل سی محسوس ہوتی ہے اور مجھے کچھ سُجھائی نہیں دیتا۔ پھر لمحے بھر کے لیے مجھے میڈیکل کالج کی عمارت دکھائی دیتی ہے، جس کا ایک بڑا حصہ منہدم ہوگیا ہے۔ پھر وہ پُل جس پر میں کھڑی ہوں ٹوٹ ٹوٹ کر پانی میں گرنے لگتا ہے اور میں چیخ مار کر پانی میں کود پڑتی ہوں۔ عین اس وقت یہ پانی آنکھیں بن جاتا ہے۔''(۶۶)

اس افسانہ میں ایک نوجوان لڑکی کے اندر جنم لینے والے رومان و چاہت کے جذبوں کی نفسیات کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ پروفیسر عتیق اللہ اس افسانہ پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''اقبال متین نے ایک نوجوان لڑکی کی ذہنی رو کو بڑی خوبی سے اخذ کرنے کی سعی کی ہے۔لڑکی کے تعاقب کرنے والی آنکھیں کسی پناہ گاہ سے کم نہیں ہیں، جو زندگی سے معمور ہیں، زندگی سے پر ہیں، زندگی بخش ہیں۔ محض باہر

کا جبر یگانگت کی راہ میں حائل ہے جس کے باعث بار بار اس کے اندر خوف کی کونپلیں پھوٹنے لگتی ہیں۔ نانی کا چہرہ، پُل یعنی جوڑنے والے سارے راستے علم مہیا کرنے والی منہدم دانش گاہ سب جھوٹے ہیں۔ وہ آنکھیں ہی اس کے لیے سب سے سچ ہیں جو اس کے سارے وجود پر محیط ہونا چاہتی ہیں۔ کھڑکیاں محض کھڑکیاں نہیں ہیں بلکہ اس جیل خانے جیسے فلیٹ میں زندگی کے علامتی سراغ ہیں۔ اگر یہ علامتی سراغ بھی نہ ہوں تو وہ آنکھیں بھی نہ ہوں اور آنکھیں نہ ہوں تو زندگی محض ایک ڈراؤنا خواب بن کر رہ جائے۔'' (۶۷)

افسانہ ''سانپوں کی پٹاری'' میں ایک ابنارمل لڑکی کی نفسیاتی حالت دکھائی گئی ہے۔ ایک سکھ لڑکی ہے جو بے حد ذہین اور خوبصورت ہے۔ وہ کلاس میں ہمیشہ اول آتی ہے۔ ایک مرتبہ سونے کی حالت میں اس کا بھائی مذاقاً اسے نقلی ڈاڑھی اور مونچھ لگا دیتا ہے۔ جب وہ بیدار ہو کر آئینہ میں اپنی شکل دیکھتی ہے تو ڈر جاتی ہے۔ یہ ڈر اس کے ذہن پر بیٹھ جاتا ہے۔ دوسری مرتبہ وہ لڑکی کسی نقلی ڈاڑھی بیچنے والے کو ڈاڑھی بیچتے ہوئے دیکھتی ہے تو ڈاڑھی کا خوف اس کے ذہن و دماغ پر اس طرح مسلط ہو جاتا ہے کہ وہ لڑکی ابنارمل ہو جاتی ہے اور ابنارمل حرکتیں کرنے لگتی ہے۔ افسانہ ''مہمان'' بھی نفسیات ہی سے متعلق افسانہ ہے۔ انسان چاہے مرد ہو یا عورت، اس کے اندر فطری طور پر اولاد کی خواہش ہوتی ہے۔ اگر یہ خواہش پوری نہ ہو تو اس کے اندر نفسیاتی محرومی جنم لیتی ہے۔ اسی نفسیاتی محرومی کو اس افسانہ میں دکھایا گیا ہے۔

اقبال متین نے اپنے افسانوں میں عورتوں کی نفسیاتی کیفیات اور اس کے مسائل کو بھی موضوع بحث بنایا ہے۔ ایسے افسانوں میں ''ایک خط یادوں کے نام''، ''ماں''، ''مورنی'' اور ''رابی اپیا'' وغیرہ ہیں۔ ''ایک خط یادوں کے نام'' میں ایک بیاہتا عورت کی نفسیاتی کیفیت پیش کی گئی ہے۔ ہمارے یہاں بیاہتا عورت اپنے شوہر اور بچوں کے درمیان اس طرح گھر جاتی ہے کہ اس کا وجود کہیں گم ہو جاتا ہے اور وہ خود اپنے لیے کچھ نہیں رہ جاتی ہے۔ وہ سب پر محبت نچھاور کرتی ہے اور اپنے وجود کی قربانی دے کر گھر بساتی ہے لیکن اس کے نازک جذبات و احساسات کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ دیکھیے درج ذیل اقتباس میں بیاہتا عورت کی نفسیات کی کتنی گتھیاں سلجھا دی گئی ہیں:

''میں کبھی کبھی سوچتی ہوں ذِکّی کہ اپنی ہستی کو اُڑتے ہوئے بادل کی طرح بنا

لینا ہی شاید عورت پن ہے۔ پودوں کی دُھوپ جھلس رہی ہو تو سایہ بن گئے
اور اگر ان کی جڑیں سُوکھ رہی ہوں تو برس پڑے۔ اب اس برسنے میں یہ
تخصیص تو ممکن نہیں نا کہ کس ننھے پودے کی قسمت میں کتنا جل آ گیا ہے اور
کس تناور درخت کے حصّے میں کتنا پانی۔'' (۶۸)

افسانہ ''ماں'' میں مامتا کے جذبہ کی عکاسی کی گئی ہے۔ ڈاکٹر شہلا مامتا کے جذبہ سے سرشار ہے۔ اسے اولاد کی بڑی چاہت ہوتی ہے لیکن اپنے منگیتر باسط الطاف سے اس کی ذہنی ہم آہنگی نہیں ہے۔ اولاد کی چاہت میں وہ اپنی کلینک کے معاون سے ناجائز جنسی تعلق قائم کرتی ہے اور حاملہ ہو جاتی ہے۔ وہ ڈاکٹر ہونے کے باوجود اپنے حمل کو ساقط نہیں کرتی ہے۔ وہ بڑی آرزوؤں سے اپنے پیٹ میں بچے کی پرورش تو کرتی ہے لیکن ایک وقت ایسا آتا ہے جب سماجی دباؤ کے تحت وہ اپنی مامتا کے جذبہ کا گلا گھونٹ دیتی ہے۔ مامتا اور اولاد کی چاہت کے جذبہ کو افسانہ ''مورنی'' میں بھی دکھایا گیا ہے۔ یہ افسانہ فنی اعتبار سے اس لیے کمزور ہے کہ اس میں غیر ضروری واقعات راہ پا گئے ہیں۔ افسانہ کا مرکزی کردار مورنی کوئی آٹھ سال سے بانجھ ہے۔ اسے اولاد کی بڑی چاہت ہے لیکن اپنے شوہر سے اسے بچہ ہونے کی کوئی امید نہیں ہے۔ اس لیے وہ اپنی مامتا کے جذبہ کی تکمیل کے لیے ایک لڑکے سے ناجائز جنسی تعلق قائم کرتی ہے۔ دیکھئے درج ذیل مکالمے اس کے اندر موجود مامتا کے جذبہ کی عکاسی کس طرح کرتے ہیں:

''آنسو تم مردوں کی سمجھ میں نہیں آتے۔ بس یہی بات ہے نا؟''
مجھے بچّہ چاہیے۔ میرا آنگن سونا ہے اور اسی لیے تو میں اپنے بچّے کی تلاش میں
یہاں تک چلی آئی ہوں کہ تمہارا ہاتھ تھام کر آگے بڑھ سکوں۔ زندگی ویسے
بھی گزر سکتی تھی۔ بنجر دھرتی کا رکھوالا اگر اس کے بنجر ہونے پر ہی خوش ہو تو
دھرتی کا کیا جاتا ہے، لیکن عورت شاید تخلیق کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ بیوی
اور بہن پکاری جانے والی تمہاری مورنی کوئی آٹھ سال سے ماں پکارے
جانے کے لیے ترس رہی ہے۔'' (۶۹)

مورنی کو جب ناجائز جنسی تعلق کے نتیجہ میں بچہ ہو جاتا ہے تو اسے اپنے وجود کی تکمیل اور دلی سکون کا احساس ہوتا ہے۔ افسانہ ''رابی اپیا'' بھی مامتا کے جذبہ کی عکاسی کرتا ہے۔ 'رابی اپیا' ایک خوبصورت بچی کو جنم دے کر ٹی بی کی مریض ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے ہی گھر میں اپنی بچی سے الگ تھلگ

رہنے پر مجبور ہوتی ہے۔ اپنی بچی سے الگ تھلگ رہنے میں اس کی ماںتا اس طرح مجروح ہوتی ہے کہ اس کا سراپا وجود درد ہی درد معلوم ہوتا ہے۔ افسانہ ''ایک پھول ایک تتلی'' میں عورت کی ذاتی محرومی اور اس کے اندر موجود محبت و انسانیت کے جذبہ کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ رضیہ چچی خود تو اولاد کی نعمت سے محروم ہے لیکن وہ اس محرومی کا ازالہ اس طرح کرتی ہے کہ خاندان کے تمام لوگوں سے وہ ٹوٹ کر محبت کرتی ہے۔ وہ ہر ایک کے دکھ درد کو اپنا درد سمجھتی ہے اور ہر ایک کی مصیبت میں کام آتی ہے۔ یہ اس کی زندگی کا مشن بن جاتا ہے۔ افسانہ ''شیبا'' میں عورت کے اندر موجود رفاقت و محبت کے جذبہ اور اس کے ساتھ ہوئی بے حرمتی کو دکھایا گیا ہے۔ افسانہ کا مرکزی کردار 'شیبا' ہے۔ وہ دوسری جنگ عظیم کے موقع پر گرفتار کر لی جاتی ہے۔ وہ جنگی محاذ پر کیپٹن مسعود الزماں زیدی کو اس وقت ملتی اور اسے سہارا دیتی ہے جب کیپٹن کی زندگی اُداسیوں میں گھری ہوئی ہوتی ہے۔ شیبا خوبصورت لیکن بے زبان اور بہت ہی وفادار ہوتی ہے۔ اپنی وفاداری سے وہ کیپٹن مسعود الزماں کے دل میں گھر کر لیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب انگریز میجر شیبا کا جنسی استحصال اور اس کی بے حرمتی کرتا ہے تو کیپٹن مسعود الزماں اس سے بھڑ جاتا ہے۔ شیبا کیپٹن مسعود الزماں سے جذباتی طور پر اس طرح جُڑ جاتی ہے کہ وہ اس سے الگ ہونا نہیں چاہتی ہے لیکن انگریز میجر کی غلط نگاہ مسلسل اس کے تعاقب میں رہتی ہے۔ وہ موقع ملتے ہی اسے زبردستی اپنے کیمپ اُٹھا لاتا ہے اور اس سے جنسی خواہش پوری کرنا چاہتا ہے۔ شیبا سخت مزاحمت کرتی ہے۔ اس مزاحمت پر انگریز میجر اس کے ساتھ درندگی سے پیش آتا ہے اور اسے زخمی کر دیتا ہے۔ یہی انگریز میجر جب جاپانیوں کے ہاتھوں گرفتار ہوتا ہے اور اسے شیبا موت سے بدتر زخمی حالت میں ملتی ہے تو وہ اپنے عمل پر شرمندہ ہوتا ہے اور شیبا کے ساتھ محبت و انسانیت سے پیش آتا ہے۔ شیبا زخموں سے اس قدر نڈھال ہو جاتی ہے کہ اس کی ناقابل برداشت حالت دیکھنے کے لائق نہیں رہ جاتی۔ اس لیے مسعود جلدی سے ایک جاپانی کی کمر سے پسٹل نکال کر اس کی ساری گولیاں شیبا کے سینے میں داغ دیتا ہے۔ شیبا تو مر جاتی ہے لیکن اپنی وفاداری، خلوص اور انسانیت و محبت کے جذبہ کی وجہ سے کیپٹن مسعود الزماں زیدی اور قاری دونوں کے دل و دماغ پر ہمیشہ کے لیے چھا جاتی ہے۔ نور الحسنین اس افسانہ پر اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں:

''ان کا ایک اور افسانہ ''شیبا'' موضوع کے لحاظ سے نہایت اچھوتا افسانہ

ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اردو ادب میں اس قسم کے افسانے نہیں کے برابر
ہیں تو غلط نہ ہوگا۔ دوسری عالمی جنگ کے پس منظر میں لکھا گیا یہ افسانہ
انسانوں کی حیوانی جبلت، اور حیوانوں کی انسانی صفات کا ایک مرقع بن گیا
جہاں انسان بھی اپنے استحصال پر خود شرمندہ نظر آتا ہے۔''(۷۰)

ان افسانوں کے علاوہ ''رات کے راہی''، ''جنگ کے بعد''، ''پانچویں عورت اٹھارواں مرد''، ''سہارے''، ''غلاف''، ''بہروپ''، اور ''ادھورا سوئٹر'' بھی عورتوں سے متعلق افسانے ہیں۔ ''رات کے راہی'' میں عورت کی جنسی تشنگی ''جنگ کے بعد'' اور ''پانچویں عورت اٹھارواں مرد'' میں بیوگی اور ''سہارے'' اور ''غلاف'' میں طوائف کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ''بہروپ'' میں عورت کے مکر و فریب کو اُجاگر کیا گیا ہے اور ''ادھورا سوئٹر'' میں پتی ورتا کے جذبہ کو دکھایا گیا ہے۔ مذکورہ تمام افسانوں میں افسانہ نگار اقبال متین نے عورتوں کے مختلف روپ کو پیش کیا ہے اور ان کے نازک جذبات و احساسات، آرزوؤں، امنگوں، مجبوریوں، محرومیوں اور دکھ درد کو اس سلیقہ سے پیش کیا ہے کہ اس موضوع پر بھی ان کی مضبوط گرفت کا پتہ چلتا ہے۔

اردو میں رقابت کے جذبہ کو موضوع بنا کر بہت سے افسانے لکھے گئے ہیں۔ اقبال متین نے بھی اس موضوع پر افسانہ لکھا ہے لیکن انھوں نے اس موضوع کو نئے اور دلکش انداز میں برتا ہے۔ اس موضوع پر ان کا مشہور و معروف افسانہ ''گریویارڈ'' ہے۔ اس میں ہارڈنگ کی اینی سے محبت اور بروج سے اس کی رقابت کے جذبہ کو دکھایا گیا ہے۔ ہارڈنگ ایک لاابالی فطرت کا نوجوان ہے۔ وہ اینی سے محبت کرتا ہے۔ جب اسے پتہ چلتا ہے کہ اینی کی شادی بروج سے ہو چکی ہے تو اس کے اندر رقابت کا جذبہ جنم لیتا ہے۔ چنانچہ وہ ''کوالٹی'' سے نکل کر اپنے ساتھ موٹر بائیک پر بروج کو بٹھاتا ہے اور اتنی تیز رفتاری سے موٹر بائیک چلاتا ہے کہ ہوا سے باتیں کرتی ہوئی اس کی موٹر بائیک حادثے کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس طرح رقابت کا جذبہ دونوں کو ختم کر دیتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے برابر دفن کر دیے جاتے ہیں اور اینی بیہوشی کے عالم میں ہاسپٹل میں داخل کی جاتی ہے۔ اینی جب ٹھیک ہو جاتی ہے تو وہ بروج کی یاد میں اس کی قبر پہ جاتی ہے لیکن بروج کی قبر سمجھ کر وہ ہارڈنگ کی قبر پہ کھڑی نظر آتی ہے۔ یہاں پہ افسانہ کا اختتام ہوتا ہے۔ یہ افسانہ رومانی انداز میں لیکن درد و غم میں ڈوب کر لکھا گیا ہے۔ افسانہ کا پس منظر ایک

عیسائی قبرستان ہے جہاں قبروں پر پھول پڑے ہوئے ہیں اور اس کے اردگرد موم بتیاں جل رہی ہیں۔ قبرستان میں روشنی تو ہے لیکن اس کی فضا غمگین اور درد انگیز ہے۔اس فضا کی تصویر کشی اس دلچسپ انداز میں کی گئی ہے کہ قاری اس افسردہ ماحول میں پہنچ جاتا ہے۔اس افسانہ کا انداز بیان بہت دلچسپ ہے جو شروع ہوتے ہی قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور آخر تک اپنے سحر سے نکلنے نہیں دیتا ہے۔رتن سنگھ اس افسانہ پر اپنے تاثرات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

> ''یہ کہانی نثر میں لکھا ہوا ایسا مرثیہ ہے کہ دل کرتا ہے کہ اقبال متین کو کہانی کا میر تقی میر کہہ کر پکاروں۔ درد بھرے احساسات کی اس کہانی کو تھوڑے سے الفاظ میں بیان کرنا بہت مشکل کام ہے۔''(۷۱)

ڈاکٹر وحید اختر اس افسانہ کے تعلق سے لکھتے ہیں:

> ''ان کا ایک افسانہ ''گریویارڈ'' جذبے کی وہ کیفیت رکھتا ہے جو ضبط و توازن کے ساتھ جذبے کو غیر شخصی بنا کر اسے فکر کی نوک پلک عطا کر دیتا ہے۔ اس افسانے کا اسلوب رومانی ہے۔ اور اس میں تغزل LYRICISM کی وہ فضا ہے جو ترگنیف کی عشقیہ کہانیوں کی یاد دلاتی ہے۔''(۷۲)

افسانہ ''پس پردہ'' بھی اسی موضوع پر ہے جو تمثیلی انداز میں لکھا گیا ہے۔

اردو افسانہ کا ایک اہم موضوع فرقہ وارانہ فساد رہا ہے۔ ہمارے ملک میں آئے دن مذہب اور ذات پات کے نام پر فسادات ہوتے رہتے ہیں۔فسادات ہمارے ملک کے لیے اتنا سنگین مسئلہ بن چکے ہیں کہ اس سے نظریں پھیر لینا ممکن نہیں۔فسادات کو موضوع بحث بنا کر ہمارے بہت سے افسانہ نگاروں نے افسانے لکھے ہیں جن میں بہت سے افسانے فنی اعتبار سے معیاری بھی ہیں اور کچھ کمزور بھی۔اس موضوع پر اردو میں اتنے افسانے لکھے گئے ہیں کہ یہ موضوع تقریباً پامال ہو گیا اور یہ محسوس کیا جانے لگا کہ اب اس موضوع پر لکھنے کے امکانات سلب ہو چکے ہیں۔ جب کہ ایسا نہیں ہے کیوں کہ فسادات آج بھی ہو رہے ہیں اور جب فسادات کا سلسلہ جاری ہے تو لازمی ہے کہ اس پر افسانے بھی لکھے جائیں گے اور لکھے بھی جا رہے ہیں۔فسادات کے موضوع پر آج جو افسانے لکھے جا رہے ہیں، ان کی نوعیت پہلے کے افسانوں سے مختلف ہے۔ پہلے کے افسانوں میں فساد کی صرف ہولناکیوں کا ذکر ہوتا تھا لیکن آج

فساد سے پیدا ہونے والی صورت حال کو موضوع بنایا جاتا ہے۔

اقبال متین نے بھی فساد کے موضوع پر افسانے لکھے ہیں۔اس موضوع پر ''شہر آشوب'' ان کا مشہور اور کامیاب افسانہ ہے۔ اس میں افسانہ نگار نے متوسط طبقہ کے ایک مسلم خاندان کی زندگی کو تاراج ہوتے اور ایک شہر کو اُجڑتے دکھایا ہے۔افسانہ کا مرکزی کردار ایک بچہ ہے۔اس کے ایک رشتہ دار کے گھر شادی کی تقریب ہے جس کی وجہ سے وہاں بڑی چہل پہل، گہما گہمی ہے، پرلطف انتظام ہے اور مسرت و شادمانی کا ماحول ہے۔ اچانک شہر میں فساد پھوٹ پڑتا ہے اور یہ پررونق محفل ماتم میں تبدیل ہو جاتی ہے، کچھ لوگ زخمی ہوتے ہیں، کچھ مر جاتے ہیں اور پورا گھر اجڑ جاتا ہے۔ اس فساد میں شہر کے مختلف حصوں میں دوسرے لوگ بھی مارے جاتے ہیں اور وہ منی بھی اپنے والدین کے ساتھ ماری جاتی ہے جس سے (مرکزی کردار) راوی کو بے حد لگاؤ اور انسیت ہے۔ راوی کو فساد میں منی سے بچھڑنے کا بڑا غم ہوتا ہے۔فساد شروع ہوتے ہی شہر میں لوگوں پر ایسا مذہبی جنون طاری ہوتا ہے کہ لوگ ایک دوسرے کی جان کے درپے ہو جاتے ہیں اور قتل و خون کا منظر شروع ہو جاتا ہے۔اس منظر کی تصویر کشی افسانہ نگار کے لفظوں میں ملاحظہ ہو:

> ''سسک کر جینے والی زندگیاں سہی نہیں جاتیں۔ اخباروں میں کچھ نہیں ہے، صرف خون خرابے ہیں۔ انسان کی زندگی کا ننگا رقص پردوں کے پیچھے چھپا چھپا کر دکھایا گیا ہے۔ ہنستے ہنستے چیخ مار کر زمین پر منٹ دو منٹ کے لیے تڑپنا اور ڈھیر ہو جانا۔ پڑھا نہیں جاتا۔ دیکھا کس طرح جاتا ہوگا۔ کیا وہ آدمی ہی ہوں گے جو آدمی کو خنجر مار دیتے ہیں۔''(۷۳)

فساد کے بعد شہر میں کرفیو لگا دیا جاتا ہے تاکہ بگڑے حالات کو معمول پر لایا جاسکے اور امن و امان کی بحالی ہو سکے مگر اس کے برعکس کرفیو میں عام انسانوں کی زندگی مزید غیر محفوظ ہو جاتی ہے اور قتل و غارت گری کا وہ بہیمانہ کھیل کھیلا جاتا ہے کہ انسانیت شرمسار ہو جاتی ہے۔ کرفیو کے بعد کی یہ صورت حال افسانہ نگار کی زبانی ملاحظ ہو:

> ''باہر لگے کرفیو میں زندگی اپنی حفاظت کے تصور کے باوجود کس درجہ بے آرام ہے۔ ساری آدمیت چوہے کی طرح بلوں میں دبکی بیٹھی ہے۔ چھپے ہوئے خنجروں نے جنہیں کاٹ دیا ہے۔ تھوڑی سی دیر میں وہ تباہی مچی ہے

کہ آدمی کی درندگی پر شرم آنے لگی ہے۔ غذا مہنگی ہے، خون ارزاں ہے،
انسانی خون گلی کوچوں میں ضائع ہوسکتا ہے لیکن گیہوں کے دانے کے لیے
بچے بلک رہے ہیں۔'' (۷۴)

فساد شروع ہونے کے بعد شہر میں خون کی ہولی کھیلی جاتی ہے، اقلیتی فرقے کے مکانوں اور دکانوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر آگ لگائی جاتی ہے اور پورے شہر میں ایسی تباہی مچتی ہے کہ انسانیت کانپ اُٹھتی ہے۔ لوگوں کا مارے غم کے اتنا برا حال ہوتا ہے کہ ان کی آنکھوں میں رونے کے لیے آنسو تک نہیں بچتے۔ اس افسانہ میں افسانہ نگار نے فسادات کی تباہ کاریوں اور معصوم لوگوں کی ہلاکت کا ذکر بڑے دردانگیز پیرائے میں کیا ہے اور فساد کی وجہ سے پیدا المناک انسانی صورت حال کی عکاسی اس طرح کی ہے کہ آج کے دور میں منصوبہ بند طریقے سے کرائے جانے والے فسادات اور اس میں ہونے والی بربادیوں کا پورا منظر نگاہوں کے سامنے زندہ ہوجاتا ہے۔ فضیل جعفری اس افسانہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

''شہر آشوب'' فرقہ وارانہ تشدد اور فسادات کے پس منظر میں ہی لکھا گیا
ہے۔ وحدت تاثر کے اعتبار سے یہ ایک نہایت ہی کامیاب اور دل کی
گہرائیوں میں اتر کر چوٹ کرتا ہے۔ یہ ایک ایسے مصیبت زدہ اور پوری
طرح برباد کردیے جانے والے شہر کی کہانی ہے جس کے مکینوں کے چہروں
سے مسکراہٹ ہی نہیں چھین لی گئی بلکہ جن کی آنکھوں میں رونے کے لیے
آنسو تک نہیں بچے۔ کہیں کوئی ایسی شئے نہیں رہ گئی جسے دیکھ کر یا محسوس
کر کے لمحے بھر کے لیے بھی خوش ہوا جاسکے۔'' (۷۵)

وسیم عباس اس افسانہ پر اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں:

''شہر آشوب'' یہ کہانی بھی آج کے معاشرے کی عکاسی کرتی ہے۔ سارے
کردار جیتے جاگتے نظر آتے ہیں۔ فساد پر کئی کہانیاں لکھی گئی ہیں۔ اس
موضوع پر سعادت حسن منٹو کی لکھی گئی کہانیاں بھلائی نہیں جاسکتیں۔ لیکن
اقبال متین کا اسلوبِ بیان منٹو سے جدا ہے۔ وہ ایک الگ رنگ لئے ہوئے
ہے۔ ان کے قلم سے نکلا ہوا ہر جملہ ہمیں غور وفکر کی دعوت دیتا ہے۔'' (۷٦)

افسانہ ''اونچ نیچ'' بھی فساد ہی کے موضوع پر ہے۔ اس میں بھی فرقہ وارانہ فساد سے پیدا ہونے والی صورت حال کو دکھایا گیا ہے۔ افسانہ میں دو خواتین کردار ہیں۔ گھر کی اعلی تعلیم یافتہ مالکن اور اس کی

ملازمہ شہزادی بیگم۔ دونوں، شہر میں مذہب کے نام پر پھوٹ پڑنے والے فساد کی وجہ سے بے حد مغموم ہیں۔ گھر کی اعلیٰ تعلیم یافتہ مالکن فرقہ وارانہ فساد سے متاثر ہو کر سوچنے لگتی ہیں:

''اس وقت دنیا بھر میں خود کو تسلیم کروا لینے والے عظیم اور بے ریا آرٹسٹ ایم ایف حسین کی پینٹنگس کے ساتھ احمد آباد میں کئے گئے غیر انسانی سلوک کی داستاں پڑھتے ہوئے محسوس کر رہی تھی کہ افغانستان کی طالبانی بنیاد پرستی میرے وطن میں تو بہت پہلے ہی روپ بدل کر داخل ہو چکی ہے۔'' (۷۷)

دل کو کتنا جھنجھوڑ دینے والا اقتباس ہے جسے پڑھ کر ہندوستان جیسے ملک کی نفرت آمیز فرقہ وارانہ صورت حال کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہے۔ اس فرقہ وارانہ صورت حال کی ایک اور جھلک ملاحظہ ہو۔ ملازمہ شہزادی بیگم اپنی مالکن سے مخاطب ہو کر کہتی ہے۔

''کچھ سنا بی بی آپ نے؟''

انسان جانور سے بدتر کوئی مخلوق ہو گیا ہے۔''

کوئی سیکل پر جا رہا تھا۔ روکا، بڑے چاؤ سے نام پوچھا، چاقو لگا دیا۔''

کوئی غریب کسی سنیما ہال کا ملازم تھا۔ سنا کہ اپنی ہی دنیا میں مست کھڑا دیوار پر پوسٹر چپکا رہا تھا۔ پہناوا دیکھا اور چھرا گھونپ دیا پیچھے سے۔'' (۷۸)

اس اقتباس کو پڑھ کر بھی آج ہمارے ملک کے تشدد آمیز فرقہ وارانہ ماحول، مذہبی جنون اور حیوانیت و درندگی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ملازمہ شہزادی بیگم ایک دن اپنی مالکن کے گھر بہت زیادہ مغموم دکھائی دیتی ہے۔ پوچھنے پر پتہ چلتا ہے کہ اس کا شوہر دلاور خاں بھی فساد کا شکار ہو گیا ہے۔ حالاں کہ دلاور خاں بہت ہی ملنسار اور مخلص قسم کا انسان ہے۔ وہ گاؤں میں بے حد مقبول ہے۔ لوگ اس کے فیصلہ کو دل سے مانتے ہیں۔ ایسا شخص کسی پارٹی کی طرف سے کسی زمین کا تصفیہ کرنے جاتا ہے اور اسی دوران مذہب کے نام پر اس پر جان لیوا حملہ ہوتا ہے۔ اپنے شوہر کے زخمی ہونے کی وجہ سے شہزادی بہت رنجیدہ رہتی ہے۔ وہ اپنی مالکن سے کچھ دنوں کے لیے چھٹی مانگنا اور اس کے تحفظ میں اپنی جوان بیٹی کو رکھنا چاہتی ہے۔ جب وہ اپنی مالکن سے مخاطب ہو کر کہتی ہے۔ ''یہ مذہب نہیں ہے بی بی۔ یہ ہرگز کوئی مذہب نہیں ہے۔'' تو ان جملوں کو سن کر قاری کی نگاہوں کے سامنے آج کے مذہبی جنون اور مذہب کے نام پر پھیلائے گئے فرقہ وارانہ فساد کا پورا نقشہ آجاتا ہے۔ اس افسانہ میں بھی افسانہ نگار نے نفرت آمیز ماحول اور فرقہ وارانہ

صورت حال کی عکاسی خوبی سے کی ہے۔ پروفیسر قمر رئیس ان دونوں افسانوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''شہر آشوب' اور 'اونچ نیچ' جیسی کہانیوں میں فساد کی بہیمیت، دہشت اور قتل وخون سے پیدا ہونے والا کرب، قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ اس لیے کہ یہ ایسی آگ ہے جس میں سارے مہکتے ہوئے جذبے اور معصوم انسانی رشتے جل کر بھسم ہو جاتے ہیں۔'' (۷۹)

اقبال متین کا افسانہ ''گھونگھٹ میں خون'' بھی فساد ہی کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ اس میں خونیں آزادی کو طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں جب ملک آزاد ہوا تو اس کے ساتھ ہی مذہب کے نام پر دو ملکوں کا بٹوارہ ہوا۔ اس کی وجہ سے پورے برصغیر میں نفرت وتشدّد کی لہر دوڑ گئی۔ بڑے پیمانے پر فرقہ وارانہ فسادات ہوئے اور قتل و غارت گری کا ایسا بازار گرم ہوا کہ انسانیت ومحبت شرمسار ہو گئی۔ آزادی کے بعد کی اس المناک صورت حال اور نفرت آمیز ماحول کی تصویر کشی افسانہ نگار نے اس طرح کی ہے۔

> ''سنو سنو۔ آج انسانیت کے سارے پُرخلوص جذبے مذہب کی اٹوٹ تاریکیوں میں چھپ گئے ہیں۔ کوئی رام نہیں، کوئی مریم نہیں۔ کوئی کاکا نہیں۔ کوئی ہندو ہے۔ کوئی مسلم ہے۔ محبت کہاں ہے۔ مامتا کہاں ہے۔ صرف خون۔ صرف لہو۔ خون، خون، لہولہو، بھاگو بھاگو۔ آزادی آرہی ہے۔ آزادی۔ بھاگو۔ خون لہو۔'' (۸۰)

اس اقتباس میں افسانہ نگار نے آزادی پر کتنا گہرا طنز کیا ہے کہ آزادی تو ملی مگر خون میں لت پت جس کا لوگوں نے تصور تک نہیں کیا تھا۔ لوگوں نے تو خوشحال آزادی کا خواب دیکھا تھا، اس سے بڑی توقعات وابستہ کی تھیں اور قربانیاں دے کر بڑی آرزوؤں سے آزادی حاصل کی تھی لیکن جب خون میں لت پت آزادی ملی تو لوگوں کے سارے خواب چکنا چور ہو گئے اور ان کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ ان تمام پہلوؤں کو افسانہ میں اجاگر کیا گیا ہے۔ اس افسانہ کو پڑھ کر فیض احمد فیض کا یہ مشہور زمانہ شعر یاد آنے لگتا ہے۔

یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں

اقبال متین نے آزادی کے بعد کے سیاسی حالات و واقعات کو موضوع بحث بنا کر چند اور افسانے

لکھے ہیں۔ ایسے افسانوں میں ''آخری رات''، ''سچی دنیا کھوٹے سکے''، ''آواز کا انتظار''، ''بہادر'' اور ''پل صراط'' ہیں۔ ''آخری رات'' میں آندھرا پردیش کے علاقوں میں بائیں بازو کی عوامی تحریک سے وابستہ لوگوں کو نظام حکومت اور پٹیلوں کے استحصالی جاگیردارانہ نظام سے عام لوگوں کو نجات دلانے کے لیے جدوجہد کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ اس میں نام نہاد جمہوری نظام پر طنز کرتے ہوئے اس بات کو بھی اجاگر کیا گیا ہے کہ جن علاقوں میں بائیں بازو کے لوگوں کا اثر و رسوخ قائم ہوا، وہاں عوام کو ظلم و استحصال سے چھٹکارا ملا اور امن و سکون اور انسانیت و محبت کی بے مثال فضا قائم ہوئی۔ یہ افسانہ اگرچہ اقبال متین کے ترقی پسند نظریہ کی ترجمانی کرتا ہے لیکن اس کے ذریعے بائیں بازو کے لوگوں کی جدوجہد اور آزادی کے بعد کی سیاسی صورت حال بھی سامنے آتی ہے۔ جیسا کہ ذکر کیا گیا کہ جب ہمارا ملک آزاد ہوا اور ایک ہی ملک کا دو حصوں میں بٹوارہ ہوا تو اس وقت چھوٹے بڑے پیمانے پر سینکڑوں فسادات ہوئے اور بہت سے خاندان اس ملک سے نقل مکانی کر کے پڑوسی ملک جانے پر مجبور ہوئے۔ اس نقل مکانی اور فساد کی وجہ سے نہ جانے کتنے لوگ اپنے عزیز و اقارب، رشتہ دار اور اپنی محبوبہ سے بچھڑ گئے۔ ''سچّی دنیا کھوٹے سکّے'' اور ''آواز کا انتظار'' میں اپنوں سے اسی بچھڑنے کے غم کو اُجاگر کیا گیا ہے۔

افسانہ ''بہادر'' بھی آزادی کے فوراً بعد کے حالات کی عکاسی کرتا ہے۔ اس میں حیدرآباد اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں پولیس ایکشن کے بعد ابھرنے والی صورت حال کو دکھایا گیا ہے۔ حیدرآباد اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں پولیس ایکشن کے نام پر مسلمانوں پر بے انتہا ظلم و ستم ڈھایا گیا۔ بہت سے مسلمانوں کو تہہ تیغ کیا گیا۔ بہت سی عورتیں اپنے شوہر، اپنے بیٹوں سے محروم کر دی گئیں اور بہت سی عورتوں کا جنسی استحصال بھی ہوا۔ افسانہ میں اسی صورت حال کی عکاسی کی گئی ہے۔ پولیس ایکشن کے بعد وہاں کے مسلمانوں کی ابتر حالت کی ایک جھلک افسانہ نگار کی زبانی ملاحظ ہو:

> ''پولیس ایکشن نے خاص طور پر اس ضلع کے مسلمانوں کی اکثریت کو آزادی کے نام پر اتنا اوپر اٹھایا تھا کہ وہ اس زمین سے اٹھ کر سیدھے آسمانوں تک جا پہنچے تھے۔ کتنی مائیں اپنے کڑیل نوجوان بیٹوں کو کھو چکی تھیں۔ کتنی بہنیں اپنے بھائیوں کو، کتنوں کا سہاگ اجڑ چکا تھا۔ کتنوں کی محبت لٹ چکی تھی۔'' (۸۱)

افسانہ کا مرکزی کردار علی بہادر چپراسی ہے۔ وہ اتنا خودغرض، بے ضمیر اور چاپلوس ہے کہ اپنے نئے عہدیدار کی جنسی خواہش کی تکمیل کے لیے اس کی خوابگاہ میں ضلع کی سینکڑوں غریب و مجبور لڑکیوں اور عورتوں کو پہنچاتا ہے تاکہ وہ اس کی نظر میں سرخرو بنا رہے۔ جب ایک ایک کر کے ضلع کی بیشتر عورتیں اور لڑکیاں عہدیدار کی خوابگاہ میں پہنچا دی جاتی ہیں اور علی بہادر کو اپنے عہدیدار کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے کوئی نئی لڑکی نہیں ملتی ہے تو وہ مجبور و بے بس خواتین سے شادی کر کے انھیں اس کی خوابگاہ میں پہنچانے کا انتظام کرتا ہے۔ اس افسانہ کے ذریعے حیدرآباد اور اس کے آس پاس کے علاقوں کی مجبور و بے بس خواتین کی حالت زار بھی سامنے آتی ہے اور علی بہادر جیسے آدمی کی خودغرضی اور بے ضمیری بھی۔ یہ خودغرضی اور بے ضمیری افسانہ ''پل صراط'' میں بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ سیٹھ مرتضیٰ بھائی برتن والا شہر کا متمول آدمی ہے۔ اس کے شہر میں ایک نیا حاکم متعین ہو کر آتا ہے جسے زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو آختہ کرنے کی ذمہ داری سونپی جاتی ہے۔ اس کے لیے وہ سیٹھ مرتضیٰ بھائی کا سہارا لیتا ہے۔ وہ اسے ٹکٹ دلانے اور الیکشن لڑانے کا لالچ دیتا ہے۔ سیٹھ مرتضیٰ بھائی جس پر گاؤں کے تمام لوگ بھروسہ کرتے ہیں، اتنا بے ضمیر اور خودغرض ہوتا ہے کہ لالچ میں آکر زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو گرفتار کروانے میں حاکم کا تعاون کرتا ہے۔ جب حاکم کا ٹارگٹ پورا ہو جاتا ہے تو وہ اسے ٹکٹ دینے سے انکار کر دیتا ہے۔ ایسے میں اپنی عزت و آبرو کے نیلام ہونے کے خوف سے سیٹھ مرتضیٰ بھائی فوراً حج پر چلا جاتا ہے۔ اس افسانہ میں بھی پولیس ایکشن کے بعد مسلمانوں پر ہونے والے مظالم کو دکھایا گیا ہے۔ مذکورہ تمام افسانوں میں اقبال متین نے آزادی کے بعد رونما ہونے والے حالات و واقعات کی عکاسی اس طرح کی ہے کہ اس عہد کی پوری تصویر نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے۔

افسانہ ہو یا کوئی اور فن، کسی بھی فنکار کے فن کو اس کی ذاتی زندگی سے بالکل جدا کر کے نہیں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کی ذاتی زندگی میں رونما ہونے والے حالات و واقعات کا بھی اس کے فن پر اثر پڑتا ہے اور اس کی ذاتی زندگی بھی اس کے فن کا موضوع بنتی ہے۔ اس سیاق میں جب ہم اقبال متین کے فن پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں لگتا ہے کہ انھوں اپنی ذاتی زندگی کو بھی اپنے افسانہ کا موضوع بنایا ہے۔ اس ضمن میں ان کا افسانہ ''اُجلی پرچھائیاں'' قابل ذکر ہے۔ افسانہ کے مرکزی کردار راوی کو اپنے ہی خاندان کی کسی

لڑکی سے عشق ہے۔ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے لیکن اس کی ماں اپنی بہن کی بیٹی کو اپنی بہو بنانے پر مصر ہے۔ راوی جب اپنی ماں کی بات نہیں مانتا ہے تو اس کی ماں اور خاندان کے دوسرے لوگ اس کی شادی کی پرزور مخالفت کرنے لگتے ہیں۔ ایسے میں بڑے ہنگاموں سے گزر کر راوی کی شادی تکمیل کو پہنچتی ہے جس میں نہ اس کی ماں شریک ہوتی ہے اور نہ کوئی خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ ہر طرف مسرّت و شادمانی اور چہل پہل کے بجائے خاموشی طاری ہوتی ہے۔ ان تمام واقعات کو افسانہ نگار نے اپنے مخصوص انداز میں اس طرح بیان کیا ہے۔

''بچپن سے اس نے جس کو چاہا تھا۔ جوانی میں اس نے جس سے محبت کی تھی وہی لڑکی اس کی دلہن بنائی گئی۔ لیکن اس طرح کہ عقد میں دلہن کی ماں شریک نہ تھیں۔ خاندان کے بڑے بوڑھے منہ بسورے جیسے آفتوں کو سہہ رہے تھے۔ پھلارا سہرہ لاتے ہوئے راستے ہی سے لوٹا دیا گیا تھا۔ اور قاضی جی گھر کی بجائے محلّہ کی مسجد میں بیٹھے بادام چھوہاروں کی خیر منا رہے تھے لیکن اس نے ہزار ہزار منّتیں کیں اور اپنے والدین کو منا سمجھا کر اس روز عقد مسعود کو ٹلنے نہ دیا۔ ویسے دیکھنے کو لوگ کھاتے پیتے نظر آتے تھے اور کوئی وجہ نہیں سمجھ میں آتی تھی کہ اس عقد کا انداز آخر اتنا اسلامی کیوں تھا۔ نہ نوبت، نہ روشنی، نہ دعوتیوں کا ہجوم، نہ میراثنیں۔ یہاں تو سرے سے سب کچھ غائب تھا۔ یہاں تک کہ چہروں کی بشاشت غائب تھی۔ ہونٹوں پر ہنسی غائب تھی۔ اور جب قاضی صاحب نے دلہن کی عمر اور نام دریافت کیا تو سب کو خاموش دیکھ کر خود دلہا میاں بول اٹھے کہ نام یہ ہے، عمر یہ ہے اور اس انداز سے قاضی صاحب کو دیکھنے لگے جیسے کہہ رہے ہوں کہ مولوی صاحب فرمایئے تو ناک نقشہ سب نوٹ کرادوں''۔(۸۲)

شادی کے بعد راوی اپنی بیوی کے ساتھ موسی ندی کے کنارے کرائے کے ایک مکان میں رہنے لگتا ہے۔ یہاں دونوں میاں، بیوی مل کر گزر بسر کے لیے بطخیں پالنے کے کاروبار کے بارے میں سوچتے ہیں۔ دونوں بڑے ارمانوں سے یہ کاروبار شروع کرتے ہیں لیکن ایک بے ایمان، گھاگھ بیوپاری انھیں بوڑھی اور بانجھ بطخیں دے کر ٹھگ لیتا ہے۔ اس طرح ان دونوں کی بطخیں پالنے اور انڈے بٹورنے کی حسرت دل ہی میں رہ جاتی ہے۔ افسانہ میں ایک جگہ اس بات کا بھی ذکر ملتا ہے کہ راوی نے شادی سے

پہلے پان کی دکان بھی کھولی تھی جو کچھ دن چلی پھر بند ہوگئی۔ یہ راوی کوئی اور نہیں خود اقبال متین ہیں۔ اس افسانہ میں انھوں نے اپنی ازدواجی زندگی کی شروعات اور کسب معاش کے لیے اپنی جدوجہد کی داستان بیان کی ہے۔ اس افسانہ کے مطالعہ سے اقبال متین کی زندگی کے اس گوشے پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ وہ ڈھنڈورچی ترقی پسند نہیں تھے، بلکہ وہ دل سے ترقی پسندی اور جدوجہد کے قائل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کبھی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے نہیں رہے بلکہ ہمیشہ جدوجہد کرتے رہے۔ اپنی بے روزگاری کے دنوں میں انھوں نے پان کی دکان تک کھولی۔ اس افسانہ میں انھوں نے اپنی نجی تفصیلات تو بیان کی ہیں لیکن اس عمومی انداز میں کہ اس آپ بیتی میں جگ بیتی کی شان پیدا ہوگئی ہے۔ اس افسانہ میں کچھ غیر ضروری تفصیلات بھی آگئی ہیں جس سے افسانہ کمزور ہوگیا ہے۔ مشہور فکشن نگار جیلانی بانو اس افسانہ کے تعلق سے لکھتی ہیں:

> ''اجلی پرچھائیاں'' اپنی طوالت کے باوجود اس لیے بہت اچھی کہانی نہیں بن سکی کہ اس میں بطخوں کی قیں قیں بعض جگہ بھلی نہیں لگتی۔ اگرچہ اس کہانی میں متوسط طبقے کے ایک انسان کی معاشی جدوجہد بڑے متاثر کن انداز میں دکھائی گئی ہے''۔(۸۳)

اقبال متین کے افسانے ''نچا ہوا البم'' اور ''خالی پٹاریوں کا مداری'' بھی ان کی ذاتی زندگی پر مبنی افسانے ہیں۔ اس میں انھوں نے اپنے بچپن اور ماضی کی زندگی کو دکھایا ہے۔

اقبال متین نے اپنے ذاتی دکھ درد کو بھی اپنے افسانوں میں سمویا ہے۔ ان کے تین چہیتے بیٹوں کا نوعمری میں یکے بعد دیگرے انتقال ہوگیا تھا جس کا انھیں بڑا دُکھ اور ملال تھا۔ وہ زندگی بھر اپنے مرحوم بیٹوں کے غم میں مبتلا رہے۔ اس ذاتی دکھ درد اور غم کو انھوں نے اپنے مختلف افسانوں اس طرح بیان کیا ہے کہ ان کے افسانے ہمارے شعور کا حصّہ بن جاتے ہیں۔ مشہور افسانہ نگار رام لعل لکھتے ہیں:

> ''اقبال متین غم کا نبض شناس ہے۔ اس کے ذاتی غموں کے تجربے اس کے افسانوں میں راہ پا جاتے ہیں لیکن اس کے افسانے محض شخصی تجربے بن کر نہیں رہ جاتے۔ وہ ہمارے شعور کا بھی ایک حصہ بن جاتے ہیں''۔(۸۴)

اقبال متین نے اپنے کئی افسانوں میں اپنے ذاتی غم کو پیش کیا ہے۔ اس موضوع پر ''دریدہ'' ان کا مشہور افسانہ ہے۔ اس افسانہ کا مرکزی کردار سید ہے۔ وہ شریف آدمی ہے۔ اس میں خلوص و ہمدردی اور

محبت وانسانیت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ وہ حاضر جواب بھی ہے۔اس کی باتوں سے اس کی ذہانت اور دوراندیشی بھی جھلکتی ہے اوراس میں ایک کشش بھی ہے۔جو بھی اس سے ایک بار ملتا ہے،اس کا گرویدہ ہوجاتا ہے۔بہت سی خوبیوں کا حامل ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی طبیعت کا ایک انوکھا روپ بھی ہے۔وہ رات رات بھر چین سے سوتا نہیں، بے چین ومضطرب رہتا ہے اور ٹیپ ریکارڈ پر گانا سنتا ہے۔اس کی ان عادتوں سے بیزار ہوکر اس کا روم میٹ اور چہیتا ساتھی نندو ہاسٹل کا کمرہ بدلنا چاہتا ہے تاکہ اس سے نجات مل جائے لیکن دوستی اور مروّت آڑے آتی ہے۔اس بیچ نندو اپنے گاؤں چلا جاتا ہے اور کچھ دنوں بعد واپس آتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ سید نے خود ہی کمرہ بدل لیا ہے۔سید کمرہ بدلتے ہوئے نندو کے کمرہ میں ایک خط چھوڑ جاتا ہے جس میں لکھا ہوتا ہے۔

> ''وہ جو ٹیپ ریکارڈ پر دھری، فریم میں جڑی ہوئی تصویر تم دیکھتے رہتے ہو، سچ پوچھو تو وہ میرا بچپن نہیں ہے۔وہ کھلنڈرا ہنس مکھ لڑکا میرا بیٹا تھا جو اب اس دنیا میں نہیں ہے''۔(۸۵)

اس خط کو پڑھ کر نندو کو پتہ چلتا ہے کہ سید کی بے خوابی اور اضطرابی کیفیت یوں ہی نہیں ہے بلکہ اس کے بیٹے کی موت کے دُکھ درد اور غم کے سبب ہے۔افسانہ میں سید کا کردار کوئی اور نہیں، یہ اقبال متین کا اپنا کردار ہے۔اس میں انھوں نے اپنے بیٹے کی موت کے دُکھ درد اور اس کے بچھڑنے کے غم کو اجاگر کیا ہے۔اسی سے ملتا جلتا افسانہ ''مزبلہ'' بھی ہے۔اس میں بھی بیٹے کے بچھڑنے کے غم کو بیان کیا گیا ہے۔ افسانہ کا مرکزی کردار راوی، مرحوم بیٹے کے غم میں مبتلا ہے۔وہ فجر کی نماز کے بعد قبرستان کی جانب نکلتا ہے۔راستے میں چلتے ہوئے اس کی نظر اس ہوٹل اور پانی کے نل پہ پڑتی ہے جس سے اس کے مرحوم بیٹے کی یادیں وابستہ ہیں۔ان مناظر کو دیکھ کر اس کے مرحوم بیٹے کی یاد مزید تازہ ہوجاتی ہے۔ وہ قبرستان اپنے بیٹے کی قبر پر پھول چڑھانے کی غرض سے جاتا ہے لیکن جب وہ بیٹے کی قبر پر پہنچتا ہے تو اس کے ہاتھ میں پھول نہیں ہوتے، صرف حسرت کے آنسو ہوتے ہیں۔ظاہر ہے غم جس کی زندگی کے روزمرہ کا معمول بن جائے پھر معاشی تنگدستی بھی ہو، ایسے میں پھول کی پابندی کہاں سے ہو۔وہ بغیر پھول کے بیٹے کی قبر پر تو پہنچ جاتا ہے لیکن اسے پھول نہ لے جانے کا بے حد صدمہ ہوتا ہے۔اس کا ذہن پھول نہ لے جانے کی لاکھ توضیح کرتا ہے اور وہ منطق کے ذریعے اپنے دل کو لاکھ سمجھانے کی کوشش کرتا ہے لیکن

کسی منطق سے اس کے دل کو تسلّی نہیں ہوتی۔ اس افسانہ میں افسانہ نگار نے رنج والم میں مبتلا ایک باپ جس کے بیٹے کا انتقال ہو گیا ہے، کے غم کو اُجاگر کیا ہے اور ساتھ ہی انسان قدرت کے ہاتھوں کس قدر مجبور ہے، اس کو بھی چابکدستی سے بیان کیا گیا ہے۔ ''اتھل پانیوں کے سودائی'' بھی ایک غمزدہ باپ کی کہانی ہے جس کے دو بیٹوں کا انتقال ہو گیا ہے۔ بیٹے کے انتقال پر باپ (راوی) کس قدر دُکھی اور درد و کرب میں مبتلا ہے اس کا اندازہ افسانہ کے درج ذیل اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے۔

> ''ایک رات جب میں اپنے گھر پہنچا، بہت سارے رشتے دار جمع تھے۔ میں نے دیوانوں کی طرح ان سے پوچھا۔ وہ کہاں ہے؟ وہ بھی تمہارے ساتھ تھا۔ سبھوں نے کہا۔ ''صبر کرو اللہ کو یہی منظور تھا''۔ میں نے کب کسی سے کہا۔ میں نے تو پہلے بھی صبر کیا ہے اور اس سے پہلے بھی صبر کیا ہے اور اب بھی صبر کر لوں گا۔ لیکن اللہ کو یہ سب کچھ کیسے منظور ہو جاتا ہے۔ اب میں زندگی بھر اُس سے یہی پوچھتا رہتا ہوں کہ میرے مالک تجھے یہ سب کچھ منظور کیسے ہوا؟۔'' (۸۶)

باپ (راوی) کے دونوں مرحوم بیٹے اس سے بچھڑ کر بھی اس کے شب و روز میں شامل، اس کی زندگی میں در آئی ہر تنہائی کے ساتھی اور ہر اس منظر کا حصہ ہیں جو باپ کھلی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ جب یہ دونوں بیٹے زندہ تھے تو گوداوری ندی کے کنارے بطخیں تلاش کرتے کرتے دور نکل جاتے تھے اور جب بطخیں تلاش کر کے لاتے تھے تو باپ کو بے انتہا خوشی ہوتی تھی۔ بطخیں تو بیٹوں کے انتقال کے بعد بھی آ جاتی ہیں لیکن اب باپ کو وہ خوشی نہیں ملتی۔ باپ کے ذہن میں دونوں مرحوم بیٹے اس طرح بس گئے ہیں کہ باپ کو ان کے ہیولے نظر آتے ہیں۔ جب یہ دونوں بیٹے زندہ تھے تو راستوں سے آتے دیکھ کر باپ ان سے چمٹ جاتا تھا مگر آج وہ ان کے ہیولوں کو دیکھ کر ان سے بات تک نہیں کر سکتا۔ اس لیے وہ مسلسل دونوں بیٹوں کی یاد میں تڑپتا رہتا ہے اور غم میں ڈوبا نظر آتا ہے۔ اس افسانہ میں بھی بیٹوں کے بچھڑنے کے غم کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ ''گنجا مسیح''، ''جھوٹی سچائی''، ''بے دلی اپنا پتہ پوچھے ہے''، ''گریز پا''، ''بھیگے دن بھیگی راتیں'' اور ''تار تار'' بھی اسی موضوع پر لکھے گئے افسانے ہیں۔ ان افسانوں میں اقبال متین نے بظاہر تو اپنی ذاتی زندگی کے دکھ درد کو بیان کیا ہے لیکن انھوں نے اپنے دکھ درد کو اس پر اثر انداز میں بیان کیا ہے کہ ان کے ان افسانوں میں جگ بیتی کی شان پیدا ہو گئی ہے اور ان کے یہ افسانے ہر دکھی دل اور مغموم باپ کی کہانی بن

گئے ہیں۔ ان افسانوں میں قاری کو دکھ کا احساس بھی بہت شدّت سے ہوتا ہے۔ مشہور افسانہ نگار رتن سنگھ اقبال متین کے ان افسانوں کو پڑھنے کے بعد اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں:

''اقبال متین کی اپنی زندگی کی کہانی جتنی درد بھری ہے، اس کے سوا درد ان کی کہانیوں میں بھرا پڑا ہے، بلکہ بعض اوقات تو یہ دونوں درد کہانیوں میں اس طرح گڈ مڈ ہو گئے ہیں کہ پتہ نہیں چلتا کہ اقبال متین آپ بیتی کہہ رہے ہیں یا جگ بیتی۔ اقبال متین کی کہانیوں میں اس ذاتی عنصر کے در آنے سے ان کی کہانیاں پڑھتے پڑھتے کبھی تو ایسا لگتا ہے جیسے ہماری انگلیوں کے نیچے ان کے کسی کردار کی نبض پھڑک رہی ہو۔ اقبال متین کا پہنایا ہوا الفاظ کا جامہ اتار کر اپنے دل کی دھڑکنوں کے ساتھ لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے وہ زندہ جاوید ہو کر آپ کے سامنے آ کھڑے ہو جاتے ہیں۔'' (۸۷)

عابد سہیل لکھتے ہیں:

''زندگی نے اقبال متین کو ترچھی نظر سے دیکھا اور مسائل و مصائب نے ان کا دامن کبھی نہیں چھوڑا۔ ان کے ہاتھوں نے جگر کے ٹکڑوں کو قبر میں اتارا، شریک حیات کی صورت میں اپنے دل کو دفن ہوتے دیکھا لیکن ان مصائب کے سامنے سرنگوں نہیں ہوئے، انھیں زندگی کے کھیل کا حصہ جانا اور ساری دنیا کے دکھوں میں انہیں شامل کر کے ان سے خوب خوب بدلا لیا۔ اپنے قلم کے ذریعے۔ اس کام کے لیے اور کچھ ان کے پاس تھا بھی نہیں۔ ان کے افسانوں میں دکھوں کی پھوار جس طرح برستی ہے ویسے اردو کے کسی دوسرے افسانہ نگار کی تحریروں میں شاید ہی برسی ہو۔ لیکن یہ پھوار ان کو، ان کے کرداروں کو اور ان افسانوں کے قاری کو جینے اور زندگی کرنے کا حوصلہ بخشتی ہے۔'' (۸۸)

پروفیسر عتیق اللہ لکھتے ہیں:

''اقبال متین دکھ کے احساس کو بھی اکثر تازہ دم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دکھ جو اقبال متین کی روح کی گہرائیوں میں کہیں بیٹھ گیا ہے۔ ایک تناؤ، ایک محزونی، ایک اُداسی ان کے نوک قلم سے ہمیشہ چمٹی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ وہ اس سے پیچھا چھڑانے یا اسے جھٹکنے کی کوشش بھی نہیں کرتے کہ دکھ کی رفاقت سب سے اٹوٹ رفاقت ہوتی ہے۔'' (۸۹)

اقبال متین نے اپنے افسانوں میں اپنی ذاتی زندگی کے غم کے ساتھ ساتھ عام انسانوں کے دکھ درد کو بھی سمویا ہے۔آج انسان ترقی کر کے چاند پر تو پہنچ گیا ہےلیکن عام انسان غربت وافلاس اور تنگدستی کے مارے تڑپ تڑپ کر دردناک زندگی جینے پر مجبور ہے۔افسانہ ''زمین کا درد'' میں اسی دردناک زندگی کی عکاسی کی گئی ہے۔افسانہ کا مرکزی کردار (راوی) ایک عام انسان ہے۔اس کے چہیتے بیٹے کا انتقال ہوگیا ہےجس کی وجہ سے وہ بے حد دُکھی ہے۔وہ اپنے غم کو ہلکا کرنے کے لیے اپنے بیٹے کی قبر پہ پھول چڑھانے پہنچتا ہے۔قبرستان کے بغل میں اسے کھنڈر مکان نظر آتا ہے۔اس کھنڈر مکان میں ایک عورت اپنی چھ جوان بیٹیوں کے ساتھ رہتی ہے جو غربت وتنگدستی کے مارے موت سے بدتر زندگی گزار رہی ہوتی ہے۔یہ عورت راوی کے پاس آ کر اسے جھوٹی تسلی دیتی ہے۔دوسری بار جب راوی اپنے بیٹے کی قبر پہ پہنچتا ہےتو اسے المناک صورت حال نظر آتی ہے۔وہ دیکھتا ہے کہ کھنڈر میں رہنے والی عورت ایک قبر کے سامنے کھڑی ہے۔یہ قبر اس کی بڑی بیٹی کی ہوتی ہے جس نے خودکشی کرلی ہے اور جس کا نومولود بچہ کھنڈر میں رو رہا ہوتا ہے۔کھنڈر کی اس غربت زدہ اور دردناک زندگی کو دیکھ کر راوی کو یوں محسوس ہوتا ہے۔

> ''مجھے محسوس ہوا جیسے چاند مجھ سے پوچھ رہا ہے کہ تم لوگ مجھ تک پہنچ گئے ہو تو میں لرز رہا ہوں۔خدارا زمین کے درد کو زمین ہی پر چھوڑ آؤ۔اپنے سینوں میں چھپا کر اسے کبھی ساتھ نہ لے آنا۔میرے سینے میں اتنی وسعت کہاں ہے جو زمین کا سارا دکھ سمیٹ سکوں۔''(۹۰)

کتنا دردناک اقتباس ہے۔چند جملوں میں افسانہ نگار نے زمین پر رہنے والے عام انسانوں کے دکھ درد کو اس پراثر انداز میں بیان کیا ہے کہ قاری محسوس کیے بغیر نہیں رہتا۔عام انسانی زندگی کے دکھ درد، مجبوریوں اور محرومیوں کا بیان ان کے ابتدائی افسانوں ''چوڑیاں''، ''سُنہری لکیریں''، ''مرگھٹ''، ''تانبہ اور پانی'' اور ''۵۵۵'' میں بھی ملتا ہے۔

اقبال متین کے افسانوں میں زندگی کے چھوٹے چھوٹے پہلوؤں کا بھی بیان ہوا ہے۔''کھنڈر''، ''چھوٹی بی بی'' میں عشق کی ناکامی ''بیر بہوٹی''، ''ایک داستان شہر سے دور'' میں جھوٹی شان وشوکت ''بچھڑا''، ''پیر صاحب'' میں رومانی جذبہ، اور ''ہم سفر'' اور ''ساحل'' میں عشقیہ کیفیات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ان چھوٹے اور بظاہر معمولی موضوعات کو بھی اقبال متین نے اس فنکارانہ انداز میں برتا ہے کہ یہ

موضوعات بھی اہم ہو گئے ہیں۔

اب تک اقبال متین کے جتنے افسانوں کا ذکر کیا جا چکا ہے، ان کے علاوہ بھی ان کے کچھ اور افسانے ہیں۔ ایسے افسانوں میں ''دام ہر موج''، ''روزنِ در''، ہیں کوا کب کچھ''، ''چور''، ''شکن در شکن''، ''پچھلا دروازہ''، ''ایک طوفان دو بوندیں''، ''واپسی''، ''کانپتی لرزتی لو''، ''فوری گرام''، ''بے حس آنکھیں''، ''تین مسافر''، ''شعور سفر منزل''، ''من مول''، ''شرمیلا''، دھوپ''، ''سڑک''، ''پنجرے کا آدمی''، ''شعلہ پوش''، ''ڈورتھی''، ''تعویذ''، ''سناٹے کی آواز'' اور ''سلورفش'' ہیں۔ ان افسانوں میں بھی ہم عصر انسانی زندگی، اس کے مختلف پہلوؤں اور انسانی جذبات و احساسات کا بیان موثر انداز میں ہوا ہے۔

اقبال متین کے افسانوں کے اس تفصیلی موضوعاتی جائزہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان کے یہاں موضوعات کا تنوع بھی ہے اور اسے برتنے کا ہنر بھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی افسانہ نگاری کے ذریعے اردو کے افسانوی میدان میں ایک ممتاز اور قد آور افسانہ نگار کی شکل میں سامنے آتے ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں ہم عصر زندگی کے چھوٹے چھوٹے پہلوؤں سے لے کر بڑے اور اہم مسائل و موضوعات کا احاطہ کیا ہے اور انہیں سلیقے سے برتنے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں عہد حاضر کا معاشرہ سانس لیتا اور جیتا جاگتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں ہم عصر زندگی کی ترجمانی اپنے منفرد انداز میں کی ہے اور سماج کے تاریک ترین گوشوں کو بے نقاب کر کے اسے آئینہ بھی دکھانے کی کوشش کی ہے جس میں وہ کامیاب ہوئے ہیں۔ فضیل جعفری اقبال متین کے افسانوں کو پڑھ کر اپنے تاثرات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

> ''اقبال متین کو اس بات کا گہرا دکھ اور ملال ہے کہ موجودہ سڑے گلے معاشرے میں رہنے بسنے والے لوگ ایک طرف اگر اپنی انفرادی شناخت کھو چکے ہیں تو دوسری طرف انسانی اور اخلاقی اقدار بے معنی ہو چکی ہیں۔ بیشتر افراد ذاتی اور محدود مفادات کے گھن چکر میں پھنس کر ایک دوسرے کے لیے اجنبی بن گئے ہیں۔ سائنس اور صنعت کے طفیل آدمی نے بظاہر تو بڑی ترقی کر لی ہے مگر زندگی کی بنیادی قدر یعنی انسانیت کہیں نظر نہیں آتی۔ وہ چند افراد جو آج بھی اس قدر کو کسی نہ کسی وجہ سے سینے سے لگائے ہوئے ہیں وہ ہمیشہ اور بطور اصول خسارے میں رہتے ہیں۔ عام انسانوں کا

استحصال کرنے والے یقیناً دولت مند ہو گئے ہیں مگر خط غربت سے نیچے زندگی گزارنے والوں کی تعداد برابر بڑھتی جارہی ہے۔ پڑھے لکھے غریب لوگوں کی زندگی ریلوے پلیٹ فارم بن چکی ہے۔‘‘ (۹۱)

پروفیسر قمر رئیس اقبال متین کے افسانوں پر اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں:

’’اقبال متین کی کہانیاں انسانی دکھ درد کے رشتوں سے گوندھی ہوئی حکایتیں ہیں۔ یہ آج کی پُر آشوب زندگی کے کینوس پر اتاری ہوئی ایسی بے لاگ تصویریں ہیں جو اپنی کربنا کی سے قاری کے دل کو خون کر دیتی ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ سرخ رنگوں میں زندگی اور فطرت کی مصوری آسان ہوتی ہے لیکن پانی جیسے ہلکے کم نما رنگوں میں زندگی کی سچائیوں کی پیکر تراشی بہت مشکل ہوتی ہے۔ اس کے لیے ماہر فن مصور کا موء قلم درکار ہوتا ہے۔ اقبال متین کی کہانیوں میں اسی بے مثل مہارت کا احساس ہوتا ہے۔‘‘ (۹۲)

اقبال متین کی افسانہ نگاری کا فنی جائزہ

(پلاٹ، کردار، زبان و بیان اور اسلوب کے حوالے سے)

اقبال متین اردو کے منفرد و ممتاز افسانہ نگار ہیں۔ انھوں نے افسانہ نگاری ۱۹۴۵ء ہی سے شروع کر دی تھی مگر افسانوی منظرنامے پر وہ پورے طور پر ابھر کر ۱۹۶۰ء کے بعد سامنے آئے۔ ان کے سات افسانوی مجموعے منظر عام پر آ کر فن افسانہ نگاری میں ان کا اعتبار قائم کر چکے ہیں۔

اقبال متین ترقی پسند تحریک سے وابستہ فن کار تھے۔ ان کی ادبی و فکری تربیت مخدوم محی الدین جیسے ترقی پسند انقلابی شاعر کے زیر اثر ہوئی تھی۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہونے کے باوجود اقبال متین نہ تو ترقی پسندوں سے مرعوب ہوئے، نہ ان کی نعرہ بازی سے متاثر ہوئے۔ وہ جدیدیت کے فیشن کا بھی شکار نہیں ہوئے بلکہ انھوں نے اپنی راہ خود متعیّن کی، اعتدال و توازن کو برقرار رکھا اور قدیم و جدید کی آمیزش سے ایک ایسی راہ نکالی جس نے نوجوان افسانہ نگاروں پر اپنے اثرات مرتب کیے۔ بقول پروفیسر قمر رئیس:

> ''قرۃ العین حیدر، اقبال متین، جوگندر پال، اور اقبال مجید نے جس جادۂ اعتدال کو اپنایا۔ موضوع اور تکنیک میں جس ہم آہنگی پر زور دیا۔ علامتی اظہار میں جس چابکدستی کا رویہ اختیار کیا اور افسانہ میں افسانویت کے جوہر کو مختلف وسائل سے جس طرح قائم رکھا وہی جدید افسانہ کی صحیح سمت تھی اور آخر آخر ان کے اس رویے نے نوجوان افسانہ نگاروں کو متاثر کیا اور وہ ارادی ابہام کی ''شب خونی'' ڈگر سے ہٹ کر صحیح راستے پر آئے۔'' (۱)

اردو افسانہ میں اقبال متین کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے اردو افسانے کی صحت مند روایات سے استفادہ کیا، ادب کے معاصر رجحانات پر نظر رکھی اور موضوع اور ٹیکنیک میں ہم آہنگی پیدا کرنے اور فنی لوازم کو برتنے

کی کامیاب کوشش کی۔ان کا شمار اردو کے ان حساس افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنے آپ کو کسی سے مرعوب ہونے نہیں دیا۔فن کے تقاضوں کو ملحوظ رکھا اور اردو افسانے کو انحطاط سے بچانے اور اسے فروغ دینے میں اہم رول ادا کیا۔ پروفیسر سلیمان اطہر جاوید لکھتے ہیں:

''اقبال متین ایسے فن کاروں میں شامل ہیں جنہوں نے صحت مند روایات سے استفادہ کیا اور عصری مسائل اور میلانات پر بھی نظر رکھی۔ان کے فکشن میں ان کا معاشرہ چلتا پھرتا محسوس ہوتا ہے۔یہ ان کی جاگتی عصری حسّیت ہے کہ وہ اپنے اطراف واکناف کی ترجمانی کرتے ہیں۔انھوں نے اردو فکشن کی صحت منداقدار کو مستحکم کیا اور ان کے فروغ میں اپنا حصہ ادا کیا۔''(۲)

ڈاکٹر محمد علی اثر رقم طراز ہیں:

''اس صنف میں انھوں (اقبال متین) نے ادب کے معاصر رجحانات،فنی لوازم،موضوع اور ٹیکنیک میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی اور اسلوب بیان اور طرز تحریر میں جو شعریت اور افسانویت کا حسین امتزاج پیدا کیا ہے،وہ اپنی مثال آپ ہے۔''(۳)

اقبال متین کی افسانہ نگاری کا زمانہ وہ تھا جب کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی جیسے بلند پایہ افسانہ نگار اپنا لوہا منوا چکے تھے اور قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین جیسے افسانہ نگار اپنے قدم جمانے میں مصروف تھے۔ایسے دور میں کسی نئے افسانہ نگار کے لیے اپنی الگ شناخت قائم کرنا دشوار ترین مرحلہ تھا لیکن اقبال متین نے اس مرحلہ کو بھی سر کیا۔انھوں نے اپنا الگ رنگ و آہنگ پیدا کیا، پیش روؤں کے اثر سے بھی خود کو آزاد رکھا لیکن افسانے کی صالح روایات سے کبھی روگردانی نہیں کی۔اقبال متین کو شناخت کا مسئلہ صرف اپنے پیش روؤں سے درپیش نہیں تھا بلکہ ان کا مقابلہ ان جدید افسانہ نگاروں سے بھی تھا جو جدیدیت کے زیر اثر انتہا پسندی کا شکار ہو کر افسانہ کی روایت کا انہدام کر رہے تھے اور بے جا علامت نگاری اور تجریدیت کے نام پر ژولیدہ قسم کی تحریریں لکھ رہے تھے۔ان کی یہ تحریریں بڑی آن بان کے ساتھ مؤقر رسالوں میں شائع ہو رہی تھیں اور انھیں نقادوں کی حمایت بھی حاصل تھی۔ایسے افسانہ نگار داد پا رہے تھے اور جینوئن، کھرے اور اصل افسانہ نگار نقادوں کے عتاب کا شکار ہو رہے تھے۔ایسے وقت میں اقبال متین اپنی روش پر قائم رہے اور اپنے مخصوص انداز بیان اور منفرد

اسلوب کے ذریعے اپنی الگ شناخت قائم کی۔ڈاکٹر مثنی رضوی لکھتے ہیں:

''اقبال متین اردو کے ان افسانہ نگاروں میں سے ہیں جنھوں نے موضوعات کے تنوع اور اسلوب کی تازہ کاری سے اپنی کہانیوں کو ایک منفرد شناخت اور الگ مزاج کا حامل بنادیا ہے۔'' (۴)

اقبال متین ایک کھلے ذہن کے افسانہ نگار تھے۔انھوں نے فن میں کبھی کسی کی تقلید کرنا گوارا نہیں کیا بلکہ ہمیشہ اپنے ذہن و دل کے دریچوں کو کھلا رکھا۔انھوں نے اردو افسانے کی صحت مند روایات سے استفادہ کیا اور جدید رویّوں کو بھی ملحوظ رکھا۔یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں روایت اور جدّت کا حسین امتزاج نظر آتا ہے اور ان کے افسانے موضوعات اور اس کے برتاؤ کے لحاظ سے تازگی اور ندرت کا احساس دلاتے ہیں۔

اقبال متین کا فن زندگی کے عرفان اور اس کے اظہار کا فن ہے۔انہیں زندگی کی چھوٹی چھوٹی حقیقتیں اور ان کا فنکارانہ اظہار زیادہ عزیز ہے۔ان کی کہانیوں میں اجتماعی کرب اور انفرادی دکھ درد، دونوں کا پراثر اظہار ملتا ہے۔انفرادی دکھ درد کو وہ اپنی کہانیوں میں اس طرح پیش کرتے ہیں کہ وہ اجتماعی معلوم ہونے لگتا ہے۔وہ اپنی بات دھیمے سُروں اور مدھم لہجے میں کہتے ہیں۔بیانیہ اسلوب ان کی کہانیوں کا طاقت ور حربہ ہے۔وہ علامتی افسانے کے خلاف نہیں ہیں لیکن وہ ذاتی علامتوں جس کی ترسیل نہ ہو سکے، کے استعمال کی سخت تردید کرتے ہیں۔علامتی افسانے کے بارے میں وہ کہتے ہیں:

''علامتی افسانے کا حسن یہ ہے کہ وہ کم کینوس پر وسیع تناظر کا احاطہ کرتا ہے۔ علامت کا تخلیق کار کے ذہن سے قاری کے ذہن تک سفر ضرور ہوتا ہے اگر آپ علامت کو اپنی ذاتی ملکیت قرار دینے سے گریز کریں کہ قاری اس کا دروازہ کھٹکھٹانے کی جرأت بھی نہ کرے۔علامت اس لیے وضع نہیں کی جاتی کہ آپ کو علامتی افسانہ لکھنا ہے۔افسانہ اپنے دروبست کے لیے اپنے اظہار کے لیے علامت کا سہارا اس درک کے ساتھ لیتا ہے کہ وہ لفظ کو معانی ومفاہیم کا زیادہ بوجھ اٹھانے کے قابل بنائے۔اس لیے نہیں کہ سرے سے لفظ کی پہچان ہی ختم کردے۔'' (۵)

اقبال متین اپنی کہانیوں میں پرتصنع داخلیت، بے جا ابہام، فیشن زدہ تجریدیت اور علامت نگاری کے قائل نہیں ہیں۔وہ اینٹی اسٹوری قسم کی کہانی لکھنے سے گریز کرتے ہیں۔وہ اپنی کہانیوں میں علامت

اور تجرید کا استعمال بہت سوچ سمجھ کر کرتے ہیں اور ہر حال میں کہانی میں کہانی پن کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ کیوں کہ ان کے نزدیک کہانی کی پہلی شرط اس کا کہانی پن ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''میرے نزدیک کہانی خواہ علامتی ہو کہ تجریدی، اس کو پہلے کہانی ہونا چاہئے۔ اس کا کہانی پن یا اس کی افسانویت ہی اس کو اس کی بے چہرگی سے بچاسکتی ہے جو ضروری ہے۔''(۶)

جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ اقبال متین جدید رویّوں سے استفادہ تو کرتے ہیں لیکن وہ افسانے کی روایت اور اس کے فنی لوازم سے کبھی روگردانی نہیں کرتے ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں پلاٹ، کردار، موضوع کے مطابق اسلوب اور زبان و بیان کا خاص اہتمام کرتے ہیں۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے کچھ افسانوں کے پلاٹ اور کردار پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے ان کے اسلوب اور زبان و بیان کا جائزہ لیا جائے لیکن اس سے پہلے یہ دیکھتے چلیں کہ پلاٹ کیا ہوتا ہے۔

پلاٹ:

کہانی میں جو واقعات بیان کئے جاتے ہیں، ان کی فنی ترتیب و تنظیم کا نام پلاٹ ہے جو آغاز، وسط اور انجام سے منطقی طور پر مربوط ہوتا ہے۔ یہ پلاٹ ہی ہے جو قاری کے مدوجزر کو ابھارتا ہے اور پھر کلائمکس سے گزار کر مائل بہ اعتدال کرتا ہے۔ اس تمام عرصے میں وہ کہانی کے وحدت تاثر کو مجروح ہونے نہیں دیتا۔ گویا پلاٹ وہ اڈا ہے جس پر کہانی کا تانا بانا بنا جاتا ہے۔ وقار عظیم کا خیال ہے۔

''افسانہ حیات انسانی کے مختلف پہلوؤں، ان کے تاثرات، ان تاثرات کی بلندی و پستی، ان کی تبدیلی، حرکت و جمود اور اس طرح کی بہت سی چیزوں کا ایک ادبی اور فنی عکس ہے۔ جو واقعہ، تجربہ، خیال یا حس افسانے کی بنیاد بنتا ہے۔ پلاٹ اس واقعے، تجربے، خیال یا حس کو ایک فنی ترتیب دیتا ہے۔''(۷)

پلاٹ افسانہ کا اہم جزو ہے۔ افسانہ میں اس کی بڑی اہمیت ہے۔ اس کے بغیر افسانہ کا فنی حسن مجروح ہوتا ہے، افسانے میں پیچیدگی پیدا ہوتی ہے اور واقعات خاطر خواہ طریقے سے آگے نہیں بڑھ پاتے۔ لیکن پلاٹ کا یہ تصور جدید افسانے میں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ کیوں کہ جدید افسانے میں آزاد تلازمۂ خیال اور شعور کی رو کی تکنیک نے زمانی تسلسل کو مجروح کر کے افسانے کی نظم و ضبط اور

ترتیب وتنظیم کوختم کردیا اور پلاٹ جس نظم وضبط کا تقاضا کرتا ہے، لاشعور کی نا قابل شناخت اور غیر متعین دنیا اس چوکھٹے میں فٹ نہیں ہوسکتی۔

پلاٹ دوطرح کے ہوتے ہیں سادہ اور پیچیدہ یعنی منظّم اور غیر منظّم۔ منظّم پلاٹ میں واقعات باقاعدہ طور پر مرتب شکل میں ترتیب پاتے ہیں لیکن غیر منظّم پلاٹ اس کے برعکس اور تنظیم وترتیب کی حدود سے آزاد ہوتے ہیں۔ ان کی یہی آزادی پلاٹ کو مجروح کرنے اور افسانے میں جھول پیدا کرنے کا سبب بنتی ہے۔ افسانے کے لیے سیدھے سادھے پلاٹ کو زیادہ اچھا سمجھا جاتا ہے۔ اقبال متین نے اپنے افسانوں کی بنیاد منظّم پلاٹ پر رکھی ہے۔ لیکن اس کے باوجود پلاٹ کے معاملے میں ان کے یہاں یکسانیت نہیں پائی جاتی کیوں کہ حسب ضرورت انہوں نے پلاٹ میں ندرت اور تازگی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ کچھ افسانوں کے پلاٹ میں کہانی ابتدا سے شروع ہوتی ہے اور درمیانی حصے سے ہوکر اختتام کو پہنچتی ہے۔ کچھ افسانوں کے پلاٹ ایسے ہوتے ہیں جس میں کہانی کا آغاز درمیانی حصے سے کیا جاتا ہے۔ پھر اس سے پہلے کا حصہ آغاز کے بعد بیان کیا جاتا ہے۔ کبھی افسانے کا آغاز انجام سے ہوتا ہے اور درمیانی حصے میں پورا واقعہ بیان کرتا ہوا پھر اسی انجام پر ختم ہوتا ہے جہاں سے شروع ہوا تھا۔ اقبال متین کے افسانوں کے پلاٹ میں بھی یہ صورتیں پائی جاتی ہیں۔ ان کے افسانوں کے پلاٹ کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ پلاٹ کی تعمیر وتشکیل کے ہنر سے بخوبی واقف ہیں۔ وہ واقعات کو بڑے سلیقے اور فنی ہنرمندی سے ترتیب دیتے ہیں تا کہ کہانی پن مجروح نہ ہونے پائے اور وحدت تاثر بھی برقرار رہے۔

یوں تو اقبال متین کے تقریباً تمام افسانوں میں پلاٹ پائے جاتے ہیں لیکن ان کے کچھ افسانے ایسے ہیں جن میں پلاٹ کا فنکارانہ اہتمام کیا گیا ہے اور جو اپنے خوبصورت پلاٹ کی وجہ سے قاری کو متاثر کرتے ہیں۔ ایسے پلاٹ مرکوز افسانوں میں ''ملبا''، ''آدمی اور آدمی''، ''مسدود راستے''، ''زمین کا درد''، ''درد کا رشتہ''، ''کاٹا ہوا نام'' اور ''آنگن میں سہاگن'' قابل ذکر ہیں۔ یہ افسانے اپنے دلکش پلاٹ کی وجہ سے جانے جاتے ہیں۔

پلاٹ کے اعتبار سے ''ملبا'' اقبال متین کا خوبصورت اور پر اثر افسانہ ہے۔ اس میں جاگیردارانہ معاشرہ میں غریب وبے بس خواتین کے جنسی استحصال کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ اس افسانہ کے پلاٹ کا تانا بانا

ایک ایسے بوالہوس نواب کے گرد بنا گیا ہے جو غریب و بے بس لڑکیوں سے جبراً عقد کر کے ان کا جنسی استحصال کرتے ہیں، پھر انھیں اپنی ویران و تاریک حویلیوں میں سسک سسک کر جینے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔نواب صاحب کی نگاہ آئے دن کسی نہ کسی خوبصورت لڑکی پر پڑتی اور ٹھہر جاتی ہے جسے ان کی خواب گاہ میں پہنچانے کا کام ان کا چہیتا اور وفادار ملازم سرفراز علی انجام دیتا ہے۔ایک دن نواب صاحب کی نگاہ خود سرفراز علی کی بیاہتا بیوی گلبدن بوا پر ٹک جاتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ گلبدن بیگم بن جاتی ہیں۔ ان کے بطن سے پورے دس مہینے کے بعد نواب قلندر حسین خاں جنم لیتے ہیں جو شکل و شباہت میں ہو بہو نواب صاحب کی طرح ہوتے ہیں۔ان کے متعلق نواب صاحب کو یقین ہو جاتا ہے کہ وہ ان ہی کے نطفہ سے ہیں۔اسی لیے وہ نواب صاحب کا چہیتا بیٹا بن جاتا ہے اور ان کی ماں گلبدن بیگم نواب صاحب کی سب سے چہیتی بیگم قرار پاتی ہیں۔گلبدن بیگم چند ہی برسوں تک نواب صاحب کی منظور نظر رہتی ہیں کہ نواب صاحب فلمی دنیا سے لائی گئی ایک نوخیز لڑکی کو اپنی خواب گاہ کی زینت بنا لیتے ہیں اور گلبدن بیگم سے نظریں ہٹا لیتے ہیں۔اب گلبدن بیگم کی زندگی ویرانی اور اداسی کی نذر ہو جاتی ہے۔وہ نواب صاحب کی توجہ سے تو محروم ہوتی ہی ہیں، اپنے بیٹے نواب قلندر حسین خاں کے دیدار کے لیے بھی ترستی رہتی ہیں۔ان کے بیٹے نواب قلندر حسین خاں اپنی بیوی اور ماں کو چھوڑ کر رات دن ابا حضور نواب صاحب کی خدمت گزاری میں لگے رہتے ہیں۔اسی دوران ایک دن حویلی میں یہ خبر گشت کر جاتی ہے کہ نواب قلندر حسین خاں چھوٹی بیگم کے ساتھ پکڑے گئے اور نواب صاحب نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ یہاں پہ کہانی کلائمکس کو پہنچتی ہے۔اس خبر کو سن کر گلبدن بیگم کے پاؤں تلے زمین کھسک جاتی ہے۔ان کے بیٹے نواب قلندر حسین خاں ان کی گود میں سر رکھے زار و قطار رو رہے ہوتے اور کہنے لگتے ہیں:

> ''ابا حضور نے مجھ پر شک کیا ہے۔مجھ پر۔ماں مجھ پر، مجھ پر ماں۔گلبدن بیگم بھی اپنے آنسو روک نہ سکیں۔ان کو آج ان کا بیٹا مل گیا تھا۔لیکن قلندر نواب ڈیوڑھی کے چھوٹے بڑے ہر شخص کی آنکھوں میں آنسو بن کر جانے کہاں جا چھپے۔کسی نے پھر ان کو نہیں دیکھا۔''(۸)

ان جملوں کے ساتھ کہانی اختتام کو پہنچتی ہے۔اس افسانہ کا موضوع انتہائی نازک ہے لیکن افسانہ نگار نے اسے بہت ہی سنبھل کر فنی ہنرمندی سے برتا ہے۔ڈاکٹر مثنیٰ رضوی اس افسانہ کی فنی خوبیوں پر

روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ملبا' اقبال متین کی جاں گسل کہانی ہے جس میں جاگیردارانہ ماحول کے جبر واستبداد کے ایک مخصوص پہلو کو بڑی نزاکت اور چابکدستی سے ابھارا گیا ہے۔ اقبال متین کا تعلق ہندوستان کے اس علاقہ سے ہے جس نے جاگیردارانہ سماج کا درخشاں عروج اور تاریک زوال دونوں دیکھا ہے۔ انھوں نے اس ماحول کو اتنے قریب سے دیکھا ہے اور اتنی گہری نگاہ سے اس کے پیچ وخم کا مطالعہ کیا ہے کہ اس کا باریک سے باریک گوشہ بھی ان کی نظروں سے مخفی نہیں رہ سکا۔ اس ماحول کی چیرہ دستیوں نے ان کے دل میں درد کا جو طوفان اٹھایا اسے نہایت صبر وضبط کے ساتھ انھوں نے اس خوبصورت اور درد انگیز کہانی میں منتقل کر دیا۔ ان کی داد دینی پڑتی ہے کہ ظلم و استحصال کے اس ماحول کی عکاسی اور پیشکش میں بھی انھوں نے اپنے جذبات اور احساسات پر قابو رکھا اور رقیق جذباتیت (Sentimentality) کے شکار نہیں ہوئے''۔(۹)

اس افسانہ کا بافت اور گٹھاؤ اس قدر مضبوط ہے کہ کہانی میں کہیں بھی کوئی جھول پیدا نہیں ہوتا اور کسی طرح کی کوئی رکاوٹ محسوس نہیں ہوتی۔ افسانہ میں کوئی جملہ یا لفظ زائد نہیں لگتا بلکہ جس قدر الفاظ کی ضرورت تھی اقبال متین نے چھان پھٹک کر ان ہی جملوں اور الفاظ کا انتخاب کیا ہے اور واقعات کو اس حقیقی انداز میں بیان کیا ہے کہ قاری جاگیردارانہ ماحول میں پہنچ کر خود اپنی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کرنے لگتا ہے۔ افسانہ اپنے آغاز ہی سے قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور اختتام پہ اس کے ذہن و دل پہ گہرا نقش چھوڑ جاتا ہے۔ اس افسانہ کا پلاٹ سیدھا سادا ہے مگر ایمائی انداز میں چھوٹے چھوٹے واقعات کو اس طرح پرویا گیا ہے کہ اس میں جدت وندرت پیدا ہوگئی ہے۔ اس افسانہ کے پلاٹ میں کہانی ابتدا سے شروع ہوتی ہے اور درمیان سے ہوتی ہوئی اختتام کو پہنچتی ہے لیکن افسانہ ''آدمی اور آدمی'' کا پلاٹ دوسری طرح سے ترتیب پاتا ہے۔ اس کی ابتدا انجام سے ہوتی ہے۔ یہ افسانہ بھی زوال پذیر جاگیردارانہ معاشرہ کو موضوع بنا کر لکھا گیا ہے۔ اس میں ریاکاری اور جھوٹی دینداری کے پہلو کو اُجاگر کیا گیا ہے۔

اس افسانہ کا پلاٹ دو کرداروں خاں صاحب اور ان کے بیٹے اسلم خاں کے اردگرد بنا گیا ہے۔ خاں صاحب انتہائی لالچی، خودغرض، بے ضمیر، تنگدل اور ریاکار قسم کے آدمی ہیں۔ وہ چالاکی سے امیر گھرانے

میں شادی کرتے ہیں اور خسر کی بدولت محکمہ پولیس میں نوکری حاصل کر کے اتنی دولت بٹورتے ہیں کہ شہر کے متمول لوگوں میں ان کا شمار ہونے لگتا ہے۔ وہ اپنے بیٹے اسلم خاں کو بھی اپنے ہی راستے پر چلانا چاہتے ہیں لیکن ان کا بیٹا جو انقلابی خیالات کا حامل، انسانیت و ہمدردی سے لبریز ایک باضمیر نوجوان ہے، ان کے راستے پر نہیں چل پاتا ہے۔ اپنے والد کی مرضی پہ نہ چل پانے کے سبب اسلم خاں جائداد سے بے دخل کر دیا جاتا ہے اور اس کی زندگی شدید تنگدستی میں گزرتی ہے۔ اسی تنگدستی کے دوران اس کی بچی کو شدید عارضہ لاحق ہوتا ہے۔ وہ اپنی بچی کے لیے اپنے والد سے رحم کی بھیک مانگتا ہے مگر اس حالت میں بھی اس کے والد کا دل نہیں پسیجتا۔ وہ علاج و معالجہ میں ہاتھ بٹانے اور مدد کرنے کے بجائے اسے دین کی تلقین کرنے لگتے ہیں اور بالآخر بچی مر جاتی ہے جس کے غم میں اسلم خاں بے ہوش ہو جاتا ہے۔ بے خبری کے عالم میں اسلم خاں جب بھاگتا ہوا اپنے والد کے وظیفہ کے کمرے میں پہنچتا اور شیشے کی الماری سے ٹکراتا ہے تو الماری سے مہنگی شراب کی بوتلیں نیچے گرنے لگتی ہیں جس سے اس کے والد کی دینداری کا پورا ڈھونگ سامنے آ جاتا ہے۔ اس افسانہ کا آغاز انجام سے ہوتا ہے لیکن درمیان میں واقعات کی کڑیوں کو اس طرح جوڑا گیا ہے کہ کہانی میں کسی خلا کا احساس نہیں ہوتا، بلکہ ہر واقعہ ایک دوسرے سے مربوط اور کہانی کے بطن سے جنم لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ افسانہ کا پلاٹ اس فنی ہنرمندی سے ترتیب دیا گیا ہے کہ کہانی اپنے خوبصورت پلاٹ کی وجہ سے قاری کے دل میں اتر جاتی ہے۔

''مسدود راستے'' اقبال متین کی پُر درد کہانی ہے۔ اس میں معاشی زبوں حالی کے شکار عام انسانوں کی دردناک زندگی کو دکھایا گیا ہے۔ اس افسانہ کا پلاٹ ایک ایسے شخص کے ارد گرد بنا گیا ہے جس کی زندگی قرضوں کے بل بوتے پر چل رہی ہے۔ اس شخص کو چوں کہ اپنی عزت اور سفید پوشی کا بھی خیال ہے۔ اس لیے وہ قرض خواہوں کی نظروں سے بچ بچا کر گھر سے آفس جاتا ہے اور ان کے مطالبہ سے بچنے کے لیے اپنے اوپر تین راستوں کو بند کر لیتا ہے۔ وہ اپنے اوپر ایک اور راستہ کو ہمیشہ کے لیے بند کر لیتا ہے جس پر کبھی اس کا بارہ سالہ مرحوم بیٹا اس کا راستہ روک لیا کرتا تھا۔ اس راستہ سے گزرنا وہ کسی طرح اپنے بس میں نہیں پاتا لیکن ایک دن قرض خواہ حسین سیٹھ سے بچنے کے لیے وہ اس راستے پہ چلنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس راستہ پر اسے اپنا مرحوم لڑکا نظر آتا ہے جس کا ہاتھ جھٹک کر وہ آگے بڑھ جاتا ہے۔ اس راستہ

سے گزرنے اور اپنے لڑکے کا ہاتھ جھٹک کر آگے بڑھ جانے میں اس کے جذبات ہی نہیں بلکہ اس کا پورا وجود زخمی ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر مثنیٰ رضوی اس افسانہ پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''اقبال متین کی کہانی مسدود راستے ایک ایسی کہانی ہے جس کے متعلق اگر میں یہ کہوں کہ یہ کہانی انھوں نے اپنے خونِ دل سے لکھی ہے تو مبالغہ نہیں ہوگا۔ میں نے یہ کہانی کئی بار پڑھی ہے اور سانس روک کے پڑھی ہے۔ اب آپ خود سوچیے کہ جب قاری کا یہ حال ہے تو تخلیق کار کا کیا حال رہا ہوگا۔ کیا اس کی روح قلم کی نوک میں نہیں آگئی ہوگی؟ اس کہانی میں ان کے فن کا ایک مخصوص وصف یہ ہے کہ خارجی حقائق اور اشیاء کے ساتھ داخلی کوائف کا رشتہ احساس کی شدت اور گہرائی کو غیر معمولی قوت اظہار بخش دیتا ہے۔ قاری کو اپنے دل کی دھڑکنوں میں کبھی کہانی کہنے والے کے دل کی دھڑکنیں سنائی دینے لگتی ہیں اور کبھی کرداروں کے دل کی دھڑکنیں.... لگتا ہے کہانی نے اپنے آپ کو خود لکھوایا ہے۔ ایسی آمد، ایسی بے ساختگی۔ آخری وار تو ایسا بھرپور ہے کہ یادوں کا سارا درد اسی میں سمٹ آیا ہے۔ غم و آلام کے اتنے بھیانک طوفان سے گزرتے ہوئے بھی افسانہ نگار نے کہانی کا ایک تار بھی ٹوٹنے نہیں دیا ہے۔ درد کا آہنگ متناسب زیروبم کے ساتھ پہلے جملہ سے آخری جملہ تک ثابت و سالم ہے۔ کوئی جملہ زائد نہیں، کوئی لفظ فاضل نہیں۔'' (۱۰)

اس افسانے کا پلاٹ سیدھا سادہ ہونے کے باوجود جدت و ندرت لیے ہوئے ہے اور اس قدر چست و مربوط ہے کہ افسانہ اپنے آغاز ہی سے قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور ایک لمحہ کے لیے بھی اس کی توجہ کو ہٹنے نہیں دیتا بلکہ قاری پوری طرح کہانی کا ہو کر رہ جاتا ہے۔

''زمین کا درد'' نام کے افسانہ کا پلاٹ بھی منظّم اور گٹھا ہوا ہے۔ اس افسانے کی ابتدا درمیان سے ہوتی ہے۔ اس میں ایک غمزدہ باپ جس کے بیٹے کا انتقال ہو گیا ہے، کے رنج والم کو اُجاگر کرنے کے ساتھ عام انسانوں کی درد بھری زندگی کی عکاسی کی گئی ہے۔ افسانہ قبرستان کے منظر سے شروع ہوتا ہے جہاں مرکزی کردار اپنے مرحوم بیٹے کی یاد کو تازہ کرنے کے لیے جاتا ہے۔ اس قبرستان کے بغل میں اسے کھنڈر مکان نظر آتا ہے۔ اس کھنڈر مکان میں ایک عورت اپنی چھ جوان بیٹیوں کے ساتھ رہتی ہے جو غربت و تنگدستی کے مارے موت سے بدتر زندگی گزار رہی ہوتی ہے۔ یہ عورت راوی کے پاس آکر اسے

جھوٹی تسلی دیتی ہے۔ دوسری بار جب راوی اپنے بیٹے کی قبر پہ پہنچتا ہے تو اسے المناک صورت حال نظر آتی ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ کھنڈر میں رہنے والی عورت ایک قبر کے سامنے کھڑی ہے۔ یہ قبر اس کی بڑی بیٹی کی ہوتی ہے جس نے خودکشی کر لی ہے اور جس کا نومولود بچہ کھنڈر میں رو رہا ہوتا ہے۔ کھنڈر کی اس غربت زدہ اور دردناک زندگی کو دیکھ کر راوی کو یوں محسوس ہوتا ہے۔

> ''مجھے محسوس ہوا جیسے چاند مجھ سے پوچھ رہا ہے کہ تم لوگ مجھ تک پہنچ گئے ہو تو میں لرز رہا ہوں۔ خدارا زمین کے درد کو زمین ہی پر چھوڑ آؤ۔ اپنے سینوں میں چھپا کر اسے کبھی ساتھ نہ لے آنا۔ میرے سینے میں اتنی وسعت کہاں ہے جو زمین کا سارا دکھ سمیٹ سکوں۔'' (۱۱)

اس دردناک اقتباس پہ افسانہ کا اختتام ہوتا ہے۔ اس افسانہ کا پلاٹ مرکزی کردار کے درد بھرے احساسات کے گرد بنا گیا ہے لیکن بات ایسی ہنرمندی سے کہی گئی ہے کہ کہانی قاری کے دل کو چھو لیتی ہے۔

''درد کا رشتہ'' بھی اقبال متین کی موثر کہانی ہے۔ اس میں عام انسانوں کے درمیان دکھ درد کے بے نام رشتہ کی عکاسی کی گئی ہے۔ اس افسانہ کا پلاٹ راوی اور تاجی کے گرد بنا گیا ہے۔ دونوں کی ایک دوسرے سے ملاقات ریس کورس کے میدان میں ہوتی ہے جہاں راوی اپنی غربت وافلاس سے تنگ آ کر ریس کھیلنے جاتا ہے کہ شاید قسمت یاوری کرے مگر وہ بری طرح لٹ جاتا ہے۔ ایسے میں تاجی جو پیشہ ور عورت ہے، اسے سہارا دیتی ہے۔ دونوں کی دکھ بھری زندگی چند ہی لمحوں میں دونوں کو ایک دوسرے سے اس طرح قریب کرتی ہے اور دونوں کے درمیان ایسا گہرا لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کے درمیان کوئی گہرا رشتہ ہو۔ دونوں کے درمیان بے تکلفی بھی بڑھ جاتی ہے۔ یہ بے تکلفی یہاں تک بڑھتی ہے کہ تاجی، راوی کی جیب میں دس روپے کا نوٹ ڈال دیتی ہے تاکہ وہ ''نان کن'' میں بیٹھ کر شراب سے دل بہلائے اور اس کا انتظار کرے۔ یہاں سے افسانہ ایک نیا موڑ لیتا ہے۔ راوی کو تاجی کے حوصلے پر تعجب ہوتا ہے لیکن وہ زبان سے کچھ نہیں کہہ پاتا ہے۔ وہ 'نان کن' میں بیٹھ کر شراب پیتا ہے۔ جب وہ گھر جانے کے لیے بس اسٹینڈ کی راہ لے رہا ہوتا ہے تو پیچھے سے کسی کے ساتھ ٹیکسی میں سوار تاجی نمودار ہوتی ہے اور اس کے ہاتھ میں سو روپے کا نوٹ تھما کر واپس لوٹنے لگتی ہے۔ غور سے دیکھنے پر راوی کو پتہ چلتا ہے کہ تاجی اس کے مکان مالک کے ساتھ ہے۔ وہ جب تاجی کو نوٹ لوٹانے کی کوشش کرتا ہے

توتاجی بھرائی ہوئی آواز میں کہتی ہے۔''تمہارا مجھ سے رشتہ ہی کیا ہے''۔راوی ٹیکسی کے اندر نوٹ پھینک بھی نہیں پاتا ہے کہ تاجی بند دروازے کا شیشہ چڑھا لیتی ہے اور ٹیکسی آگے بڑھ جاتی ہے۔اب راوی بھی سوچنے لگتا ہے۔''واقعی تاجی کا میرا رشتہ ہی کیا ہے۔بس اسی قدر نا کہ میں ہمیشہ اس سے مل کر اداس ہو جاتا ہوں۔''

راوی اور تاجی کی باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں کے درمیان کوئی رشتہ نہیں ہے اور حقیقت میں نہیں ہے مگر ان دونوں کے درمیان کوئی رشتہ نہ ہوتے ہوئے بھی، دکھ درد کا وہ رشتہ ہے جو دونوں کو ایک دوسرے سے قریب کرتا ہے۔یہی وہ دکھ درد کا رشتہ ہے جو دنیا کے عام انسانوں کے درمیان لگاؤ اور قربت کا وسیلہ بنتا اور انھیں آپس میں جوڑے رکھتا ہے۔اسی احساس کو موضوع بنا کر یہ افسانہ لکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر مثنیٰ رضوی اس افسانہ کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> ''یہ کہانی فنی اعتبار سے بڑی خوبصورت اور پراثر کہانی ہے۔فن کار پہلے جملہ سے آخری جملہ تک قاری کی توجہ کو پوری طرح مرکوز رکھنے پر قادر نظر آتا ہے۔حالاں کہ یہاں سیدھا سادہ بیانیہ والا انداز نہیں ہے۔کہانی سنانے والا کبھی آگے بڑھتا ہے کبھی پیچھے لوٹتا ہے اس کے باوجود کہانی کے تسلسل میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا۔فن پر ایسی دسترس ہر کہانی کار کے بس میں نہیں ہوتی۔''(۱۲)

اس افسانے کا پلاٹ بہت ہی مضبوط اور گٹھا ہوا ہے۔پلاٹ کو آگے بڑھانے کے لیے مکالمہ اور مناظر سے بھی بھرپور مدد لی گئی ہے۔اس افسانے کے پلاٹ کو ترتیب دینے کے لیے افسانہ نگار نے مختلف قسم کے خیالات کو پیش کر کے واقعات کی صورت گری کی ہے۔اس طرح اس افسانے کا پلاٹ سیدھا سادہ ہونے کے باوجود تازگی اور ندرت کا بے پایاں حسن رکھتا ہے جو بغیر کسی پیچیدگی اور الجھاو کے معنی خیز انجام پر تکمیل پاتا ہے۔

''کاٹا ہوا نام'' کا شمار بھی اقبال متین کے نمائندہ افسانوں میں ہوتا ہے۔اس میں سرکاری محکمہ کی بدعنوانیوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔اس افسانہ کا پلاٹ ایک ایسے ہاسپٹل کے گرد ترتیب دیا گیا ہے جہاں نیچے سے لے کر اوپر تک سارے ملازم اتنے بدعنوان اور سنگدل ہیں کہ وہ مریضوں کی غذا اور دوا کے پیسے

ہڑپنے کے ساتھ زندہ مریضوں کو مُردہ لکھتے ہیں اور خانہ پری کے ذریعے لاشوں کی تعداد بڑھا کر غلط ڈھنگ سے پیسے کماتے ہیں۔ایسے ہاسپٹل میں ایک باضمیر، ایماندار انسپکشن افسر کی تعیناتی ہوتی ہے۔وہ ہاسپٹل کے بدعنوان اور سنگدل ماحول کو دیکھ کر اندر اندر کُڑھتا ہے۔وہ مریضوں سے محبت وانسانیت سے پیش آتا ہے اور ایمانداری سے اپنا فریضہ انجام دیتا ہے مگر رفتہ رفتہ ہاسپٹل کا گندہ ماحول اس پر بھی اثرانداز ہوجاتا ہے اور وہ بھی سنگدل ڈاکٹروں کی طرح ایک اچھے بھلے زندہ مریض کو مُردہ لکھ دیتا ہے۔ ہاسپٹل کے گندے اثر سے وہ بے ضمیری میں مبتلا تو ہوتا ہے لیکن افسانہ کا اختتام اس خوش گوار احساس کے ساتھ ہوتا ہے کہ اس کا ضمیر زندہ ہوجاتا ہے اور وہ اس نام کو کاٹ دیتا ہے۔اس افسانہ کا پلاٹ بھی کسا ہوا ہے۔ پلاٹ کو آگے بڑھانے کے لیے افسانہ نگار نے چند دوسرے کرداروں سے مدد لی ہے۔ یہ کردار افسانہ میں اس طرح پیش کیے گئے ہیں کہ کہانی کو فطری انداز میں آگے بڑھانے میں مدد دیتے ہیں۔ افسانہ کا مرکزی کردار، ہاسپٹل، نرس اور مریضوں کے بارے میں مختلف واقعات بیان کرتا ہے۔ان چھوٹے چھوٹے واقعات کو بھی افسانہ میں اس طرح پرویا گیا ہے کہ وہ کہانی کا جز ومعلوم ہوتے ہیں۔ افسانے کا پلاٹ اس چابکدستی سے بنا گیا ہے کہ کہیں بھی خلا کا احساس نہیں ہوتا اور شروع سے آخر تک روانی برقرار رہتی ہے۔افسانہ اپنے آغاز ہی سے قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور اختتام پہ اس کے ذہن ودل پر اپنا گہرا نقش چھوڑ جاتا ہے۔

''آنگن میں سہاگن'' بھی اقبال متین کا مشہور ومعروف افسانہ ہے۔اس کی ابتدا درمیان سے ہوتی ہے۔اس میں بمبئ کی جھگی جھونپڑی میں رہنے والی ایک نوبیاہتا لڑکی کی حسرت بھری زندگی کو دکھایا گیا ہے۔اس کی شادی کھولی ہی میں رہنے والے یونس میاں سے ہوتی ہے۔یونس میاں جنسی بے راہ روی کا شکار اور شرابی ہے۔اس غلط روش سے بچانے کے لیے اس کی ماں اس کی شادی کرادیتی ہے لیکن شادی کے بعد بھی اس کے اندر ذمہ داری کا احساس پیدا نہیں ہوتا۔وہ گھر والوں کو ایک پیسہ دیتا ہے نہ اپنی بیوی کے ساتھ رہنے کے لیے کوئی کھولی کرایہ پر لیتا ہے، بلکہ اپنی ماں، بھائی بہنوں کے ساتھ جس تنگ کھولی میں رہتا ہے، اسی کے ایک کونے میں پردہ ٹانگ کر اپنی بیوی کے ساتھ سوتا اور جنسی تسکین حاصل کرتا ہے۔اس طرح پردہ کے پیچھے اسے اپنی بیوی کے ساتھ سوتے اور جنسی حظ اٹھاتے ہوئے دیکھ کر اس کی

چار جوان بہنیں جو پاس ہی پڑی سورہی ہوتی ہیں، رات بھر جنس کی آگ میں تڑپتی اور کراہ رہی ہوتی ہیں جن کی حالت ان کی بوڑھی ماں سے جب نہیں دیکھی جاتی تو وہ صبح ہوتے ہی پردے کونوچ پھینکتی اور بہوکو کوسنے لگتی ہے۔اسی بات پر ایک دن یونس میاں کا اپنی ماں سے جھگڑا ہوجاتا ہے اور گالی گلوج تک کی نوبت آجاتی ہے۔اس کے بعد اس کی بیوی میکے چلی جاتی ہے۔یونس میاں جب سسرال پہنچتا ہے تو وہاں بھی اس کی ساس اس کی غیر ذمہ داری پر برہم ہوتی، اسے اپنی بیوی کو خرچ دینے کے لیے کہتی ہے۔یہی نہیں داماد ہونے کے ناطے وہ اس کی مہمان نوازی کرنے کے بجائے اس سے کھانے تک کے پیسے کا مطالبہ کرتی ہے۔اس کی وجہ سے یونس میاں سسرال کو بھی خیر باد کہتا ہے اور پھر سے پہلے کی طرح بازاری عورتوں کا سہارا لیتا ہے۔اس کی جدائی میں اس کی بیوی جنسی گھٹن کا شکار ہوجاتی ہے اور اس پر نیم جنونی کیفیت طاری ہونے لگتی ہے۔ یہاں سے کہانی نیا موڑ لیتی ہے۔نوبیاہتا لڑکی کی ماں اس کا روحانی علاج کرانے کے لیے اسے حاجی علی بابا کے مزار پر لے کر جاتی ہے۔وہاں سے واپسی کے بعد وہ چالاکی سے کام لیتے ہوئے اس بات کی تشہیر کر دیتی ہے کہ اس کی بیٹی کو حاجی علی بابا نے نواز دیا ہے۔ وہ کمال ہوشیاری سے مذہب کے نام پر اس کا استعمال کمائی کے لیے کرنے لگتی ہے، جبکہ اس کی بیٹی حسرت وغم کے مارے اندر اندر سسکتی رہتی ہے۔اس کی غربت زدہ زندگی اور اس کے شوہر کی بے راہ روی، ان دونوں کے درمیان رشتوں کو سلامت ہی نہیں رہنے دیتی، بلکہ ان کی زندگی کو ویرانیوں اور محرومیوں کی نذر کر دیتی ہے۔اس المناک انجام پہ افسانہ کا اختتام ہوتا ہے۔

اس افسانہ کا پلاٹ اسی نوبیاہتا لڑکی اور اس کے شوہر یونس میاں کے گرد بنا گیا ہے۔اس پلاٹ کو آگے بڑھانے کے لیے افسانہ نگار نے کرداروں کی سوچ، مکالموں، مناظر اور چند ضمنی کرداروں سے بھرپور مدد لی ہے۔ یہ مکالمے، مناظر اور کردار فطری انداز میں پیش کیے گئے ہیں جو کہ نہ صرف کہانی کا جزو معلوم ہوتے ہیں بلکہ پلاٹ کو آگے بڑھانے میں مدد دیتے ہیں۔اس افسانہ کے پلاٹ کو بننے کے لیے افسانہ نگار نے کرداروں کے جذبات واحساسات اور ان کے ردعمل کو پیش کر کے واقعات کی صورت گری کی ہے۔ یہ ایک طویل افسانہ ہے جس میں مختلف قسم کے واقعات بیان کیے گئے ہیں مگر تمام واقعات کو اس مربوط انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ ایک واقعہ سے دوسرا، دوسرے سے تیسرا واقعہ جنم لیتا ہے اور کہانی

بتدریج آگے بڑھتی ہے۔کوئی واقعہ غیر ضروری محسوس نہیں ہوتا بلکہ سارے واقعات کہانی کے بطن سے پھوٹتے ہیں اور کہانی کی تاثیر میں اضافہ کا سبب بنتے ہیں۔افسانہ کے پلاٹ میں کسی قسم کے مصنوعی پن کا احساس نہیں ہوتا۔افسانہ نگار نے اس افسانہ کا پلاٹ اپنے آپ کو بمبئی کی جھگی جھونپڑی کے ماحول سے ہم آہنگ کرکے اس فنی ہنرمندی سے ترتیب دیا ہے کہ اس ماحول اور اس ماحول میں ایک نوبیاہتا لڑکی کی ویران زندگی اور اس کے درد وکرب کی پوری تصویر واضح ہوکر سامنے آجاتی ہے۔ڈاکٹر عشرت رومانی اس افسانے کی خوبی پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آنگن میں سہاگن'' ایک طویل افسانہ ہے جس میں اقبال متین نے اس انداز سے طوالت کی حد بندی کی ہے کہ وہ افسانے کے موضوع پر اثرانداز نہ ہو۔ دوسری جانب میاں بیوی کے رشتے سے متعلق انہوں نے قلم کو سنبھال کر جس انداز سے افسانہ لکھا ہے اس سے ان کی ذہنی پختگی اور کشادگی کا احساس ہوتا ہے۔میرا خیال ہے کہ اقبال متین نے تخلیق کی سطح پر محتاط رویہ اختیار کیا ہے۔یہی ان کا کمال ہے بلکہ کمال فن ہے''۔(۱۳)

اقبال متین کے یہ افسانے اپنے دلچسپ پلاٹ کی وجہ سے جانے جاتے ہیں۔ان افسانوں کی خوبی اور دلکشی پلاٹ کی جدت وندرت اور اس کی فنکارانہ تعمیر وتشکیل میں مضمر ہے۔ان افسانوں کے پلاٹ کی بنت میں اہم اور ضروری واقعات سے مدد لی گئی ہے اور غیر ضروری واقعات کی شمولیت سے مکمل گریز کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان افسانوں میں وحدت تاثر پوری طرح پایا جاتا ہے۔ان افسانوں کی تخلیق اور واقعات کی ترتیب میں اقبال متین نے جس فنی مہارت کا مظاہرہ کیا ہے، وہ افسانہ کے فن پر ان کی گرفت کا ثبوت ہے۔

اقبال متین کے یہاں کچھ افسانے بغیر پلاٹ کے بھی ملتے ہیں۔''نچا ہوا البم''، ''اتھل پانیوں کے سودائی''، ''خالی پٹاریوں کا مداری'' اور ''بے دلی اپنا پتہ پوچھے ہے'' ایسے ہی افسانے ہیں۔ یہ افسانے پلاٹ سے عاری ہونے کے باوجود کہانی پن سے یکسر خالی نہیں ہیں۔ایسے افسانے اقبال متین کے یہاں پائے تو جاتے ہیں مگر بہت کم۔اس کے برعکس ان کے بیشتر افسانوں میں پلاٹ کا اہتمام پایا جاتا ہے۔ ان کے ابتدائی افسانوں میں پلاٹ ڈھیلا ڈھالا ہے۔یہی صورت ان افسانوں میں بھی نظر آتی ہے جو انھوں نے رواروی میں یا معاوضے وغیرہ کے لیے لکھے تھے۔ان کے یہاں بہتر پلاٹ ان کے نمائندہ

افسانوں ہی میں نظر آتے ہیں جن کے جائزہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ پلاٹ کی تعمیر و تشکیل میں انھیں غیر معمولی مہارت حاصل ہے۔

کردار نگاری:

کردار نگاری کے اعتبار سے بھی اقبال متین کے افسانے قابل قدر ہیں۔ ان کے بعض افسانے ایسے ہیں جن کے کردار ذہن پر لافانی نقوش مرتب کرتے ہیں۔ ایسے کرداروں میں 'شیبا'، 'چھگن چاچا'، 'برہان قاطع'، 'رام دیال'، 'رضیہ چچی'، 'منور میاں' اور خان صاحب خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

افسانہ کا فنی تجزیہ کرتے وقت ہماری نظر پلاٹ کے بعد کرداروں پر جاتی ہے کیوں کہ کردار نگاری افسانہ کا ایک اہم جز ہے۔ افسانے کا کینوس چوں کہ چھوٹا ہوتا ہے اور تکنیک نازک، اس لیے افسانہ طوالت کا متحمل نہیں ہوسکتا اور اس میں کرداروں کی مکمل تصویر کشی ممکن نہیں بلکہ کہیں کہیں صرف ایک جھلک ہی دکھائی جاسکتی ہے۔ لیکن افسانہ نگار اشاروں اشاروں میں کردار کی پوری زندگی کا نقشہ کھینچ دیتا ہے۔ یہ کام وہی افسانہ نگار کرسکتا ہے جو اپنے کرداروں کے ایک ایک پہلو سے اچھی طرح واقف ہو اور انھیں سلیقہ سے پیش کرنے کا ہنر آتا ہو۔ اگر افسانہ نگار ان خصوصیات سے متصف ہے تو وہ اپنے افسانوں میں کردار نگاری کے بہتر نمونے پیش کرسکتا ہے۔ جب ہم اقبال متین کے کرداروں پر نظر ڈالتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ وہ ان خصوصیات سے متصف ہیں اور اپنے کرداروں کی تشکیل اس فنی ہنرمندی سے کرتے ہیں کہ وہ افسانوی ہوتے ہوئے بھی حقیقی معلوم ہوتے ہیں۔

اقبال متین نے اردو افسانے کو مختلف النوع کردار دیئے ہیں جو اسی دنیا کے باسی ہیں۔ ان کے کردار زندہ اور متحرک ہوتے ہیں۔ وہ محض خوبیوں کا مجسمہ ہوتے ہیں، نہ محض خامیوں کا، بلکہ فطری انداز میں سامنے آتے ہیں۔ عابد سہیل اقبال متین کے کرداروں کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''ان کے کردار زندہ، متحرک ہوتے ہیں اور ان میں وہ یک رنگی نہیں پائی جاتی جو ہیئت اور کسی ادبی یا سیاسی نظریہ پر فن کو قربان کردینے سے پیدا ہوجاتی ہے۔ ان کے کرداروں میں وہ سارا تضاد پایا جاتا ہے جو زندگی سے عبارت ہے۔ ان میں نہ کوئی مکمل شیطان ہے نہ کوئی مکمل فرشتہ، سب انسان ہیں۔ فرشتہ صفت کردار ہمیں اچھے لگتے ہیں لیکن شیطان صفت کرداروں سے ہمیں

نفرت نہیں ہوتی اور وہ حالات جنھوں نے ان کو ایسا بنا دیا ہے، اس کردار اور ہمارے درمیان آ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔"(۱۴)

اقبال متین اپنے کرداروں کے ساتھ برسوں ذہنی سفر کرتے ہیں اور جب پورے طور سے وہ ان کے ذہن میں رچ بس جاتے ہیں، تب انھیں کاغذ پر اتارتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کردار دیکھے بھالے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، اجنبی نہیں لگتے۔ معروف فکشن نگار نورالحسنین لکھتے ہیں:

"ان کے کرداروں سے مل کر اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا، بلکہ وہ اپنے اطراف و اکناف میں سانسیں لیتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں متمول افراد بھی ہیں، درمیانی طبقہ بھی ہے، لٹے پٹے نواب، جاگیردار اور زمیندار بھی ہیں، سرکاری عہدہ دار بھی ہیں اور وہ افراد بھی ہیں جو بظاہر ہماری زندگیوں میں شامل ہوتے ہوئے بھی ہماری فکر کا حصہ نہیں بنتے۔"(۱۵)

اقبال متین انسانی نفسیات کے نباض ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں کرداروں کی شخصیت کی پیچیدہ تہوں کی گتھیاں اس طرح کھولتے ہیں جیسے کوئی ماہر نفسیات ہو۔ اردو کے معتبر ناقد شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

"اقبال متین کی نفسیاتی گرفت اس قدر سچی اور مضبوط ہے کہ ان کے افسانوں کے کرداروں کی داخلی زندگی آئینہ ہوکر ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔"(۱۶)

اقبال متین نے اپنے اردگرد کی زندگی سے عام انسانوں کے کرداروں کو چُنا ہے جن سے مل کر ہم سرسری گزر جاتے ہیں اور ہمیں ان میں کوئی خاص بات نظر نہیں آتی لیکن ان عام انسانوں کو جب اقبال متین اپنے افسانوں میں کردار کی شکل میں پیش کرتے ہیں تو ہم ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ قیصر سرمست لکھتے ہیں:

"انہوں (اقبال متین) نے ہم سے جیتے جاگتے انسانوں کو بھی افسانوی جامہ پہنا دیا ہے اور یہ وہی کردار ہیں جنہیں آپ اور ہم روز دیکھتے ہیں، اکثر ملتے ہیں یہ اور بات ہے کہ ہم ان سے متاثر ہوئے بغیر بے نیازانہ گزر جاتے ہیں۔ ان کرداروں سے اثر قبول نہ کرنے کی وجہ شاید یہ ہو کہ ہم ان میں کوئی خاص بات نہیں پاتے لیکن ان ہی جانے پہچانے کرداروں کو جب اقبال متین افسانوں کا قالب دے دیتے ہیں تو ہم نہ صرف ان سے متاثر

ہوتے ہیں بلکہ ہماری آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔ان کرداروں کے جذبات،
احساسات، خیالات اور کیفیات اقبال متین کی نظروں میں ہوتے ہیں یا
یوں سمجھئے کہ ان کرداروں کا ذہن اقبال متین کے لئے کھلی کتاب ہوتا ہے۔
جیسے وہ بڑے انہاک سے اور ہر سطر پر انگلی رکھ کر پڑھتے ہیں تا کہ ایک لفظ
بھی چھوٹنے نہ پائے۔''(۱۷)

اپنے کرداروں کے ساتھ اقبال متین کا تخلیقی رشتہ بہت گہرا اور سچّا ہے۔ وہ جن کرداروں پر لکھتے ہیں، باریک بینی سے ان کا مطالعہ کرتے ہیں، ان کے ظاہر و باطن سے پوری طرح واقف ہوتے ہیں، بہت قریب سے شدت کے ساتھ انھیں محسوس کرتے ہیں، بلکہ خود کردار کا حصّہ بن جاتے ہیں، پھر پوری ذمہ داری اور جزئیات نگاری کے ہمراہ ان کرداروں کے خارجی و داخلی دونوں رُخ پیش کرتے ہیں۔ اس طرح ان کے کردار اکہرے پن کا شکار ہونے سے بچ جاتے ہیں۔ یہ ایک طرح سے ان کی انفرادیت بھی ہے اور ندرت و کمال بھی۔ حفظ الکبیر قریشی، اقبال متین کی کردار نگاری پر اپنی رائے کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

''اقبال متین کو کردار نگاری میں ملکہ حاصل ہے اور جنہیں اس کی کہانیاں
پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے وہ اس کی کردار نگاری سے انکار نہیں کرسکتے۔
''چاچا چھگن''، ''نواب صاحب''، ''رام دیال''، ''ماسٹر''، ''بیگم''، ''اپنی''
اور ''رضیہ چچی'' بڑے ہی جاندار اور توانا کردار ہیں۔ یہ کردار اس نے
حیدرآباد کے مختلف سماجی طبقات سے ڈھونڈ نکالے ہیں اور ہمیں اور آپ کو
ان کی اصلی زندگی سے متعارف کرایا ہے۔ یہ کردار اپنی اصلی زندگی میں اتنے
واضح ہیں کہ ذرا سی تلاش وجستجو کے بعد آپ انہیں اپنے اڑوس پڑوس میں
چلتے پھرتے دیکھ سکتے ہیں۔''(۱۸)

سلیمان اریب اقبال متین کے پہلے افسانوی مجموعہ ''اُجلی پرچھائیاں'' کا مقدمہ لکھتے ہوئے ان کی کردار نگاری کے فن پر اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں:

''وہ کہانی کے ضروری اجزا کے ساتھ دوسرے فنّی نکات پر بھی پوری توجہ
صرف کرتا ہے اور خاص طور پر کردار نگاری اور جزئیات نگاری میں تو اسے
یدطولیٰ حاصل ہے۔ وہ اپنی کہانی کے لیے کبھی کوئی ایسا کردار نہیں چُنے گا جس
سے نہ مل چکا ہو بلکہ جب تک خود کردار کی طرف سے یہ اصرار نہ ہو کہ جب تم
مجھ سے، مجھ سے زیادہ واقف ہو تو پھر مجھ پر کیوں نہیں لکھتے۔ اس پر اقبال

متین کہے گا کہ تمہاری خواہش ہوتو میں تم پر آج ہی کہانی لکھوں گا مگر ایک شرط پر کہ میرا کیمرہ جس میں ایکسرے کی مشین بھی لگی ہے اگر تمہارے ظاہری خدوخال کے ساتھ تمہاری روح کے ڈھکے چھپے گوشوں کو بھی اجاگر کردے تو مجھے بُرا بھلا نہ کہنا اور جب کردار کی طرف سے اقبال متین کو اجازت مل جائے گی تو پھر وہ بڑی بیدردی اور بڑی ہمدردی سے اس کردار کو کاغذ پر منتقل کردے گا۔ چنانچہ آپ چھگن چاچا سے گاؤں میں ملیے یا برہان سے اسٹیشن والی سڑک پر، رام دیال سے آروند گھوش کی تعلیمات پر تبادلۂ خیال کیجئے یا شیکھر کے ساتھ ہرن کے شکار پر جائیے، بیگم سے راست اس کے جسم کا مول تول کیجئے یا ہارڈنگ کے ساتھ کوالٹی میں آخری بار وہسکی پیجئے، آپ کو کوئی کردار اجنبی نہیں لگے گا۔ سب آپ کے شناسا، دوست، عزیز، رشتہ دار اور پیارے نکلیں گے اور ہوسکتا ہے کہ کسی کردار کے روپ میں آپ کو خود اقبال متین نظر آجائے اور آپ جھجک کے پیچھے ہٹ جائیں۔ اگر کہانی میں کردار نگاری کی کوئی اہمیت ہے اور اپنے زندہ کرداروں کے بل بوتے پر کوئی افسانہ نگار زندہ رہ سکتا ہے تو اس مجموعے کی حد تک ہی چھگن چاچا، برہان، ماسٹر صاحب اور رام دیال اقبال متین کو زندہ رکھنے کے لیے کافی ہیں۔‘‘ (۱۹)

جیسا کہ مذکورہ اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال متین کے افسانوں میں ان کے سوانحی کردار بھی ملتے ہیں مگر یہ کردار ذاتی نہ رہ کر عمومی صورت اختیار کر جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کردار افسانہ نگار کے محض سوانحی واقعات یا نظریات کی تبلیغ نہیں کرتے، بلکہ اپنے ہر عمل کا جواز رکھتے ہیں اور اپنی زندگی کے واقعات فن کے دائرے میں رہ کر بیان کرتے ہیں جو انسانی ہمدردی کی شکل اختیار کر جاتے ہیں۔

اقبال متین کے افسانوں کے بیشتر کردار متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے کچھ کرداروں کا تعلق جاگیردارانہ معاشرہ سے ہے۔ ان کے علاوہ نچلے متوسط طبقے کے کردار اور عورتوں کے کردار بھی ان کے یہاں پائے جاتے ہیں۔ ان تمام کرداروں کی نفسیات و معاملات کے نازک پہلوؤں کو وہ بڑے فنکارانہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کردار اپنے طبقے کی نمائندگی بھی کرتے ہیں اور ان تمام پیچیدگیوں اور نیرنگیوں کے ساتھ ہمارے سامنے جلوہ گر ہوتے ہیں جو فطرت انسانی کا تقاضہ ہیں۔ وہ اپنے کرداروں کی نفسیات و معاملات کا اظہار براہ راست نہیں کرتے بلکہ ایمائی طور پر کرتے

ہیں۔ وہ ایمائی انداز میں کرداروں کے ذریعے اپنا نقطۂ نظر بھی واضح کرتے ہیں مگر وہ اپنے خیالات کرداروں پر تھوپتے ہیں، نہ انھیں کٹھ پتلی کی طرح نچاتے ہیں، بلکہ انھیں آزادانہ فضا میں سانس لینے اور سوچنے کا موقع دیتے ہیں۔ وہ اپنے تخلیق کردہ کرداروں کو اچانک اس طرح سامنے نہیں لاتے کہ افسانہ کا قاری حیرت واستعجاب میں مبتلا ہو جائے، بلکہ وہ ایک ماہر فن کار کی طرح فضا ہموار کرتے ہیں اور افسانہ کی سچویشن کے مطابق کرداروں کے چہرے پر پڑی ہوئی نقابیں ایک ایک کر کے اتارتے ہیں اور انھیں اس طرح پیش کرتے ہیں کہ وہ کہانی سے نکل کر قاری کے ذہن میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ ان کے کرداروں میں ارتقاء بھی ملتا ہے، تہذیب کی نمائندگی بھی، زندگی کرنے کا جذبہ بھی، بے راہ روی کا ماتم بھی اور غموں کو نباہنے کا حوصلہ بھی۔

اقبال متین کے افسانوں میں اگر کردار کی بات کی جائے تو ان کے تمام افسانوں میں کردار پائے جاتے ہیں لیکن ان کے کچھ افسانے کرداروں کے گرد گردش کرتے نظر آتے ہیں۔ ایسے کردار مرکوز افسانوں میں ''چھگن چاچا''، ''ایک پھول، ایک تتلی''، ''رابی اپیا''، ''شیبا''، ''برہان قاطع''، ''شکن در شکن''، ''بیمار''، ''کتاب سے کتبے تک'' اور ''اجنبی'' قابل ذکر ہیں۔ یہ افسانے کرداری افسانے ہیں جو اپنے کرداروں کی وجہ سے جانے جاتے ہیں۔

افسانہ ''چھگن چاچا'' اپنے مرکزی کردار چھگن چاچا کے گرد طواف کرتا ہے۔ چھگن چاچا گاؤں کے ہنس مکھ، کھلنڈرے اور زندہ دل انسان ہیں۔ وہ انتہائی ملنسار، سخی دوسروں کے ہمدرد و خیر خواہ ہیں۔ دوسروں کے دکھ درد میں کام آنا، ان کی مدد کرنا وہ اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ وہ اپنے گاؤں 'اوجنی' میں لوگوں کے درمیان جھگڑے چکاتے پھرتے ہیں اور میل ملاپ پیدا کر دیتے ہیں۔ غرض یہ کہ چاچا میں بے شمار خوبیاں ہیں اور ان ہی خوبیوں کے سبب وہ اپنے گاؤں کی زندگی کا مرکز ومحور بن جاتے ہیں۔

> ''چاچا کیا تھے گاؤں والوں کا دل تھے۔ ہمدرد اتنے کہ ہر کسی کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھتے۔ کبھی انھوں نے کسی کی مدد کرنے سے دریغ نہیں کیا بلکہ سچ پوچھئے تو وہ ایسے وقت کی تلاش میں رہتے کہ انھیں کسی کی خدمت کرنے کا موقع ملے۔ آپ یقین کیجئے جب وہ ہمیں حکایات شیریں میں چھُپ چھُپ کر گھروں میں تھیلیاں پھینکنے والے وزیر کا قصّہ پڑھاتے تو میں اس وزیر کو

چاچا کے روپ میں دیکھنے لگتا۔‘‘(۲۰)

جھگن چاچا، گاؤں والوں کو آپس میں جوڑے رکھتے ہیں اور ان کی زندگیوں میں خوشیاں بکھیرتے ہیں۔ ان ہی اوصاف کی بنا پر وہ گاؤں میں انسان کے روپ میں دیوتا سمجھے جاتے ہیں۔ چاچا ظاہری طور پر تو بہت خوش نظر آتے ہیں مگر اپنی اکلوتی بیٹی مالتی کے مستقبل کی فکر انھیں گھن کی طرح کھائے جا رہی ہے۔ ان کی بیٹی، ایک شرابی، جواری سے بیاہی گئی ہے جہاں اس کی زندگی تلخیوں میں گھر گئی ہے۔ اپنی بیٹی کے غم میں چاچا اندر اندر گھلتے رہتے ہیں لیکن اس دکھ کو وہ کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیتے۔ ایک مرتبہ ان کی بیٹی بیمار پڑ کر موت کے منہ میں چلی جاتی ہے۔ انھیں اس کے علاج کے لیے ایک ہزار روپیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ اپنے گاؤں کے بنیے برج لال سے قرض مانگتے ہیں لیکن ان کی منت سماجت کچھ کام نہیں آتی ہے۔ مجبوراً چاچا رات میں برج لال بنیے کے یہاں نقب لگا کر پندرہ سو روپے حاصل کرتے ہیں اور اپنی بیٹی کے پاس چلے جاتے ہیں۔ یہاں جھگن چاچا کی تصویر کا دوسرا رُخ سامنے آتا ہے جسے دیکھ کر ہمیں چاچا سے نفرت نہیں ہوتی، بلکہ ان کی مجبوریوں اور محرومیوں کو دیکھ کر ان سے بے پناہ ہمدردی ہونے لگتی ہے۔ اگر افسانہ میں جھگن چاچا کی تصویر کے دوسرے رُخ کو پیش نہیں کیا جاتا تو ان کا کردار حقیقت سے دور جا پڑتا اور مٹی کا مادھو ہو کر رہ جاتا۔

اس کردار کے ذریعے افسانہ نگار نے انسان کو بحیثیت انسان دکھایا ہے جس کی اپنی مجبوریاں، محرومیاں ہیں اور جو حالات کے سامنے بے بس ہے۔ افسانہ کے شروع میں ہم اس کردار سے دوسرے طریقے سے متعارف ہوتے ہیں اور افسانہ کے آخر میں اس کا ایک دوسرا پہلو سامنے آتا ہے مگر اس کے لیے افسانہ میں جواز بھی ہوتا ہے۔ اس لیے یہ کردار بالکل حقیقی اور فطری انداز میں سامنے آتا ہے۔ یہ کردار اقبال متین کا زندہ و توانا کردار ہے جسے انہوں نے اس فنی ہنرمندی اور دردمندی سے پیش کیا ہے کہ اس سے ہمیں ہمدردی ہوتی ہے اور یہ کردار ہمارے ذہن پر ایک گہرا نقش بھی چھوڑ جاتا ہے۔ وحید اختر اس کردار کے تعلق سے لکھتے ہیں:

> ’’جھگن چاچا‘‘ کا مرکزی کردار اتنا جاندار اور بھرپور ہے کہ جدید افسانہ نگاری کے ان چند مستقل کرداروں میں اس کا شمار ہو سکتا ہے جو عرصہ تک یاد رکھے جائیں گے۔ اس کردار نے پڑھنے والوں کو اتنا متاثر کیا کہ بعد میں

اسی قسم کے کرداروں کو مرکز بنا کر بعض دوسرے افسانہ نگاروں نے بھی
کہانیاں لکھیں۔'' (۲۱)

افسانہ ''ایک پھول، ایک تتلی'' اپنے مرکزی کردار رضیہ چچی کے گرد گھومتا ہے۔ یہ بھی اقبال متین کا ایک انوکھا کردار ہے جسے پراثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ 'چھگن چاچا' کی طرح رضیہ چچی کا کردار بھی ایثار و محبت کا کردار ہے۔ یہ ہندوستانی تہذیب کی بہترین روایات میں ڈھلی ہوئی ایک ایسی عورت کا کردار ہے جو خلوص و ہمدردی کا ایک خوبصورت پیکر ہے۔ دوسروں کے دُکھ درد میں کام آنا چھگن چاچا کی طرح رضیہ چچی کا بھی شیوہ ہے۔ رضیہ چچی صلہ وستائش سے بے نیاز ہو کر خاندان کے ہر فرد سے خلوص و ہمدردی سے پیش آتیں، اس پر اپنی محبت نچھاور کرتی ہیں۔ وہ خاندان کے چھوٹے بڑے، ہر ایک کی خدمت کرتی ہیں۔ ان کی شخصیت کی ایک جھلک افسانہ نگار کے لفظوں میں ملاحظہ ہو:

''خدمت، خدمت، خدمت، اپنے سے چھوٹوں کی خدمت کر رہی ہیں، برابرداروں کی خدمت کر رہی ہیں۔ بزرگ تو بزرگ ہی ٹھہرے۔ نہ ستائش کی پروانہ صلے کی طلب۔ نیکی تقسیم ہو رہی تھی۔ اب جس کے دامن میں جتنی گنجائش رہے سمیٹ لے، جس کی جھولی جتنی وسیع ہو بھرے اور چچا میاں نے سب سے زیادہ سمیٹا، سب سے زیادہ بھر لیا...... تقریب میں جاتیں، دکھ بیماری میں جاتیں، جہاں اور جس وقت جاتیں اس طرح جاتیں جیسے خوشی سب کی ہو تو سب کی نہ ہوئی بس انہیں کی ہوئی۔ غم سب کا ہو تو سب کا نہ ہوا بس انہیں کا ہوا۔'' (۲۲)

رضیہ چچی پورے خاندان کو اپنی ذات سے فائدہ پہنچاتی ہیں۔ وہ، اچھے برے کی تخصیص کیے بغیر ہر ایک کے غم کو مل بانٹ کر ہلکا کرتیں اور اسے سکون پہنچانے کی کوشش کرتی ہیں۔ ان ہی خوبیوں کے سبب وہ اپنے خاندان کے لیے شجر سایہ دار کی حیثیت رکھتی ہیں:

''بس رضیہ چچی کو یوں سمجھیے جیسے نیم کا بہت بڑا اور گھنا پیڑ ہوں۔ ننھی منی فاختائیں اس پیڑ کی شاخ پر آ بیٹھیں تب بھی یہ پیڑ اپنے ٹھنڈے ٹھنڈے سایوں کی شانتی دے گا۔ موٹے تازے گدھ اس پیڑ کی شاخ پر آ بیٹھیں تب بھی یہ پیڑ اپنے ٹھنڈے ٹھنڈے سایوں کی شانتی دے گا۔'' (۲۳)

رضیہ چچی خاندان کے ہر فرد کو سکھ پہنچاتیں اور اس کے غم کو ہلکا کرتی ہیں مگر ان کا بھی ذاتی غم اور ذاتی

محرومی ہے۔افسانہ نگار ان کی ذات میں چھپے ہوئے جو ہر قاری کے سامنے رکھنے کے بعد ان کی محرومیوں پر یوں روشنی ڈالتا ہے۔

''دو دو حمل ٹھہرے دونوں ہی ساقط ہوگئے۔ رضیہ چچی پھوٹ پھوٹ کر روئیں۔ بلک بلک کر تڑپیں لیکن مولا کی مرضی میں کون دخیل ہوسکتا ہے بھلا۔'' پتہ نہیں میں کون سے گناہوں کا خمیازہ بھگت رہی ہوں۔'' کبھی رضیہ چچی نے ایسی بات کی بھی تو کچھ اس انداز سے کی جیسے اپنے گناہ انہیں معلوم ہیں۔اور پھر انہوں نے کبھی ایسی بات کی ہی نہیں۔'' (۲۴)

رضیہ چچی خود تو اولاد کی نعمتوں سے محروم ہیں مگر وہ اپنی محرومی اور غم کو بھلا کر پورے خاندان میں محبت کی روشنی بکھیرتیں، ہر ایک پر اپنی ذات کو نچھاور کرتیں اور اس کے دکھ کی گھڑی میں کام آتی ہیں۔ یہ ان کی زندگی کا مقصد بن جاتا ہے اور یہی ان کی شخصیت کی انفرادیت بھی ہے جسے افسانہ نگار نے اس خوبی سے اُجاگر کیا ہے کہ ان کی شخصیت بڑے دلآویز انداز میں سامنے آتی ہے جو قاری کے دل کو چھو لیتی ہے۔

افسانہ ''رابی اپیا'' تپ دق کی شکار عورت 'رابی اپیا' کے گرد گردش کرتا ہے اور ان کے کردار کو حقیقی انداز میں سامنے لاتا ہے۔ رابی اپیا کا کردار ایک وفا شعار بیوی اور فرض شناس عورت کا کردار ہے۔ وہ اپنے گھر کو جنت کا نمونہ بناتی ہیں۔ان کی ذات اپنے شوہر حارث اور بیٹی لاڈلی کے لیے ایک سائبان کا درجہ رکھتی ہے کہ اچانک ان پہ تپ دق جیسے موذی مرض کا حملہ ہوتا ہے۔اس مرض کی وجہ سے وہ اپنے جگر کی ٹھنڈک لاڈلی کو اپنے قریب نہیں آنے دیتیں کہ کہیں اس کو بھی نہ مرض لاحق ہوجائے مگر ایسا کرنے میں ان کی ممتا بری طرح مجروح ہوتی ہے۔ وہ اپنی لاڈلی کے قرب کے لیے تڑپتی رہتی ہیں۔اب رابی اپیا اپنے ہی گھر میں ایک زندہ لاش بن جاتی ہیں اور اپنے بستر پر مجبور و بے بس وجود کی طرح قابل رحم زندگی گذارنے پر مجبور ہوتی ہیں۔

''وہ جس کے اشارے پر گھر کی کایا پلٹ ہوجاتی تھی۔اب ہر ایک کے رحم و کرم کا منتظر تھا۔بس کوئی شئے اس کے اپنے بس میں تھی تو وہ زخمی مسکراہٹ تھی جو سوکھے ہونٹوں پر یوں معلوم ہوتی جیسے تڑخی ہوئی زمین پر پیلی پیلی دھوپ کا سماں۔اور اس مسکراہٹ کو رابی اپیا نے کچھ اتنی مجبوری سے اپنے ہونٹوں پر ضرورتاً بکھیر لینے کا اہتمام کر رکھا تھا کہ انہیں مسکراتا ہوا دیکھ کر

وحشت سی ہوتی تھی جیسے کوئی سچائی کا منھ بند کر کے چیخ چیخ کر جھوٹ کہہ رہا ہو۔'' (۲۵)

رابی اپیا زندہ ضرور ہیں۔ وہ اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی بکھیرنے کا اہتمام کرتی ہیں مگر ان کی حالت افسانہ کے راوی کے لیے اتنی اذیت ناک ہے کہ وہ یوں سوچنے لگتا ہے۔

''اس وقت اگر میں تمھیں کچھ دے سکتا رابی اپیا تو موت دے دیتا۔ اور تم جانتی ہو کہ تمہارے لیے اس سے زیادہ خوبصورت کوئی تحفہ نہیں ہے، لیکن ہم سب بندے عاجز ہیں، مجبور ہیں۔ کسی کو موت بھی تو نہیں دے سکتے۔'' (۲۶)

رابی اپیا خلوص و محبت، ایثار و ہمدردی کی پیکر ہوتی ہیں۔ وہ اپنی خوبیوں سے کام لے کر دوسروں کی زندگی میں رنگ بھرتی ہیں لیکن حالات کی ستم ظریفی کا شکار ہو کر وہ زندگی سے دور ہو جاتیں اور جیتے جی لاش بن جاتی ہیں۔ ایسی حالت میں بھی وہ مسکراتی ہیں کہ دوسروں کو خوشی ملے۔ ان کی خوبیوں، ان کی المناک زندگی، دردناک جذبات واحساسات اور نفسیاتی کیفیات کو افسانہ نگار نے اس فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے کہ قاری ان کے درد میں شریک ہو جاتا ہے اور ان کی خوبیوں سے بھی بے حد متاثر ہوتا ہے۔ اس کردار اور رضیہ چچی اور چھگن چاچا کے کردار کے بارے میں ڈاکٹر احمد طارق اپنے تاثرات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

''یہ کردار شرافت، محبت، خلوص، ایثار، ہمدردی، وفاشعاری، کشادہ دلی، وسیع النظری اور رواداری جیسی اعلیٰ تہذیبی اور سماجی قدروں کے جیتے جاگتے پیکر ہیں۔ ان کی زندگی کا نصب العین دوسروں کی زندگی میں خوشیوں کا اجالا بکھیرنا ہے۔ مگر یہ نورانی اوصاف ان کرداروں کو جہد حیات میں اپنا سب کچھ داؤ پر لگانے کے بعد ہی حاصل ہوتا ہے۔..... یہ ایسے کردار ہیں جن کی ذاتی محرومیاں اور غم کی حدت ان کی شخصیت کو ایسی جلا بخشتی ہے کہ وہ دوسروں کے لیے مشعل راہ بن جاتے ہیں۔ انہیں زندگی میں نیکیوں کا یہ عرفان غم کا زہر پی کر حاصل ہوتا ہے۔'' (۲۷)

افسانہ ''شیبا'' اپنے مرکزی کردار 'شیبا' کے گرد بنا گیا ہے۔ اس میں 'شیبا' کے منفرد کردار کو افسانہ نگار نے جس خوبصورتی سے تراشا ہے وہ قابل داد ہے۔ اس کردار سے ہم افسانہ کے شروع میں کہانی کے راوی کے دوست کیپٹن مسعود الزماں زیدی کے حوالے سے متعارف ہوتے ہیں۔ کیپٹن مسعود الزماں

زیدی راوی کو بتاتا ہے۔

''ایک انگریز میجر نے مجھ سے اور میرے ساتھ گرمیت سنگھ سے ایک بار اہانت آمیز سلوک کیا تھا۔ میں نے اپنا پسٹل گورے میجر کے سینے پر تان دیا تھا لیکن گرمیت سنگھ نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ پسٹل فائر ہوا اور گولی زمین کے سینے میں دھنس گئی۔ ورنہ بلڈی باسٹرڈ کے پرخچے اڑ جاتے۔ اور تمھیں پتہ ہے یہ سب کچھ کیوں ہوا۔ صرف میری شیبا کے لیے۔ شیبا جس نے زندگی کی صعوبتوں میں میرا ساتھ دیا۔ شیبا جو ہر صبح سے شام تک سنگاپور میں جاپانیوں کی قید سے میری رہائی کی منتظر رہی۔ میری شیبا کی اس کمینے انگریز میجر نے بے حرمتی کی تھی۔ بڑی تذلیل کی تھی اس کی۔ اتنی کہ خود اس کی قوم کے سپاہیوں نے اس حرکت پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا اور ہاں، واقعی قصور میری شیبا کا بالکل نہیں تھا۔'' (۲۸)

شیبا کے اس مختصر تعارف کے بعد افسانہ نگار نے راوی اور کیپٹن مسعودالزماں زیدی کے مکالموں کے ذریعے شیبا کا ایک دھندلا خاکہ یوں پیش کیا ہے۔ ان دونوں کے مکالمے ملاحظہ ہوں:

''کون تھی یہ شیبا۔ نام بڑا خوبصورت ہے۔''

''شیبا۔ شی۔ با۔ شی۔ با'' مسعود نے دو ایک بار اسی طرح اس کا نام لیا۔ پھر کہنے لگا۔ ''میری کتیا، وفادار جانور۔ میری ڈارلنگ''۔

''تو تم ایک جانور کے لیے ایک آدمی کی جان کے درپے ہو گئے تھے''

''بالکل نہیں۔ میں تو ایک عظیم عورت کے لیے ایک حیوان کی جان کے درپے ہو گیا تھا''

''کیا کہہ رہے ہو''

''شیبا جانور تھی تو کیا ہوا۔ شیبا کے اوصاف میں نے کم انسانوں میں دیکھے ہیں بلکہ کم عورتوں میں''

''تم یقین کرو شیبا میری دوست تھی، میری ہمدرد، وہ ایک بہن تھی ایک ماں''

''کیا بکتے ہو؟''

''سچ کہتا ہوں۔ تم شیبا کے دل تک کہاں پہنچ سکتے ہو۔ صبر کرو میں تمہیں سب بتادوں گا کہ وہ کیا تھی۔ میں اسے کیا سمجھتا تھا۔'' (۲۹)

مذکورہ مکالموں سے شیبا کی دھندلی تصویر سامنے آتی ہے مگر جیسے جیسے افسانہ آگے بڑھتا جاتا ہے، یہ

دھندلی تصویر صاف ہوتی جاتی ہے، یہاں تک کہ افسانہ کے اختتام پہ شیبا کی مکمل اور واضح تصویر پوری طرح جلوہ گر ہو جاتی ہے۔

شیبا ایک ایسی عورت ہے جو پر خلوص رفاقت و محبت اور ایثار و وفا کی پیکر ہے۔ وہ دوسری جنگ عظیم کے دوران بھوکی، پیاسی اور نڈھال حالت میں کیپٹن مسعود الزماں زیدی کو سنگاپور کے محاذ پر ملتی ہے جہاں مسعود جاپانیوں سے نبرد آزما رہتا ہے اور اس کی زندگی اُداسیوں اور تاریکیوں میں گھر جاتی ہے۔ ایسے وقت میں شیبا مسعود کو جذباتی سہارا دیتی ہے۔ وہ بہت جلد اپنی معصوم اداؤں سے مسعود کو دام محبت میں اس طرح اسیر کر لیتی ہے کہ وہ اس کی رفیق و دمساز بن جاتی ہے۔ اسی دوران شیبا کے ساتھ ایک ناخوشگوار واقعہ پیش آتا ہے۔ اور وہ واقعہ یہ ہے کہ شیبا گورے انگریز میجر کے جنسی ہوس کا شکار ہو جاتی ہے۔ وہ درد سے کراہ رہی ہوتی ہے۔ مسعود اس منظر کو دیکھ کر شرمسار ہو جاتا ہے اور اسے شیبا سے بیزارگی محسوس ہونے لگتی ہے۔ اب مسعود شیبا کی طرف متوجہ نہیں ہوتا ہے لیکن اس کی عدم توجہی کے باوجود شیبا پہلے ہی کی طرح مسعود سے خلوص و رفاقت سے پیش آتی ہے۔ بالآخر شیبا کی کوشش رنگ لاتی ہے اور مسعود کا دل پھر سے اس کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ اب مسعود کو شیبا سے شدید جذباتی لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے لیکن کچھ دنوں بعد شیبا ایک بار پھر انگریز میجر کی حیوانیت و درندگی کا شکار ہو جاتی ہے۔ شیبا اس درندگی کے دوران بھرپور مزاحمت کرتی ہے جس کی وجہ سے انگریز میجر اسے زخمی کر دیتا ہے۔ اس واقعہ سے مسعود اس قدر طیش میں آتا ہے کہ وہ انگریز میجر سے بھڑ جاتا ہے اور پسٹل نکال کر اس پر فائر کر دیتا ہے۔ وہ تو کیپٹن ڈاکٹر گرمیت سنگھ مسعود کے نشانہ کو دوسری طرف پھیر کر انگریز میجر کو بچا لیتا ہے ورنہ وہ اسی وقت ڈھیر ہو جاتا۔ اس واقعہ کے بعد مسعود مضمحل رہنے لگتا ہے۔ وہ جنگ بھی ہار جاتا ہے اور جاپانیوں کے ہاتھوں قید کر لیا جاتا ہے۔ جب وہ قیدیوں کے غول میں لے جایا جا رہا ہوتا ہے تو اچانک اس کی نظر شیبا پر پڑتی ہے جو شدید زخمی حالت میں ہوتی ہے۔ اس حالت میں بھی شیبا گھسٹتی ہوئی مسعود تک پہنچتی ہے اور اس کے پیروں کو چاٹ کر اس سے اپنی چاہت اور لگاوٹ کا اظہار کرتی ہے مگر جاپانی فوجی ان دونوں کو جدا کر دیتا ہے۔ مسعود کے ساتھ اس کا انگریز میجر بھی قید کر لیا جاتا ہے۔ قید کیے جانے کے بعد اب انگریز میجر اپنے کیے پر شرمندہ ہوتا ہے۔ اب وہ شیبا کے ساتھ ہمدردی سے پیش آتا ہے۔ ایک دن مسعود کیا

دیکھتا ہے کہ انگریز میجر شیبا کے زخم سے کیڑے چن کر نکال رہا ہے اور شیبا اس کے پیروں کو چاٹ رہی ہے۔اب شیبا زخم سے اتنی چور چور ہوجاتی ہے کہ اس کے جسم کا نچلا حصہ بیکار ہوجاتا ہے۔اس ادھ مری حالت میں بھی شیبا کی نگاہیں مسعود کو ڈھونڈتی رہتی ہیں اور اپنی پوری قوت سے وہ اپنا جسم گھسیٹتی ہوئی اس کی آواز پر لپکتی ہے اور اس طرح وہ مسعود سے اپنی بے لوث محبت کا اظہار کرتی ہے۔اسی قید و بند کے دوران ایک دن یہ خبر پھیلتی ہے کہ کل سارے قیدیوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر کے انھیں سائگان لے جایا جائے گا۔اس خبر کو سن کر مسعود کو یہ احساس ستانے لگتا ہے کہ کل جب یہاں کوئی نہیں ہوگا تو شیبا اپنے ادھ مرے جسم کے ساتھ اکیلی کیسے رہے گی۔اس لیے وہ تیزی سے کام لیتے ہوئے جاپانی سپاہی کی کمر سے بندھا ہوا پسٹل نکالتا ہے اور ساری گولیاں شیبا کے سینے میں داغ دیتا ہے۔شیبا تو مرجاتی ہے لیکن وہ اپنی محبت سے مسعود کی تاریک زندگی میں روشنی کی کرن پھینک دیتی ہے اور اس کے بکھرے ہوئے وجود کا اٹوٹ حصہ بن جاتی ہے۔وہ اپنی چندروزہ رفاقت میں مسعود کی زندگی میں وہ مقام حاصل کرلیتی ہے جو میکی اس کی شریک حیات ہوکر بھی نہیں کر پاتی ہے۔

اقبال متین نے اس کردار کی شخصیت کو جس زاویے سے دیکھا اور اس کی بے لوث محبتوں، پرخلوص رفاقتوں نیز اس کی بے بسی و بے کسی اور پھر دردناک موت کو جس ہنرمندی سے حرف ولفظ کا قالب عطا کیا ہے وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے انوکھا اور منفرد ہے۔یہ ایک بے زبان عورت کا کردار ہے لیکن اس کی حرکات وسکنات کے ذریعے اس کے ایثار وخلوص اور محبت و ہمدردی کے جذبات واحساسات کی مصوری اس طرح کی گئی ہے کہ اس کی شخصیت آئینہ ہوکر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔اقبال متین نے اس کردار کے خدوخال پر کوئی روشنی نہیں ڈالی ہے مگر اس کی پیش کش اتنی ہنرمندی سے ہوئی ہے کہ وہ ہمارے حافظہ کا حصہ بن جاتا ہے اور ہمارے ذہن پہ ایک نہ مٹنے والا نقش چھوڑ جاتا ہے۔یہ اقبال متین کا ایسا جاندار اور بھرپور کردار ہے جو افسانہ نگاری میں ان کی انفرادیت واہمیت کا پتہ دیتا ہے اور کردار نگاری پر ان کی فنکارانہ مہارت کو اُجاگر کرتا ہے۔

افسانہ ''برہان قاطع'' میں برہان کے کردار کو بھی اقبال متین نے بڑی خوبصورتی سے تراشا ہے۔ برہان ایک لنگڑا بھکاری لڑکا ہے۔وہ ریلوے اسٹیشن پر ہر راہ گیر کے قدموں میں دھڑام سے گر کر چمٹ

جاتا اور پیسے مانگتا ہے۔اس طرح سے پیسے مانگنے پر کئی مرتبہ اس کی پٹائی بھی ہوتی ہے،اس کے باوجود وہ اپنی حرکت سے باز نہیں آتا ہے۔اپنی ظاہری حرکات وسکنات کی وجہ سے اس کی شخصیت لوگوں کے درمیان ناپسندیدہ نظر آتی ہے جسے افسانہ نگار نے اپنے مخصوص انداز میں اس طرح بیان کیا ہے۔

''مجھے یقین ہے کہ اس کا دوسرا پاؤں بھی کٹ جائے گا۔ میں اس دن خوش ہوں گا یا نہیں قطعی طور پر اس وقت کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اسٹیشن کے حدود سے لے کر رائل ہوٹل اور اسٹار بار اور دوسری سمت عابڈس کو مڑنے والی شاہراہ کی نکڑ تک اللہ کی ساری مخلوق، سارے بندے جشن منائیں گے، خوشی کے مارے ایک دوسرے سے گلے ملتے پھریں گے۔ یہ نہ سوچیں گے کہ کون اجنبی ہے، کون بیگانہ ہے۔ایک دوسرے سے اجنبی ہونے کے باوجود، بیگانہ ہونے کے باوجود اس خطرناک وبا سے، اس خوفناک دشمن سے متحدہ طور پر سب کے سب بیزار ہیں۔''(۳۰)

برہان کی حرکتوں کی وجہ سے لوگ اسے برہان قاطع پکارنے لگتے ہیں۔ برہان اپنی ظاہری حرکات کی وجہ سے تو لوگوں کے درمیان ناپسندیدہ نظر آتا ہی ہے، چہرہ مہرہ سے بھی وہ بدصورت دکھائی دیتا ہے۔ افسانہ کے شروع میں جب ہم برہان سے متعارف ہوتے ہیں تو ہمیں اس کی حرکتوں کی وجہ سے اس سے ناپسندیدگی ہونے لگتی ہے لیکن جیسے جیسے افسانہ آگے بڑھتا ہے اور ہم برہان کے حالات سے واقف ہوتے جاتے ہیں تو ہماری ناپسندیدگی کم ہونے لگتی ہے، یہاں تک کہ افسانہ کے اختتام میں جب ہم برہان کے اصلی روپ سے واقف ہوتے ہیں تو ہمیں اس سے ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے۔

برہان ایک غریب لڑکا ہے۔ وہ اس لیے لوگوں سے زبردستی پیسہ مانگتا ہے کہ سیدھے مانگنے پر لوگ کچھ نہیں دیتے۔اس طرح بھیک مانگ کر وہ اپنا اور اپنی ماں کا پیٹ پالتا ہے۔اس کی ماں کی غربت کا ناجائز فائدہ اٹھا کر ایک مولوی صاحب اس سے ناجائز جنسی تعلقات پیدا کر لیتے ہیں۔ وہ اس کو شادی کا لالچ دیتے رہتے ہیں مگر آخر میں شادی سے انکار کر دیتے ہیں۔اس بات کا پتہ چلتے ہی برہان کو اس کا ضمیر کچوکے لگاتا ہے اور وہ مولوی صاحب کو قتل کر ڈالتا ہے۔

برہان بظاہر حقیر، اپاہج اور بدصورت نظر آتا ہے اور بھیک مانگتا ہوا دکھائی دیتا ہے مگر اس کا ضمیر زندہ ہوتا ہے اور اس میں احتجاج کا زبردست جذبہ ہوتا ہے۔ برہان کے کردار کا یہی وہ روشن پہلو ہے جو اس کی

ساری بدصورتی پر غالب آ جاتا ہے۔ برہان کے کردار کے اس پہلو سے جب ہم واقف ہوتے ہیں تو وہ لنگڑا ہوتے ہوئے بھی لنگڑا نظر نہیں آتا بلکہ ہمارے اپاہج سماج میں وہ سب سے صحت مند دکھائی دیتا ہے۔ برہان کی شخصیت، اس کے جذبات واحساسات کو افسانہ نگار نے اس کی حرکات وسکنات، اس کے مکالموں اور مختلف واقعات کے ذریعے بڑی خوبصورتی سے اُجاگر کیا ہے اور اس کے کردار کو اس فنی ہنرمندی سے پیش کیا ہے کہ برہان ایک معمولی لڑکا ہوتے ہوئے بھی غیر معمولی نظر آتا ہے اور قاری کے ذہن پر اپنا انمٹ نقش چھوڑ جاتا ہے۔

افسانہ ''شکن در شکن'' میں ایک بوالہوس شخص کے کردار کو پیش کیا گیا ہے۔ یہ کردار واصف کا ہے۔ افسانہ نگار اس کا تعارف اس سادگی سے کراتا ہے کہ ہم افسانہ کی ابتدا میں اسے ایک سیدھا سادا انسان سمجھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ مگر جب افسانہ نگار اس کی شخصیت کے مختلف روپ ہمیں دکھاتا ہے تو اس کی شخصیت کی کجی اور نفسیاتی گرہوں تک ہماری رسائی ہوتی ہے۔ افسانہ نگار ایک جگہ واصف کی شخصیت پر سے یوں پردہ اٹھاتا ہے۔

> ''مجھے معلوم تھا کہ واصف اتنا معصوم آدمی نہیں ہے جو والہانہ عشق اور ہوس کے درمیان خطِ فاصل نہ کھینچ سکے۔ وہ سب کچھ جانتا تھا لیکن دھوکا دینے اور دھوکا کھانے میں اس کو جو لذت ملتی تھی وہی شاید اس کی دانست میں اس کا سب سے بڑا وصف تھا۔'' (۳۱)

افسانہ نگار نے اپنے مخصوص انداز کے مطابق واصف کی شخصیت پر پڑے دبیز پردوں کو دھیرے دھیرے اُٹھایا ہے اور اس کے کردار کو اس طرح پیش کیا ہے کہ اس کی شخصیت اپنی نفسیاتی گرہوں کے ساتھ پوری طرح واضح ہو کر قاری کی نگاہوں کے سامنے آ جاتی ہے۔

افسانہ ''بیمار'' رام دیال کے منفرد کردار پر مشتمل ہے۔ یہ بھی اقبال متین کا ایک دلچسپ اور انوکھا کردار ہے۔ رام دیال ایک فرض شناس اور ایماندار سرکاری ملازم ہے۔ وہ جسمانی اعتبار سے کمزور اور مستقل بیمار رہتا ہے۔ چنانچہ جسمانی کمزوری جب اس کے فرض کی ادائیگی میں مانع ہوتی ہے تو اس کی خوداعتمادی کو ٹھیس پہنچتی ہے اور وہ مذہب کی آغوش میں پناہ لے لیتا ہے۔ افسانہ نگار اس کی شخصیت کے اس پہلو پر یوں روشنی ڈالتا ہے۔

''اس کو دو چیزوں سے بہت پیار تھا۔ آروند گھوش کی نظموں اور مضامین کے مجموعوں سے اور اپنے فائلس سے ... مجھے اکثر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہی دونوں چیزیں اس کی شخصیت کی پناہ گاہیں ہیں۔''(۳۲)

ایک جگہ افسانہ نگار رام دیال کی مذہب پرستی کا تجزیہ اس طرح کرتا ہے۔

''مجھے یقین ہو چلا تھا کہ اس کی کٹر مذہبیت اس کی خرابیٔ صحت کا ردّعمل ہے اور وہ اپنی مفلوج انفرادیت کا پھٹا ہوا لبادہ اوڑھے کبھی کبھی مذہب سے ستیزہ کار رہتا ہے۔ لیکن ہار ہمیشہ اسی کی ہوتی ہے اور مذہب کی گرفت اس کے دل و دماغ پر زیادہ شدید ہو جاتی ہے، زیادہ دیرپا ہو جاتی ہے۔''(۳۳)

رام دیال اپنی مسلسل بیماری سے تنگ آ کر مذہب کی آغوش میں چلا جاتا ہے۔ اس کا یہ عمل اس کے لیے یک گونہ ذہنی سکون اور اطمینان قلب کا باعث بھلے ہی ہو، مگر اس کے درد کا درماں نہیں ہوتا۔ وہ رفتہ رفتہ دنیا سے بیزار ہو جاتا اور راہ فرار میں پناہ لیتا ہے۔ اس کردار کو اقبال متین نے ہمدردی اور فنکاری سے تراشا ہے اور اس کی فرض شناسی، ایمانداری، مسلسل بیماری، مذہب پرستی اور دنیا بیزاری، ان تمام پہلوؤں کو مختلف واقعات کی مدد سے بیان کر کے انہیں اس طرح پیش کیا ہے کہ اس کی شخصیت اپنی متضاد خصوصیات کے ساتھ بھرپور انداز میں سامنے آتی ہے اور قاری کے ذہن میں گھر کر جاتی ہے۔

افسانہ ''کتاب سے کتبے تک'' میں جاگیردارانہ نظام حیات کے پروردہ، جمود اور بے عملی کے شکار کردار کو پیش کیا گیا ہے۔ یہ کردار منور میاں کا کردار ہے جو خاندان بھر میں لائق و فائق عالم و فاضل کی حیثیت سے مشہور ہیں لیکن ان کی شخصیت بے عملی کا شکار ہے۔ دیکھئے افسانہ نگار نے منور میاں کی متضاد شخصیت کا تعارف اپنے مخصوص طنزیہ انداز میں کس چابکدستی سے کرایا ہے۔

''منوّر میاں خاندان بھر میں لائق فائق مشہور تھے۔ عربی، فارسی، انگریزی تینوں زبانیں جانتے تھے اور جاننا بھی کیسا، عالموں فاضلوں کے کان کاٹتے تھے۔ بحث و تمحیص ہوتی، مکالمے و مجادلے ہوتے تو منور میاں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔ بس مجبوری تھی سو اتنی ہی کہ خیالات کی وسعتوں کا زبان ساتھ نہ دے پاتی۔ رک رک کر، تھم تھم کر، چبا چبا کر کچھ اس طرح بحث کرتے کہ موضوع کتنا ہی جان دار ہو منور میاں کی زبان پر آ کے دم توڑتا ہوا سا محسوس ہوتا''۔(۳۴)

منور میاں کو دنیا کے کسی کام سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ انہوں نے اپنی کمزوریوں کو چھپانے کے لیے اپنے آپ کو کتابوں کے مطالعہ میں غرق کر رکھا تھا اور بڑی چالاکی سے شادی کے بعد سسرال کو اپنا مسکن بنا کر اپنی اور اپنی بیوی بچوں کی ذمہ داری ساس سسر پر ڈال دی تھی۔ وہ حصول علم کے لیے لندن بھی گئے مگر ناکام لوٹے۔ وہ اپنی نام نہاد علمیت کی وجہ سے ہمیشہ گھمنڈ میں چور رہے۔ انہوں نے آئی ہوئی چھوٹی موٹی نوکریوں کو بھی ٹھکرا دیا اور حالات سے بالکل سمجھوتا نہیں کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنی بیوی بچوں سے آنکھ ملانے کے قابل نہیں رہ گئے اور اسی حالت میں وہ اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ یہ کردار جاگیردارانہ معاشرے کے بے عمل شخص کا کردار ہے جسے اقبال متین نے بڑی خوبصورتی سے تراشا ہے۔ انہوں نے اس کے عادات و اطوار اور اس کی اصول پسندی پر گہرا طنز کیا ہے اور اس کی مضرت رساں شخصیت کا خاکہ کھینچتے ہوئے اسے اس فنی ہنرمندی سے پیش کیا ہے کہ یہ کردار اپنی شخصیت کی تمام تر پیچیدگیوں کے ساتھ نمودار ہوتا ہے اور ایک پورے طبقے اور عہد کی نمائندگی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

افسانہ ''اجنبی'' میں ایک ایسے اسکول ماسٹر کے کردار کو پیش کیا گیا ہے جو بڑا محنتی، ذہین، اصول پسند اور اخلاق مند انسان ہے مگر فرائض کے بوجھ تلے جس کی انفرادیت اور خود اعتمادی کھو چکی ہے اور جس پر ضرورت اور مصلحت نے کئی لبادے ڈال دیے ہیں۔ یہ ماسٹر بچوں کے درمیان تو بے باک اور پرکشش نظر آتا ہے مگر سماج میں اونچی پوزیشن رکھنے والوں کے سامنے وہ ایسا ڈرپوک اور بزدل دکھائی دیتا ہے کہ پہچانا نہیں جاتا۔ اس کی شخصیت کے ان دونوں پہلوؤں کو افسانہ میں مختلف واقعات کی مدد سے اس خوبی سے اُبھارا گیا ہے کہ اس کا کردار بھرپور انداز میں سامنے آکر قاری کے ذہن پر نقش ہو جاتا ہے۔

مذکورہ تمام افسانے اپنے مرکزی کرداروں کے گرد گردش کرتے نظر آتے ہیں۔ ان افسانوں میں مرکزی کرداروں کو فنی ہنرمندی سے تراشا گیا ہے اور ان کی شخصیت، جذبات و احساسات، نفسیاتی کیفیات، ان کی خوبیوں، خامیوں اور حالات و مسائل کو ان کے تہذیبی و سماجی پس منظر میں مختلف واقعات اور ضمنی کرداروں کی مدد سے اس خوبی سے بیان کیا گیا ہے کہ یہ کردار بھرپور انداز میں سامنے آتے ہیں اور قاری کے ذہن پر اپنا گہرا نقش چھوڑ جاتے ہیں۔ ان کرداروں کی تخلیق اور ان کی پیش کش میں اقبال متین نے جس چابکدستی کا مظاہرہ کیا ہے، وہ کردار نگاری میں ان کی فن کارانہ گرفت کا پتہ دیتا ہے۔

اسلوب:

اقبال متین کی افسانہ نگاری کا ایک اہم وصف ان کا مخصوص اسلوب ہے جو انہیں ایک منفرد افسانہ نگار کے روپ میں سامنے لاتا ہے۔اقبال متین ایک حساس فنکار ہیں۔وہ ابلاغ وترسیل کے مسائل سے آگاہ اور لفظ کی حرمت کا احساس رکھتے ہیں۔انھوں نے خود کو روایت کا اسیر کیا نہ جدت پسندی کے زعم کا شکار ہوئے بلکہ روایت کا دامن تھام کر نئے تجربات کیے اور اعتدال وتوازن کو ملحوظ رکھا۔یہی وجہ ہے کہ وہ علامت خاص کر داخلی علامت، تجریدیت اور حد سے بڑھی ہوئی داخلیت سے ہمیشہ دامن کش رہے۔طارق چھتاری لکھتے ہیں:

''ایسا نہیں ہے کہ ۱۹۶۰ء کے بعد کے دور میں صرف Abstraction کا رجحان ہی کارفرما ہو بلکہ اسی زمانے میں کچھ نئے ترقی پسند ادیب یا ترقی پسند تحریک پر چلنے والے فن کار بھی خاصے کامیاب افسانے لکھ رہے تھے اور قارئین کے حلقے میں ان کی پذیرائی بھی ہو رہی تھی۔مثلاً قاضی عبدالستار، عابد سہیل، جیلانی بانو، شمیم صادقہ، عائشہ صدیقی، اقبال متین اور اقبال مجید وغیرہ۔یہ وہ کہانی کار ہیں جنہوں نے بیانیہ اسلوب میں نئے موضوعات پر کہانیاں لکھیں۔ان کو صرف روایتی کہانی کار کہہ کر نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔انہوں نے ابہام سے بچ کر روایت کا دامن تھامے رکھا اور فرسودہ روایت سے دامن کش ہو کر جدید محسوسات کو افسانے کا موضوع بنایا ہے۔ان کے یہاں ترسیل وابلاغ کا مسئلہ کوئی الجھن پیدا نہیں کرتا، ان کے افسانوں میں پلاٹ بھی ہوتا ہے، کردار بھی اور جزئیات بھی۔انسان کی داخلی کیفیات کا اظہار بھی ہوتا ہے اور سماجی حقیقت نگاری بھی۔''(۳۵)

اقبال متین حقیقت پسند افسانہ نگار ہیں۔انھوں نے اپنے افسانوں میں بیانیہ اسلوب کا سہارا لیا ہے مگر وہ اپنے افسانوں کو بیان نہیں بننے دیتے بلکہ بیانیہ کو اپنے افسانوں میں اس طرح برتتے ہیں کہ وہ افسانہ کی بناوٹ میں پوری طرح شامل ہو جاتا ہے۔اقبال متین اپنی بات سیدھے سادے انداز میں کہتے ہیں جو فطری طور پر نمو پاتی ہے اور تصنع و بناوٹ کی تہمت اپنے اوپر عائد نہیں ہونے دیتی۔انھوں نے اپنے افسانوں میں ایسے پیچیدہ اسلوب کا سہارا نہیں لیا ہے جو افسانے کی تفہیم میں دشواری پیدا کرے۔ان کے افسانوں کا اسلوب مواد سے پوری طرح ہم آہنگ ہو کر تشکیل پاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں شروع سے آخر تک دلچسپی برقرار رہتی ہے۔

اقبال متین اپنے خیالات قاری پر تھوپتے نہیں بلکہ وہ قاری کے احساس کا خاص خیال رکھتے ہیں اور اپنی بات کہنے کے لیے ایسا ماحول تیار کرتے ہیں کہ قاری ان کے محسوسات میں شریک ہو جاتا ہے اور ان کی بات خود بخود قاری کے دل میں اترتی چلی جاتی ہے۔مجموعی تاثر ان کے افسانوں کا خاص وصف ہے۔ان کے اسلوب کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ خیال کا رشتہ الفاظ سے بہت گہرا ہوتا ہے اور متنوع موضوعات کے باوجود بھی اعتدال کا دامن چھوٹنے نہیں پاتا جو زبان پر اقبال متین کی گرفت کا ثبوت ہے۔

اقبال متین کا اسلوب بہت ہی سادہ اور رواں ہے۔نرمی اور لوچ ان کے اسلوب کا خاص وصف ہے۔وہ اپنی بات ڈرامائی یا چونکانے والے انداز میں شروع نہیں کرتے ہیں۔اس کے باوجود کہانی جیسے جیسے آگے بڑھتی ہے، قاری اس کے سحر میں گرفتار ہوتا جاتا ہے اور افسانہ ختم کرنے کے بعد دوسری دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ انکشافات کی ایک وسیع دنیا اس کے سامنے ہوتی ہے۔ان کے افسانوں کا پہلا جملہ پڑھ کر انجام کی پیش گوئی نہیں کی جاسکتی۔آغاز کی طرح ان کے افسانے بغیر کسی ڈرامائیت کے انجام کو پہنچتے ہیں۔لیکن افسانے کی بنت کچھ اس طرح ہوتی ہے کہ قاری پر اس کی گرفت کبھی بھی ڈھیلی نہیں پڑتی۔کہانی فطری انداز میں ترتیب پاتی ہے۔واقعات بہت ہی سہج انداز سے آگے بڑھتے ہیں۔پروفیسر عتیق اللہ اقبال متین کے اسلوب کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''اقبال متین کے اسلوب میں بھی افسانہ کہنے کا فن قائم ہے۔ان کے اظہار کی منطق لفاظی اور چرب زبانی سے کوئی نسبت نہیں رکھتی اور نہ ہی ان کے کرداروں میں دانشورانہ کلیوری ہے۔ پچھلے دس بارہ سال کے انتہائی آزمائشی عرصہ میں بھی انھوں نے اپنے اسلوب کو علامت بازی سے محفوظ رکھا۔وہ جدید افسانے میں اسلوبیاتی قطعیت کی ایک قابل قدر مثال ہیں۔ انھوں نے علامتوں کے جنگل پروان نہیں چڑھائے اور نہ ہی علامتی اور استعاراتی اسلوب اختیار کیا۔تب بھی ان کا افسانہ ایک ایسی تراش مہیا کرتا ہے جو اپنے آپ میں منفرد اور جدید حسّیت کا حامل ہے۔''(۳۶)

اثر فاروقی لکھتے ہیں:

> ''اقبال متین کا طرز اسلوب سادہ ہے۔اور ان کی اسی سادگی کا نتیجہ ہے کہ ان کے افسانوں کی قرأت کے دوران کہیں بھی بوجھل پن کا احساس نہیں

ہوتا۔ ان کی کہانیوں میں دریا کے بہاؤ کے بجائے ایک چھوٹے سے جھرنے
کی روانی کی مترنم موسیقی کو صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔'' (۳۷)

قیصر سرمست اقبال متین کے اسلوب کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''اقبال متین کو دورِ جدید کے دوسرے افسانہ نگاروں میں جو بات انفرادیت بخشتی ہے وہ ہے اس کا اسلوب اور انداز بیان۔ ان کے افسانوں میں ایسا بہاؤ ہوتا ہے کہ قاری بہتا چلا جاتا ہے اور وہ افسانے کے انجام کے متعلق کوئی آئیڈیا قائم نہیں کر سکتا اور نہ ہی سوچ سکتا ہے کہ افسانہ کیا کروٹ بدلے گا۔'' (۳۸)

اقبال متین کے اسلوب میں دردمندی کا عنصر پایا جاتا ہے۔ وہ عام انسانوں کے درد و کرب اور کبھی کبھی اپنے غم کو اس دردمندانہ انداز میں بیان کرتے ہیں کہ لفظ ابل ابل پڑتے ہیں اور قاری معنی کی دھیمی دھیمی آنچ میں اپنے آپ کو پگھلتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ مجتبیٰ حسین اقبال متین کے اسلوب کے اس وصف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''لفظ ان کے مخصوص اسلوب میں ایک نئے انداز سے ابل ابل پڑتے ہیں اور معنی کی دھیمی دھیمی آنچ پڑھنے والے کو موم میں تبدیل کرتی چلی جاتی ہے۔ ایک انوکھا اور اچھوتا درد، جس کی کسک ذاتی بھی ہے اور آفاقی بھی، ان کے افسانوں کو منفرد مرتبہ عطا کرتی ہے۔'' (۳۹)

اقبال متین کے اسلوب میں ریزہ خیالی نہیں ہوتی بلکہ اس میں جذبات کا وفور اور سرشاری پائی جاتی ہے لیکن استدلال بھی موجود ہوتا ہے جس سے افسانوں کے منطقی اور نفسیاتی گوشوں پر روشنی پڑتی ہے۔ اقبال متین اپنے افسانوں میں ایسا آرائشی اور رنگین اسلوب اختیار نہیں کرتے جو ''نفس مضمون'' تک پہنچنے میں رکاوٹ ہو بلکہ وہ موضوع اور افسانے کے ماحول کے مطابق ایسا اسلوب اپناتے ہیں کہ خیالات کی ترسیل آسانی سے ہو جاتی ہے اور ان کا اسلوب قاری کو لطف بھی دے جاتا ہے۔ پروفیسر یوسف سرمست اقبال متین کے اسلوب کی اس خوبی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''صاحب طرز ادیب کے لیے فکشن میں انداز بیان کی انفرادیت اور ندرت کو قائم رکھتے ہوئے فکشن کے تقاضوں کو پورا کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں فکشن کے بہت بڑے اور اہم نقاد Percy Lubback نے بڑی اہم اور پتے کی بات کہی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ فکشن میں اسلوب

بالکل سلولائیڈ کی طرح ہوتا ہے۔سلولائیڈ پر فلمیں بنائی جاتی ہیں لیکن فلم دیکھنے والے کبھی سلولائیڈ کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔لیکن جب کبھی فلم سے توجہ ہٹ کر سلولائیڈ کی طرف مبذول ہوتی ہے تو یہ سلولائیڈ کی خوبی نہیں بلکہ خامی بن جاتی ہے۔فکشن میں بھی اگر توجہ کرداروں اور واقعات سے ہٹ کر اسلوب یا انداز بیاں پر مرکوز ہوجاتی ہے تو یہ اسلوب کی خوبی نہیں بلکہ خامی بن جائے گی۔فکشن میں اسی لیے انداز بیاں کی انفرادیت کو قائم رکھنا بے حد مشکل ہوتا ہے۔اقبال متین کے افسانوں میں طرز بیان کی یہ خوبی اس قدر اعلیٰ درجے پر ملتی ہے کہ بہت کم لوگ اس بات سے واقف ہیں کہ انھوں نے افسانوں میں اپنے اچھوتے انداز کو قائم رکھا ہے۔''(۴۰)

اقبال متین کے اسلوب کا ایک نمایاں وصف ایجاز واختصار ہے۔وہ چند جملوں میں کسی واقعہ اور منظر کو اس چابکدستی سے بیان کرتے ہیں کہ اس کی ہو بہو تصویر کھینچ دیتے ہیں۔وہ اپنے افسانوں میں قاری کو ایک فضا اور ماحول سے آشنا کرنے کے لیے جزئیات نگاری پر خاص توجہ دیتے ہیں۔لیکن بے جا تفصیلات سے افسانے کو بوجھل نہیں بناتے بلکہ ضرورت کے مطابق ہی وہ تفصیلات اور جزئیات سے کام لیتے ہیں۔ان کی جزئیات نگاری میں کیمرے کی صداقت نمایاں ہوتی ہے۔حلیہ کشی میں بھی اقبال متین کو زبردست مہارت حاصل ہے۔انھوں نے خاکہ نگاری کی اپنی صلاحیت سے اپنے افسانوں میں بھر پور کام لیا ہے۔وہ چند الفاظ میں کردار کا خاکہ اس طرح کھینچتے ہیں کہ کردار اپنے پورے خدوخال کے ساتھ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ان کے اسلوب کی ایک خوبی محاوروں، کہاوتوں، گیتوں اور تشبیہات کا برمحل اور مناسب استعمال ہے جس سے ان کے افسانوں میں معنویت ودلکشی اور تاثیر پیدا ہو جاتی ہے۔وہ کسی بھی واقعہ کو سپاٹ انداز میں بیان نہیں کرتے بلکہ ایسا انداز بیان اختیار کرتے ہیں کہ وہ واقعے کو ہمارے سامنے زندہ کرکے پیش کردیتے ہیں۔انھوں نے اپنے اسلوب کے پردے میں اپنے آس پاس کے سماج اور اس میں رہنے والے عام انسانوں کے حالات کی بھر پور عکاسی کی ہے۔دیکھئے انھوں نے اپنے مخصوص اسلوب کے ذریعے تہذیبی تبدیلیوں، معاشرتی زوال اور انسانی واخلاقی گراوٹ کا نقشہ کس چابکدستی سے کھینچا ہے۔افسانہ ''چھت'' کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''آج آنکھوں کو خیرہ کرنے والی روشنیاں شہروں کو لوٹ رہی ہیں۔ایک دوسرے سے کٹا پھٹا سڑکوں پر بے تحاشا بھاگتا ہوا انسان شہروں کو لوٹ رہا

ہے۔ دوڑتی ہوئی کاریں، اڑتے ہوئے جہاز، بڑے بڑے سنیما گھروں کے پردوں پر اسمگلنگ کا کاروبار، قتل، غارت گری جو سارے معاشرے کا گھناؤنا پہلو ہے وہی آج سب سے دلچسپ پہلو ہے۔ بچہ کھیلتا ہی ٹھشم ٹھشم ہے، اپنے ساتھیوں کے بدن کو ہوائی آوازوں سے چھلنی کرتا ہے۔ لات، مکے، ہاتھا پائی ختم ہوتی ہے تو پھر ہوائی گولیاں چلتی ہیں، ٹھشاں اور اس کے ساتھی سفید خون میں لت پت اس کی آنکھوں کے سامنے تڑپتے ہیں۔ یہ خون خرابا اس کی انا کی پہلی تسکین ہے۔ کل بچوں کا شہزادہ سبز پری کو راکشش سے چھڑانے کے لیے تلوار کھینچ کر گھوڑے پر نکلتا تھا۔ یہ تو ہونا ہی تھا کہ گھوڑے کی جگہ موٹر سائیکل اور ہیلی کاپٹر نے لے لی۔ زنگ خوردہ تلواروں کے بجائے ریوالور اور اسٹین گن حفظ جاں کا وسیلہ ہوئے۔ دکھ اس بات کا ہے کہ سبز پری مرگئی ہے اور بچوں کا شہزادہ خود بھی راکششوں سے جاملا ہے۔ گھروں میں بند ٹی وی اور وی۔ سی۔ آر کے چھوٹے سے اسکرین پر ال ایس ڈی اور ہیروئن کے مضر اثرات کی اس حد تک نمائش کہ نہ جاننے والے بھی اس کے رسیا ہو جائیں۔ نکوٹین پر اخلاقیات کا پرچار کہ سگریٹ پینا مضر ہے۔ ساتھ ہی سگریٹ کی نئی نئی اقسام میں اضافہ۔ کون ہے جو اب شہروں کو ویران کر رہا ہے اور اس طرح کر رہا ہے کہ ویرانی نہیں پہچانی جاتی۔ زبانیں جو ایک دوسرے کا دکھ درد سمجھنے کے لیے تھیں، آج لہو چاٹنے کے لیے ہیں، آنکھیں محبتوں کا پیغام نہیں پہنچا سکتیں۔ سازشوں کا کام کرتی ہیں۔ یہ زمانہ کمپیوٹر اور فیکس کا زمانہ ہے۔ سب اچھا ہے لیکن محبتوں کے زمانے کیا ہوئے۔'' (۴۱)

اقبال متین نے طنز و مزاح سے جا بجا کام لیا ہے۔ ان کے اسلوب میں طنز و مزاح کی حسین آمیزش پائی جاتی ہے جس سے افسانے میں مزید تاثیر پیدا ہو جاتی ہے۔ دیکھئے انھوں نے اپنے طنزیہ و مزاحیہ اسلوب میں جاگیردارانہ نظام حیات کے پروردہ منور میاں کے کردار کا خاکہ کس چابکدستی سے کھینچا ہے۔

''چوڑی ہڈی اور دوہرے بدن کے مضبوط سے آدمی تھے۔ ناک نقشہ سجیلا ہی تھا لیکن رنگ کم از کم بیوی کے ساتھ ہوتے تو رنگ کا فرق اور نمایاں ہو جاتا تھا۔ گرد داڑھی اور اس پر ٹخنوں تک چڑھا ہوا شرعی پاجامہ۔ اس کے باوجود بھی دیکھنے میں آنکھوں میں برے نہ لگتے تھے۔ البتہ جی یہ ضرور چاہتا کہ یہ سب کچھ نہ ہوتا تو مناسب تھا اور اگر ہے بھی تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اب کس کو

پڑی تھی کہ ان کے حلیے میں ان کی ہیئت میں اتنی دل چسپی لیتا۔....اللہ رکھے منور میاں کے سات بچے تھے۔آٹھویں کی آمد آمد تھی۔ وہ ہر بچے کو اللہ کی برکت پر محمول کرتے اوراس کوخوش آمدید کہنے کے لیے تیار رہتے۔ایک برکت نازل ہوکر کچھ ہی مہینے گزرتے کہ دوسری برکت کے نزول کے لیے اللہ میاں کو ہموار کر لیتے۔ رہ گئی بیوی سو وہ تو ایک ذریعہ تھیں۔ پھر محکوم و مجبور الگ۔ منور میاں نیم خدا تھے۔ان کا التفات ہی تو ان کی بیوی کے لیے سب کچھ تھا۔ ''جب چاہا کرلیا ہے کنج قفس بہاراں'' کے مصداق جب چاہتے کچی نیند سے بیدار کر لیتے اوراس طرح برکت کا نزول ہوتا رہتا۔'' (۴۲)

اقبال متین کا اسلوب مدھم اور گمبھیر ہوتا ہے جو دھیرے دھیرے قاری پر اثر کرتا ہے اوراسے مکمل طور پر اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ان کے اسلوب کے زیریں رو میں احتجاج کا رنگ اور خالص طنزیہ عنصر بھی شامل ہوتا ہے۔دو اقتباسات ملاحظہ فرمائیں:

''میرا سارا قبیلہ ماں کے بطن سے پیدا نہیں ہوتا۔آسمانوں سے اترتا ہے۔ پھر ہم معلق معلق ہواؤں میں جیتے ہیں۔ہم زندگی کی کلائی مروڑنے کا بل بوتا نہیں رکھتے۔ وہ ناکارہ آدمی کی طرح ہمیں برتتی رہتی ہے اور ہم اپنے کاغذ وقلم کی سرگوشیوں پر اس طرح مگن ہوجاتے ہیں جیسے ہماری نیندیں بستر کی استراحت نہیں چاہتیں۔ جیسے ہمارے سروں کو چھت کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہماری انا پیٹ کی بھوک کے بعد کی چیز ہے اور اس بھوک کو مٹانے کے لیے ہم اپنی انا کو ہزار بار زخمی کرتے ہیں۔ جب یہ مٹ جاتی ہے تو ہماری انا پھر زندہ ہوجاتی ہے اور ہمیں یاد بھی نہیں رہتا کہ ہم نے کتنوں سے کتنے نوالے چھین لیے۔'' (۴۳)

''وہ دن بیت گئے جب ایمان والے اپنا ایمان سینے میں بسائے رکھتے تھے، دل میں چھپائے رکھتے تھے، اگر سب کچھ وہی ہوتا جو تم نے کبھی دیکھا ہے، پڑھا ہے، چکھا ہے، محسوس کیا ہے تو محبتیں بے گور وکفن کیوں ہوتیں۔آج تو صرف ڈھونا اور بھوگنا رہ گیا ہے لیکن زندگی بڑی بیسوا ہے، اس کو کوٹھے سے اتار دو تو بازار میں جھم جھم چھن چھن کرتی پھرے، بازار سے اٹھا کر تاریک حجرے میں بند کردو، وہ اس حجرے کو ہی حجلہ بنالے گی۔زندگی اپنی دل شکستگی کے باوجود دل زدہ نہیں ہے، وہ ہمیشہ دل ربا بنی رہتی ہے۔اس لیے جینے کے بہانے ہم نہیں تراشتے، زندگی خود تراش لیتی ہے۔'' (۴۴)

اقبال متین کے افسانوں میں رومانی اسلوب بھی ملتا ہے مگر ان کی رومانیت، واقعیت پر دبیز پردے نہیں ڈالتی۔ انھوں نے حسب ضرورت سچویشن کو ابھارنے اور کفایت لفظی کو برقرار رکھنے کے لیے علامتی اسلوب کا بھی سہارا لیا ہے لیکن وہ علامتوں کو ذاتی معنی نہیں پہناتے بلکہ ان کی علامتیں افسانے کے بطن سے نمودار ہوتی ہیں اور امکانات کی ایک وسیع دنیا کی سیر کراتی ہیں۔ ان کی علامتیں ترسیل کا مسئلہ پیدا نہیں کرتیں کیوں کہ وہ قاری کے ذہن کا پورا خیال رکھتے ہیں۔

اقبال متین کسی ایک بندھے ٹکے اسلوب کے پابند نہیں ہیں بلکہ موضوع و مواد کے مطابق انھوں نے مختلف اسالیب کو برتا اور اس پر اپنی گرفت کا خوبصورت مظاہرہ کیا۔ اس طرح اقبال متین اپنے اسلوب، مزاج، طرز اظہار، انتخاب الفاظ اور جملوں کی ساخت اور ان کی ترتیب کی وجہ سے اپنی انفرادی شان اور الگ شناخت رکھتے ہیں جو قاری کو ان کی تخلیقات کے مطالعہ پر آمادہ کرتی ہے۔ ان کا قاری ان سے کبھی مایوس نہیں ہوتا بلکہ ان کے افسانوں کا مطالعہ کرتے وقت وہ اپنے آپ کو شگفتہ و شاداب ماحول میں محسوس کرتا ہے۔ یہ کسی بھی افسانہ نگار کی کامیابی کی دلیل ہے۔ اقبال متین کے افسانوں کا مطالعہ کرتے ہوئے کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی غیر ضروری احتیاط اور حد سے بڑھی ہوئی کفایت لفظی سچویشن کو صاف صاف ظاہر ہونے نہیں دیتی لیکن یہ صورت صرف چند مقامات پر ہی ہے۔ بحیثیت مجموعی اقبال متین کی فن کارانہ چابکدستی ان کے اسلوب میں نمایاں ہو کر ان کی اہمیت اور انفرادیت کو اجاگر کرتی ہے اور ان کو ایک صاحب طرز افسانہ نگار کے منصب پر فائز کرتی ہے۔

زبان:

اقبال متین کے افسانوں کی ایک خوبی ان کی سادہ اور شگفتہ زبان ہے۔ زبان کے معاملے میں اقبال متین بے حد حساس ہیں۔ وہ ایک ایک لفظ سنبھال سنبھال کر جس فطری انداز میں استعمال کرتے ہیں اس سے اس میں ایک طرح کا لطف پیدا ہو جاتا ہے اور تصنع کا احساس تو بالکل ہی نہیں ہوتا۔ اقبال متین اپنے افسانوں میں مرصع اور رنگین زبان سے گریز کرتے ہیں۔ وہ زبان کے چٹخارے پر موضوع کی روح کو قربان نہیں ہونے دیتے۔ وہ نامانوس، ثقیل اور ژولیدہ قسم کی زبان سے بھی بچتے ہیں جس سے نفس مضمون پس پشت پڑ جائے۔ وہ موضوع اور کرداروں کے ماحول کے مطابق زبان استعمال کرتے ہیں۔ ان کے

افسانوں کی زبان صاف ستھری ہوتی ہے جس میں خیالات کی ترسیل آسانی سے ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کہانیاں پڑھتے وقت قاری کہیں الجھن محسوس نہیں کرتا۔ وہ سیدھے سادے الفاظ سے اپنے افسانوں کا تانا بانا بنتے ہیں مگر وہ پامال یا سپاٹ انداز میں کوئی بات نہیں کرتے بلکہ زبان کے استعمال کے معاملہ میں ان کے یہاں انفرادیت پائی جاتی ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں موضوع اور سچویشن کے مطابق پُر کیف اور پُر اثر زبان استعمال کرتے ہیں۔ زبان کے اسی تخلیقی استعمال کا نتیجہ ہے کہ وہ جب کسی واقعہ کو بیان کرتے ہیں تو اسے زندہ کر کے ہمارے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر دو اقتباسات ملاحظہ فرمائیں۔

> ''مجھے کبھی کبھی ایسا محسوس ہوا کہ حالات کا زہر پی کر زندگی کے شانہ بشانہ چلنے والا انسان شراب کا سہارا لے کر بھی پچھتاتا ہے۔ آج پھر میں کچھ اسی طرح محسوس کر رہا ہوں۔ وہسکی کی آدھی بوتل نے مجھے مسحور تو کیا ہے لیکن زندگی کے اس زہر کو جو میری نس نس میں سرایت کر گیا ہے، میں بھولنے میں کامیاب نہیں ہو سکا ہوں۔ انسان جس کی مجبوری پر مجھے ہنسی آتی تھی، آج اس کے ہنسنے پر مجھے مجبوری کا گمان ہوتا ہے۔ میں سوچتا ہوں زندگی کے اس سفر میں میں اکیلا نہیں ہوں۔ کتنے ہوں گے جو اخبار میں آدمی کے خلا میں تیرنے کی خبر پڑھ کر اب خلاؤں کے متعلق سوچتے ہوں گے جو اسی زمین پر ان کے اطراف پھیلے ہوئے ہیں اور چاند تک پہنچنے والا آدمی ان کا سینہ چیرنے کی دسترس نہیں رکھتا۔'' (۴۵)

> ''باہر لگے کرفیو میں زندگی اپنی حفاظت کے تصور کے باوجود کس درجہ بے آرام ہے۔ ساری آدمیت چوہے کی طرح بلوں میں دبکی بیٹھی ہے۔ چھپے ہوئے خنجروں نے جنہیں کاٹ دیا ہے۔ تھوڑی سی دیر میں وہ تباہی مچی ہے کہ آدمی کی درندگی پر شرم آنے لگی ہے۔ غذا مہنگی ہے، خون ارزاں ہے۔ انسانی خون گلی کوچوں میں ضائع ہو سکتا ہے لیکن گیہوں کے دانے کے لیے بچے بلک رہے ہیں۔'' (۴۶)

اقبال متین الفاظ کو چھان پھٹک کر استعمال کرتے ہیں۔ وہ عامیانہ زبان میں بات نہیں کرتے بلکہ سامنے کے الفاظ کو بھی وہ اس ہنر مندی سے برتتے ہیں کہ اس میں تخلیقی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کے یہاں گھن گرج والے الفاظ نہیں ملتے۔ وہ دھیمے سروں میں بات کرنے کے قائل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ

نرم اور شائستہ الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ وہ احتجاج بھی مدھم لہجے میں کرتے ہیں جس کا اثر دیر پا ہوتا ہے۔ان کی زبان میں ان کی شخصیت صاف جھلکتی نظر آتی ہے۔ان کی شخصیت کی طرح ان کی زبان میں بھی متانت وسنجیدگی، سلیقہ مندی اور رکھ رکھاؤ دکھائی دیتا ہے اور ان کے الفاظ سے دردمندی ٹپکتی محسوس ہوتی ہے۔ انہوں نے مقامی الفاظ کا استعمال بھی بڑے سلیقے سے کیا ہے جس سے بیان میں زور اور اثر پیدا ہو گیا ہے۔ سلیمان اریب لکھتے ہیں:

''اقبال متین کی تحریر میں بھی اس کی شخصیت صاف جھلکتی نظر آتی ہے جو عبارت ہے آراستگی، سلیقہ مندی اور ایک پُر تکلف رکھ رکھاؤ سے۔ ساتھ ہی اقبال متین اپنے افسانوں میں حیدرآباد کے محاورے اور مقامی زبان کے الفاظ بھی بڑے چاؤ سے استعمال کرتا ہے۔''(۴۷)

سید محمد عقیل اقبال متین کی زبان کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''زبان کے معاملے میں اقبال متین کہانی اور کرداروں کے ماحول کی زبان کے قائل ہیں۔ جن حالات میں کہانی اپنا ارتقائی سفر طے کرتی ہے، زبان کو اسی لحاظ سے چلنا پڑتا ہے۔ کردار کا مزاج، اس کی ترتیب، اس کی سچویشن، سب کردار اور کہانی کی زبان کو اسی طرح ڈھلنے پر مجبور کرتے ہیں۔ چوں کہ خود اقبال متین کو بیانیہ انداز پسند ہے، اس لیے ان کی کہانیوں کی زبان بھی بہت Expressive ہوتی ہے جو تفہیم تک کہانی اور قاری دونوں کی دستگیری کرتی ہے۔ وہ زبان کو الجھانے کے قائل نہیں۔ ان کے یہاں کبھی کبھی علاقائی زبان اور محاوروں کا استعمال بھی ملتا ہے۔ خاص علاقے کے کرداروں کو پیش کرتے وقت بعض اوقات یہ ضرورت ہو جاتی ہے کہ باتیں اور اشارے ان ہی زبانوں کے پیش کیے جائیں جنھیں کردار استعمال کرتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ان کی بہتات نہ ہونی چاہئے کیوں کہ ایسا کرنے سے کہانی کا تاثر مجروح ہوتا ہے۔ اقبال متین ان تمام باتوں کا ہر ہر قدم پر خیال رکھتے ہیں۔''(۴۸)

اقبال متین کے افسانوں میں علاقائی الفاظ کے مناسب استعمال سے مقامی رنگ پیدا ہوا ہے جو ان کے افسانوں کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ جیلانی بانو اقبال متین کے افسانوں کی اس خصوصیت کے بارے میں لکھتی ہیں:

''ان کے افسانوں کی ایک اہم خصوصیت مقامی رنگ ہے۔انھوں نے آس پاس کی فضا کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے اور کوشش کی ہے کہ اس فضا کے ساتھ ساتھ مقامی زبان بھی برقرار رکھیں۔ اس میں وہ کامیاب ہوئے ہیں۔''(۴۹)

اقبال متین کے افسانوں میں مکالمے برجستہ،فطری اور کرداروں کے عین مطابق ہوتے ہیں۔ان کے کردار اپنے ماحول اور علاقے کی بولی بولتے ہیں۔اقبال متین نے یہاں بھی زبان کے استعمال کے معاملہ میں ہنرمندی کا ثبوت دیا ہے۔انھوں نے اپنے افسانوں میں ہندی الفاظ کا بھی برمحل استعمال کیا ہے۔اس کے علاوہ انھوں نے اپنی زبان کو پرکشش بنانے کے لیے محاوروں، کہاوتوں، گیتوں اور مقولوں کا استعمال کیا ہے۔ان کے افسانوں کی زبان موضوع سے ہم آہنگ اور کرداروں کے ماحول اور فضا کے مطابق ہوتی ہے جس میں نفس مضمون آئینہ ہو کر سامنے آجاتا ہے۔ان کی زبان میں سلاست و روانی کے ساتھ ایک خاص کیفیت، اثر اور زور پایا جاتا ہے جس کی وجہ سے ان کے افسانوں میں تخلیقی سرشاری اور ادبی لطف وانبساط کا احساس ہوتا ہے۔

مجموعی طور پر اقبال متین کے افسانوں کا فنی جائزہ لینے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ وہ افسانہ نگاری کے فنی رموز سے اچھی طرح واقف ہیں۔انھوں نے اپنے افسانوں میں اپنی تمام تر قوت محسوسات کو صرف کر کے اپنے اعلیٰ تخلیقی شعور سے کام لیا ہے۔موضوع کی وسعت،فن کی بصیرت، روایت کی پاسداری، جدّت کا لحاظ، دونوں کے درمیان خوبصورت توازن،عصری حسّیت ، زندگی کے ٹھوس حقائق اور پے چیدہ مسائل کا فنکارانہ اظہار، مواد اور ہیئت کے درمیان ہم آہنگی، مناسب و موزوں تکنیک کا استعمال اور اختصار وارتکاز ان کے افسانوں کی نمایاں خصوصیات ہیں۔انھوں نے اپنے افسانوں میں جدید رویّوں کو بھی مناسب انداز میں برتا ہے اور علامتی اور استعاراتی طرزِ اظہار سے بھی کام لیا ہے۔ تکنیک کے لحاظ سے ان کے افسانوں میں بیانیہ انداز پایا جاتا ہے۔اس کے علاوہ فلیش بیک،خودکلامی، تضاد اور خط کی تکنیک کا استعمال بھی ہوا ہے۔تکنیکی سطح پر اقبال متین کی انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے افسانے کے تقاضے کے مطابق تکنیک کا استعمال کیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے تکنیکی اعتبار سے منفرد نظر آتے ہیں۔ان کے بیشتر افسانے سادہ وسلیس اور عام فہم اسلوب میں لکھے گئے ہیں۔

اقبال متین کے افسانوں کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ ان میں داخلیت وخارجیت کا ایک حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ان کے افسانوں کی ایک بڑی خصوصیت نازک جذبات واحساسات اور انسانی نفسیات کی فنکارانہ عکاسی ہے۔ انھوں نے اپنے کئی افسانوں میں انسانی نفسیات کا بڑا گہرا مطالعہ پیش کیا ہے اور لطیف سے لطیف اور نازک سے نازک جذبات واحساسات کی تصویر کشی بڑی ہنر مندی سے کی ہے۔

اقبال متین نے سو سے زائد افسانے لکھے ہیں۔ ان کے کچھ ابتدائی افسانے فنی اعتبار سے کمزور ہیں۔انھوں نے کچھ افسانے مجبوری میں معاوضے کے حصول کے لیے بھی لکھے تھے جیسا کہ اس کی تائید خود ان کے درج ذیل بیان سے ہوتی ہے۔

> ''میں نے ایک سو سے کچھ اوپر ہی افسانے لکھے ہیں۔ وہ افسانے جنھوں نے جنم لے کر مجھے مسرور کیا وہ چند ہی ہیں۔ اپنے دوسرے افسانوں کے لیے مجھے وکالت کرنی نہیں ہے صرف اتنا کہنا ہے کہ زیادہ تر افسانوں نے میرے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائی۔ چند ایسے بھی ہیں جنھوں نے میرے اعتماد کو مجروح کیا لیکن ان کی اشاعت کے لیے میں مجبور تھا کہ چند ہلکے پھلکے جریدوں سے مجھے معاوضہ مل جانا قطعی تھا۔''(۵۰)

دوسرے جدید افسانہ نگاروں کی طرح اقبال متین کے یہاں بھی فنی اعتبار سے کمزور افسانے ملتے ہیں لیکن ایسے افسانوں کی تعداد کم ہے۔ان کے بیشتر افسانے فن پر پورے اُترتے ہیں جن میں پلاٹ، کردار نگاری، جزئیات نگاری، منظر نگاری، ان تمام فنی لوازم کا اہتمام ملتا ہے۔

اقبال متین کے افسانے جدید معاشرے کے عکاس ہیں۔ انھوں نے گردوپیش کے ماحول پر گہری نظر ڈالی ہے اور ہم عصر سماج کے بنتے بگڑتے رشتوں، مادّیت کا غلبہ، قدروں کی پائمالی، انسانیت کی ناقدری، اخلاقی گراوٹ، معاشی زبوں حالی، غربت وافلاس، عام انسانوں کا استحصال، ان تمام مسائل کا اظہار روایت کا دامن تھام کر اپنے اچھوتے انداز میں کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں عہد حاضر کی سیاسی، سماجی، تہذیبی اور اقتصادی تصویریں بھر پور انداز میں دیکھنے کو ملتی ہے۔

اقبال متین کی افسانہ نگاری کا ایک اہم وصف یہ ہے کہ ان کے افسانے ظاہری آرائش اور چونکا دینے والے عناصر سے خالی ہیں مگر ان کے لہجے کے ٹھہراؤ میں جو اثر کرنے والی کیفیت ہے، وہ آہستہ آہستہ قاری کے حواس پر اپنی گرفت قائم کرتی ہے اور کہانی ختم ہونے تک یہ تاثر قاری کی شخصیت پر

پوری طرح حاوی ہو جاتا ہے۔ اقبال متین اپنی بات سادگی سے کرتے ہیں لیکن ان کے اس سادہ انداز میں بھی توانائی اور تیکھاپن پایا جاتا ہے۔ ان کی افسانہ نگاری کا ایک خاص وصف اختصار اور کفایت لفظی ہے۔ وہ چند جملوں میں ساری اہم تفصیلات بیان کر دیتے ہیں اور ایسے لطیف اشارے کرتے ہیں کہ قاری کا ذہن ان تفصیلات تک آسانی سے پہنچ جاتا ہے۔ ان کے افسانوں کی زبان سادہ، سلیس اور دلکش ہے۔ مختصر یہ کہ ان کے افسانوں میں فکری و فنی خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ انھوں نے اردو کو کئی نمائندہ افسانے دیئے ہیں جو افسانہ نگاری میں ان کی شناخت قائم کرتے ہیں اور افسانوی ادب میں خوشگوار اضافہ ہیں۔ انھوں نے افسانہ نگاری میں جس فکری مہارت اور فنی ندرت کا مظاہرہ کیا ہے، اس کی بنا پر وہ ہم عصر افسانہ نگاری میں نمایاں مقام کے مستحق ہیں۔ سلیمان اریب افسانہ نگاری میں اقبال متین کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''میں بلاخوف تردید یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستان کی تقسیم کے بعد جو افسانہ نگار بھارت اور پاکستان میں ابھرے ہیں اور جنھوں نے اُردو افسانہ نگاری کی ناک کو اونچا کیا ہے، ان میں ایک اقبال متین بھی ہے۔''(۵۱)

پروفیسر یوسف سرمست افسانہ نگاری میں اقبال متین کی قد آور حیثیت کو یوں اُجاگر کرتے ہیں:

> ''اقبال متین ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے ہند و پاک میں مشہور و مقبول ہی نہیں بلکہ ان کا شمار اردو کے صف اول کے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ وہ اردو افسانہ نگاری میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔''(۵۲)

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید رقم طراز ہیں:

> ''پریم چند کے بعد اردو کے ممتاز فکشن نگاروں کی فہرست مرتب کی جائے تو اس میں ایک نام اقبال متین کا بھی رہے گا، خواہ یہ فہرست کتنی ہی مختصر ترین کیوں نہ ہو... انہوں نے اردو فکشن کی صحت مند اقدار کو مستحکم کیا اور ان کے فروغ میں اپنا حصہ ادا کیا۔ اردو فکشن کی تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ تابندہ رہے گا۔''(۵۳)

اقبال متین کی ناولٹ نگاری کا موضوعاتی جائزہ

اقبال متین اردو ادب میں ایک اہم اور ممتاز افسانہ نگار ہونے کے علاوہ ناولٹ نگار کی حیثیت سے بھی معروف ہیں۔ ''چراغِ تہہِ داماں'' ان کا مشہور ناولٹ ہے۔ اسے پروفیسر یوسف سرمست، مہدی جعفر اور افصح ظفر وغیرہ نے ناول کہا ہے جب کہ غیاث احمد گدّی، قاضی عبدالستار، نسیم احمد درانی، محمود احمد ہنر، ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی وغیرہ نے اسے ناولٹ میں شمار کیا ہے۔ اقبال متین کی اس تخلیق کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ناول نہیں بلکہ ناولٹ ہے۔ ناولٹ کو اردو میں ناول اور مختصر افسانہ کے درمیان کی ایک صنف مانا گیا ہے جس میں نہ تو ناول کی طرح پھیلاؤ ہو، نہ مختصر افسانہ کی طرح بہت زیادہ ایجاز و اختصار، بلکہ ان دونوں کی درمیانی صورت ہوتی ہے۔ ناولٹ کو مختصر ناول بھی کہا جاتا ہے جس میں زندگی کے واقعات کو اختصار اور تھوڑے بہت پھیلاؤ کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ ناولٹ کے معروف ناقد ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی نے ناولٹ کی تعریف اس طرح کی ہے:

> ''ناولٹ زندگی یا سماج کے کسی اہم مسئلہ اور اس کے خاص پہلوؤں کا مختصراً جائزہ لیتا ہے جس کی اپنی الگ تنظیم ہوتی ہے، جو ناول سے قدرے مختصر مگر طویل افسانے سے زیادہ طویل اور تفصیلی ہوتا ہے''۔(۱)

ڈاکٹر سید مہدی احمد رضوی ناولٹ کی تعریف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''فنی طور پر ناولٹ، افسانے کے اختصار اور ناول کی طوالت کے بیچ کی کڑی ہے۔ بالعموم ایک ناولٹ کی ضخامت سوسوا سو صفحات سے زیادہ اور پچاس ساٹھ صفحات سے کم نہیں ہوسکتی۔ یہاں تاثر کی وحدت اتنی واضح اور مکمل ہوتی ہے کہ قارئین انجام پر کسی تذبذب یا انتشار میں مبتلا نہیں ہوتے۔ واقعات کی تشریح و تفصیل یہاں نہیں ہوتی۔ ایجاز و اختصار کے ساتھ علامتوں، اشاروں اور کنایوں میں زندگی کے وہ مختلف پہلو پیش کر دیے

جاتے ہیں جن کی پیش کش کو ناولٹ نگار ضروری سمجھتا ہے۔ ناولٹ کا پلاٹ گٹھے ہوئے مربوط واقعوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ ابتدا سے وسط تک کے مرحلے طے کرنے کے لیے واقعاتی الٹ پھیر بار بار رونما نہیں ہوتی اور نہ وسط سے انجام تک کے مرحلوں میں واقعات بار بار پیچھے مڑتے اور آگے بڑھتے دکھائی دیتے ہیں''۔(۲)

مذکورہ تعریفوں سے واضح ہوتا ہے کہ ناولٹ میں انسان کی پوری زندگی کو اس کی تمام تر وسعتوں اور تفصیلات کے ساتھ پیش نہیں کیا جاتا ہے بلکہ اس میں ایجاز و اختصار اور تھوڑے بہت پھیلاؤ کے ساتھ زندگی کے کچھ خاص پہلوؤں کو اجاگر کیا جاتا ہے۔ یہ بات اقبال متین کے ناولٹ ''چراغِ تہہِ داماں'' پر بھی صادق آتی ہے۔ اس لیے اسے ناولٹ کے زمرے میں شمار کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی کی بھی یہی رائے ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''چراغ تہہ داماں' کے ذریعے اقبال متین نے زندگی اور سماج کے ایک اہم مسئلہ مرد طوائف کے ساتھ ہی اس کے متعلق چند مخصوص گوشوں کی ترجمانی کی ہے۔ انھوں نے ناولٹ کا مواد اپنے عصری معاشرے سے اٹھایا ہے اور شانوجہ جیسے کردار کے ذریعہ ایک چھوٹے سے کینوس پر اپنے فنکارانہ انداز میں نمایاں کیا ہے۔ 'چراغ تہہ داماں' میں وہ ساری خصوصیات کسی حد تک پائی جاتی ہیں جن کی بنا پر اسے ناولٹ کے زمرے میں ہی رکھا جائے''۔(۳)

قاضی عبدالستار نے بھی اقبال متین کی اس تخلیق کو ناولٹ قرار دیا ہے۔ انھوں نے اقبال متین کے نام ایک خط میں لکھا ہے۔

''ناولٹ کا آرٹ خاصا نازک ہے۔ نہ تو یہ ناول کی بیٹی ہے اور نہ افسانے کی ماں۔ یہ فکشن کے خاندان کی اہم رکن ہے جس کی اپنی شخصیت اور اپنا کردار ہے۔ ناولٹ اردو ادب میں خاصی تعداد میں لکھے جا رہے ہیں لیکن ان کی بڑی تعداد طویل افسانے کی زنجیر میں الجھی ہوتی ہے۔ 'چراغ تہہ داماں' اس چکر سے آزاد ہے''۔(۴)

اردو میں ناولٹ نگاری کی ایک توانا اور مضبوط روایت رہی ہے۔ ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی کے مطابق ڈپٹی نذیر احمد کی تحریروں سے اس فن کا آغاز ہوا۔ انھوں نے ''ایامیٰ'' کو اردو کا پہلا ناولٹ قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کے مطابق کشن پرشاد کول کا ''شاما'' اردو کا پہلا کامیاب ناولٹ ہے۔

سید مجاور حسین رضوی نے نیاز فتح پوری کے ''شہاب کی سرگذشت'' کو اور سید مہدی احمد رضوی نے نیاز فتح پوری کے ''ایک شاعر کا انجام'' کو ظ۔ انصاری نے عبدالحلیم شرر کے ''بدرالنساء کی مصیبت'' کو اور مناظر عاشق ہرگانوی نے عبدالحلیم شرر کے ''فردوس بریں'' کو وہاب اشرفی نے ضیا عظیم آبادی کے ''افیونی'' کو اور صدیق محی الدین نے پنڈت رتن ناتھ سرشار کے دو ناولٹ ''پی کہاں'' اور ''ہشو'' کو اردو ناولٹ کے نقوش اول قرار دیا ہے۔ یہ سب اردو کے اولین ناولٹ ہیں جو ڈپٹی نذیر احمد اور ان کے بعد کے زمانے میں لکھے گئے۔ ناولٹ کے ارتقا میں پریم چند کا حصہ بھی نظر آتا ہے۔ ناقدین نے ان کی دو تخلیقات ''روٹھی رانی'' اور ''بیوہ'' کو ناولٹ قرار دیا ہے۔ پریم چند کی تحریروں کے ساتھ ہی اردو ناولٹ ترقی پسند عہد میں داخل ہوا۔ یہ وہ دور ہے جس میں اردو ناولٹ نگاری کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ سجاد ظہیر، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، خواجہ احمد عباس، اوپندر ناتھ اشک، سہیل عظیم آبادی، عزیز احمد، حیات اللہ انصاری، بلونت سنگھ وغیرہ، نے اس فن کی ترقی میں حصّہ لیا اور فنی و تکنیکی اعتبار سے اس کو عروج و استحکام بخشا۔ ترقی پسندی کے بعد جدیدیت کے عہد میں بھی بہت سے ناولٹ لکھے گئے۔ اقبال متین نے اسی عہد میں ۱۹۶۶ء۔ ۱۹۶۷ء کے درمیان اپنا ناولٹ ''چراغ تہہ داماں'' لکھا۔ اس عہد میں اقبال متین کے 'چراغ تہہ داماں' کے علاوہ کئی اور ناولٹ منظر عام پر آئے جن میں ''شب گزیدہ''، ''داراشکوہ'' از قاضی عبدالستار، ''آخری آدمی'' از آمنہ ابوالحسن، ''کیمیائے دل'' از جیلانی بانو، ''رات'' از عبداللہ حسین، ''حریف آتش پنہاں'' از رام لعل وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان میں اقبال متین کا ناولٹ ''چراغ تہہ داماں'' منفرد ہے جو ایک سو تیس صفحات پر مشتمل ہے۔

اقبال متین کا یہ ناولٹ پہلی بار ۱۹۶۷ء میں نسیم درانی کی ادارت میں سہ ماہی ''سیپ'' کراچی کے ناولٹ نمبر میں شائع ہوا۔ یہ 'سیپ' کا دسواں شمارہ تھا۔ 'سیپ' کے اس ناولٹ نمبر میں حیات اللہ انصاری کا ناولٹ ''پرانے کوہ و صحرا''، کرشن چندر کا ''دس روپئے کا نوٹ''، محمد احسن فاروقی کا ''جنم'' قرۃ العین حیدر کا ''آخر شب کے ہم سفر''، قاضی عبدالستار کا ''داراشکوہ''، عصمت چغتائی کا ''سوری ممی''، شوکت صدیقی کا ''وہ اور اس کا سایہ'' اور شرون کمار ورما، ہنس راج رہبر، عوض سعید، ام عمارہ، اور سعیدہ افضل وغیرہ کے ناولٹ بھی شائع ہوئے۔ ان میں چند دیگر ناولٹ کے ساتھ اقبال متین کے ''چراغ تہہ داماں'' کو اہل

ادب نے خوب سراہا۔ یہ ناولٹ دوسری بار ۱۹۶۸ء میں محمود احمد ہنر کی ادارت میں الہ آباد سے نکلنے والے ڈائجسٹ ''شاہکار'' کے ناولٹ نمبر میں چھپا۔

اقبال متین کا یہ ناولٹ کتابی صورت میں پہلی بار ۱۹۷۶ء میں لکھنؤ سے اور دوسری بار ۲۰۰۵ء میں حیدرآباد سے شائع ہوا۔ اس ناولٹ کو لے کر ادبی حلقوں میں اس وقت بڑا ہنگامہ برپا ہوا جب آندھراپردیش اردو اکیڈمی نے انعامی کمیٹی اور ججس کی سفارش کے باوجود اس کے جنس کے موضوع پر ہونے کی وجہ سے اسے فحش قرار دے کر انعام سے محروم رکھا۔ اردو اکیڈمی کی اس ادبی ناانصافی کے خلاف حیدرآباد اور حیدرآباد سے باہر کے ادیبوں نے سخت احتجاج کیا اور اکیڈمی کی مجلس عاملہ کے غیر ادبی رویے پر ان کی سخت سرزنش کی اور ان کے خلاف مذمتی قرارداد پاس کیا۔ حیدرآباد کے ممتاز شعرا و ادبا شاذ تمکنت، جیلانی بانو، سعید بن محمد، انور معظم، فصیح الدین، مصحف اقبال توصیفی، عوض سعید، اقبال متین، قدیر زماں، اوم پرکاش نرمل، مرلیدھر شرما، راجہ دوبے اور ایم۔ ٹی۔ خاں وغیرہ نے اردو اکیڈمی کی بدعنوانی کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے ایک مشترکہ بیان جاری کیا۔ یہ تمام احتجاجی بیانات اس وقت کے اخبارات جیسے پندرہ روزہ ''تیشہ''، حیدرآباد، ہفتہ وار ''علم و عمل''، حیدرآباد، ہفتہ وار ''مورچہ''، گیا، بہار، ''ہفتہ وار بلٹز''، بمبئی، روزنامہ ''منصف''، حیدرآباد، روزنامہ ''سیاست''، حیدرآباد، روزنامہ ''رہنمائے دکن''، حیدرآباد وغیرہ میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

اقبال متین کے اس ناولٹ کو جب آندھراپردیش اردو اکیڈمی نے انعام سے محروم رکھا تو محرومی کے اس زخم کی تلافی کے لیے ۲۵/ دسمبر ۱۹۷۷ء کو انوارالعلوم کالج ملے پلی کے لائبریری ہال میں حیدرآباد کے ادیبوں اور فنکاروں کی جانب سے اقبال متین کے اعزاز میں خیر مقدمی جلسہ کیا گیا اور ان کی ادبی خدمات کی ستائش میں انھیں ایک ہزار گیارہ روپئے کا ایک کیسۂ زر پیش کیا گیا۔ اس جلسہ کی صدارت پروفیسر عالم خوندمیری نے کی۔ انھوں نے اپنی صدارتی تقریر کے دوران 'چراغ تہہ داماں' کے تعلق سے بڑی اہم بات کہی۔

> ''ان کا جو خاص موضوع ہے وہ ہے Human Deprivity کہ انسانی گراوٹ بڑی حد تک Social Condition بھی ہے جس کے سبب انسانی عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ اس محرومی کا جو نقشہ 'چراغ تہہ داماں' میں اقبال متین نے پیش کیا ہے اس پر بعض ناقدین کی نظر نہیں گئی۔ اس ناول پر

Obscenity فحش ہونے کا جو اعتراض کیا گیا ہے تو وہ میں اس بات کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اب ترقی پسند تحریک میں جو ملائیت آ گئی ہے اس کا خطرناک موڑ ہے اور اس کا مطلب یہی ہے کہ پھر سے اس تحریک کا تخلیقی سر چشمہ سوکھ رہا ہے''۔(۵)

پروفیسر عالم خوندمیری نے اپنی صدارتی تقریر کے دوران مزید کہا کہ:

''ہر ادیب کی تخلیق میں بغاوت واحتجاج کا جذبہ ہونا چاہئے۔اگر کسی ادیب میں اس جذبہ کی کمی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ادب کی صحیح خدمت انجام نہیں دے رہے ہیں اور کسی ادیب میں بغاوت واحتجاج ختم ہو جائے تو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اس نے اپنے حصہ کی آخری سطر لکھ دی ہے اور اس میں مزید کوئی گنجائش نہیں ہے۔....اقبال متین کی تخلیقات میں جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ادب کے وہ ٹھیکے دار جو اقبال متین کے ناولٹ ''چراغ تہہ داماں'' کو فحش قرار دیتے ہیں دراصل ادب پر ان کی معلومات محدود ہیں۔ اقبال متین نے اپنی شخصیت کو علیحدہ کر کے حقائق کا مشاہدہ کیا ہے۔ان کی تخلیقات میں انسانی ہمدردی کا گہرا عنصر ملتا ہے جو ان کے فن کی عظیم خصوصیت ہے''۔(۶)

اس جلسہ میں پروفیسر یوسف سرمست، سعید بن محمد نقش، عوض سعید اور دوسرے ادیبوں نے اقبال متین کی شخصیت وفن پر اظہار خیال کیا اور ان کے ادبی کارناموں کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے ناولٹ 'چراغ تہہ داماں' پر فحش ہونے کے الزام کو بے بنیاد ثابت کیا۔سچائی بھی یہی ہے کہ یہ ناولٹ 'فحش' نہیں ہے۔ یہ ضرور ہے کہ یہ ناولٹ سماج کی تلخ سچائی کو بے نقاب کرتا ہے۔

اقبال متین نے اپنے اس ناولٹ میں ہم جنسیت اور مرد طوائف کے موضوع کو پیش کیا ہے۔ یہ انتہائی حسّاس اور نازک موضوع ہے۔اس نازک موضوع کو اردو ادب میں پہلی بار اقبال متین نے اپنے اس ناولٹ میں فنکارانہ صداقت کے ساتھ برتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ اردو کا منفرد ناولٹ ہے۔اس ناولٹ کا نام بھی بڑا دلچسپ ہے جس میں پوری کہانی کا مرکزی خیال سمٹ آیا ہے۔اس تعلق سے پروفیسر یوسف سرمست رقم طراز ہیں:

''اس ناول کا نام ہی نہ صرف خوبصورت اور شاعرانہ ہے بلکہ اس کی سب سے بڑی خصوصیت جو بہت کم ناولوں میں ملتی ہے یہ ہے کہ اس کے نام ہی

میں پوری کہانی کا مرکزی خیال یوں اور اتنے بھرپور انداز میں پیش ہوگیا ہے۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ یہ بجائے خود اس ناول کی بڑی ہی انفرادی خصوصیت ہے۔ ''چراغ تہہ داماں کی کہانی اپنے نام کے مطابق اس دامن کی کہانی ہے جو چراغ کو روشن و محفوظ رکھنے کے لیے زمانے کی سرد و گرم ہواؤں کا مقابلہ کررہا تھا، لیکن حادثے کا ایک ایسا جھونکا آتا ہے جو دامن سے گذرتا ہوا چراغ تک پہنچ ہی جاتا ہے اور چراغ کچھ اس طرح بھڑکنے لگتا ہے کہ دامن کے حصار کو توڑ کر باہر نکل آتا ہے اور چراغ کو تہہ داماں کرنے کی ساری کوشش رائیگاں جاتی ہے''۔(۷)

اقبال متین نے اپنے اس ناولٹ میں ایک عورت طوائف اور ایک مرد طوائف کا قصہ بیان کیا ہے۔ ان دونوں میں آپس میں ماں اور بیٹے کا رشتہ ہے۔ 'کوشلیا' ماں ہے اور 'شانوجہ' اس کا بیٹا ہے۔ کوشلیا ایک غریب گھرانے کی خوبصورت لڑکی ہے۔ وہ کالج میں پڑھتی ہے۔ اس کی ماں کے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں کہ وہ زیادہ سے زیادہ جہیز دے کر کسی مناسب لڑکے سے اس کی شادی کرا سکے۔ اپنی شروع جوانی میں انتظار کرتے کرتے ایک دن وہ جذبات میں آجاتی ہے اور اپنے عاشق کے بہکاوے میں آکر گھر سے بھاگ جاتی ہے اور برودلے گیسٹ ہاؤس پہنچ جاتی ہے۔ یہ گیسٹ ہاؤس اپنے پرفضاء مناظر اور بعض منفرد خصوصیات کی وجہ سے مشہور ہے۔ اس کے بارے میں ناولٹ نگار نے لکھا ہے:

''برودلے گیسٹ ہاؤس اتنی بلندی پر ہے کہ موٹے آدمی اس تک پہنچتے پہنچتے ہانپنے لگتے ہیں۔ یہ گیسٹ ہاؤس اپنے پرفضاء مناظر، صحت بخش آب و ہوا، اطراف میں بکھری ہوئی چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں اور ایک گہری خوفناک کھائی کے لیے مشہور ہے''۔(۸)

برودلے گیسٹ ہاؤس کے احاطے میں 'فیوزے' نامی ایک خوبصورت ریسٹورنٹ ہے۔ اس کا مالک فیوزک ہینسن ہے۔ اس گیسٹ ہاؤس کے پاس ایک خوشنما جھیل ہے۔ اس جھیل میں بوڑھا کاکا اپنا بجرہ چلاتا ہے اور دور دراز سے آئے مسافروں کو اس کی سیر کراتا ہے۔ جھیل، فیوزے اور برودلے گیسٹ ہاؤس کے اس مثلث میں کوشلیا کی زندگی اس طرح گھر جاتی ہے کہ وہ اس سے نکل نہیں پاتی ہے۔ کوشلیا ایک معصوم اور جذباتی لڑکی ہے۔ اسے زمانے کے نشیب و فراز کا بہت زیادہ اندازہ نہیں ہے۔ اس لیے وہ اپنے نام نہاد عاشق کے فریب میں آجاتی ہے جو اس سے محبت کا ڈھونگ رچا کر، اسے اپنی بیوی بنانے کا

وعدہ کرکے بردو لے گیسٹ ہاؤس لاتا ہے جہاں وہ اس سے بھرپور جنسی تسکین حاصل کرکے ہمیشہ کے لیے اس کی زندگی سے فرار ہو جاتا ہے۔ یہاں سے کوشلیا ایک دوسری زندگی میں داخل ہوتی ہے۔ ایک نئی زندگی اور ایک نیا گھر بسانے کا اس کا حسین خواب، خاک میں مل جاتا ہے۔ اپنی عزت و آبرو کے لٹ جانے کے بعد وہ واپس اپنا گھر بھی جانا گوارا نہیں کرتی ہے۔ ایسے میں بجرے والا بوڑھا کاکا اس کے حال پر ترس کھا کر اسے اپنی معمولی جھونپڑی میں پناہ دے دیتا ہے۔

کوشلیا اپنے عاشق سے جنسی ملاپ کے نتیجے میں حاملہ ہو جاتی ہے اور اپنے بیٹے شانوجہ کو جنم دیتی ہے۔ مجبوری و بے بسی کے عالم میں وہ اپنے بیٹے اور اپنا پیٹ پالنے کے لیے کاکا کے بجرہ میں بیٹھ کر نئے نئے مسافروں کی دلجوئی کرتی ہے اور رات میں انھیں جنسی تسکین پہنچاتی ہے۔ اس طرح وہ طوائف کے پیشہ سے منسلک ہو جاتی ہے۔ طوائف بننے کے بعد وہ اکثر تنہائی میں سوچتی رہتی ہے اور گم سم سی نظر آتی ہے۔ وہ اندر سے بہت رنجیدہ و ملول رہتی ہے۔ اقبال متین نے اس کے غم زدہ جذبات و احساسات اور اس کی داخلی کیفیات کی تصویر کشی منظر نگاری کے ذریعے اپنے مخصوص فنکارانہ انداز میں اس طرح کی ہے۔

> ''چٹکی ہوئی چاندنی راتوں میں جھیل کے شفاف پانی میں پیر لٹکائے ہوئے جب کوشلیا اکیلی بیٹھی چاند کا عکس پانی کی لہروں میں ٹوٹتا ہوا دیکھتی تو وہ بڑی گم سم سی رہتی۔ پیر ہلا کر جھیل میں ہلکورے پیدا کرتے کرتے وہ ایک دم بت کی طرح خاموش ہو جاتی۔ پانی آہستہ آہستہ تھم کر آئینہ بن جاتا اور وہ اپنا چہرہ چاند کے برابر جھیل کے دل میں اترتا ہوا دیکھ کر اداس ہو جاتی.... پھر یکا یک پیر ہلا کر اس سارے منظر کو بڑی بے دردی سے وہ تہس نہس کر دیتی''۔(۹)

کوشلیا اپنے عاشق سے بچھڑنے کے بعد بہت مغموم رہتی ہے۔ دراصل اس کے عاشق نے اسے جو حسین خواب دکھائے تھے، وہ چکنا چور ہو جاتے ہیں۔ کوشلیا کے یہی وہ شکستہ خواب ہیں جو اسے اندر سے کچوکے لگاتے اور رنج و الم میں مبتلا کرتے ہیں۔ وہ مجبوری میں طوائف تو بن جاتی ہے مگر اس کے اندر کی عورت بار بار انگڑائی لیتی ہے۔ وہ عورت جو کسی کی بیوی اور کسی کی ماں ہو کر رہنا چاہتی ہے۔ اس کے اندر ممتا کا بھی بے پناہ جذبہ ہے۔ اس کی ممتا کی کیفیت کی ایک جھلک اقبال متین کے لفظوں میں ملاحظہ ہو:

> ''شانوجہ تو اتنا ضدّی ہے کہ کوشلیا کو اچھے خاصے سخی مسافر تک کے پہلو سے

اٹھ کر اپنے اتارے ہوئے کپڑے پھر سے پہن لینے پڑے ہیں''۔(۱۰)

کوشلیا دراصل ایک گھریلو عورت ہے۔ اس لیے اس کے اندر مامتا، محبت وشفقت اور رفاقت کا بھرپور جذبہ موجود ہے۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ طوائف کا پیشہ اختیار کرے گی مگر مجبوری میں وہ طوائف بن جاتی ہے۔ اس لیے تنہائی میں وہ اکثر اداس رہتی ہے۔ وہ اس پیشہ میں اندرونی طور پر مغموم تو رہتی ہے لیکن اپنے گاہکوں کے سامنے ظاہری اور مصنوعی طور پر وہ خوش نظر آنے کی کوشش کرتی ہے۔ وہ اپنے گاہکوں سے مسکرا کر ملتی ہے۔ ایسے میں وہ بڑی معصوم نظر آتی ہے۔ اس کی معصومیت گاہکوں کو اپنی جانب کھینچتی ہے۔ معصوم ہونے کے ساتھ ساتھ وہ بے حد جذباتی اور پیار ومحبت کی بھوکی ہے۔ وہ جذبات میں آ کر کسی گاہک سے اپنا دل لگا بیٹھتی ہے اور اس کی جھوٹی محبت کے فریب میں آ کر لٹتی رہتی ہے۔

ایک بار کوشلیا کے پاس ڈیربالڈ سعید الزماں اور بلونت عرف پیارے لال نامی دو شخص آتے ہیں۔ یہ دونوں ہی اس کے ساتھ رات گزارنا چاہتے ہیں۔ یہ دونوں انتہائی عیّاش اور اوباش قسم کے انسان ہیں۔ ان دونوں کی شخصیت جھوٹ، مکّاری، عیّاری اور ریاکاری سے عبارت ہے۔ دوسروں کو فریب دینے اور اپنا اُلّو سیدھا کرنے میں ان دونوں کو کمال حاصل ہے۔ یہ دونوں کوشلیا سے بڑی محبّت اور پیار سے پیش آتے ہیں۔ یہ دونوں کوشلیا کے ساتھ جھیل کی سیر وتفریح کرنے کے بعد فیوزے ریسٹورنٹ آتے ہیں۔ فیوزے ریسٹورنٹ کے حسین اور رومان پرور مناظر کی تصویر کشی ناولٹ نگار نے بڑے دلکش انداز میں کی ہے۔ اس ریسٹورنٹ میں کوشلیا، ڈیربالڈ اور پیارے لال کے کھانے پینے اور کوشلیا کے ساتھ ڈیربالڈ اور پیارے لال کی ہنسی مذاق اور چھیڑ چھاڑ کے رومانی مناظر کو بھی ناولٹ نگار نے بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ قاری ان دلکش رومانی مناظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ اس رومانی منظر کی ایک جھلک آپ بھی ملاحظہ کریں:

''ڈیربالڈ... پی چکو نا... کوشلیا نے انگڑائی لے کر اپنے جوبن کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔

''... خصوصیات کا لحاظ رکھتے ہوئے نام عمدہ دیتی ہو... ریڈش ڈیر نے کوشلیا کی تعریف کی اور اس کا ہاتھ چوما۔

''... تمہیں کیوں نہ پیارے لال کہوں... یہ زیادہ اچھا رہے گا...''

''... خوب خوب... نام بھی دیتی ہو ترجمہ بھی کر دیتی ہو...''

''...ارے ہاں...'' ڈیربالڈ اپنی کرسی سے قریب قریب اچھل پڑا''۔(۱۱)

جب ڈیربالڈ سعید الزماں اور پیارے لال، کوشلیا کے پاس آتے ہیں تو یہ دونوں ہی اس کے ساتھ رات گزارنے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔اس لیے قرعہ اندازی کی نوبت آتی ہے۔قرعہ کوشلیا کے پانچ چھ سالہ بیٹے شانوجہ کو ڈالنا ہے لیکن وہ گہری نیند میں ہوتا ہے۔اس لیے یہ کام کوشلیا کو انجام دینا پڑتا ہے۔ قرعہ ڈالتے وقت بڑا حسین رومانی منظر ہوتا ہے۔اس منظر کو اقبال متین نے ڈرامائی انداز میں بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔

''... جانم ...رحم کا طلبگار ہوں ...'' ڈیربالڈ نے جھک کر کوشلیا کے پیر چھو لئے۔

''... یوں نہ کرو'...اس نے پیر ہٹاتے ہوئے کہا...میں تمہارے حق میں ہی فیصلہ کئے دیتی ہوں...''

''سچ مچ یوں نہ کر دینا...'' پیارے لال نے التجا کی....''ورنہ میں جھیل میں ڈوب مروں گا...''

کوشلیا مسکرائی...''کون کسی کے لئے جھیل میں ڈوبتا ہے بابا... بالکل یہی بات چھ سات سال پہلے مجھ سے کسی نے کہی تھی...پھر وہ آج تک نہیں لوٹا...اور میں اکیلی جھیل میں ڈوب ڈوب کر ابھرنے کے لئے رہ گئی ہوں...''۔(۱۲)

اس اقتباس میں حسین رومانی منظر کی جھلک نظر آنے کے ساتھ ساتھ کوشلیا کی کربناک کیفیت کو بھی محسوس کیا جا سکتا ہے کہ وہ کس طرح اکیلی اپنی کڑوی زندگی اور تلخ حالات کا سامنا کر رہی ہے۔کوئی اسے اپنانے والا نہیں۔اس کے پاس مختلف مرد آتے ہیں لیکن وہ اس کے جسم سے جنسی تسکین حاصل کر کے چند لمحوں میں اس کی زندگی سے جدا ہو جاتے ہیں۔دیگر مختلف مردوں کی طرح ڈیربالڈ اور پیارے لال بھی اس کے پاس جنسی خواہش پوری کرنے آتے ہیں۔جب کوشلیا قرعہ اندازی کے ذریعے ایک رات کے لیے ڈیربالڈ کی ہو جاتی ہے تو ڈیربالڈ اس کے ساتھ اپنی فرضی اور بناوٹی محبت کا اظہار اس طرح سے کرتا ہے کہ کوشلیا اسے دل دے بیٹھتی ہے۔وہ اسے اپنا سمجھ کر اس سے مختلف طرح کی باتیں کرتی ہے۔وہ اس کے سامنے اپنی دلی باتوں کا بھی اظہار کرتی ہے۔اس کی باتوں سے اس کے دلی دُکھ درد اور رنج و غم پہ بھی روشنی پڑتی ہے۔وہ مجبوری میں اپنا پیٹ پالنے اور اپنے بیٹے شانوجہ کی پرورش اور اس کی تعلیم و تربیت کی

خاطر طوائف تو بن گئی ہے لیکن اسے اس ذلّت آمیز زندگی کا دُکھ ہے۔ وہ اس زندگی سے نکلنا اور کسی کی ہو کر رہنا چاہتی ہے۔ دیکھئے وہ اس خواہش کا اظہار ڈیر بالڈ سے باتوں باتوں میں کس طرح کرتی ہے:

''مجھے کچھ کرنا نہیں ہے، لیکن شانوجہ کو زندگی میں بہت کچھ کرنا ہے۔ میں چاہتی ہوں اس کی خاطر... میرے شانوجہ کی خاطر کوئی میرا ہاتھ پکڑے اور میں اس کے ساتھ شانو کو لے کر اس ماحول سے بہت دور نکل جاؤں، اس زندگی سے بہت دور نکل جاؤں، اتنا دور کہ شانو بڑا ہو جائے تو یہ بات بھی اسے معلوم نہ ہو کہ اس کی ماں نے جو کچھ دولت اس کی تعلیم و تربیت کے لیے جمع کی ہے وہ اس طرح جمع کی گئی ہے جس طرح میں کرتی رہی ہوں''۔(۱۳)

کوشلیا کے ان جملوں میں اس کی محرومیوں اور اس کے دکھ درد کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ وہ اپنے پیشے اور اپنی زندگی سے رنجیدہ ہے۔ وہ حالات کی بے بسی کے تحت طوائف بن گئی ہے لیکن وہ اس پیشہ میں دیگر پیشہ ور طوائفوں کی طرح گری نہیں ہے۔ اسے اپنے وجود اور اپنی اہمیت کا احساس ہے۔ وہ اپنی توہین پر چراغ پا ہو جاتی ہے۔ جب وہ قرعہ اندازی کے ذریعے ڈیر بالڈ کی ہو جاتی ہے اور ڈیر بالڈ اسے پیارے لال کو پیش کرنے کی خواہش کا اظہار کرتا ہے تو اس توہین پر کوشلیا یوں برہم ہوتی ہے:

''تم کون ہوتے ہو مجھے دوسروں کے پاس پیش کرنے والے۔ میں کوئی مٹی کا کھلونا نہیں ہوں۔ اپنی مرضی کی مالک ہوں، جس کے ساتھ چاہے سو سکتی ہوں، جس کے ساتھ چاہے نہیں۔ تم کوئی پیشہ ور دلال معلوم ہوتے ہو''۔(۱۴)

مذکورہ اقتباسات کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ کوشلیا کے اندر کی عورت مری نہیں ہے۔ اس کے اندر گھریلو عورت بار بار انگڑائی لیتی ہے۔ وہ کسی کی ہو کر رہنے کا خواب دیکھتی ہے اور کسی مرد کے ساتھ بیوی بن کر زندگی گزارنا چاہتی ہے لیکن کوئی اس کا ہاتھ تھامنے والا نہیں۔

چنانچہ جب ڈیر بالڈ قرعہ اندازی کے ذریعے کوشلیا کو ایک رات کے لیے حاصل کر لیتا ہے تو وہ اس کے ساتھ دادِ عیش دینے کے لیے اسے فیوزے ریسٹورنٹ سے لے کر برودلے گیسٹ ہاؤس پہنچتا ہے۔ ایک کمرے میں کوشلیا کے ساتھ ڈیر بالڈ ہوتا ہے اور دوسرے کمرے میں شانوجہ کے ساتھ پیارے لال۔ جب ڈیر بالڈ اپنے کمرے میں کوشلیا کو اپنے پہلو میں لے کر اس سے پیار کر رہا ہوتا ہے، اسی وقت کوشلیا کو شانوجہ کی دلخراش چیخ سنائی دیتی ہے۔ دراصل پیارے لال شانوجہ کے ساتھ ہم جنسیت کا ارتکاب کر بیٹھتا

ہےاور وہ درد کے مارے چیخ رہا ہوتا ہے۔اس چیخ کو سن کر کوشلیا بدحواسی کے عالم میں گرتے پڑتے بھاگتی ہوئی شانوجہ کے کمرے میں پہنچتی ہے جہاں کے وحشتناک منظر کو دیکھ کر وہ مشتعل ہو جاتی ہے:

''شانوجہ کا نیکر بھی نیچے پڑا ہوا تھا اور وہ پیارے لال کے بستر پر ننگا پڑا کراہ رہا تھا۔کوشلیا کی آنکھوں میں زمانے بھر کی وحشت جیسے پناہ لینے کے لئے چلی آئی تھی۔اس کی آنکھیں گھائل ہرنی کی طرح وحشیانہ تھیں...اس نے پھیلی پھیلی آنکھوں سے بلونت کو دیکھا جو جلدی جلدی پتلون پہن رہا تھا...وہ جست لگا کر اٹھی اور بلونت پر جھپٹی...اس نے تابڑ توڑ دو چار مکے اور تھپڑ بھی اسے جڑ دیئے''۔(۱۵)

یہاں سے کوشلیا کی زندگی میں زہر سرایت کرنا شروع ہوتا ہے۔یہ زہر اس کی زندگی میں پیارے لال گھولتا ہے۔وہ اس کے معصوم بیٹے سے بدفعلی کرتا ہے اور اسے اس کا چسکہ لگا دیتا ہے۔وہ برابر شانوجہ سے ملتا رہتا ہے۔وہی شانوجہ کو چپکے سے برہن بستی کے خانوں کے سردار کے پاس پہنچاتا ہے جو اسے رکھیل بنا لیتا ہے۔اچانک شانوجہ کے غائب ہو جانے سے اس کی ماں کوشلیا مضطرب ہو جاتی ہے۔اس کے اس اضطراب کے عالم میں پیر اصمصام دین اور بوڑھا کاکا اس کے ہمدرد ثابت ہوتے ہیں۔اس کی ہمدردی میں پہلے صمصام دین شانوجہ کے بارے میں پتہ لگانے برہن بستی پہنچتا ہے۔وہاں سے آکر وہ کوشلیا کے سامنے انکشاف کرتا ہے کہ شانوجہ نے زنانہ لباس پہن کر اور آرائش و زیبائش اختیار کر کے اس طرح نسوانیت اختیار کر لی ہے کہ وہ پہچانا نہیں جاتا۔اس دلخراش خبر کو سن کر کوشلیا بے چین ہو اُٹھتی ہے۔وہ دل ہی دل میں سوچتی ہے کہ یہ خبر جھوٹ ہو۔اس کی بے چینی کو دیکھ کر جب بوڑھے کاکا سے نہیں رہا جاتا تو وہ کوشلیا کو تسلّی دیتا اور خود سے شانوجہ کے بارے میں پتہ لگانے چلا جاتا ہے۔واپس آکر بوڑھا کاکا کوشلیا کو شانوجہ کے بارے میں بتاتا ہے:

''وہ اب برہن بستی چھوڑ چکا ہے لیکن آج ہی رات کے کسی حصے میں یہاں آجائے گا۔برودلے گیسٹ ہاؤس کا کوئی کمرہ پٹھانوں کے سردار نے اپنے لیے محفوظ کر رکھا ہے۔وہ رات اسی کے ساتھ ٹھہرے گا۔صمصام دین نے جو کچھ کہا ہے وہ ٹھیک ہی ہے۔میں نے شانوجہ کو دیکھا ہے۔تم بھی دیکھو گی تو پہچان نہ سکو گی۔میں نے اس سے ملنے کی کوشش بھی کی لیکن خانوں کے سردار نے مجھے اجازت نہیں دی اور نہ شانوجہ ہی اس پر راضی ہوا۔زنانے

لباس میں وہ بالکل تمہاری طرح لگتا ہے۔ مجھے تو اس حد تک دھوکا ہوا کہ میں
سمجھا تم آ گئی ہو لیکن منٹ بھر میں میری غلط فہمی دور ہو چکی تھی‘‘۔(۱۶)

بوڑھے کاکا کی زبان سے ان باتوں کو سن کر کوشلیا کے پیروں تلے سے زمین کھسک جاتی ہے۔ وہ اندر سے بے حد دُکھی اور غمزدہ ہو جاتی ہے۔ اس کا دل رو رہا ہوتا ہے۔ اسے اپنی طوائف ہونے کا اتنا دُکھ نہیں ہوتا، جتنا اپنے بیٹے شانوجہ کے بدچلن ہونے کا ہوتا ہے۔ اگر اس کا بیٹا شانوجہ اس طرح کا بدچلن ہوتا کہ مختلف عورتوں سے میل جول رکھتا اور عیاشی کرتا تو بھی اسے اتنی تکلیف نہیں ہوتی لیکن اس نے تو نسوانی صفات اختیار کر کے طوائف کا پیشہ اختیار کر لیا ہے جس کا کوشلیا کو بے حد صدمہ ہے۔ اس صدمہ نے اس کے وجود کو اندر سے ہلا کر بے چین و مضطرب کر دیا ہے۔ اب وہ سوتے جاگتے پریشان رہنے لگتی ہے۔ اس اضطراب و پریشانی کے عالم میں ڈیر بالڈ کا خط اسے موصول ہوتا ہے جو اسے جھوٹی تسلّی دیتا اور مصنوعی ہمدردی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اس جھوٹی تسلّی سے اسے تھوڑی دیر کے لیے سکون تو مل جاتا ہے لیکن تھوڑی دیر بعد پھر اس کے اندر بے قراری پیدا ہوتی ہے۔ وہ اپنے کیے یعنی گھر سے بھاگنے پر بہت پچھتاتی اور افسوس کرتی ہے۔ کبھی وہ سوچتی ہے کہ شاید یہ اس کی ماں کی بددعا کا اثر ہے۔ مختلف طرح کی سوچوں اور وسوسوں میں گم وہ اندر سے بڑی بے چین رہتی ہے۔ اسے اپنے بیٹے شانوجہ کی جدائی اور بدکاری کا بڑا دُکھ ہوتا ہے۔ اس نے بڑے ارمانوں سے اپنے بیٹے شانوجہ کو پالا پوسا اور پرورش کی تھی۔ اسے اس میں زندگی کی کرن نظر آئی تھی۔ وہ اسے اپنے اردگرد کے غلیظ ماحول سے دور رکھنا اور تعلیم و تربیت دے کر اپنے بڑھاپے کا سہارا بنانا چاہتی تھی مگر حالات کی ستم ظریفی دیکھئے کہ اس کا بیٹا شانوجہ اس گندے ماحول کی زد سے بچ نہیں پاتا ہے اور طوائف بن جاتا ہے۔ اس کے بارے میں طرح طرح کی باتیں سن کر کوشلیا تلملا اُٹھتی ہے۔ وہ اپنے بیٹے کی جدائی میں اندر اندر گھٹتی اور کُڑھتی رہتی ہے۔ وہ اس سے ملنا چاہتی ہے کہ کیا واقعی وہ ایک پیشہ ور طوائف ہو گیا ہے۔ اگر ایسا ہو گیا ہے تو اسے اپنے کئے پہ کچھ پچھتاوا ہے یا نہیں۔ وہ شانوجہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لیے بے قرار رہتی ہے۔ اسی درمیان اسے شانوجہ سے ملنے کی ایک ترکیب نظر آتی ہے۔ وہ اس طرح کہ ایک دن کوشلیا کا فریبی عاشق ڈیر بالڈ اس کے پاس آنے والا ہوتا ہے جس کا اظہار وہ اپنے خط میں کرتا ہے۔ اسی دن شانوجہ کا عاشق پیارے لال،

شانوجہ کے ساتھ رات گزارنے کے لیے برودلے گیسٹ ہاؤس میں کمرہ بک کراتا ہے۔ ادھر کچھ دنوں سے کوشلیا کا عاشق ڈیریبالڈاس کے ساتھ بوڑھے کاکا کے پھوس کی جھونپڑی ہی میں رات گزار لیتا ہے لیکن آج کوشلیا اپنے عاشق سے کہہ کر برودلے گیسٹ ہاؤس میں کمرہ بک کراتی ہے تاکہ وہ شانوجہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے۔ اتفاق سے ماں اور بیٹے دونوں کا کمرہ آمنے سامنے ہوتا ہے۔ یہاں تو دونوں کا آمنا سامنا ہوتا ہی ہے مگر یہاں سے پہلے دونوں کا سامنا بوڑھے کاکا کی جھونپڑی میں ہوتا ہے جہاں شانوجہ زنانہ لباس میں اپنی ماں سے ملنے کے لیے آتا ہے اور مسکرا رہا ہوتا ہے۔ اچانک شانوجہ کو اس صورت میں اپنے سامنے مسکراتے ہوئے دیکھ کر کوشلیا مبہوت ہو جاتی ہے، اس کا سر چکرانے لگتا ہے اور وہ جھومنے لگتی ہے۔ شانوجہ اسے سہارا دے کر پلنگ پر بٹھاتا ہے اور اسے ''ماں'' پکارتا ہے تو وہ شانوجہ پر غصّہ سے پھٹ پڑتی ہے۔ اس کے جواب میں شانوجہ بھی اپنی ماں پر طنز کرنے سے نہیں چونکتا۔ یہ پورا منظر ناولٹ نگار کی زبانی ملاحظہ ہو:

> ''کوشلیا چونک گئی، پلک جھپکنے میں اس کی آنکھوں پر سے ہاتھوں کی گرفت ہٹ گئی تھی اور اس نے دیکھ لیا تھا کہ شانوجہ سامنے کھڑا مسکرا رہا ہے۔ وہ مبہوت ہو کر رہ گئی۔ اس غیر متوقع حادثہ کے لیے وہ بالکل تیار نہیں تھی۔ ہر جذبے سے عاری خالی خالی نظروں سے وہ اسے تکتی رہی، پھر اس کا سر چکرا گیا، آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ آنکھیں بند کر کے وہ ہوا میں جھومتے ہوئے سرو کی طرح دیکھتے دیکھتے جھوم کر رہ گئی۔ شانوجہ نے بڑھ کر اسے سنبھالا، سہارا دے کر پلنگ کی پٹی پر بٹھایا اور اس کی بانہہ پکڑ کر اسے جھنجھوڑتے ہوئے پوچھنے لگا۔
>
> ''کیا ہو گیا ہے تجھے ماں... دیکھ میں آ گیا ہوں''
>
> کوشلیا نے سنبھل کر آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں۔ شانوجہ کو پلکیں جھپکا کر غور سے دیکھا، پھر یکایک چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر سسکنے لگی۔ شانوجہ کھاٹ کی پٹی پر اس کے قریب ہو آیا۔... ''ماں''
>
> وہ بپھری ہوئی شیرنی کے مانند اٹھی۔.. ''ماں'' مجھے ماں مت کہنا۔
>
> ''میں تیری ماں نہیں ہوں۔ اچھا ہوتا اگر تو مر جاتا اور میں ماں پکارے جانے کے لیے ترس ترس کر رہ جاتی۔ میں سوچتی تھی... میں تو سوچتی تھی کہ جب تو بڑا ہو گا تو مجھ سے کہے گا کہ کاش تم میری ماں نہ ہوتیں اور میں فخر سے

سینہ تان کر چلوں گی کہ میں بہر حال تیری ماں ہوں، تیرے نہ کہنے سے کیا
ہوتا ہے، لیکن آج مجھ جیسی ماں تجھ سے کہہ رہی ہے کہ کاش تو میرا بیٹا نہ ہوتا،
تو نے کبھی آئینے میں اپنا قد دیکھا ہے، اپنے ہاتھ پیر دیکھے ہیں، اپنا سینہ
دیکھا ہے۔ تجھے معلوم بھی ہے کہ ماں جب اپنے بیٹے کو عمر کی اس منزل میں
دیکھتی ہے تو رعونت کی حد تک خود اعتمادی اس میں پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے
کو عام عورتوں سے بلند و برتر سمجھنے لگتی ہے، لیکن تو نے میری زندگی کو اٹھا کر
کھائی کے اندھیروں میں پھینک دیا ہے۔ اس سے اچھا تو یہ ہوتا کہ خود مجھے
پھینک دیتا تا کہ تجھے دیکھنے کے لیے زندہ نہ رہتی۔ شانوجہ! میں نے کیا کیا
سوچ رکھا تھا۔ میں سوچتی تھی کہ تو شرم سے میرے سامنے بھی آ نہ سکے گا، تیرا
کاکا تجھے پکڑ کر مجھ تک لائے گا لیکن تو کس قدر سفاک ہے۔ تجھے اپنے کیے
پر کوئی پچھتاوا بھی تو نہیں، لجا اور شرم کے لفظ تو نے شاید کبھی سنے ہی نہیں۔
تجھے آخر یہ کیا ہو گیا ہے شانوجہ! تجھے آخر پر سب کیا ہو گیا ہے؟ اور کوشلیا نے
پھر اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا۔

''ماں تو یہ مجھ سے پوچھ رہی ہے کہ لجا اور شرم کے لفظ میں نے سنے نہیں
ہیں۔ تو جانتی ہے کہ تو مجھ سے کیا پوچھ رہی ہے۔ برودلے گیسٹ ہاؤس میں
آج ہم دونوں کے کمرے اتفاق سے ایک دوسرے کے برابر برابر ہیں۔
ایک دیوار بیچ میں حائل ہے ماں!.. ایک کمرے میں پیارے لال کے ساتھ
میں ٹھہرا ہوں اور دوسرے میں سعید الزماں کے ساتھ تو رہے گی۔ میں اپنی
شرم کی گٹھری اٹھا لاؤں گا تو اپنی لجا سمیٹ لا... رات گزر جائے تو صبح کو ہم
ایک دوسرے کا چہرہ اجالے میں دیکھیں گے، پھر تو مجھے ایک بار صرف ایک
بار بیٹا پکار لینا اور مجھے بھی اتنی اجازت دینا کہ میں بھی تجھے صرف ایک بار
ماں پکار لوں''۔ (۱۷)

یہاں ماں اور بیٹے کے مذکورہ مکالموں سے ان دونوں کی دلی حالت و کیفیت کو بخوبی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ماں کوشلیا کو شانوجہ کو اس حالت میں دیکھ کر اپنی زندگی پر بے حد افسوس اور پچھتاوا ہوتا ہے۔ اسے شانوجہ کے بدچلن ہونے کا بہت زیادہ رنج و ملال ہوتا ہے مگر اس کے برعکس شانوجہ کو اپنے اوپر کوئی افسوس اور اپنے پیشہ کا کوئی ملال نہیں ہوتا ہے۔ وہ بڑے آرام سے اور چالاکی و ہشیاری سے اپنے پیشے کو انجام دیتا ہے اور خوب دولت بٹورتا ہے۔ وہ اپنے پیشہ میں بڑا سفاک بن جاتا ہے۔ اس کی سفا کی کو دیکھ

کر کوشلیا زندگی سے مایوس ہو جاتی ہے اور اس کا وجود درد سے تلملا اُٹھتا ہے۔ دیکھئے کوشلیا کے ان جملوں میں اس کے دل کا درد اُبل پڑا ہے:

> ''میں نے اپنا سب کچھ کھو دیا ہے۔ اب میرے پاس ہے ہی کیا، سوچ سوچ کر ہی سہی جی تو لیتی تھی۔ زندگی کو میں نے آنکھ کھولتے ہی بیسوا کی طرح چکلے پر دیکھا، اس کے باوجود اس کے ننگے سینے سے چمٹ کر زندہ رہی۔ اس لیے کہ شانوجہ نے مجھے مرنے ہی نہ دیا۔ آج جب شانوجہ موت اور زندگی کے درمیان سے ہٹ گیا ہے، میں سوچتی ہوں کہ آرام نہ کروں، تھک کر چور ہوگئی ہوں۔ زخمی پیروں سے کب تک راستہ ناپتی رہوں گی جب کہ منزل کا کوئی نشان بھی نہیں رہ گیا ہے۔ اب سوچنے کے لیے بھی تو کچھ نہیں رہ گیا''۔(۱۸)

اپنے بیٹے شانوجہ سے دوسری بار کوشلیا کا سامنا برودلے گیسٹ ہاؤس میں ہوتا ہے۔ یہاں وہ اپنے نام نہاد عاشق ڈیریالڈ کے ساتھ ٹھہری ہوئی ہے۔ آج وہ بہت زیادہ شراب پینے لگی ہے اور بہت زیادہ غمزدہ نظر آتی ہے۔ اس کی اس حالت کو دیکھ کر اس کا بناوٹی عاشق چالاکی یہ کرتا ہے کہ کوشلیا کی پسندیدہ شراب لانے کے بہانے سے کمرے سے نکلتا ہے اور فرار ہو جاتا ہے۔ جاتے ہوئے وہ اپنی سوٹ کیس کے ساتھ ساتھ کوشلیا کے صندوق میں پڑی اس کی بچی کھچی رقم بھی لے اُڑتا ہے۔ صبح جب کوشلیا برودلے گیسٹ ہاؤس کے کمرے میں نشہ سے بیدار ہوتی ہے تو اپنے عاشق ڈیریالڈ کو اپنے کمرے میں نہ پا کر بے چین ہو اُٹھتی ہے۔ وہ دیوانہ وار دوڑ کر شانوجہ کے کمرے میں پہنچتی ہے اور پاگلوں کی طرح دروازہ کھٹکھٹاتی ہے۔ دروازہ کھلنے پر جب کوشلیا، شانوجہ سے اپنے عاشق ڈیریالڈ کے بارے میں پوچھتی ہے تو شانوجہ یہاں بھی اپنی ماں پر بڑا گہرا طنز کرتا ہے۔ ماں اور بیٹے دونوں کے آمنے سامنے اور ہم کلام ہونے کا یہ منظر ملاحظہ ہو:

> ''کوشلیا نے پوچھا۔ ''کہاں ہے وہ؟''
> شانوجہ مسکرایا۔ اس نے کوشلیا کی پروا کیے بغیر کہا۔ ''میرے بدن پر کپڑے نہیں ہیں۔ میں شال کے اندر بالکل ننگا ہوں۔ خلاف معمول تم اس ڈھنگ سے کپڑے پہنی ہوئی ہو جیسے رات تم نے کپڑے اتارے ہی نہیں، پھر بھی کوئی مضائقہ نہیں، لیکن حیرت اس بات پر ہے کہ تم اب بھی مجھ سے یہ کہنے

کے لیے نہیں آئی ہو کہ میں تمہیں ماں پکار سکتا ہوں‘‘
کوشلیا نے شانو کے لگائے ہوئے زہریلے نشتر کو تڑپ کر محسوس کیا۔
’’بکواس بند کرو، پہلے مجھے یہ بتلاؤ کہ وہ ہے کہاں؟‘‘
’’وہ جا چکا ہے اور اگر ہوتا بھی تو تم اس کا کیا بگاڑ لیتیں؟‘‘
’’تو تم اس کا پہلو بھی گرما چکے ہو؟ تم جانتے ہو... تم جانتے ہو کہ وہ میرا....‘‘
شانوجہ چونکا.....اس کی سمجھ میں آیا کہ کوشلیا پیارے لال کو نہیں اپنے ڈیر بالڈ کو پوچھ رہی ہے۔ شانوجہ نے حقارت سے کوشلیا کو دیکھ کر کہا۔ ’’اونہہ اس کی گرہ میں اتنے دم نہیں ہیں کہ وہ مجھے اپنے پہلو میں لے سکے‘‘
’’ورنہ تم اس کے بھی ہو جاتے؟‘‘
’’نہیں جی.....اس کے تو میں پتا جی کہہ کر پیر پکڑ لیتا.. تم یہی چاہتی تھیں نا‘‘
’’مجھ پر طنز کرتے ہوئے افسوس ہے کہ تمہارا دل روتا نہیں ہے‘‘
’’رو لے گا... آہستہ آہستہ رو لے گا۔ پہلے تم مجھے ان سارے مردوں کا حلیہ بتا دو جو تمہارے ہو چکے ہیں تاکہ جب وہ میری طرف ہاتھ بڑھائیں تو میں ان کی کلائی مروڑ کر پوچھوں کہ تم میرے باپ تو نہیں ہو، یا پھر ان کا گریبان پکڑ کر تمہارے سامنے لے آؤں، تم سے کہوں کہ ماں پہچانو یہ میرا باپ تو نہیں ہے، اور جب نفی میں سر ہلاؤ تو اپنا جسم اس کی آغوش میں دے دوں اور جو تم پہچان سکو کہ وہ کبھی تمہارے ساتھ بھی سو چکا ہے تو میں اس کی ادا کی ہوئی ساری رقم لوٹا کر اس کے پیر پکڑ لوں کہ پتا جی مجھے معاف کر دو‘‘۔(۱۹)

شانوجہ کے مذکورہ مکالموں سے ایسا لگتا ہے کہ اسے بھی کہیں نہ کہیں اپنی زندگی کا غم ہے مگر وہ کوشلیا کی طرح مکمل طور پر غم و اندوہ کی نذر نہیں ہو جاتا، بلکہ وہ سارے درد و غم کو بھول کر اپنے پیشہ کو پیشہ کی طرح برتتا ہے کیوں کہ زمانے کے تلخ حالات پر بھی اس کی نظر ہے۔ وہ اپنی ماں پر طنز ضرور کرتا ہے مگر اسے اپنی ماں سے کہیں نہ کہیں ہمدردی بھی ہے۔ اس لیے وہ ماں سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:

’’ماں! تو کیسے انکار کر دے گی ماں کہ تو میری ماں نہیں ہے۔ میں تجھے جانتا ہوں ماں تو نے سایوں کے پیچھے زندگی بتا دی ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ جس جہنم سے تو بھاگتی رہی ہے، میں اسی جہنم میں تجھے کھینچ لایا ہوں۔ میں بھی کوئی خوش نہیں ہوں لیکن مجھے کوئی افسوس بھی نہیں ہے۔ میں آج بھی مطمئن ہوں کہ میں بہتوں سے اچھا ہوں۔ وہ لوگ جو مجھ پر بے دریغ لٹاتے ہیں، وہ مجھ سے بڑے مجرم ہیں ماں! ان کی گرہ میں جو دام میرے

لیے ہوتے ہیں، وہ رشوتوں اور ناجائز ٹھیکوں سے کمائی ہوئی دولت کا ایک حصہ ہیں، لیکن زمانہ ان کے آگے جھکتا ہے۔ ان کی بڑی بڑی موٹریں آنکھوں کو خیرہ کر کے اس طرح گزر جاتی ہیں کہ آدمی کو آدمی کا خون نظر نہیں آتا۔ ہمارا جرم تو اتنا ہے کہ ہم اپنے ہی خون میں زہر ملا کر مگن ہو بیٹھے ہیں۔ کل جب ایک اچھے سے بنگلے سے اچھی سی کار میں بیٹھ کر تو اور میں نکلیں گے تو کتنی ہی نظریں تعظیم کو جھک جائیں گی۔ خدا کی خدائی سے انکار کرنے والے بہت سے دیکھے ہیں، دولت کی خدائی سے انکار کرنے والا تو نے آج تک دیکھا ہے ماں؟''۔(۲۰)

شانوجہ، اپنی ماں کوشلیا سے ہمدردی کا مظاہرہ کرتا ہے اور اس کے سامنے سماج کی بدعنوانیوں اور تلخ حالات کا انکشاف کر کے اسے زمانے کی سنگینی سے بھی واقف کراتا ہے۔ شانوجہ کی اپنے زمانے کے اچھے، بُرے دونوں پہلوؤں پر نظر ہے۔ اسے پتہ ہے کہ اس کے سماج میں صرف اور صرف دولت اور مادیت کی اہمیت ہے۔ کسی کے درد و کرب اور کسی کے غم سے کسی کو کوئی سروکار نہیں ہے۔ ہر آدمی اپنے مفاد کا غلام اور اپنی ذاتی خواہشوں کی زنجیر میں قید ہے۔ ایسے میں زمانہ کے تقاضوں کے مطابق چل کر ہی زندگی سے نباہ کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے شانوجہ اپنے پیشہ سے اندرونی طور پر خوش نہ ہوتے ہوئے بھی اسے اس کے تقاضوں کے مطابق برتتا ہے۔ اس پیشہ میں وہ اس قدر سفاکی سے کام لیتا ہے کہ اپنی ماں کو بھی مات دے دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک کامیاب پیشہ ور طوائف بن کر خوب دولت بٹورتا ہے اور عیش و عشرت کی زندگی گزارتا ہے۔ اس کے برعکس اس کی ماں کوشلیا اس پیشہ میں کامیاب نہیں ہو پاتی۔ وہ مجبوری میں طوائف تو بن جاتی ہے مگر اس کے اندر کی عورت بار بار انگڑائی لیتی ہے۔ وہ اسے مار نہیں پاتی ہے۔ وہ اس زندگی سے نکلنا چاہتی ہے۔ وہ کسی کی بیوی بن کر زندگی گزارنا چاہتی ہے لیکن اس کے لیے وہ صحیح راستہ اختیار نہیں کر پاتی ہے۔ دراصل کوشلیا بے حد جذباتی ہے۔ جذبات میں آ کر وہ اپنے کالج کے ایک ساتھی کو دل دے بیٹھتی ہے اور اپنی ماں کو بتائے بغیر، اس کے ساتھ خوش حال زندگی کا تصور لیے گھر سے بھاگ کھڑی ہوتی ہے اور طوائف بن جاتی۔ طوائف بننے کے بعد وہ اس زندگی سے نکلنا چاہتی ہے۔ بیرا صمصام دین سے شادی کر کے اسے اس زندگی سے نکلنے کا موقع بھی ہاتھ آتا ہے لیکن وہ اسے اس کے معمولی حیثیت کے آدمی ہونے کی وجہ سے ٹھکرا دیتی ہے۔ وہ جذباتی ہو کر ڈیر بالڈ جیسے رند اور

عیاش قسم کے آدمی سے عشق کر بیٹھتی ہے جو اسے جھوٹی تسلّیاں دے کر اور اس کے ساتھ فرضی اور بناوٹی محبت کا اظہار کر کے اس سے جی بھر کر جنسی تسکین حاصل کرتا ہے۔ وہ اپنی فرضی بیٹی کی شادی کا بہانہ بنا کر کوشلیا کی رقم پر بھی ہاتھ صاف کرتا ہے۔ وہ کوشلیا سے اپنے جھوٹے عشق کا اظہار اس طرح کرتا ہے کہ کوشلیا اس کے فریب میں آ کر لٹتی رہتی ہے اور اسے اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔ کوشلیا ہمیشہ خوابوں اور فریب کے پیچھے بھاگتی ہے۔ وہ جذبات کی رو میں بہہ کر ناموافق حالات کے ہاتھوں مسلسل ٹھوکر کھاتی ہے۔ وہ مجبوری میں طوائف تو بن جاتی ہے لیکن وہ اپنی زندگی کی تمام تر تلخیوں کو اپنے بیٹے شانوجہ کے لیے سہتی ہے۔ شانوجہ اس کی امیدوں اور آرزوؤں کا چراغ ہوتا ہے۔ کوشلیا بڑے جتن سے اس کی پرورش کرتی ہے۔ وہ اسے اپنے آس پاس کے گندے ماحول سے دور رکھنا چاہتی ہے۔ وہ اسے تعلیم و تربیت دے کر اپنی زندگی کا سہارا بنانا چاہتی ہے مگر کوشلیا کی قسمت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ اس کا بیٹا شانوجہ بھی اسی کے راستے پر چل پڑتا ہے اور ایک کامیاب پیشہ ور طوائف بن جاتا ہے۔ کوشلیا کو اس کا بے حد ملال ہوتا ہے۔ اس کی ساری آرزوئیں حسرت بن جاتی ہیں۔ وہ اپنے بیٹے شانوجہ کی بربادیوں اور اپنی رسوائیوں کو دیکھنے کے بعد اندر سے ٹوٹ جاتی ہے۔ وہ اپنی زندگی سے مایوس ہو جاتی ہے۔ وہ اس قدر دُکھی اور غمگین ہوتی ہے کہ غم کی تاب نہ لا کر برودلے گیسٹ ہاؤس کے سامنے، گہری خوفناک کھائی میں چھلانگ لگا کر خودکشی کر لیتی ہے۔ یہاں پر ناولٹ کی کہانی اختتام پذیر ہوتی ہے۔ اس اختتام پر کوشلیا کی خودکشی کی خبر سن کر قاری کی آنکھوں میں آنسو آ جاتا ہے اور وہ کوشلیا کے دردناک حالات پر غم زدہ ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

اس ناولٹ پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر رؤف خیر رقم طراز ہیں:

> ''چراغ تہہ داماں'' ایک ایسی دردناک کہانی پر مشتمل ہے جس کے انجام پر اگر کوئی آنکھ نہیں بھیگتی ہے، اس کی بے نوری میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا اور اگر کسی دل سے ہوک نہیں اٹھتی ہے، اس کی سنگ دلی میں بھی شک نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اردو ادب کا ایک کامیاب ترین ناولٹ ہے۔ جناب اقبال متین نے ایسے نازک موضوع کو اپنایا ہے کہ اس کو ہاتھ لگانا چراغ کی لو پر ہاتھ رکھنا ہے''۔(۲۱)

اس ناولٹ میں اقبال متین نے ایک معصوم اور جذباتی عورت کوشلیا کی زندگی کے تباہ و برباد ہونے کی داستان بیان کی ہے۔ کوشلیا اپنے عاشق کے فریب میں آ کر گھر سے بھاگ جاتی اور طوائف بن جاتی

ہے۔کوشلیا مجبوری میں طوائف تو بن جاتی ہے لیکن وہ اپنی زندگی سے بہت دُکھی رہتی ہے۔ دراصل کوشلیا اپنے اندر کی عورت کو ختم نہیں کر پاتی ہے۔ محبت ورفاقت اور ماماتا کے جذبہ سے پُر کوشلیا چاہتی ہے کہ کوئی اس کا ہاتھ تھام لے اور اسے اس غلیظ زندگی سے نکال لے مگر کوئی اسے نہیں اپناتا۔ کوشلیا زندگی بھر محبت کے لیے ترستی رہتی ہے۔ اس کے پاس مختلف مرد آتے بھی ہیں تو وہ ہوس پوری کرنے کے لیے، جو اس کی محبت اور ماماتا کے جذبہ کو کچل کر رکھ دیتے ہیں۔ کوشلیا کی امیدوں کا آخری مرکز اس کا بیٹا ہوتا ہے جسے وہ اپنا سہارا بنانا چاہتی ہے لیکن اس کا بیٹا شانو جبھی ایک پیشہ ور طوائف بن جاتا ہے۔ کوشلیا کو اپنے بیٹے کے پیشہ ور طوائف ہونے کا اس قدر رنج ہوتا ہے کہ مارے غم کے وہ اپنی زندگی ہی سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہے۔ اس ناولٹ میں کوشلیا کے المناک حالات، اس کی دردناک کیفیات اور غم زدہ جذبات واحساسات کو ناولٹ نگار نے اس موثر انداز میں بیان کیا ہے کہ قاری اسے محسوس کیے بغیر نہیں رہتا۔

اس ناولٹ میں اقبال متین نے عورت طوائف اور مرد طوائف کو پیش کیا ہے اور ہم جنسیت کے انتہائی نازک موضوع کو اپنایا ہے مگر ان کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اس پیچیدہ اور انتہائی حساس موضوع کو بہت سنبھل کر اور سلیقے سے پیش کیا ہے۔ ان کی اس خوبی پر داد دیتے ہوئے مشہور افسانہ نگار عابد سہیل رقم طراز ہیں:

> ''اقبال متین نے 'چراغِ تہہِ داماں' میں ایک ایسے موضوع کو چھوا ہے جس کو ہاتھ لگاتے ہی خیال کی انگلیاں جلتی ہیں۔ بے حد نازک بلکہ سچ پوچھیے تو ایک ایسے موضوع کو جس میں مصنف کے بھٹک جانے کے بے پایاں امکانات موجود تھے۔ ان کے قلم نے اس طرح برتا کہ پورا ناولٹ ایک مکمل اکائی بن گیا''۔ (۲۲)

معروف فکشن ناقد پروفیسر یوسف سرمست اس ناولٹ پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اقبال متین نے بہت ہی نازک موضوع کو اپنایا ہے۔ 'چراغ تہہ داماں' کا موضوع جس میں ناول نگار کو بھٹکنے اور بہکنے کی پوری پوری گنجائش تھی لیکن ناول نگار نے حیرت انگیز طور پر توازن کو برقرار رکھا ہے''۔ (۲۳)

اردو کے اہم افسانہ نگار الیاس احمد گدّی اقبال متین کے نام خط میں اس ناولٹ پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''ناولٹ کا موضوع بڑا نازک تھا اور آپ نے جس خوبصورتی سے برتا ہے وہ قابل داد ہے کردار بھی بہت واضح ہوکر سامنے آتے ہیں اور اس کا اثر بہت دیر تک ذہن پر قائم رہتا ہے۔ اور میرے خیال میں کسی بھی تحریر کی یہ سب سے بڑی خوبی ہوتی ہے کہ اس کی گونج دیر تک آدمی محسوس کرتا رہے''۔ (۲۴)

شاہکار کے مدیر محمود احمد ہنر اقبال متین کے نام خط میں اس ناولٹ پر اپنے تاثرات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

''آپ نے بے حد کامیاب ناولٹ لکھا ہے۔ واقعی کمال کر دیا ہے آپ نے۔ کوشلیا، سعید اور شانوجہ تینوں کردار بڑے عجیب ہیں لیکن بے حد جاندار۔ اُنھیں جلد بھلایا نہیں جا سکتا۔ موضوع بھی بالکل اچھوتا ہے۔ ماں بیٹی کو لے کر تو لکھا گیا ہے لیکن ماں بیٹے کو لے کر غالباً کسی نے نہیں لکھا ہے''۔ (۲۵)

اقبال متین کا ناولٹ 'چراغ تہہ داماں' نازک اور اچھوتے موضوع پر ضرور ہے مگر ناولٹ نگار نے اس حساس موضوع کو سلیقے سے برتا ہے اور اس کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ اس ناولٹ کے تفصیلی موضوعاتی جائزہ کے بعد یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ یہ ناولٹ موضوع کی ندرت اور اس کے فنکارانہ برتاؤ کے اعتبار سے اردو کا منفرد ناولٹ ہے جو ناولٹ نگاری میں ایک خوشگوار اضافہ ہے۔ اقبال متین نے اگرچہ ایک ہی ناولٹ لکھا ہے مگر اس میں انھوں نے فنکارانہ کمال کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس ایک ناولٹ کی بنیاد پر ہی وہ ممتاز ناولٹ نگاروں میں جگہ پانے کے مستحق ہیں۔

اقبال متین کی ناولٹ نگاری کا فنی جائزہ

اقبال متین اردو کے منفرد ناولٹ نگار ہیں۔ انھوں نے ''چراغ تہہ داماں'' کے عنوان سے ایک ناولٹ لکھا ہے۔ یہ اردو کا پہلا ناولٹ ہے جس میں مرد طوائف کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس حساس اور نازک موضوع کو ناولٹ نگار اقبال متین نے اس سلیقہ سے برتا ہے اور اپنی فنی ہنر مندی کا ایسا ثبوت دیا ہے کہ اس ایک ناولٹ کی بنیاد پر ان کا شمار اردو کے ممتاز ناولٹ نگاروں میں ہوتا ہے۔ اس ناولٹ میں انھوں نے فنی لوازم جیسے بہتر پلاٹ، کردار نگاری، مکالمہ نگاری، اسلوب اور زبان و بیان کی انفرادیت کا خیال رکھنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

پلاٹ:

اقبال متین کے ناولٹ ''چراغ تہہ داماں'' کا پلاٹ فنی اعتبار سے خوبصورت پلاٹ ہے۔ اس ناولٹ میں اقبال متین نے پلاٹ کی تعمیر و تشکیل میں بڑی محنت سے کام لیا ہے اور واقعات کو بڑے سلیقے اور فنی ہنر مندی سے ترتیب دیا ہے۔ ''چراغ تہہ داماں'' کا پلاٹ کوشلیا اور شانو جہ کی زندگی کے گرد بنا گیا ہے جو آپس میں ماں اور بیٹے کا رشتہ رکھتے ہیں۔ ناولٹ کا آغاز برودلے گیسٹ ہاؤس اور اس کے جھیل کے خوبصورت منظر نامے سے ہوتا ہے جہاں کوشلیا بجرہ پر بیٹھ کر نئے نئے مسافروں کی دلجوئی کرتی ہے اور رات میں برودلے گیسٹ ہاؤس میں انھیں جنسی تسکین پہنچاتی ہے۔ اس گیسٹ ہاؤس میں وہ اپنے ایسے عاشق کے ساتھ بھاگ کر آتی ہے جو جنم جنم اس کے ساتھ رہنے کی قسمیں کھاتا ہے۔ کوشلیا کا عاشق اس سے جنسی تسکین کے حصول کے بعد اسے حاملہ کر کے ہمیشہ کے لیے اس کی زندگی سے فرار ہو جاتا ہے۔ اس مجبوری و بے بسی کے عالم میں کوشلیا کو بجرہ والا بوڑھا کاکا اپنی معمولی جھونپڑی میں پناہ دیتا ہے جہاں

کوشلیا اپنے بیٹے شانوجہ کو جنم دیتی ہے۔اب کوشلیا اپنا پیٹ پالنے اور اپنے بیٹے شانوجہ کی پرورش اور اس کی تعلیم و تربیت کے لیے اپنا جسم بیچتی ہے۔ وہ اپنے بیٹے شانوجہ کو اس غلاظت آمیز ماحول سے دور رکھنا، اسے تعلیم و تربیت دے کر اپنے بڑھاپے کا سہارا تو بنانا چاہتی ہے لیکن وہ اس کے لیے حقیقی اور عملی قدم نہیں اٹھا پاتی ہے۔ دراصل وہ بے حد جذباتی لڑکی ہے۔ وہ چاہتی تو فیوزے ریسٹورنٹ میں کام کرنے والے بیر اصمصام دین، جو ایک طویل عرصے تک اس سے شادی کرنے کا متمنی رہتا ہے، کے ساتھ مل کر گھر بسا سکتی تھی ،لیکن وہ اس کے معمولی حیثیت کے آدمی ہونے کی وجہ سے اس سے شادی کرنے اور اس کے ساتھ گھر بسانے سے گریز کرتی ہے۔ وہ خود اس ماحول سے نکلنا اور کسی کی بیوی بن کر زندگی گزارنا چاہتی ہے۔صمصام دین کی شکل میں اسے یہ موقع ہاتھ آتا ہے لیکن اس کے مفلس ہونے کی وجہ سے وہ اس سے سمجھوتہ نہیں کر پاتی ہے۔ وہ مالدار مرد سے شادی کرنے اور گھر بسانے کے خواب دیکھتی ہے۔اس خواب کے سائے کے پیچھے بھاگتے بھاگتے وہ کہیں کی نہیں رہتی ہے۔ایک دن ڈیریالڈ سعید الزماں اور بلونت عرف پیارے لال کے نام سے دو مسافر اس کے پاس آتے ہیں اور دونوں ہی اس کے ساتھ رات گزارنے کے متمنی ہوتے ہیں۔ اتفاق سے قرعہ فال ڈیریالڈ کے نام نکلتا ہے جو کوشلیا کے ساتھ دادِ عیش دینے کے لیے ایک کمرے میں چلا جاتا ہے اور دوسرے کمرے میں شانوجہ کے ساتھ پیارے لال ہوتا ہے جو اس سے ہم جنسیت کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے اور دھیرے دھیرے اسے اس کا چسکہ لگا دیتا ہے۔ یہی وہ پیارے لال ہے جو شانوجہ کو برہن بستی کے اسی سالہ خانوں کے سردار کے چالیس سالہ عیاش بیٹے کے پاس پہنچاتا ہے جو اسے اپنا رکھیل بنالیتا ہے۔ یہاں سے کہانی نیا موڑ لیتی ہے۔ جب برہن بستی کے سردار کا بیٹا شانوجہ کو رکھیل بنالیتا ہے تو وہ اپنی ماں سے دور ہو جاتا ہے۔ اپنے بیٹے کی جدائی میں کوشلیا مضطرب و بے قرار رہتی ہے۔اس کی اضطرابی کیفیت کا نقشہ ناولٹ نگار نے پراثر انداز میں کھینچا ہے۔ برہن بستی میں شانوجہ زنانہ لباس پہننے لگتا ہے اور طوائف کے پیشے میں وہ اتنا ماہر ہو جاتا ہے کہ اپنی ماں سے بھی آگے نکل جاتا ہے۔ شانوجہ کے بارے میں اس قسم کی خبریں سن کر اس کی ماں کوشلیا بے حد پریشان ہو جاتی ہے۔ایسے میں بیر اصمصام دین اور بجرہ والا بوڑھا کاکا اسے سہارا دیتا ہے اور اس سے ہمدردی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ کوشلیا کے بارے میں کہا جا چکا ہے کہ وہ جذبات کی رو میں بہنے والی لڑکی ہے۔ اسی جذباتی رو میں بہہ کر وہ اس گیسٹ ہاؤس میں آتی ہے اور یہاں وہ پھر ڈیریالڈ جیسے مکّار، عیّار، بوالہوس اور

مفاد پرست مرد کی پُر فریب باتوں میں آ کر اس کے عشق میں بُری طرح مبتلا ہوتی ہے اور آنکھ بند کر کے اس پر بھروسہ کر بیٹھتی ہے۔ ڈیر بالڈ اس کا فائدہ اٹھا کر اس سے خوب جنسی تسکین حاصل کرتا اور آخر میں اس کے مال پر بھی ہاتھ صاف کرتا ہے۔ وہ کوشلیا کو اپنی چکنی چپڑی باتوں میں پھنسائے رکھتا ہے اور اپنے عمل سے اسے بیوی بنانے کی اداکاری تو کرتا ہے لیکن وہ اسے بیوی نہیں بناتا ہے۔ کوشلیا کو اپنے بیٹے شانوجہ سے بڑی امیدیں وابستہ ہوتی ہیں کہ وہ اس کے بڑھاپے کا سہارا بنے گا لیکن اس گندے ماحول میں وہ بھی طوائف بن جاتا ہے۔ کوشلیا کو پہلے تو اپنے بیٹے شانوجہ کے طوائف ہونے کا یقین نہیں آتا لیکن جب اس کی ملاقات اپنے بیٹے سے ہوتی ہے اور اپنی آنکھوں سے دیکھتی ہے تو اسے یقین ہو جاتا ہے۔ کوشلیا ایک گھریلو عورت ہے لیکن ساتھ ہی وہ جذباتی بھی ہے۔ وہ طوائف بننا نہیں چاہتی ہے لیکن دھوکہ میں آ کر اور زمانہ کے ناسازگار حالات کے تحت وہ طوائف بن جاتی ہے۔ وہ اپنے بیٹے شانوجہ کو اس گندے ماحول سے دور رکھنا اور اسے اپنی زندگی کا سہارا بنانا چاہتی ہے لیکن اس کا بیٹا شانوجہ بھی طوائف بلکہ کامیاب طوائف بن جاتا ہے جو اپنی ماں کو بھی مات دے دیتا ہے۔ کوشلیا اپنے بیٹے کی اس حرکت پر اس قدر غمگین وافسُردہ ہوتی ہے کہ غم کی تاب نہ لا کر وہ خودکشی کر لیتی ہے۔ ان تمام واقعات کو ناولٹ نگار نے اس مربوط اور فطری انداز میں بیان کیا ہے کہ ناولٹ میں کہیں کوئی جھول نظر نہیں آتا۔ ناولٹ کا پلاٹ انتہائی گٹھا ہوا اور چُست و مربوط ہے جس میں بلا کی روانی اور دلکشی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ناولٹ کا پلاٹ قاری کو مکمل طور سے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور اس کے ذہن و دل پر اپنا گہرا تاثر چھوڑتا ہے۔ اس ناولٹ میں کسی غیر ضروری واقعہ اور کردار کو بالکل جگہ نہیں دی گئی ہے۔ ناولٹ کی اس خوبی کے تعلق سے مشہور افسانہ نگار عابد سہیل رقم طراز ہیں:

> ''چراغ تہہ داماں'' کا ایک بھی کردار، ایک بھی واقعہ ایسا نہیں ہے جسے ناول کی اکائی کو مجروح کیے بغیر نظر انداز کیا جا سکے''۔(۱)

معروف افسانہ نگار غیاث احمد گدّی اقبال متین کے نام خط میں اس ناولٹ پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''چراغ تہہ داماں' کیا پلاٹ، کیا واقعات، کیا زبان و بیان اور کیا مواد کے پیش کرنے کی خوبصورت ترین تکنیک، ہر لحاظ سے ایسا ہے کہ اس کی تعریف نہ کرنا جرم ہے''۔(۲)

کردار:

اقبال متین کا ناولٹ ''چراغِ تہہ داماں'' کردار نگاری کے فن کے اعتبار سے بھی اردو کا ایک دلچسپ اور اہم ناولٹ ہے۔اس میں اقبال متین نے بہت محنت اور فن کاری سے اپنے کرداروں کو تراشا ہے۔اس ناولٹ کے اہم کردار کوشلیا اور شانوجہ ہیں جو آپس میں ماں اور بیٹے کا رشتہ رکھتے ہیں۔ ناولٹ کی پوری کہانی ان ہی دونوں کرداروں کے گرد گھومتی ہے۔کوشلیا کا کردار ناولٹ میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔وہ مرد کے فریب کی ماری ہوئی ایک لاچار و بے بس عورت کا کردار ہے۔ وہ اپنی شروع جوانی میں اپنے نام نہاد عاشق کے بہکاوے میں آ کر گھر سے بھاگ جاتی ہے اور ایک بچے کی ماں اور طوائف بن جاتی ہے۔ مجبوری میں وہ طوائف تو بن جاتی ہے لیکن وہ اپنے اندر کی عورت کو مار نہیں پاتی ہے۔ وہ کسی کی ہو کر رہنے کے خواب دیکھتی ہے۔ وہ اتنی معصوم اور بھولی بھالی ہے کہ ڈیر بالڈ سعید الزماں جیسے کھلنڈرے، دغا باز اور فریبی شخص کی فرضی محبت میں مبتلا ہو کر زندگی بھر لٹتی رہتی ہے۔ وہ بے حد جذباتی بھی ہے۔ وہ بروقت کوئی صحیح فیصلہ نہیں لے پاتی ہے۔ وہ بیرا صمصام دین سے اس کے معمولی حیثیت کے آدمی ہونے کی وجہ سے شادی نہیں کرتی ہے اور اونچی زندگی کا خواب دیکھتی ہے۔اس کشمکش سے وہ زندگی بھر نہیں نکل پاتی اور قدم قدم پہ دھوکہ کھاتی رہتی ہے۔ وہ اپنے پیشہ سے دل ہی دل میں نفرت کرتی ہے۔ وہ اپنے پیشہ کی تمام تلخیوں کو اپنے بیٹے شانوجہ کے لیے سہتی ہے جو اس کی امیدوں اور آرزوؤں کا آخری مرکز ہے۔ وہ اسے اپنے مستقبل کا سہارا بنانے کا خواب دیکھتی ہے۔ وہ اسے اپنے گندے ماحول سے دور رکھنا چاہتی ہے لیکن اس کی امیدوں کے برخلاف اس کا بیٹا شانوجہ اس گندے ماحول کی زد سے نہیں بچ پاتا ہے اور وہ بھی طوائف کے پیشہ سے منسلک ہو کر اپنی ماں کا رقیب بن کر سامنے آتا ہے۔کوشلیا کو اپنے بیٹے کی بدکاری کا بے انتہا رنج و ملال ہوتا ہے۔اس کی آخری آرزو اور تمنا بھی حسرت بن جاتی ہے۔ وہ اپنے بیٹے کے گھناؤنے کرتوت سے اس قدر افسردہ اور مایوس ہو جاتی ہے کہ یاس و افسردگی کے مارے وہ خودکشی کر لیتی ہے۔ اس کردار کو اقبال متین نے بڑے خلوص و ہمدردی کے ساتھ پیش کیا ہے۔معروف فکشن ناقد پروفیسر یوسف سرمست اس کردار کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''ناول کا اہم ترین کردار کوشلیا ہے۔اسی کردار کی ذہنی اور جذباتی کشمکش کو

مکمل انداز میں پیش کرنے میں ناول نگار کا کمال نظر آتا ہے۔کوشلیا حالات کی مجبوریوں کی وجہ سے ''طوائف'' بن جاتی ہے۔لیکن وہ زمانے اور ماحول کے جبر سے اپنی ''مامتا'' کے جذبہ کا گلا گھونٹنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ یہ ناول کوشلیا کے اندر طوائف اور عورت کے پیکار کی تصویر ہے''۔(۳)

مشہور افسانہ نگار غیاث احمد گدّی اقبال متین کے نام خط میں اس کردار پر اظہار خیال کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''کوشلیا کے ساتھ تمہارا سلوک اتنا محبت آمیز رہا ہے کہ میں تو بھائی تمہاری دردمندی کا قائل ہوگیا۔ میری آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے جب کوشلیا اپنے بیٹے شانو جہ کی ننگی چوتڑ کو شال سے ڈھک رہی تھی جیسے خود اپنا ننگا جسم ڈھک رہی ہو...اتنی تیکھی سچائی کو الفاظ کے سپرد کر دینا کسی معمولی ادیب (بلکہ انسان) کا کام نہیں مری جان! بخدا تمہارا قلم چومنے کو جی چاہتا ہے''۔ (۴)

افسانہ نگار الیاس فرحت اس کردار کے بارے میں لکھتے ہیں:

''کوش (کوشلیا) کا کردار موجودہ معاشرہ کی دکھتی رگ ہے جس کا جواب شانو جہ ہے جو آج کے موجودہ سماج پر نہ صرف داغ ہے بلکہ سماج کا وہ کریہہ المنظر چہرہ بھی ہے جس میں ہم اپنی اپنی شبیہہ دیکھ رہے ہیں''۔(۵)

'چراغ تہہ داماں' کا دوسرا اہم کردار شانو جہ ہے۔ یہ کردار ندرت اور اچھوتے پن کا آئینہ دار ہے۔ یہ مرد طوائف کا کردار ہے جسے اردو ادب میں پہلی بار اقبال متین نے پیش کیا ہے۔اس تعلق سے پروفیسر یوسف سرمست رقم طراز ہیں:

''یہ ''مرد طوائف'' کا کردار ناول کی تاریخ میں سب سے پہلے اس میں ملتا ہے۔حقیقی زندگی میں گو ایسے بہت سے کردار ملتے ہیں لیکن آج تک کسی نے افسانوی زندگی میں اسے پیش کرنے کی کوشش نہیں کی تھی''۔(۶)

شانو جہ کوشلیا کا بیٹا ہے۔اس کی ماں اس کی پرورش کرتی ہے اور اسے اپنے مستقبل کا سہارا سمجھتی ہے۔ وہ اسے اپنے اردگرد کے غلاظت آمیز ماحول سے محفوظ رکھنا چاہتی ہے مگر نہیں رکھ پاتی ہے۔اس گندے ماحول میں شانو جہ بھی طوائف بن جاتا ہے۔اس پیشہ میں وہ بڑی سفاکی سے کام لیتا ہے اور اپنی ماں کو بھی مات دے دیتا ہے۔وہ اپنی ماں کی طرح بیوقوفی کا مظاہرہ کر کے دھوکہ نہیں کھاتا بلکہ خود دوسروں

کوفریب دے کر پیسے بٹورتا اور دولت کا بڑا ذخیرہ اکٹھا کر لیتا ہے۔ اسے اپنے گاہکوں کو رجھانے، لبھانے اور اپنے قریب لانے کا ہنر خوب آتا ہے۔ وہ اپنے پیشہ میں بڑی ہشیاری، چالاکی اور عیّاری سے کام لیتا اور نفس پرست مردوں کو بیوقوف بناتا ہے۔ وہ اپنی گفتار و رفتار میں بھی بے باک ہوتا ہے۔ جب اس کا سامنا اپنی ماں سے ہوتا ہے اور اس کی ماں اس پر غصہ اور طنز کرتی ہے تو وہ اپنی ماں کو ایسا جواب دیتا ہے کہ اسے لاجواب کر دیتا ہے۔ وہ اپنی ماں پر بھرپور طنز ضرور کرتا ہے لیکن اس کے دل میں اپنی ماں کے لیے احترام کا جذبہ بھی ہوتا ہے۔ وہ اپنے گرد وپیش کے ماحول سے باخبر معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے وہ بڑی سفاکی سے اپنے زمانے کی تلخ سچائیوں کا انکشاف یوں کرتا ہے۔

> ''وہ لوگ جو مجھ پر بے دریغ لٹاتے ہیں وہ مجھ سے بڑے مجرم ہیں ماں... ان کی گرہ میں جو دام میرے لیے ہوتے ہیں وہ رشوتوں اور ناجائز ٹھیکوں سے کمائی ہوئی دولت کا ایک حصّہ ہیں لیکن زمانہ ان کے آگے جھکتا ہے۔ ان کی بڑی بڑی موٹریں آنکھوں کو خیرہ کر کے اس طرح گزر جاتی ہیں کہ آدمی کو آدمی کا خون نظر نہیں آتا۔ ہمارا جرم تو اتنا ہے کہ ہم اپنے ہی خون میں زہر ملا کر مگن ہو بیٹھے ہیں۔ کل جب ایک اچھے سے بنگلے سے اچھی سی کار میں بیٹھ کر تو اور میں نکلیں گے تو کتنی ہی نظریں تعظیم کو جھک جائیں گی۔ خدا کی خدائی سے انکار کرنے والے بہت سے دیکھے ہیں۔ دولت کی خدائی سے انکار کرنے والا تو نے آج تک دیکھا ہے ماں؟''۔(۷)

شانو جہ کی زبان سے یہ باتیں پہلی نظر میں غیر فطری معلوم ہوتی ہیں کہ ایک نوعمر بچہ اتنی پتے اور تجربے کی باتیں کیسے کر سکتا ہے لیکن جس طرح کے ماحول میں وہ رہ رہا تھا اس میں حالات کی تلخیوں اور زمانہ کے مصائب نے اس میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت اور فکر ونظر کی پختگی و گہرائی پیدا کر دی ہوگی۔ اس لیے ان کی زبان سے ان باتوں کو سن کر قاری اس کی ذہانت کا اعتراف کرنے لگتا ہے اور وہ اپنی سوجھ بوجھ اور فکر سے قاری کو متاثر کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس میں معصومیت، شوخی اور عیّاری بھی ہوتی ہے اور بغاوت کا جذبہ بھی۔ وہ سماج کے ہوس پرست مردوں سے انتقام لینے پر بھی مائل نظر آتا ہے۔ اس کردار کو ناولٹ نگار اقبال متین نے بہت ہی سنبھل کر فنی ہنرمندی سے پیش کیا ہے جو قاری کے ذہن پر ایسا گہرا نقش چھوڑ جاتا ہے کہ قاری اسے بھلا نہیں پاتا ہے۔ اس کردار کے تعلق سے مشہور فکشن نگار قاضی عبدالستار

اقبال متین کے نام خط میں رقم طراز ہیں:

''اس (چراغ تہہ داماں) کی ندرت ہیروئن کے بیٹے کے کردار میں ہے۔ آپ نے بڑی قوت اور کاریگری سے پیش کیا ہے۔لیکن ناچیز کی رائے میں اگر یہ مرکزی کردار ہوتا تو کہانی اور طاقتور اور خوبصورت ہوجاتی۔ مجھے نہیں یاد ہے کہ ہم میں سے کسی نے بھی اس کردار کو اپنا موضوع بنایا ہو۔آپ نے بڑے جوکھم کا کام کیا ہے اور کامیاب ہوئے ہیں۔ نئے افسانے یا فکشن کو پرانی ڈگر سے نکال لانے میں ایسی ہی کوشش بارآور ہوسکتی ہے۔میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں''۔(۸)

غیاث احمد گدّی اس کردار کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''شانوجہ کا کردار بے حد اہم ہے۔کیا ایسی باتیں اس دنیا میں ہوتی ہیں۔اگر ہوتی ہیں تو تمہارا فنی ضبط اور سلجھے ہوئے دماغ کی داد دینے پر مجبور ہوں''۔(۹)

ڈاکٹر محمد ممنون عالم نے اس کردار کی فنی خوبیوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

''شانوجہ کی کردار نگاری میں اقبال متین نے اپنی بہترین فنکاری کا مظاہرہ کیا ہے جس سے اس دور کے اشرافیہ و اعلیٰ طبقہ کی عیاشانہ ذہنیت، جنسی استحصال، بے راہ روی، انسانی اقدار کی پامالی، نفسیاتی خم و پیچ، سماجی و عمرانی نظام حیات کی برائیاں، اسمگلنگ، اقتصادی بحران، غلاظت اور شاہد بازاری جیسے متعدد معاملات و مسائل کا سارا منظر نامہ قاری کی نظروں کے سامنے پھر جاتا ہے''۔(۱۰)

کوشلیا اور شانوجہ دونوں ہی اس ناولٹ کے اہم کردار ہیں۔ یہ دونوں کردار اگرچہ طوائف کے کردار ہیں لیکن ان دونوں کرداروں کو اس خلوص و ہمدردی اور فنی ضبط وتوازن کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ ان سے ناگواری کے بجائے ہمدردی کا احساس ہوتا ہے۔ یہ دونوں کردار بالکل حقیقی کردار معلوم ہوتے ہیں جو سماج کے خفیہ چہروں کو بے نقاب کرتے ہیں۔ یہ دونوں کردار ناولٹ کے پورے پلاٹ پر چھائے رہتے ہیں۔ان دونوں کرداروں اور بقیہ دوسرے کرداروں کے تعلق سے افسانہ نگار عابد سہیل لکھتے ہیں:

''کوشلیا اور شانوجہ دو افراد نہیں بلکہ دو سوال ہیں لیکن اقبال متین نے ان سوالات کو جسم عطا کردیا ہے۔ ناولٹ کے باقی سارے کردار ان دونوں

کرداروں کو رنگ و روغن فراہم کرنے کے باوجود اپنی مستقل حیثیت بھی
رکھتے ہیں''۔(۱۱)

'چراغ تہہ داماں' میں پیارے لال اور ڈیر بالڈ کے کردار بھی قاری کی توجہ اپنی جانب کھینچتے ہیں۔ پیارے لال کا کردار بوالہوس اور فطری کج روی کے شکار انسان کا کردار ہے جو نوخیز لڑکوں سے بدفعلی کر کے اپنی جنسی خواہش پوری کرتا ہے۔ یہی وہ کردار ہے جو شانو جہ سے ہم جنسی کر کے اور اسے اس راہ پہ ڈال کر کوشلیا کی زندگی میں زہر گھولتا ہے۔ اس کردار کے تعلق سے افسانہ نگار الیاس فرحت لکھتے ہیں:

''پیارے لال... مجھے تو بہت سارے پیارے لال نظر آ رہے ہیں جو میری آنکھوں میں گھوم رہے ہیں لیکن جو میری وساطت سے دور تھے۔ وہ آپ ہیں جس نے ان پیارے لالوں کو دیکھ لیا اور اس ناولٹ میں کھینچ لائے۔ یہ پیارے لال جیسے لوگ ہی تو ہیں جو طبعی زندگی اور فطری اور قدرتی افعال کا منھ چڑا رہے ہیں''۔(۱۲)

پیارے لال کی طرح ڈیر بالڈ کا کردار بھی منفی کردار ہے۔ یہ جھوٹے، فریبی، مکّار، عیّار، دغا باز اور شاطر و چالاک انسان کا کردار ہے۔ یہ کردار کوشلیا کو اپنی بناوٹی اور فرضی محبت کا خواب دکھا کر اس کا خوب جنسی و جسمانی استحصال کرتا ہے اور آخر میں اس کی بچی کھچی رقم کو بھی لے اُڑتا ہے۔ اس کردار پر اظہار خیال کرتے ہوئے افسانہ نگار الیاس فرحت رقم طراز ہیں:

''ڈیر بالڈ.. میں نہیں کہہ سکتا کہ آپ نے اس عظیم اور بھرپور کردار کو محض قلم کی نوک سے پیدا کیا۔ آپ نے تصویر کشی کی ہے بخوبی اُس بھیڑیے کی جو بلّی کی کھال پہن کر پھر رہا ہے۔ یہ ڈیر بالڈ ہی تو تھا جس نے پہلی بار کوشلیا کو ''کوش'' بننے پر مجبور کیا تھا۔ اس کردار کی غیر معمولی اہمیت اور اس کے برتاؤ کے بارے میں لکھنے کے لئے میرے پاس ابھی الفاظ نہیں مل رہے ہیں''۔(۱۳)

مذکورہ کرداروں کے علاوہ اس ناولٹ کے دیگر کردار بھی اپنی منفرد خصوصیات کی وجہ سے قاری کو اپنی جانب متوجہ کرتے ہیں۔ پیر اصمصام دین اور بوڑھا کاکا، ہمدرد انسان کے کردار ہیں جو بُرے وقت میں کوشلیا کا ساتھ دیتے اور اس سے ہمدردی سے پیش آتے ہیں۔ یہ دونوں کردار اپنی ہمدردی اور انسانیت سے قاری کو متاثر کرتے ہیں۔ ریسٹورنٹ کا مالک فیوزک ہینسن ایک تاجر کا کردار ہے جو اپنی تجارت کو بڑھانے کے لیے تمام طرح کی تدبیریں اختیار کرتا ہے۔ اس کے اندر آج کے پیشہ ور انسان کی ساری

خصوصیات موجود ہیں۔ وہ اپنے پیشہ میں کوئی سمجھوتہ کرنا نہیں چاہتا ہے۔ ان کرداروں کے علاوہ بھی ناولٹ میں کچھ کردار ہیں جن میں سے کوئی کردار غیر ضروری معلوم نہیں ہوتا بلکہ سارے کردار کہانی کو آگے بڑھانے میں معاون ہوتے ہیں جو حقیقی اور جاندار نظر آتے ہیں۔ پروفیسر یوسف سرمست اس ناولٹ میں کردار نگاری کے فن پر اظہار خیال کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''''چراغِ تہہ داماں'' کے سب ہی کردار زندگی سے قریب معلوم ہوتے ہیں اور بڑی ہی انفرادیت رکھتے ہیں اور قاری کے ذہن پر گہرا اثر چھوڑتے ہیں۔خواہ وہ کوشلیا کا نام نہاد عاشق ڈیربالڈ ہو کہ شانوجہ کا پیارے لال۔ ریسٹورنٹ کا مالک ہو یا اس کا بیرا اصمصام دین۔ یہ سب کردار بے حد زندہ و توانا ہیں''۔(۱۴)

افسانہ نگار الیاس فرحت تھوڑی مبالغہ آرائی کے ساتھ اس ناولٹ کے کرداروں کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''اس (ناولٹ) کے سارے ہی کردار بہت اہم اور غیر معمولی ہیں۔ اس قدر غیر معمولی کردار اور اتنی خوبی سے تو صرف وہی بیان کر سکتے ہیں۔(یہ میری اپنی رائے ہے) کسی کردار میں جان ڈال دینا ابھی ہمارے بس کی بات نہیں لیکن آپ نے یہ بھی کر دکھایا ہے''۔(۱۵)

اقبال متین نے اپنے اس ناولٹ میں کرداروں کو اس فنی چابکدستی سے پیش کیا ہے کہ ناولٹ کے بیشتر کردار حقیقی اور جاندار معلوم ہوتے ہیں۔ یہ کردار قاری کے ذہن پر گہرا نقش چھوڑ جاتے ہیں اور اس کے دل میں گھر بھی کر جاتے ہیں۔کہا جاسکتا ہے کہ اقبال متین نے اپنے اس ناولٹ میں کردار نگاری کے فن کا بڑا دلچسپ مظاہرہ کیا ہے۔کردار نگاری کے اعتبار سے یہ اردو کا ایک کامیاب اور منفرد ناولٹ ہے جس کے ذریعے پہلی بار اردو ادب میں مرد طوائف کے کردار کو فنی ہنرمندی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

مکالمے:

اقبال متین نے 'چراغ تہہ داماں' میں پلاٹ اور کردار نگاری کے علاوہ مکالمہ نگاری میں بھی فنی ہنرمندی کا ثبوت دیا ہے۔ان کے کرداروں کی زبان سے ادا ہونے والے مکالمے، کرداروں کے اپنے لہجہ میں اور ان کی سمجھ بوجھ کے مطابق ہیں۔ یہ مکالمے برمحل اور برجستہ ہیں۔ غیر ضروری مکالموں کو ناولٹ میں بالکل جگہ نہیں دی گئی ہے۔ ناولٹ کے کچھ حصّوں میں مختصر مکالمے ہیں اور کچھ مقام پر طویل

مکالمے۔ یہ طویل مکالمے بھی غیر ضروری اور ثقیل نہیں لگتے بلکہ سچویشن کو اُبھارنے اور کہانی میں زور پیدا کرنے کے لیے ناگزیر معلوم ہوتے ہیں۔ کرداروں کے مکالموں سے ان کے جذبات واحساسات کی تصویر کشی ہوتی ہے اور ان کی نفسیاتی کیفیت اور داخلی شخصیت سامنے آتی ہے۔ دیکھئے کوشلیا کے درج ذیل مکالمے اس کی حسرتوں، محرومیوں اور اس کی کربناک شخصیت کو کس طرح عیاں کرتے ہیں۔ جب کوشلیا اور ڈیربالڈ اور پیارے لال کے درمیان قرعہ اندازی ہوتی ہے اور پیارے لال جھوٹی اداکاری کرتے ہوئے جھیل میں ڈوب کر اس کے عشق میں جان دینے کی بات کرتا ہے تو کوشلیا یوں گویا ہوتی ہے:

''کون کسی کے لئے جھیل میں ڈوبتا ہے بابا... بالکل یہی بات چھ سات سال پہلے مجھ سے کسی نے کہی تھی... پھر وہ آج تک نہیں لوٹا... اور میں اکیلی جھیل میں ڈوب ڈوب کر ابھرنے کے لئے رہ گئی ہوں''۔(۱۶)

''ہر مسافر کے ساتھ قدم دو قدم ضرور چلتی ہوں...کوئی جی دار ہوتا ہے تو اس کے ساتھ سو پچاس قدم چل لیتی ہوں لیکن پھر ہوتا وہی ہے جو میرا اور مجھ جیسی عورتوں کا مقدر ہے... گھنے سائے پل بھر میں سمٹ جاتے ہیں...چاند کی کرنیں دھوپ پھینکتی ہیں، پھر آگ پھینکتی ہیں اور سب کچھ پل بھر میں جھلس جاتا ہے۔ وہی جھیل، وہی فادر آف دی لیک، وہی بجرہ، وہی میں اور وہی شانوجہ رہ جاتے ہیں۔ پھر میں ہر آنے والے کو پیلا گلاب دیا کرتی ہوں''۔(۱۷)

اس ناولٹ 'چراغ تہہ داماں' میں شانوجہ کے طوائف بننے کے بعد جب ماں اور بیٹے دونوں کا سامنا ہوتا ہے تو دونوں ایک دوسرے پر طنز کرتے ہیں۔ اس طنزیہ مکالمے سے ناولٹ میں دلچسپ ڈرامائی کیفیت پیدا ہوئی ہے۔ شانوجہ کے مکالموں کو پڑھ کر قاری لطف تو لیتا ہے لیکن پہلی نظر میں اس کے مکالمے دل میں کھٹکتے ہیں کہ بارہ چودہ سالہ لڑکے کی زبان سے اتنی پختہ اور گہری باتیں کیسے ممکن ہیں۔ ایک مثال ملاحظہ ہو۔ وہ اپنی ماں سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:

''ماں...تو کیسے انکار کر دے گی ماں کہ تو میری ماں نہیں ہے...میں تجھے جانتا ہوں ماں تو نے سایوں کے پیچھے زندگی بتادی ہے...میں یہ بھی جانتا ہوں کہ جس جہنم سے تو بھاگتی رہی ہے میں اسی جہنم میں تجھے کھینچ لایا ہوں...میں بھی کوئی خوش نہیں ہوں لیکن مجھے کوئی افسوس بھی نہیں ہے... میں آج بھی مطمئن ہوں کہ میں بہتوں سے اچھا ہوں... وہ لوگ جو مجھ پر بے دریغ لٹاتے ہیں وہ مجھ سے بڑے مجرم ہیں ماں....ان کی گرہ میں جو دام میرے

لئے ہوتے ہیں وہ رشوتوں اور ناجائز ٹھیکوں سے کمائی ہوئی دولت کا ایک حصہ ہیں لیکن زمانہ ان کے آگے جھکتا ہے۔ ان کی بڑی بڑی موٹریں آنکھوں کو خیرہ کر کے اس طرح گزر جاتی ہیں کہ آدمی کو آدمی کا خون نظر نہیں آتا۔ ہمارا جرم تو اتنا ہے کہ ہم اپنے ہی خون میں زہر ملا کر مگن ہو بیٹھے ہیں۔ کل جب ایک اچھے سے بنگلے سے اچھی سی کار میں بیٹھ کر تو اور میں نکلیں گے تو کتنی ہی نظریں تعظیم کو جھک جائیں گی۔ خدا کی خدائی سے انکار کرنے والے بہت سے دیکھے ہیں، دولت کی خدائی سے انکار کرنے والا تو نے آج تک دیکھا ہے ماں؟''۔(۱۸)

یہ مکالمے پختہ ذہانت اور تجربے کی گہرائی و گیرائی کے غمّاز ہیں۔شانوجہ کی زبان سے ان مکالموں کو سن کر قاری کے دل میں یہ سوال پیدا ہونے لگتا ہے کہ کیا ایک نوعمر بچہ ایسی باتیں کر سکتا ہے مگر شانوجہ جس پروفیشنل اور عیّارانہ ماحول میں زندگی گزار رہا تھا اور حالات کی تلخیوں اور زمانہ کے نشیب وفراز نے اس کے اندر جو سوجھ بوجھ پیدا کر دی تھی، اس کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ شانوجہ کے اندر وقت سے پہلے گہری سوجھ بوجھ کی صلاحیت پیدا ہو گئی ہو اور وہ اس طرح کی باتیں کرنے پر قادر ہو گیا ہو۔ اگر شانوجہ کے تعلق سے یہ بات مان لی جائے تو پھر اس کے مکالمے اس کی بے پناہ ذہانت، غیر معمولی سوجھ بوجھ اور اس کی چالاکی و ہوشیاری کا ثبوت دیتے ہیں۔ اس کے مکالموں سے اس کی ذہنیت بھی سامنے آتی ہے۔ ان دونوں کرداروں کے علاوہ ناولٹ کے دیگر کرداروں ڈیربالڈ، پیارے لال، فیوزک ہینسن، بیرا صمصام دین اور بوڑھے کاکا کی گفتگو سے بھی ان کے عادات واطوار، نفسیات اور ان کی شخصیت پہ روشنی پڑتی ہے اور کہانی کو آگے بڑھانے میں مدد ملتی ہے۔

ناولٹ کا بیشتر حصہ مکالموں پر مشتمل ہے۔اس کی وجہ سے ناولٹ میں ڈرامائی انداز پیدا ہو گیا ہے۔ ناولٹ میں مکالموں کے ذریعے بڑی خوبصورتی سے کرداروں کے جذبات واحساسات کی بھی عکاسی کی گئی ہے اور حقیقی صورت حال کو بھی سامنے لایا گیا ہے۔اس ناولٹ میں کرداروں کی زبان سے ادا ہونے والے مکالموں کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ مکالمے برجستہ، مناسب وموزوں، فطری و حقیقی اور دلکش ہیں جو قاری کو متاثر بھی کرتے ہیں اور ناولٹ میں دلکشی بھی پیدا کرتے ہیں۔

تکنیک واسلوب:

’چراغ تہہ داماں‘ واحد غائب راوی کی تکنیک میں لکھا گیا ہے۔ واحد غائب راوی واقعات کو اس حقیقی انداز میں بیان کرتا ہے کہ ناولٹ کا پورا قصہ بالکل حقیقی معلوم ہوتا ہے۔ وہ بے جا تفصیلات کو راہ نہیں دیتا اور نہ ہی اپنی طرف سے دخل درانداز ی سے کام لیتا ہے، بلکہ وہ ضروری اور اہم واقعات کو مناسب ایجاز واختصار کے ساتھ اس فنی ہنرمندی سے بیان کرتا ہے کہ کہانی میں روانی اور دلکشی کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔اس ناولٹ میں برجستہ مکالموں سے بڑا کام لیا گیا ہے۔اس سے کرداروں کے جذبات واحساسات اوران کی داخلی شخصیت کی بھی عکاسی ہوتی ہےاور حقیقت کا گہرا رنگ بھی ابھر کر سامنے آتا ہے جو کہ اس ناولٹ کونہایت پرزوراور پراثر بنادیتا ہے۔

اس ناولٹ میں اقبال متین نے موضوع کے مطابق دلچسپ اور شائستہ انداز بیان اختیار کیا ہے۔ اس میں انھوں نے ہم جنسیت اور جنسی کجروی کوموضوع بنایا ہےاور ایک عورت طوائف اور ایک مرد طوائف کے قصے کو بیان کیا ہےمگرانھوں نے ان طوائفوں کی جسم فروشی کوکہیں بھی عریاں انداز میں بیان نہیں کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس ناولٹ میں نہ کہیں عریانیت ہےاور نہ کہیں لذتیت کا عنصر۔اس ناولٹ میں ناولٹ نگار نے سماج کی تلخ اور کڑوی سچائیوں کوخوبصورت لفظوں میں بیان کیا ہے۔ یہ انداز بیان ہی کا کمال ہے کہ اس ناولٹ کو پڑھنے کے بعد سماج کے گھناؤنے پہلوؤں سے نفرت اور مظلوم و بے بس کرداروں سے ہمدردی پیدا ہوجاتی ہے۔ناولٹ میں ڈرامائی انداز سے بھی خوب کام لیا گیا ہے۔ جب کوشلیا قرعہ اندازی کے ذریعے ڈیربالڈ کی ہوجاتی ہے تو ڈیربالڈ اس کے ساتھ دادِعیش دینے کے لیے برودلے گیسٹ ہاؤس کے ایک کمرے میں اسے لے جاتا ہے جب کہ دوسرے کمرے میں پیارے لال، شانوجہ کے ساتھ ٹھہرتا اوراس سے بدفعلی کربیٹھتا ہے۔کوشلیا شانوجہ کی چیخ سن کر ڈیربالڈ کے پہلو سے تڑپ کراُٹھ بیٹھتی ہےاور بدحواسی کے عالم میں گرتے پڑتے شانوجہ کے کمرے میں پہنچتی ہے جہاں شانوجہ ننگے پڑا کراہ رہا ہوتا ہے۔دیکھئے اس منظر کوناولٹ نگار نے ڈرامائی انداز میں کس خوبی سے بیان کیا ہے:

> ’’شانوجہ کا نیکر بھی نیچے پڑا ہوا تھااور وہ پیارے لال کے بستر پر ننگا پڑا کراہ رہا تھا۔کوشلیا کی آنکھوں میں زمانے بھر کی وحشت جیسے پناہ لینے کے لئے چلی آئی تھی۔اس کی آنکھیں گھائل ہرنی کی طرح وحشیانہ تھیں۔اس نے

پھیلی پھیلی آنکھوں سے بلونت کو دیکھا جو جلدی جلدی پتلون پہن رہا تھا۔ وہ جست لگا کر اٹھی اور بلونت پر جھپٹی۔ اس نے تابڑ توڑ دو چار مکے اور تھپڑ بھی اسے جڑ دیئے''۔(۱۹)

اس اقتباس کو پڑھتے ہوئے ایسا لگتا ہے کہ ہم اپنی آنکھوں سے ڈرامہ دیکھ رہے ہیں۔ اس ڈرامائی اسلوب کی وجہ سے ناولٹ میں دلکشی کی کیفیت بڑھ گئی ہے۔ اس میں رومانی مناظر کو بھی دلچسپ ڈرامائی انداز میں پیش کیا گیا ہے اور طنزیہ و مزاحیہ انداز بیان سے بھی کام لیا گیا ہے۔ مختصر یہ کہ یہ ناولٹ مناسب و موزوں تکنیک اور دلکش انداز بیان کی وجہ سے قاری کو حیرت انگیز طور پر متاثر کرتا ہے اور اسے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔

منظر نگاری:

اقبال متین کو منظر کشی میں فنی مہارت حاصل ہے۔ انھوں نے ناولٹ 'چراغ تہہ داماں' میں اس فنی مہارت کا سلیقہ سے مظاہرہ کیا ہے۔ انھوں نے مناظر کے بیان میں بے جا تفصیلات سے کام نہیں لیا ہے، بلکہ ہر جگہ ایجاز و اختصار کو ملحوظ رکھا ہے اور اپنے مخصوص اور دلچسپ انداز میں مختلف مناظر کو اس ہنرمندی سے پیش کیا ہے کہ قاری خود بخود اس میں شریک ہوتا جاتا ہے۔ ناولٹ کا آغاز بجرہ اور جھیل کے خوبصورت منظر نامے سے ہوتا ہے:

''وہ بجرہ جو جھیل کے شفاف سینے پر ڈول رہا ہے کوشلیا ابھی ابھی اس سے اتری ہے۔ اس نے ننھے شانوجہ کا ہاتھ تھام لیا ہے جو ابھی تک بجرے ہی میں کھڑا اس کی طرف ہاتھ بڑھا کر مسکرا رہا تھا۔ کوشلیا کے چہرے پر پانی کے قطرے دمک رہے ہیں اور اس کی لمبی لمبی سیاہ زلفوں میں بھی پانی کی بوندیں اس طرح اٹکی ہیں جیسے موتی پروئے گئے ہوں۔ یقیناً پانی کے یہ موتی بجرے کے ان نئے مسافروں نے کوشلیا پر پھینکے ہیں۔ ننھا شانوجہ بھی اپنی ماں کے ساتھ ان مردوں کے مذاق پر ہنستا رہا ہوگا جو کوشلیا سے کچھ ہی پہلے بجرے سے اترے ہیں''۔(۲۰)

ناولٹ میں رومانی مناظر کو بھی کرداروں کے مکالموں اور ان کی حرکات کے ذریعے خوبصورتی سے اُبھارا گیا ہے۔ جب ڈیربالڈ سعید الزماں اور پیارے لال، کوشلیا کے پاس آتے ہیں تو دونوں ہی اس کے ساتھ رات گزارنے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ ایسے میں کوشلیا قرعہ اندازی سے کام لیتی ہے تاکہ

وہ رات میں کسی ایک کے ساتھ رہے۔ جب قرعہ اندازی ہوتی ہے تو اس وقت بڑا دلچسپ رومانی منظر ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

''جانم رحم کا طلبگار ہوں'' ڈیربالڈ نے جھک کر کوشلیا کے پیر چھو لئے۔
''یوں نہ کرو'' اس نے پیر ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہارے حق میں ہی فیصلہ کئے دیتی ہوں''
''سچ مچ یوں نہ کر دینا'' پیارے لال نے التجا کی۔ ورنہ میں جھیل میں ڈوب مروں گا''۔(۲۱)

جب کوشلیا قرعہ اندازی کے ذریعے ڈیربالڈ کی ہو جاتی ہے تو اس وقت کا رومانی منظر ملاحظہ ہو:

''ڈیربالڈ... لو میں تمہاری ہو چکی ہوں''
ڈیربالڈ اپنی کرسی سے اچھل پڑا۔ وہ کھڑا ہو گیا پھر وہ کوشلیا پر جھکا، پھر کوشلیا نے اپنے ہونٹ ڈیربالڈ کے ہونٹوں میں دے دیئے۔ پیارے لال مسکراتا رہا۔ اس کی نظریں اس اثناء میں بار بار شانوجہ پر پڑتی رہیں اور شانوجہ بے خبر سوتا رہا۔ کوشلیا نے ایک دلبر مسکراہٹ کے ساتھ ڈیربالڈ کو دونوں ہاتھوں سے کرسی پر ڈھکیلتے ہوئے کہا۔ ''چلو اب بیٹھو بھی... بہت بے صبرے ہو''۔(۲۲)

ان اقتباسات کو پڑھتے ہوئے ایسا لگتا ہے کہ پیش کردہ مناظر کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ اقبال متین نے اپنے اس ناولٹ میں اپنی فنی مہارت سے کام لے کر مختلف مناظر کو دلچسپ ادبی انداز میں اُبھارا اور پیش کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قاری ان مناظر کا حصّہ بن جاتا ہے۔ اس ناولٹ کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ یہ ناولٹ اپنی خوبصورت منظرکشی کی وجہ سے بھی قاری کو متاثر کرتا ہے۔

زبان:

'چراغ تہہ داماں' زبان و بیان کے اعتبار سے بھی ایک دلچسپ ناولٹ ہے۔ اس میں ناولٹ نگار نے ثقیل و نامانوس اور الجھی ہوئی زبان استعمال نہیں کی ہے بلکہ اس میں انھوں نے صاف ستھری، شائستہ، موضوع اور سچویشن کے مطابق خوبصورت اور پُر اثر زبان استعمال کی ہے۔ اس کی وجہ سے ناولٹ میں روانی اور دلکشی کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ دلکش اور خوبصورت زبان کے استعمال کی ایک مثال ملاحظہ ہو:

''کوشلیا نے آدھا گلاس ٹانچ دیا اور بیرا کو پکارا.... ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں نے تڑپ کر پردے پر نگاہ ڈالی جس کے پیچھے سے کوشلیا کی سریلی

آواز آئی تھی۔اور واقعی کوشلیا کی آواز اس کے جسم سے کچھ کم نہ تھی۔کبھی کبھی کوشلیا کا سارا وجود ایک بنتا ہوا محسوس ہوتا تھا جو برود لے ہاؤس، فیوز ے ریسٹورنٹ اور جھیل کے گوشے گوشے میں سنائی دیتی تھی''۔(۲۳)

اس ناولٹ میں موقع ومحل کی مناسبت سے ہندی زبان کے الفاظ جیسے پتا جی، جیون اور سور گباشی کا بھی استعمال کیا گیا ہے۔ یہ ناولٹ جنس کے پیچیدہ موضوع پر ہے لیکن ناولٹ نگار نے اس موضوع کو شائستہ اور خوبصورت زبان کے ذریعے اس طرح بیان کیا ہے کہ کہیں بھی عریانی اور جنسی لذتیت کے عنصر کا شائبہ تک نظر نہیں آتا۔ ناولٹ نگار نے نازک خیال اور نازک جذبوں کو بھی خوبصورت زبان کے ذریعے سلیقے سے بیان کیا ہے۔معروف فکشن ناقد پروفیسر یوسف سرمست اس ناولٹ کی زبان و بیان کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''چراغ تہہ داماں' کی زبان و بیان بھی قابل توجہ ہے۔اقبال متین کی زبان و بیان میں ایک کیفیت اور زور ملتا ہے۔ وہ نازک سے نازک خیال اور جذبے کو زبان دینے کا یارا رکھتے ہیں''۔(۲۴)

اقبال متین کا ناولٹ 'چراغ تہہ داماں' اردو کا بے حد اہم اور منفرد ناولٹ ہے۔مشہور افسانہ نگار عظیم اقبال اس کی خوبیوں کو اُجاگر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''چراغ تہہ داماں' تو اردو ادب میں سنگ میل ہے۔آپ کا یہ ناولٹ کئی وجھوں سے ایک عظیم ادبی شہ پارہ ہے۔کردار نگاری، جملوں کی تراش خراش، جذبات کی کسک آمیز پیش کش، واقعات کی تشکیل، زندگی کی مختصر تصویریں آپ کو، آپ کے فن کو لافانی بناتی ہیں''۔(۲۵)

اقبال متین کے اس ناولٹ 'چراغ تہہ داماں'' کا بھرپور فنی جائزہ لینے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ناولٹ فنی خوبیوں سے پُر ہے۔اس میں ناولٹ نگار نے اپنے فنکارانہ کمال کا خوب مظاہرہ کیا ہے۔اس ناولٹ کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ یہ ناولٹ فنی اعتبار سے بے حد اہم اور منفرد ناولٹ ہے جو اردو کے چند منتخب اور شاہکار ناولٹ میں جگہ پانے کا مستحق ہے۔

حوالے

(الف)

(۱) اقبال متین، انٹرویو، مشمولہ، اقبال متین سے اُنسیت، مرتب: نورالحسنین، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۲ء، ص: ۳۱۲، ۳۱۳۔

(۲) پروفیسر قمر رئیس، بیسویں صدی کا افسانوی ادب، کتابی دنیا، دہلی، ۲۰۰۴ء، ص: ۱۸۶۔

(۳) سلیمان اریب، چہرہ نما (مقدمہ، اجلی پر چھائیاں)، مشمولہ، اقبال متین کے افسانے (جلد دوم)، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۰ء، ص: ۱۳۔

(۴) جیلانی بانو، اجلی پر چھائیاں: ایک جائزہ، مشمولہ، قومی زبان، حیدرآباد (اقبال متین نمبر)، جلد: ۳، شمارہ: ۱۰، اکتوبر، ۲۰۱۲ء، ص: ۱۹۔

(۵) نورالحسنین، میں اقبال متین ہوں، مشمولہ، اقبال متین سے انسیت، ص: ۹۔

(۶) ڈاکٹر مثنیٰ رضوی، اقبال متین کے تین افسانے: ایک مختصر تجزیہ، مشمولہ، بادبان، کراچی (اقبال متین نمبر)، شمارہ: ۱۳، جولائی تا ستمبر، ۲۰۱۰ء، ص: ۱۳۳۔

(۷) اقبال متین، انٹرویو، مشمولہ، اقبال متین سے اُنسیت، مرتب: نورالحسنین، ص: ۳۱۱۔

(۸) ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، تڑکے کی ''اجلی پر چھائیاں''، مشمولہ، اقبال متین سے انسیت، ص: ۱۶۷۔

(۹) پروفیسر سلیمان اطہر جاوید، اقبال متین اور شہر آشوب، مشمولہ، اقبال متین سے انسیت، ص: ۱۳۱۔

(۱۰) وحید اختر، اقبال متین، مشمولہ، اقبال متین سے انسیت، ص: ۲۹۔

(۱۱) پروفیسر محمد علی اثر، اقبال متین: شخصیت اور فن کے چند زاویے، مشمولہ، اقبال متین سے انسیت، ص: ۲۸۴۔

(۱۲) عابد سہیل، گرد پوش (نچا ہوا البم)، بحوالہ، اقبال متین سے انسیت، ص: ۲۷۰، ۲۷۱۔

(۱۳) پروفیسر محمد علی اثر، اقبال متین: شخصیت اور فن کے چند زاویے، مشمولہ، اقبال متین سے انسیت، ص: ۲۸۴۔

(۱۴) نورالحسنین، میں اقبال متین ہوں، مشمولہ، اقبال متین سے انسیت، ص: ۱۲۔

(۱۵) سلیمان اریب، چہرہ نما (مقدمہ، اجلی پر چھائیاں)، مشمولہ، اقبال متین کے افسانے (جلد دوم)، ص: ۱۴۔

(۱۶) مخدوم محی الدین، سرورق اجلی پر چھائیاں، بحوالہ اقبال متین کے افسانے (جلد اول)، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۹ء، ص: ۲۲۹۔

(۱۷) پروفیسر محمد حسن، جدید اردو افسانہ، مشمولہ، سہ ماہی عصری ادب (افسانہ نمبر)، جنوری تا اپریل، ۱۹۸۹ء، ص:۳۳، ۳۴۔

(۱۸) نورالحسنین، میں اقبال متین ہوں، مشمولہ، اقبال متین سے انسیت، ص:۹۔

(۱۹) یوسف سرمست، اقبال متین: صاحبِ طرز ادیب، مشمولہ، اقبال متین سے انسیت، ص:۵۳۔

(۲۰) نورالحسنین، میں اقبال متین ہوں، مشمولہ، اقبال متین سے انسیت، ص:۱۵۔

(۲۱) اقبال متین، افسانہ ملبا، مشمولہ، اقبال متین کے افسانے، (جلد اول)، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۹ء، ص:۹۸۔

(۲۲) ڈاکٹر مثنی رضوی، اقبال متین کے تین افسانے، ملبا، ایک مختصر تجزیہ، مشمولہ، سہ ماہی، بادبان کراچی (اقبال متین نمبر)، شمارہ نمبر:۱۳، جولائی تا ستمبر، ۲۰۱۰ء، ص:۱۳۰۔

(۲۳) وحید اختر، اقبال متین، مشمولہ، اقبال متین سے انسیت، مرتب: نورالحسنین، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۲ء، ص:۳۰۔

(۲۴) اقبال متین، افسانہ گرتی دیواریں، مشمولہ، اقبال متین کے افسانے (جلد اول)، ص:۱۱۹، ۱۲۰۔

(۲۵) اقبال متین، افسانہ کتاب سے کتبے تک، مشمولہ، اقبال متین کے افسانے (جلد اول)، ص:۱۹۴۔

(۲۶) مہدی جعفر، نئی افسانوی تقلیب، معیار پبلی کیشنز، دہلی، ۱۹۹۹ء، ص:۸۱۔

(۲۷) اقبال متین، افسانہ آدمی اور آدمی، مشمولہ، اقبال متین کے افسانے (جلد دوم)، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۰ء، ص:۸۴۔

(۲۸) حفظ الکبیر قریشی، اقبال متین اور اس کا فن، مشمولہ، اقبال متین سے اُنسیت، ص:۳۲۔

(۲۹) قیصر سرمست، اشکوں سے بجھا ہوا آدمی، مشمولہ، اقبال متین سے اُنسیت، ص:۲۷۲۔

(۳۰) پروفیسر عالم خوندمیری، بحوالہ، اقبال متین کے افسانے (جلد اول)، ص:۳۱۱۔

(۳۱) اقبال متین، افسانہ، مسدود راستے، مشمولہ، اقبال متین کے افسانے (جلد اول)، ص:۲۴۹، ۲۵۰۔

(۳۲) ڈاکٹر مثنی رضوی، مسدود راستے، ایک مختصر تجزیہ، مشمولہ، سہ ماہی، بادبان کراچی (اقبال متین نمبر)، ص:۱۳۷۔

(۳۳) ڈاکٹر شارق ادیب، اندازے (دوماہی)، حیدرآباد، ستمبر، اکتوبر، ۱۹۷۸ء، ص:۲۶۔

(۳۴) ڈاکٹر مثنی رضوی، درد کا رشتہ، ایک مختصر تجزیہ، مشمولہ، سہ ماہی، بادبان کراچی (اقبال متین نمبر)، ص:۱۳۳۔

(۳۵) وسیم عباس، بادبان کراچی اور دل کی آواز، مشمولہ، ماہنامہ تمہید، نظام آباد (اقبال متین نمبر)، جلد:۳، شمارہ:۱، جنوری، ۲۰۱۳ء، ص:۴۸۔

(۳۶)اقبال متین،افسانہ، ننگے زخم،مشمولہ،اقبال متین کے افسانے (جلداول)،ص:۳۷۲۔

(۳۷)اقبال متین،افسانہ، بوند بوند لہو،مشمولہ،اقبال متین کے افسانے (جلددوم)،ص:۳۶۱۔

(۳۸)اقبال متین،افسانہ،ایک سوال،مشمولہ،اقبال متین کے افسانے (جلددوم)،ص:۱۹۶۔

(۳۹)ڈاکٹر راج بہادر گوڑ،تڑکے کی ''اُجلی پرچھائیاں''،مشمولہ،اقبال متین سے اُنسیت،ص:۱۶۹،۱۷۰۔

(۴۰)اقبال متین،افسانہ،آنگن میں سہاگن،مشمولہ،اقبال متین کے افسانے (جلداول)،ص:۸۰۰۔

(۴۱)ایضاً،ص:۸۰۴۔

(۴۲) ڈاکٹر قمر رئیس، اقبال متین کا شہر آشوب،مشمولہ،قومی زبان، حیدرآباد (اقبال متین نمبر)، جلد:۳،شمارہ:۱۰، اکتوبر،۲۰۱۲ء،ص:۱۷۔

(۴۳)ڈاکٹر عشرت رومانی،شہر آشوب۔ایک مطالعہ،مشمولہ،سہ ماہی بادبان کراچی (اقبال متین نمبر)،ص:۱۱۴۔

(۴۴) وسیم عباس، بادبان کراچی اور دل کی آواز،مشمولہ، ماہنامہ تمہید، نظام آباد (اقبال متین نمبر)، جلد:۳،شمارہ:۱، جنوری،۲۰۱۳ء،ص:۵۰۔

(۴۵)اقبال متین،افسانہ، پو پھٹنے تک،مشمولہ،اقبال متین کے افسانے (جلددوم)،ص:۲۳۵۔

(۴۶) نورالحسنین، میں اقبال متین ہوں،مشمولہ،اقبال متین سے انسیت،ص:۱۴۔

(۴۷)ڈاکٹر راج بہادر گوڑ،تڑکے کی ''اُجلی پرچھائیاں''،مشمولہ،اقبال متین سے اُنسیت،ص:۱۶۹۔

(۴۸)اقبال متین،افسانہ،کاٹاہوانام،مشمولہ،اقبال متین کے افسانے (جلداول)،ص:۵۲۹۔

(۴۹)اقبال متین،افسانہ،چھت،مشمولہ،اقبال متین کے افسانے (جلداول)،ص:۷۰۴۔

(۵۰)فضیل جعفری،اقبال متین: شہر آشوب کا تنہا مسافر،مشمولہ،اقبال متین سے انسیت،ص:۸۱۔

(۵۱) پروفیسر سلیمان اطہر جاوید، اقبال متین اور شہر آشوب،مشمولہ، ماہنامہ قومی زبان، حیدرآباد (اقبال متین نمبر)، جلد:۳،شمارہ:۱۰، اکتوبر،۲۰۱۲ء،ص:۲۲،۲۳۔

(۵۲)اقبال متین،افسانہ،زبوں آثار،مشمولہ،اقبال متین کے افسانے (جلداول)،ص:۷۷۷۔

(۵۳)اقبال متین،افسانہ،کینڈل کالونی،مشمولہ،اقبال متین کے افسانے (جلداول)،ص:۱۴۷،۱۴۸۔

(۵۴)ایضاً،ص:۱۵۲۔

(۵۵) وسیم عباس، بادبان کراچی اور دل کی آواز،مشمولہ، ماہنامہ تمہید، نظام آباد (اقبال متین نمبر)، جلد:۳،شمارہ:۱، جنوری،۲۰۱۳ء،ص:۴۷۔

(۵۶) رتن سنگھ،اقبال متین کی کہانی،مشمولہ،اقبال متین سے اُنسیت،ص:۹۲،۹۳۔

(۵۷)اقبال متین، افسانہ، آ گہی کے ویرانے، مشمولہ، اقبال متین کے افسانے (جلد اول)،ص:۴۹۴۔

(۵۸)پروفیسر عتیق اللہ، قدر شناسی، ناشر: ادارہ اشاعت اردو، ۱۹۷۸ء، ص:۹۴۔

(۵۹)عابد سہیل، اقبال متین کے تین افسانے (ایک غیر رسمی سا تنقیدی مطالعہ)، مشمولہ، سہ ماہی بادبان کراچی (اقبال متین نمبر)،ص:۲۷۔

(۶۰)اقبال متین، افسانہ، چھگن چاچا، مشمولہ، اقبال متین کے افسانے (جلد دوم)،ص:۲۲۔

(۶۱)عظیم اقبال، خط، اقبال متین کے نام، مشمولہ، چراغ تہہ داماں، ریاض پرنٹرس، حیدرآباد، ۲۰۰۵ء، ص:۱۷۵۔

(۶۲)اقبال متین، افسانہ، اجنبی، مشمولہ، اقبال متین کے افسانے (جلد اول)،ص:۱۱۔

(۶۳)ایضاً،ص:۱۲۔

(۶۴)جیلانی بانو، اُجلی پرچھائیاں: ایک جائزہ، مشمولہ، اقبال متین سے انسیت،ص:۱۶۴۔

(۶۵)ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، تڑکے کی ''اُجلی پرچھائیاں''، مشمولہ، اقبال متین سے انسیت،ص:۱۶۹۔

(۶۶)اقبال متین، افسانہ، کھڑکیاں، مشمولہ، اقبال متین کے افسانے (جلد اول)،ص:۴۷۳۔

(۶۷)پروفیسر عتیق اللہ، اقبال متین کا افسانہ، متضاد تصویروں کا البم، مشمولہ، سہ ماہی ذہن جدید، نئی دہلی، ترتیب، زبیر رضوی، جلد: ۲۵، شمارہ: ۰۷، مارچ تا اگست، ۲۰۱۵ء، ص:۱۷۰۔

(۶۸)اقبال متین، افسانہ، ایک خط یادوں کے نام، مشمولہ، اقبال متین کے افسانے (جلد دوم)،ص:۲۹۰۔

(۶۹)اقبال متین، افسانہ، مورنی، مشمولہ، اقبال متین کے افسانے (جلد دوم)،ص:۲۲۲۔

(۷۰)نورالحسنین، میں اقبال متین ہوں، مشمولہ، اقبال متین سے اُنسیت،ص:۱۴۔

(۷۱)رتن سنگھ، اقبال متین کی کہانی، مشمولہ، اقبال متین سے اُنسیت،ص:۹۴۔

(۷۲)ڈاکٹر وحید اختر، بحوالہ اقبال متین کے افسانے (جلد اول)،ص:۳۲۔

(۷۳)اقبال متین، افسانہ، شہر آشوب، مشمولہ، اقبال متین کے افسانے (جلد اول)،ص:۶۸۰۔

(۷۴)ایضاً،ص:۶۸۱۔

(۷۵)فضیل جعفری، اقبال متین: شہر آشوب کا تنہا مسافر، مشمولہ، اقبال متین سے اُنسیت،ص:۲۷۔

(۷۶)وسیم عباس، بادبان کراچی اور دل کی آواز، مشمولہ، ماہنامہ تمہید، نظام آباد (اقبال متین نمبر)،ص:۴۷۔

(۷۷)اقبال متین، افسانہ، اونچ نیچ، مشمولہ، اقبال متین کے افسانے (جلد اول)،ص:۷۸۴۔

(۷۸)ایضاً،ص:۷۸۵۔

(۷۹)پروفیسر قمر رئیس، اقبال متین کا شہر آشوب، مشمولہ، اقبال متین سے اُنسیت،ص:۶۸۔

(۸۰)اقبال متین،افسانہ،گھونگھٹ میں خون،مشمولہ،اقبال متین کے افسانے (جلددوم)،ص:۵۱۶۔
(۸۱)اقبال متین،افسانہ،بہادر،مشمولہ،اقبال متین کے افسانے (جلددوم)،ص:۱۹۸۔
(۸۲)اقبال متین،افسانہ،اُجلی پرچھائیاں،مشمولہ،اقبال متین کے افسانے (جلداول)،ص:۵۸،۵۹۔
(۸۳)جیلانی بانو،اُجلی پرچھائیاں:ایک جائزہ،مشمولہ،اقبال متین سے اُنسیت،ص:۱۶۴۔
(۸۴)رام لعل،اردوافسانے کی نئی تخلیقی فضا،سیمانت پرکاشن،دہلی،۱۹۸۵ء،ص:۴۰۔
(۸۵)اقبال متین،افسانہ،دریدہ،مشمولہ،اقبال متین کے افسانے (جلداول)،ص:۵۷۶۔
(۸۶)اقبال متین،افسانہ،اتھل پانیوں کے سودائی،مشمولہ،اقبال متین کے افسانے (جلداول)، ص:۶۰۱۔
(۸۷)رتن سنگھ،اقبال متین کی کہانی،مشمولہ،اقبال متین سے اُنسیت،ص:۹۲۔
(۸۸)عابد سہیل،اقبال متین کے تین افسانے (ایک غیررسمی سا مطالعہ)مشمولہ،اقبال متین سے اُنسیت،ص:۹۶۔
(۸۹)پروفیسر عتیق اللہ،اقبال متین کا افسانہ،متضاد تصویروں کا البم،مشمولہ،سہ ماہی ذہن جدید،نئی دہلی،ترتیب،زبیر رضوی،ص:۱۷۱،۱۷۲۔
(۹۰)اقبال متین،افسانہ،زمین کا درد،مشمولہ،اقبال متین کے افسانے (جلداول)،ص:۴۳۶۔
(۹۱)فضیل جعفری،اقبال متین:شہرآشوب کا تنہا مسافر،مشمولہ،اقبال متین سے انسیت،ص:۸۶۔
(۹۲)پروفیسر قمر رئیس،اقبال متین کا شہرِ آشوب،مشمولہ،اقبال متین سے انسیت،ص:۶۹۔

(ب)

(۱)قمر رئیس،بیسویں صدی کا افسانوی ادب،کتابی دنیا،دہلی،۲۰۰۴ء،ص:۱۸۶۔
(۲) پروفیسر سلیمان اطہر جاوید، اقبال متین،مشمولہ، اقبال متین سے انسیت، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۲ء،ص:۲۹۸،۲۹۹۔
(۳)ڈاکٹر محمد علی اثر،اقبال متین:شخصیت اورفن کے چندزاویے،مشمولہ،اقبال متین سے انسیت،ص:۲۸۴۔
(۴)ڈاکٹر مثنیٰ رضوی،اقبال متین کے تین افسانے:ایک مختصر تجزیہ،مشمولہ،اقبال متین سے انسیت،ص:۱۸۰۔
(۵) اقبال متین، کہانی میں زیاں کا محدود تصور اور علامت،مشمولہ، اقبال متین کے افسانے (جلددوم) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی،۲۰۱۰ء،ص:۴۰۶۔
(۶)ایضاً،ص:۴۰۷۔
(۷)وقار عظیم،فن افسانہ نگاری،ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ،۲۰۰۹ء،ص:۶۳۔
(۸)اقبال متین،افسانہ،ملبا،مشمولہ،اقبال متین کے افسانے (جلداول)،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی،۲۰۰۹ء،

ص:۱۰۳۔

(۹) ڈاکٹر مثنیٰ رضوی، اقبال متین کے تین افسانے: ایک مختصر تجزیہ، مشمولہ، سہ ماہی، بادبان کراچی (اقبال متین نمبر)، شمارہ نمبر:۱۳، جولائی تا ستمبر، ۲۰۱۰ء، ص:۱۳۰۔

(۱۰) ایضاً، ص:۱۳۷ تا ۱۴۰۔

(۱۱) اقبال متین، افسانہ، زمین کا درد، مشمولہ، اقبال متین کے افسانے (جلد اول)، ص:۴۳۶۔

(۱۲) ڈاکٹر مثنیٰ رضوی، اقبال متین کے تین افسانے: ایک مختصر تجزیہ، مشمولہ، سہ ماہی، بادبان کراچی (اقبال متین نمبر)، ص:۱۳۵، ۱۳۶۔

(۱۳) ڈاکٹر عشرت رومانی، شہر آشوب: ایک مطالعہ، مشمولہ، سہ ماہی بادبان کراچی (اقبال متین نمبر)، ص:۱۱۴۔

(۱۴) عابد سہیل، (ماہنامہ کتاب، لکھنو) بحوالہ، اقبال متین کے افسانے (جلد اول) ص:۲۵۰۔

(۱۵) نور الحسنین، میں اقبال متین ہوں، مشمولہ، اقبال متین سے انسیت، ص:۹

(۱۶) شمس الرحمٰن فاروقی، (شب خون ۲۷۶) بحوالہ، اقبال متین کے افسانے (جلد اول) ص:۶۴۶

(۱۷) قیصر سرمست، اشکوں سے بجھا ہوا آدمی، مشمولہ، اقبال متین سے انسیت، ص:۲۶۹

(۱۸) حفظ الکبیر قریشی، اقبال متین اور اس کا فن، مشمولہ، اقبال متین سے انسیت، ص:۳۳

(۱۹) سلیمان اریب، ''چہرہ نما''، مشمولہ، اقبال متین کے افسانے (جلد دوم)، ص:۱۳، ۱۴

(۲۰) اقبال متین، افسانہ، چھگن چاچا، مشمولہ، اقبال متین کے افسانے (جلد دوم)، ص:۲۲

(۲۱) وحید اختر، اقبال متین، مشمولہ، اقبال متین سے انسیت، ص:۲۹، ۳۰

(۲۲) اقبال متین، افسانہ، ایک پھول، ایک تتلی، مشمولہ، قرطاس و قلم کے ساتھی، مرتبہ: صائمہ اقبال، اردو بک ڈپو، انجمن ترقی اردو، حیدرآباد، ۲۰۱۵ء، ص:۵۴۳، ۵۴۴

(۲۳) ایضاً، ص:۵۴۷

(۲۴) ایضاً، ص:۵۴۶

(۲۵) اقبال متین، افسانہ، رابی اپیا، مشمولہ، اقبال متین کے افسانے (جلد اول)، ص:۳۸۳

(۲۶) ایضاً، ص:۳۸۴

(۲۷) ڈاکٹر احمد طارق، اقبال متین کے افسانے: ایک جائزہ، مشمولہ، اقبال متین سے انسیت، ص:۲۲۳ تا ۲۲۶

(۲۸) اقبال متین، افسانہ، شیبا، مشمولہ، اقبال متین کے افسانے (جلد اول)، ص:۲۸۲

(۲۹) ایضاً، ص:۲۸۲، ۲۸۳

(۳۰)اقبال متین،افسانہ،برہان قاطع،مشمولہ،اقبال متین کے افسانے (جلداول)،ص:۱۲۳

(۳۱)اقبال متین،افسانہ،شکن در شکن،مشمولہ،اقبال متین کے افسانے (جلد دوم)،ص:۱۴۷

(۳۲)اقبال متین،افسانہ،بیمار،مشمولہ،اقبال متین کے افسانے (جلداول)،ص:۸۵

(۳۳)ایضاً

(۳۴)اقبال متین،افسانہ،کتاب سے کتبے تک،مشمولہ،اقبال متین کے افسانے (جلداول)ص:۱۹۴

(۳۵)طارق چھتاری،جدید افسانہ اردو ہندی،ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ،۱۹۹۲ء،ص:۱۲۲،۱۲۳

(۳۶)پروفیسر عتیق اللہ،قدر شناسی،ادارہ اشاعت اردو،۱۹۷۸ء،ص:۹۴

(۳۷)اثر فاروقی،اقبال متین کا فن،مشمولہ،قومی محاذ،اورنگ آباد،(خصوصی اشاعت)اکتوبر۲۰۰۴ء،ص:۳۰

(۳۸)قیصر سرمست،اشکوں سے بجھا ہوا آدمی،مشمولہ،اقبال متین سے انسیت،ص:۲۷۰

(۳۹)مجتبیٰ حسین،روزنامہ سیاست،حیدرآباد،اتوار،۲۰،دسمبر،۲۰۰۹ء،ص:۶

(۴۰)پروفیسر یوسف سرمست،اقبال متین:صاحب طرز ادیب،مشمولہ،اقبال متین سے انسیت،ص:۶۳

(۴۱)اقبال متین،افسانہ،چھت،مشمولہ،اقبال متین کے افسانے (جلداول)ص:۲۰۷

(۴۲)اقبال متین،افسانہ،کتاب سے کتبے تک،مشمولہ،اقبال متین کے افسانے (جلداول)ص:۱۹۵

(۴۳)اقبال متین،افسانہ،چھت،مشمولہ،اقبال متین کے افسانے (جلداول)،ص:۲۰۸،۲۰۹

(۴۴)اقبال متین،افسانہ،زبوں آثار،مشمولہ،اقبال متین کے افسانے (جلداول)ص:۲۷۲

(۴۵)اقبال متین،افسانہ،زمین کا درد،مشمولہ،اقبال متین کے افسانے (جلداول)ص:۴۲۷

(۴۶)اقبال متین،افسانہ،شہر آشوب،مشمولہ،اقبال متین کے افسانے (جلداول)،ص:۶۸۱

(۴۷)سلیمان اریب،چہرہ نما(مقدمہ اجلی پرچھائیاں)،مشمولہ،اقبال متین کے افسانے (جلد دوم)،ص:۱۴

(۴۸)سید محمد عقیل،آگہی کے ویرانے،مشمولہ،اقبال متین سے انسیت،ص:۱۲۸

(۴۹)جیلانی بانو،اُجلی پرچھائیاں:ایک جائزہ،مشمولہ،اقبال متین سے انسیت،ص:۱۶۵

(۵۰)اقبال متین،انٹرویو،مشمولہ،اقبال متین سے انسیت،ص:۳۱۰۔

(۵۱)سلیمان اریب،چہرہ نما(مقدمہ اجلی پرچھائیاں)،مشمولہ،اقبال متین کے افسانے (جلد دوم)،ص:۱۲

(۵۲)پروفیسر یوسف سرمست،چراغِ تہہِ داماں،مشمولہ،سہ ماہی بادبان کراچی (اقبال متین نمبر)،ص:۸۶

(۵۳)پروفیسر سلیمان اطہر جاوید،اقبال متین،مشمولہ،اقبال متین سے انسیت،ص:۲۹۸،۲۹۹

(ج)

(۱) ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی، اردو ناولٹ کا تحقیقی و تنقیدی تجزیہ، ناشر: مصنف، ٹکیت رائے کالونی، لکھنو، ۲۰۰۱، ص:۲۶۔

(۲) ڈاکٹر سید مہدی احمد رضوی، اردو میں ناولٹ نگاری: فن اور ارتقا، ناشر: کتابستان، مظفر پور، ۲۰۰۴ء، ص:۱۳۴۔

(۳) ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی، اردو ناولٹ کا تحقیقی و تنقیدی تجزیہ، ص:۱۷۰۔

(۴) قاضی عبدالستار، خط، اقبال متین کے نام، مشمولہ، بادبان، کراچی، (اقبال متین نمبر)، شمارہ:۱۳، جولائی تا ستمبر، ۲۰۱۰ء، ص:۴۷۳۔

(۵) بحوالہ، قرطاس وقلم کے ساتھی، صائمہ اقبال، اردو بک ڈپو، انجمن ترقی اردو، حیدرآباد، ۲۰۱۵ء، ص:۳۸۹۔

(۶) پروفیسر عالم خوندمیری، تقریر، مشمولہ، چراغ تہہ داماں، اقبال متین، ناشر: ریاض پرنٹرس، حیدرآباد، ۲۰۰۵ء، ص: ۸۶۔۱۸۵۔

(۷) پروفیسر یوسف سرمست، چراغِ تہہِ داماں: اقبال متین کا ایک ناول، مشمولہ، اقبال متین سے اُنسیت، مرتب: نورالحسنین، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۲ء، ص:۱۲۱۔

(۸) اقبال متین، چراغِ تہہِ داماں، ناشر: ریاض پرنٹرس، حیدرآباد، ۲۰۰۵ء، ص:۳۸۔

(۹) ایضاً، ص:۴۲۔

(۱۰) ایضاً، ص:۴۰۔

(۱۱) ایضاً، ص:۵۳۔

(۱۲) ایضاً، ص:۵۶۔

(۱۳) ایضاً، ص:۷۸۔

(۱۴) ایضاً، ص:۶۶۔

(۱۵) ایضاً، ص:۸۲۔

(۱۶) ایضاً، ص:۲، ۱۰۱۔

(۱۷) ایضاً، ص:۱۲۴ تا ۱۲۶۔

(۱۸) ایضاً، ص:۱۵۰۔

(۱۹) ایضاً، ص:۱۵۴، ۱۵۵۔

(۲۰) ایضاً، ص:۱۵۶۔

(۲۱)ڈاکٹر روٴف خیر، چراغِ تہہ داماں: ایک جائزہ، مشمولہ تفہیم وتعبیر، مرتب: طارق سعید، ص: ۴۹، ۵۰۔

(۲۲)بحوالہ، چراغِ تہہ داماں: تفہیم وتعبیر، مرتب: طارق سعید، ص: ۸۳۔

(۲۳)پروفیسر یوسف سرمست، چراغِ تہہ داماں، مشمولہ، سہ ماہی بادبان، کراچی (اقبال متین نمبر)، شمارہ: ۱۳، جولائی تا ستمبر، ۲۰۱۰ء، ص: ۸۶۔

(۲۴)الیاس احمد گدّی، خط، مشمولہ، چراغ تہہ داماں، ص: ۱۷۴۔

(۲۵)محمود احمد ہنر، خط، مشمولہ، چراغ تہہ داماں، ص: ۱۷۶۔

(د)

(۱)عابد سہیل، بحوالہ، قرطاس وقلم کے ساتھی، مرتبہ: صائمہ اقبال، ناشر، مرتب، ۲۰۱۵ء، ص: ۳۷۵۔

(۲)غیاث احمد گدّی، خط، مشمولہ، چراغ تہہ داماں، اقبال متین، ناشر، ریاض پرنٹرس، حیدرآباد، ۲۰۰۵ء، ص: ۱۶۹۔

(۳)پروفیسر یوسف سرمست، چراغ تہہ داماں: اقبال متین کا ناول، مشمولہ، اقبال متین سے اُنسیت، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۲ء، ص: ۱۲۲، ۲۳۔

(۴)غیاث احمد گدّی، خط، مشمولہ، چراغ تہہ داماں، اقبال متین، ص: ۱۷۰۔

(۵)الیاس فرحت، خط، مشمولہ، چراغ تہہ داماں، اقبال متین، ص: ۱۷۸، ۱۷۹۔

(۶)پروفیسر یوسف سرمست، چراغ تہہ داماں: اقبال متین کا ناول، مشمولہ، اقبال متین سے اُنسیت، ص: ۱۲۴۔

(۷)اقبال متین، چراغ تہہ داماں، ص: ۱۵۶۔

(۸)قاضی عبدالستار، خط، مشمولہ، چراغ تہہ داماں، اقبال متین، ص: ۱۷۲۔

(۹)غیاث احمد گدّی، خط، مشمولہ، چراغ تہہ داماں، اقبال متین، ص: ۱۶۹۔

(۱۰)ڈاکٹر محمد ممنون عالم، شانوجہ کی کردار نگاری، مشمولہ، چراغ تہہ داماں: تفہیم وتعبیر، مرتب: طارق سعید، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۳ء، ص: ۱۰۸۔

(۱۱)عابد سہیل، بحوالہ، چراغ تہہ داماں: تفہیم وتعبیر، ص: ۸۳۔

(۱۲)الیاس فرحت، خط، مشمولہ، چراغ تہہ داماں، اقبال متین، ص: ۱۷۹۔

(۱۳)ایضاً۔

(۱۴)پروفیسر یوسف سرمست، چراغ تہہ داماں: اقبال متین کا ناول، مشمولہ، اقبال متین سے اُنسیت، ص: ۱۲۵۔

(۱۵)الیاس فرحت، خط، مشمولہ، چراغ تہہ داماں، اقبال متین، ص: ۱۷۹۔

(۱۶)اقبال متین، چراغ تہہ داماں، ص: ۵۶۔

(۱۷)ایضاً،ص:۷۶۔

(۱۸)ایضاً،ص:۱۵۶۔

(۱۹)ایضاً،ص:۸۲۔

(۲۰)ایضاً،ص:۳۸۔

(۲۱)ایضاً،ص:۵۶۔

(۲۲)ایضاً،ص:۵۸۔

(۲۳)اقبال متین، چراغ تہہ داماں،ص:۵۱۔

(۲۴)پروفیسر یوسف سرمست، چراغ تہہ داماں: اقبال متین کا ناول،مشمولہ،اقبال متین سے اُنسیت،ص:۱۱،۱۲۔

(۲۵)عظیم اقبال،خط،مشمولہ، چراغ تہہ داماں،ص:۱۷۵۔

باب سوم

اقبال متین کی غیر افسانوی نثر

(الف) اقبال متین کی خاکہ نگاری کا فنی مطالعہ

(ب) اقبال متین کی یادنگاری کا فنی مطالعہ

(ج) اقبال متین کی مضمون نگاری کا موضوعاتی مطالعہ

(د) اقبال متین کی مضمون نگاری کے فنی محاسن

اقبال متین کی خاکہ نگاری کا فنی مطالعہ

خاکہ غیر افسانوی نثری صنف ہے۔ اسے مرقع یا قلمی تصویر بھی کہتے ہیں۔ اس میں کسی شخصیت کے ظاہری اور باطنی اوصاف بیان کیے جاتے ہیں۔ اس میں شخصیت کی خوبیوں یا خامیوں کا بیان اس طرح کیا جاتا ہے کہ پڑھنے والے کے سامنے اس شخصیت کی ایک قلمی تصویر اُبھر آئے۔ اردو ادب میں خاکہ نگاری ایک منفرد، مقبول اور ترقی یافتہ صنف کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے ابتدائی نقوش اردو کے قدیم تذکروں میں ملتے ہیں۔ محمد حسین آزاد کی 'آب حیات' میں خاکہ نگاری کے بعض عمدہ نمونے موجود ہیں۔ مگر باضابطہ اس صنف کا آغاز بیسویں صدی کی دوسری اور تیسری دہائی میں مرزا فرحت اللہ بیگ کی تحریروں سے ہوا۔ بقول پروفیسر شمیم حنفی:

> ''اصطلاحی معنوں میں اردو خاکہ نگاری کا آغاز مرزا فرحت اللہ بیگ سے ہوتا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد اور مولوی وحیدالدین سلیم کی جیسی بے مثال تصویریں فرحت اللہ بیگ نے لفظوں میں اتاری ہیں انہیں آج بھی اردو خاکہ نگاری کی روایت کا روشن ترین نقش کہا جاسکتا ہے۔''(۱)

خاکہ انگریزی لفظ "SKETCH" کا مترادف ہے جس کے لفظی معنی اس نقشہ کے ہیں جو صرف حدود کی لکیریں کھینچ کر بنایا جائے یا ڈھانچہ تیار کیا جائے۔ اصطلاحی معنوں میں خاکہ سے مراد وہ نثری تحریریں ہیں جن میں کسی شخصیت کی مرقع کشی کی گئی ہو۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ خاکہ نگاری شخصیت کی عکّاسی کا فن ہے جس میں خاکہ نویس کسی شخص کی زندگی سے متعلق اہم اور مخصوص حالات و واقعات، اس کی منفرد خصوصیات، ظاہری و باطنی اوصاف، عادات و اطوار، حرکات و سکنات، اس کے حلیہ، لباس، رہن سہن اور طرزِ گفتگو کو ایجاز و اختصار کے ساتھ اس چابکدستی سے بیان کرتا ہے اور اس کی نفسیات، مزاج،

افتادِ طبع پر اس طرح روشنی ڈالتا ہے کہ اس انسان کی پوری شخصیت، جیتی جاگتی، چلتی پھرتی قاری کی نگاہوں کے سامنے جلوہ گر ہو جاتی ہے۔ خاکہ شخصیت کی دلکش تصویر کشی کا نام ہے مگر ضروری ہے کہ یہ تصویر جاذبِ نظر اور دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ حقیقت سے دور نہ ہو اور زندگی اور اس کی حرکت و حرارت سے بھرپور ہو۔ اس لیے خاکہ نگار کو چاہیئے کہ وہ شخصیت کو بغیر کسی مبالغہ آرائی اور جانبداری کے پیش کرے اور اس کے بیان میں تعریف و تنقیص یا مدح سرائی سے کام نہ لے بلکہ حقیقی اور ہمدردانہ انداز اپنائے۔ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی نے خاکہ کی تعریف ان جملوں میں کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اچھے اسکیچ کی تعریف ہی یہ ہے کہ بعض گوشوں کی نقاب کشائی ایسی ماہرانہ نفاست کے ساتھ کی جائے کہ اس شخصیت کا خاص تاثر پڑھنے والے کے ذہن میں خود بہ خود پیدا ہو۔ اچھا خاکہ وہی ہے جس میں کسی انسان کے کردار اور افکار دونوں کی جھلک ہو۔ خاکہ پڑھنے کے بعد اس کی صورت، اس کی سیرت، اس کا مزاج، اس کے ذہن کی افتاد، اس کا زاویۂ فکر، اس کی خوبیاں اور خامیاں سب نظروں کے سامنے آجائیں۔ شاعری میں مبالغہ ہو سکتا ہے، نثر میں عبارت آرائی اور تخیل کی آمیزش ہو سکتی ہے لیکن خاکہ ایک ایسی صنف ہے جس میں رد و رعایت ہو یا مبالغہ اور مدح سرائی ہو تو پھر وہ خاکہ نہیں رہتا۔''(۲)

ڈاکٹر اشفاق احمد ورک خاکہ کی تعریف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''خاکہ، لفظوں سے تصویر تراشنے اور کسی شخصیت کی نرم گرم پرتیں تلاشنے کا وہ لطیف فن ہے، جو شوخی، شرارت، ذہانت، زندہ دلی اور نکتہ آفرینی کے ہم رکاب ہو کر میدانِ ادب میں بار پاتا ہے۔ خاکہ انگریزی لفظ Sketch کا مترادف ہے جس کے معنی ڈھانچہ کچا نقشہ یا لکیروں کی مدد سے بنائی ہوئی تصویر کے ہیں لیکن ادبی اصطلاح میں اس سے مراد وہ تحریر ہے جس میں نہایت مختصر طور پر، اشارے کنائے میں کسی شخصیت کے ناک نقشہ، عادات و اطوار اور کردار کو فن کارانہ انداز اور روانی و جولانی کے ساتھ بیان کر دیا جائے۔ اس میں جواب مضمون کی سی سنجیدگی درکار ہوتی ہے، نہ یہ سوانح کی سی باقاعدگی اور ذمہ داری کا متحمل ہو سکتا ہے۔ خاکہ کسی شخص یا شخصیت سے وابستہ عقیدت، احترام، محبت، دلچسپی یا یادوں کی ایک ایسی لفظی تصویر ہوتی

ہے جو کسی جگہ سے نہایت بے ساختہ انداز میں شروع ہو کر کسی مقام پر
غیر روایتی انداز میں ختم ہو جاتی ہے۔''(۳)

یحییٰ امجد صنف خاکہ پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

خاکہ ایک تخلیقی صنف ادب ہے جس میں زندہ شخصیت گوشت پوست کا بدن لیے، علمیت کی بھاری بھرکم عباؤں کو دم بھر کے لیے اتار کر، روزمرّہ کے لباس میں نظر آتی ہیں اور ہم انھیں ویسا دیکھتے ہیں جیسا کہ وہ سچ مچ تھے۔ نہ کہ جیسا بننا چاہتے تھے، یا جیسا ظاہر کرتے تھے۔''(۴)

خاکہ میں شخصیت کی سیرت وصورت کو ضرور بیان کیا جاتا ہے مگر خاکہ نگاری، سوانح نگاری اور خودنوشت سوانح نگاری سے جداگانہ صنف ہے۔ سوانح اور خودنوشت سوانح میں کسی شخص کی پوری زندگی کے حالات وواقعات کو تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے جب کہ خاکہ میں کسی فرد کی زندگی اور اس کی شخصیت سے متعلق چند انوکھے اور منفرد پہلوؤں کو اس فن کاری سے بیان کیا جاتا ہے کہ اس شخص کی زندہ جاوید تصویر نگاہوں کے سامنے گھوم جائے اور ذہن پر اس کا نقش قائم ہو جائے۔ خاکہ نگاری اور سوانح نگاری کے درمیان فرق کو واضح کرتے ہوئے اور خاکہ کی انفرادیت اور اس کی صنفی خصوصیات وامتیازات پر روشنی ڈالتے ہوئے معروف ومعتبر نقاد پروفیسر شمیم حنفی رقم طراز ہیں:

''خاکہ نگاری نہ تو سوانحی مضمون ہے، نہ زندگی کے کسی شعبے میں موضوع بننے والی شخصیت کے کارناموں کی تفصیل، خاکہ نگاری تاریخ اور تخیّل سے یکساں تعلق رکھتی ہے۔ لکھنے والا جب کسی شخصیت کو موضوع بناتا ہے تو واقعات، سوانح، خارجی مشاہدات کے ساتھ ساتھ اپنے تاثرات اور قیاسات سے بھی مدد لیتا ہے۔ اسی لیے خاکہ ایک جیتی جاگتی، حقیقی شخصیت کی تصویر ہوتے ہوئے بھی افسانے جیسی دلکشی اور دلچسپی کا سامان رکھتا ہے اور پڑھنے والا اسے گویا کہ بیک وقت واقعے کے طور پر بھی پڑھتا ہے اور کہانی کے طور پر بھی۔ چنانچہ ایک کامیاب خاکہ جو اس صنف کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو، ہماری فکر اور ہمارے احساسات، دونوں سے رشتہ قائم کرتا ہے۔ اس صنف کے مطالبات فکری بھی ہوتے ہیں اور تخلیقی بھی۔ کامیاب خاکہ نگار وہ ہے جس کی آستین میں روشنی کا سیلاب چھپا ہوا ہو اور جو واقعات کی اوپری پرت کے نیچے، معمولات کے ہجوم میں کھوئی ہوئی، ایسی حقیقتوں کو بھی اپنی

گرفت میں لے سکے جن تک عام لکھنے والوں کی نگاہ پہنچتی ہی نہیں۔ اس لئے ہر اچھا خاکہ ایک دریافت ہوتا ہے کسی کہانی یا شعر کی طرح۔ ہم اس کے واسطے سے زندگی کی کسی عام سچائی تک پہنچنے کے بعد بھی یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس سچائی کو ہم نے آج ایک نئے زاویے سے دیکھا ہے اور یہ کہ معنی کی ایک نئی جہت ہم پر روشن ہوئی ہے۔

خاکہ نگار کا رویّہ، موضوع بننے والی شخصیت کی طرف سوانح نگار کے رویّے سے اس معاملے میں مختلف ہوتا ہے کہ اس کی توجّہ تصویر کے چند نمایاں نقطوں پر مرکوز ہوتی ہے۔ وہ نہ تو اس شخصیت سے منسوب ہر واقعے کی تفصیل میں جاتا ہے نہ شخصیت کے ہر پہلو کا احاطہ کرتا ہے۔ اس کی نظر انتخابی ہوتی ہے۔ وہ جہاں تہاں سے چند واقعات، شخصیت کے چند پہلوؤں تک اپنے آپ کو محدود کر لیتا ہے اور انہی واقعات اور پہلوؤں کی مدد سے ایسی تصویر بناتا ہے جو ادھوری نہ لگے۔ خاکہ نگار ایک چابکدست مصوّر ہوتا ہے جو گنتی کی چند لکیروں یا ہوش کے چند اسٹروکس STROKES کے وسیلے سے ایک جامع اور ہمہ گیر اور متحرک تصویر لفظوں میں اتار دیتا ہے۔ کسی شخصیت کے ایسے عناصر جو مرکزی حوالوں کی حیثیت رکھتے ہوں یا اس سے وابستہ ایسے واقعات جن سے شخصیت کے بھید کھلتے ہوں، خاکہ نگار کا بنیادی سروکار ان ہی سے ہوتا ہے۔‘‘(۵)

خاکہ کی مذکورہ تعریفوں کے مطالعہ کے بعد یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ خاکہ شخصیت کی تصویر کو لفظوں میں ڈھالنے کا نام ضرور ہے مگر یہ چند فنی لوازم کا متقاضی ہے۔ خاکہ ایک ادبی صنف ہے۔ دوسری ادبی اصناف کی طرح اس کے بھی فنّی لوازمات ہیں جن کی پابندی کرنا خاکہ نگار کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ خاکہ کے فنّی لوازمات جسے ہم اس کے اجزائے ترکیبی بھی کہہ سکتے ہیں یہ ہیں۔(۱) اختصار، (۲) وحدت تاثر، (۳) کردار نگاری، (۴) واقعہ نگاری، (۵) منظر کشی، (۶) زبان و بیان۔

اختصار:

خاکہ کا ایک اہم وصف ایجاز واختصار ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ خاکہ میں کسی بھی شخص کی زندگی کے چند منفرد، انوکھے اور اہم واقعات کو فن کارانہ انداز میں بیان کر کے اس کے جیتے جاگتے کردار، اس کی سیرت کی جھلکیوں اور اہم خط وخال کو نمایاں کیا جائے۔ اختصار کا یہی وصف خاکے کو مرقع اور سوانح سے

ممتاز کرتا ہے۔اختصار کی اس خصوصیت کوملحوظ رکھتے ہوئے طویل خاکے بھی لکھے جاسکتے ہیں۔خاکہ میں کبھی بھی غیرضروری واقعات اور بے جا طویل مباحث ومسائل کو بیان کرکے اسے بے جان واقعات کا پُشتارہ اور ثقالت اور غیر دلچسپی کا حامل نہیں بنانا چاہئے۔اہم اور انوکھے واقعات کا انتخاب، اس کی عمدہ ترتیب اوراس کا دلکش اندازِ بیان خاکہ کوکامیاب بناتا ہے۔

وحدت تاثر:

خاکہ کا ایک اہم جز وحدت تاثر ہے۔خاکہ میں اس کی بڑی اہمّیت ہے۔ یہاں وحدت تاثر سے مراد یہ ہے کہ خاکہ نگار شروع سے آخر تک فنی ہنرمندی سے واقعات کی کڑی سے کڑی ملائے اور ربط وتسلسل بنائے رکھے۔اس کے لیے ضروری ہے کہ خاکہ نگار تمہید، درمیانی حصے اور خاتمے کو اس خوبی سے ایک دوسرے میں پیوست کرے کہ ایک خاص تاثر شروع سے آخر تک قائم رہے۔خاکہ نگار کی کوشش قاری کے ذہن پر اپنے موضوع کا واحد تاثر مرتسم کرنا ہوتا ہے مگر کہیں یہ نقش دھندلا ہوتا ہے اور کہیں گہرا۔ تاثر کا نقش جتنا گہرا ہوگا خاکہ اتنا کامیاب سمجھا جائے گا۔

کردارنگاری:

کردارنگاری، فن خاکہ نگاری کا ایک لازمی جز ہے۔خاکے کا موضوع کوئی نہ کوئی شخصیت ہوتی ہے۔ یہ شخصیت اپنی انفرادی خصوصیات رکھتی ہے۔ان خصوصیات کو اجاگر کرنا ہی دراصل خاکہ نگاری کا اہم منصب ہوتا ہے۔اس اعتبار سے کردار، خاکے کا ایسا بنیادی جز ہے جس کے بغیر خاکے کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔خاکہ میں کردارنگاری کی اہمّیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر صلاح الدین رقم طراز ہیں:

> ’’خاکہ کے جملہ عناصر ترکیبی میں کردارنگاری کو بھی خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہ ایک ایسا بنیادی جز ہوتا ہے کہ اس کے بغیر خاکہ کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا ہے۔کردارنگاری کے ضمن میں مذکورہ شخصیت کے خدوخال، حرکات سکنات، لباس، نفسیاتی اور ذہنی کیفیات وتغیرات سب کچھ پیش کیا جاتا ہے۔‘‘(۶)

کردارنگاری خاصا مشکل فن ہے۔ایک اچھا کردار وہ مانا جاتا ہے جو زندگی کی حرکت وحرارت سے پُر ہو اور جس میں شخصیت اپنی خوبیوں، خامیوں، متضاد خصوصیات، منفرد اوصاف اور مختلف رنگوں کے ساتھ ہمارے سامنے جلوہ گر ہو۔عمدہ کردارنگاری کے لیے خاکہ نگار کا نفسیات داں ہونا اور شبیہہ نگاری

اور شخصیت نگاری کے فن کا ماہر ہونا ضروری ہے تا کہ خاکہ نگار کسی شخص کے جذبات واحساسات اس کی ذہنی کیفیات کی دلچسپ عکّاسی کرتے ہوئے اس کے رنگ روپ، وضع قطع، عادات واطوار اور حرکات وسکنات کی ایسی موثر جھلک دکھائے کہ وہ شخص اپنی تمام ظاہری و باطنی خصوصیات کے ساتھ قاری کی نگاہوں کے سامنے آ کھڑا ہو اور اس کے ذہن پر اس کا گہرا نقش قائم ہو جائے۔ خاکہ میں کردار جتنا حقیقی اور اثر انگیز ہوگا خاکہ اتنا کامیاب ہوگا۔

واقعہ نگاری:

خاکے کی تعمیر میں واقعات سے مدد لی جاتی ہے مگر خاکے میں واقعات کی بہتات نہیں ہونی چاہئے۔ کسی بھی شخصیت سے متعلق وہی اہم اور منفرد واقعات بیان کیے جانے چاہئیں جس سے موضوع کی شخصیت کے چھپے ہوئے گوشے سامنے آئیں اور اس کی انفرادیت نمایاں ہو۔ اس لیے خاکہ میں واقعات کا انتخاب، اس کے بعد ان میں ربط و تسلسل اور توازن کا سلیقہ بے حد ضروری ہے تا کہ قاری ان کے شامل ہونے سے الجھن محسوس نہ کرے۔ خاکے میں واقعات کو دلکش انداز میں بیان کیا جانا چاہئے کیوں کہ خاکے کی دلچسپی اور اثر انگیزی کا انحصار بڑی حد تک اس بات پر ہوتا ہے کہ واقعات کو کس ڈھنگ سے بیان کیا گیا ہے۔ بیان ایسا ہونا چاہئے کہ پڑھنے والے کو واقعہ اپنی نظروں کے سامنے ہوتا ہوا دکھائی دے۔

منظر کشی:

منظر کشی بھی خاکہ نگاری کا ایک اہم جز ہے۔ کسی چیز، کسی حالت یا کسی کیفیت کا بیان اس انداز سے کیا جائے کہ اس کی تصویر قاری کی آنکھوں کے سامنے پھر جائے، اس کا نام منظر کشی ہے۔ جیسے دریا کی روانی، جنگل کی ویرانی اور صبح کی شگفتگی وغیرہ کا بیان اس طرح ہو کہ وہ منظر نظروں کے سامنے گھوم جائے اور مدت تک ذہن پر اس کا نقش رہے۔

منظر کرداروں کی شخصیت کو مصورانہ انداز میں اُبھارنے اور اس کے منفرد پہلوؤں کو اُجاگر کرنے میں مدد دیتا ہے۔ منظر کشی کے ذریعہ کرداروں کی شخصیت نکھر کر صاف شفاف، منفرد اور پہلودار انداز میں سامنے آتی ہے۔ خاکہ نگار کو چاہئے کہ جب وہ کسی منظر کو دیکھے تو اس پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہوئے نہیں گزر جائے بلکہ پس منظر کی روح تک پہنچنے کی کوشش کرے۔ فن کارانہ منظر کشی سے خاکہ میں شگفتگی و دلکشی

اور جان پیدا ہو جاتی ہے۔

زبان و بیان:

ادب کی کوئی صنف ہو اس میں زبان و بیان کی اہمّیت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ یہی حال خاکے کا ہے۔ یہ بیانیہ نثری صنف ہے۔ اس میں زبان و بیان کی بڑی اہمّیت ہے۔ اسی کے سہارے خاکہ نگار کسی شخص کو چلتا پھرتا، ہنستا بولتا دکھاتا ہے۔ وہ واقعات میں جان پیدا کرنے اور کردار کو حرکت میں لانے اور احساس کے قابل بنانے کے لیے الفاظ ہی کا سہارا لیتا ہے۔ خاکہ نگار کو اپنے بیان میں زور پیدا کرنے کے لیے موزوں الفاظ، حسین تشبیہات، دل کش استعارات اور دوسری صنعتوں سے مدد لینی پڑتی ہے تاکہ حقیقی شخصیت بھی اُبھر کر سامنے آئے اور خاکہ میں ادبی لطف و چاشنی بھی پیدا ہو۔ خاکہ نگار کو چاہئے کہ وہ ایسا انداز بیان اختیار کرے جس کے ذریعے شخصیت کا ہلکا سا تعارف یا لمحہ بھر کی زیارت کا نقش قاری کے دل و دماغ پر ثبت کر دے۔ وہ مصائب بھی اس طرح بیان کرے کہ شخصیت بُرے پہلوؤں کے باوجود دلچسپ معلوم ہو۔ اس کے علاوہ خاکہ میں یہ ضروری ہے کہ واقعات کے بیان کا انداز اور اسلوب حقیقی ہوتے ہوئے بھی ایسا حسین و دلکش ہو جو پڑھنے والے کو اپنی جانب متوجّہ کر لے اور اپنا اسیر بنا لے۔

خاکہ نگاری کے فنّی آداب:

خاکہ شخصیت کی تصویر کشی کا فن ہے۔ یہ فن چند فنی لوازم کا متقاضی ہے۔ جیسے اس میں اختصار، حقیقی واقعات کا بیان، واقعات کی عمدہ ترتیب اور ان کے درمیان ربط و تسلسل، صحیح مرقع کشی، دیانت داری، غیر جانبداری، اظہار کی جرأت اور شعوری فراست ہو اور نپے تلے الفاظ میں دلکش انداز میں شخصیت کو بیان کیا گیا ہو۔ خاکہ نگار جب کسی شخصیت پر خاکہ لکھے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس سے متعلق وہی باتیں بیان کرے جو اس شخص کے اندر پائی جاتی ہوں۔ وہ کسی شخصیت کے بیان کے وقت اپنی ذاتی پسند و ناپسند اور بے جا تعصّبات کا شکار نہ ہو۔ وہ اپنی تحریر میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے من گھڑت اور فرضی واقعات بھی بیان نہ کرے۔ خاکہ میں کسی شخصیت کو نہ تو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے نہ اس کے قد کو گھٹانے اور اسے نیچا دکھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ خاکہ میں شخصیت کے بیان میں بے جا تعریف و

تنقیص اور مبالغہ آرائی یا مدح سرائی سے کام نہیں لیا جاتا ہے نہ کسی شخصیت پر تنقید کی جاتی ہے۔ یہ سب باتیں فن خاکہ نگاری کے اصولوں کے خلاف ہیں۔ خاکہ کی اہم خوبی یہ ہے کہ اس میں شخصیت کو اچھا یا بُرا بنائے بغیر جیسی وہ ہوتی ہے ویسی ہی پیش کر دی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں تکیٰ امجد رقم طراز ہیں:

''خاکہ میں کسی شخصیت کو جیسی وہ ہوتی ہے من وعن ویسا ہی پیش کر دیا جاتا ہے۔ اسے اچھا یا برا یا کچھ اور ''ثابت'' کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ اس کی زندگی کے مختلف واقعات کا علمی بصیرت سے انتخاب کر کے پوری فنی مہارت سے ان کی ترتیب قائم کی جاتی ہے اور یوں زندہ شخصیت سامنے آتی ہے۔ اچھے خاکہ نگار کا نقطۂ نظر ضرور ہمدردانہ ہوتا ہے لیکن وہ حتی الوسع غیر جانبدار ہی رہتا ہے۔''(۷)

خاکہ نگاری کا اہم اصول یہ ہے کہ اس میں شخصیت کو سچائی اور دیانتداری سے پیش کیا جائے۔ اس کی خوبیوں کے ساتھ اس کی خامیوں کو بھی بیان کیا جائے۔ کسی بھی شخص کی بُرائیوں کو اس ہمدردانہ انداز میں بیان کیا جائے کہ دل میں اس شخصیت سے نفرت پیدا نہ ہو۔ خاکہ نگاری کا ایک اہم اصول یہ بھی ہے کہ خاکہ نگار کسی بھی شخصیت کو بیان کرتے ہوئے اس کے منفرد، اچھوتے اور اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالے اور اس کے باطنی تہوں کو ٹٹول کر شخصیت کے ان تاریک گوشوں کو بھی بے نقاب کرے جس سے عام لوگ واقف نہیں ہیں۔ ڈاکٹر صابرہ سعید خاکہ نگاری کی ماہیت وفن پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''خاکہ نگاری کا فن خاکہ نویس سے کئی چیزوں کا طالب ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ کسی شخصیت کو الفاظ و زبان کے ذریعے حیاتِ نو بخشی جائے۔ دوسرے زیرِ مطالعہ شخصیت کو اس کے اصلی رنگ وروپ اور اس کے ماحول میں پیش کیا جائے۔ اس کی تحریر صرف حقیقت کی عکاسی کرے۔ وہ شخصیت کے صرف نمایاں اور مسلم خصوصیتوں کو زیرِ قلم لائے۔ ایسے پہلو ہی منتخب کرے جن سے شخصیت کی ذہنی افتاد، افکار ونظریات قاری کے سامنے عیاں ہوسکیں۔ اس کے علاوہ اپنے جذبات اور جوش کو اعتدال میں رکھ کر ہمدردی لیکن غیر جانبداری کے ساتھ تمام مواد کو اس طرح ترتیب دے کہ شخصیت کی سیرت کے مخصوص ومنفرد پہلو منور ہوسکیں۔ اس کے ساتھ وہ قاری میں بھی اس شخصیت کے لیے ویسے ہی ہمدردانہ جذبات پیدا کر دے جو وہ خود رکھتا ہے۔ شخصیت کا مطالعہ متوازن ہو، دقتِ نظر کے ساتھ وسعتِ نظری بھی

لازمی وضروری ہے۔ واقعات صحت کے ساتھ پیش کیے جائیں۔‘‘(۸)

خاکہ نگاری کے یہی وہ فنّی آداب ہیں جن کو برت کر دلکش اور بہترین خاکے لکھے جاسکتے ہیں۔ خاکہ نگار کے پاس غیر معمولی قوّتِ مشاہدہ کا ہونا ضروری ہے تاکہ شخصیت کے باریک سے باریک گوشوں تک اس کی رسائی ہوسکے۔ خاکہ نگار اپنی بصیرت و بصارت، ذہانت اور مصورانہ مہارت سے کام لے کر شخصیت کے چند انوکھے، منفرد اور اہم پہلوؤں کو اپنے حقیقی مگر دلکش اندازِ بیان اور حسین اسلوب میں اس طرح بیان کرے کہ اس کی جیتی جاگتی، متحرک تصویر قاری کی نگاہوں کے سامنے گھوم جائے اور ماضی کی شخصیت حال میں زندہ ہوجائے۔

اردو میں خاکہ نگاری کی ابتدا باضابطہ طور پر جیسا کہ ذکر کیا جاچکا ہے مرزا فرحت اللہ بیگ کی تحریروں ’’نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی اور کچھ میری زبانی‘‘، ’’دلی کا ایک یادگار مشاعرہ‘‘ اور ’’ایک وصیت کی تعمیل‘‘ وغیرہ سے ہوئی۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کے بعد جو خاکہ نگار سامنے آئے ان میں خواجہ حسن نظامی، آغا حیدر حسن، مولوی عبدالحق، شاہد احمد دہلوی، اشرف صبوحی، رشید احمد صدیقی، سردار دیوان سنگھ مفتون، جوش ملیح آبادی، خواجہ محمد شفیع دہلوی، مرزا محمود بیگ، مالک رام، منٹو، عصمت چغتائی، شوکت تھانوی، محمد طفیل، سید اعجاز حسن، کنھیالال کپور، شورش کاشمیری، فکر تونسوی، چراغ حسن حسرت، خواجہ غلام السیدین، مجید لاہوری، عبدالمجید سالک، کرشن چندر، ظ۔ انصاری، حامد جلال، احمد بشیر اور قرۃ العین حیدر وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ خواجہ احمد فاروقی، خلیق انجم، اسلم پرویز، ڈاکٹر عبادت بریلوی، سید ضمیر جعفری اور قدرت اللہ شہاب وغیرہ نے بھی عمدہ خاکے لکھے ہیں۔ عصر حاضر کے نمائندہ اور ممتاز خاکہ نگار مجتبیٰ حسین ہیں۔ ان کے علاوہ جن ادیبوں نے اس فن کو وسعت دی ان میں انتظار حسین، یوسف ناظم، عابد سہیل وغیرہ کے ساتھ ساتھ اقبال متین کا نام بھی اہمّیت کا حامل ہے۔

اقبال متین کے بارے میں جیسا کہ گذشتہ باب میں ذکر کیا جاچکا ہے کہ ان کی ادبی شخصیت کے مختلف پہلو ہیں۔ وہ ممتاز افسانہ نگار، ناول نگار، یادنگار، مضمون نگار اور شاعر ہونے کے ساتھ خاکہ نگار بھی ہیں۔ ان کی کتاب ’’سوندھی مٹی کے بُت‘‘ ان کے شخصی مضامین اور خاکوں کا مجموعہ ہے۔ شخصی مضامین میں خاکے کے بیشتر اوصاف پائے جاتے ہیں۔ یہ ایک طرح سے خاکہ نما مضامین ہیں جس کا شمار خاکہ

نگاری ہی کی صنف کے تحت ہوتا ہے۔ اقبال متین نے جن شخصیتوں پر مضامین لکھے ہیں ان میں مخدوم محی الدین، سلیمان اریب، شاذ تمکنت، ڈاکٹر سید عبدالمنان، حسن چشتی، مولانا ابراہیم ہارون سیٹھ، زاہد صاحب، صابر دت، کشمیری لال ذاکر، علامہ اعجاز فرخ، سروجنی نائیڈو اور خواجہ الطاف حسین حالی ہیں۔ ان شخصیتوں سے اقبال متین بے حد متاثر رہے ہیں۔ سروجنی نائیڈو اور خواجہ الطاف حسین حالی کے علاوہ ان میں تمام شخصیتوں سے اقبال متین کے دوستانہ مراسم، ذاتی، علمی و ادبی تعلقات اور ان کے ساتھ ان کا اُٹھنا بیٹھنا رہا ہے۔ ان شخصیتوں سے ملنے اور ان کا مشاہدہ کرنے کے بعد انھیں ان میں جو خوبیاں وکمزوریاں، منفرد خصوصیات اور امتیازات و کمالات نظر آئی ہیں، اسی کو انھوں نے قلمبند کرتے ہوئے ان شخصیتوں کی جھلک دکھانے کی کوشش کی ہے۔

مخدوم محی الدین اقبال متین کے استاد رہے ہیں۔ ''شعور کی شخصیت، مخدوم محی الدین'' ان ہی پر لکھا گیا مضمون ہے۔ اس میں ان کی محبوب و مقبول، ہر دلعزیز، چہیتی، انقلابی اور فکر و شعور کو پروان چڑھانے والی منفرد شخصیت کو دکھایا گیا ہے۔ یہ مضمون دو حصّوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصّہ میں چیتا پور میں چیتا شاہ ولی کے عرس کے موقع پر منعقد ہونے والے مشاعرہ کی روداد اس فنکاری سے بیان کی گئی ہے اور اس کی آرائش و زیبائش کا نقشہ اس دلچسپ انداز میں کھینچا گیا ہے کہ پورا مشاعرہ نگاہوں کے سامنے ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس تاریخی مشاعرے میں اس وقت کے حیدرآباد کے چوٹی کے شعراء لطیف ساجد، سلیمان اریب، نظر حیدرآبادی، علی صائب میاں، نذیر دہقانی، تمکین سرمست، صاحبزادہ میکش، صمد رضوی ساز، شعیب حزیں اور مخدوم محی الدین شریک ہوئے تھے۔ ان شعراء کا تعارف کراتے ہوئے اقبال متین نے ان کے اُٹھنے بیٹھنے اور کلام سنانے کے انداز کا نقشہ اس مہارت سے کھینچا ہے کہ یہ شعراء مشاعرے میں چلتے پھرتے، گاتے گنگناتے اور کلام سناتے نظر آتے ہیں اور مخدوم کی شخصیت ان میں نمایاں دکھائی دیتی ہے اور اور مشاعرہ میں چھائی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ مضمون کے دوسرے حصّے میں مخدومؔ محی الدین کو بہ حیثیت استاد پیش کیا گیا ہے۔ مخدومؔ جب سٹی کالج میں اُردو کے اُستاد بن کر گئے تو ان کی شخصیت دیگر اساتذہ سے مختلف تھی۔ بہ حیثیت استاد ان کی محبوب و مقبول، عظیم اور منفرد شخصیت کو اقبال متین یوں پیش کرتے ہیں۔

''مخدومؔ استاد بن کرسٹی کالج آچکے تھے۔ایک دن ہم نے سنا کہ اردو کی کلاس اب مخدوم محی الدین لیا کریں گے۔ ہماری خوشی چھپائے نہیں چھپتی ہے۔اردو کے استاد آدمی بھلے سے تھے۔لیکن مزاج دینیات کے مولوی کا رکھتے تھے۔ ادبیات پڑھانے اور دینیات پڑھانے میں جو فرق ہے اس کو محسوس کرنا بھی بے چاروں کے بس کا روگ نہ تھا۔کسی استاد کے لیے شاگرد کو علم سے نواز دینا کوئی بات نہیں ہے کہ وہ روٹی اسی کی کھاتا ہے۔کتنے ایسے استاد ہیں جنھوں نے اپنے شاگردوں کو شعور سے نوازا۔علم اور بات ہے، آگہی اور ہی کچھ۔ مخدومؔ محی الدین کلاس میں آئے تو درسی کتابیں بستوں میں دھری رہیں۔پہلا سوال استادِ محترم نے یہ کیا۔تم لوگوں میں شاعر کون ہے؟ ارے یہ تو آتے ہی دوست بن گئے....یہ دوست بننے والا استاد کچھ ہی دنوں میں اپنے شاگردوں کا دل بن کر دھڑکنے لگا۔میں غلو سے کام نہیں لے رہا ہوں۔مخدوم محی الدین کسی شخص کا نام نہیں ہے۔ایک محبت کا نام ہے۔ایسی محبت کا جو دل میں بستی ہے اور دل میں بسا بھی لیتی ہے۔حیدرآباد ہوسکتا ہے کہ مخدومؔ سے بڑا شاعر پیدا کرلے لیکن مخدومؔ سے بڑے انسان کے لیے جانے کتنی صدیاں وقت کے سمندر میں ڈوب ڈوب کر چلائیں گی کہ سارے سمندر کھنگال ڈالے، کسی منہ بند سیپی میں ویسا موتی نہیں ملا۔''(۹)

مخدومؔ محی الدین اقبال متین کو بے حد چاہتے اور عزیز رکھتے تھے۔وہ طلباء سے لے کر اساتذہ تک کی نگاہوں میں بہت مقبول تھے۔وہ اشتراکی ادیب اور انقلابی شخصیت کے مالک تھے۔کالج میں وہ انقلابی شان سے درس وتدریس کی خدمات انجام دیتے تھے۔وہ کالج کے طلباء کے درمیان اشتراکی خیالات وافکار کو پھیلانے کے لیے رسائل ومجلّات تقسیم کرتے تھے۔اس کی پاداش میں انھیں کالج کی لکچرر شپ سے مستعفی ضرور ہونا پڑا لیکن انھوں نے اپنی فکر سے طلباء کے ذہن ودماغ کو بڑا گہرا متاثر کیا۔ اقبال متین نے ان تمام پہلوؤں پر اس طرح روشنی ڈالی ہے کہ ان کی انقلابی شخصیت عیاں ہو جاتی ہے۔ڈاکٹر محمد علی اثر اس مضمون پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''اس کتاب کا آغاز شعور کی شخصیت مخدومؔ سے ہوتا ہے جسے دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔پہلے حصہ میں اگر چہ مخدوم کی شخصیت چھائی ہوئی ہے لیکن یہ حصہ چیتا شاہ ولی کے عرس کے موقع پر ۱۹۳۹ء میں منعقد ہونے والے مشاعرے کی روداد پر مشتمل ہے جسے رپورتاژ بھی کہا جاسکتا ہے۔اقبال

> متین نے چیتاپور میں منعقد ہونے والے اس مشاعرہ کی روداد بڑے فنکارانہ انداز میں اس طرح بیان کی ہے کہ قاری خودکواس مشاعرے میں شریک محسوس کرتا ہے۔...اس مضمون میں اقبال متین نے نہ صرف مشاعرہ گاہ کی سجاوٹ شاعروں کے لیے مختص کئے گئے خیموں، شطرنجوں، توشکوں، چاندنیوں کی زیبائش، برآمدوں میں بکھری کرسیوں اور جلتے ہوئے پٹرومکس کا نقشہ کھینچا ہے بلکہ حیدرآباد سے آئے ہوئے شاعروں اور اور ادیبوں لطیف ساجد، سلیمان اریب، نظر حیدرآبادی، علی صائب میاں، نذیر دہقانی، تمکین سرمست، صاحبزادہ میکش، صمد رضوی ساز، شعیب حزیں اور مخدوم محی الدین کی چلتی پھرتی ہنستی مسکراتی گاتی گنگناتی اور اپنے مخصوص انداز میں کلام سناتی ہوئی شخصیتوں کی تصویریں دکھائی ہیں۔مخدوم سے متعلق اس مضمون کے دوسرے حصے میں مصنف نے مخدوم کو بہ حیثیت استاد پیش کیا ہے۔''(۱۰)

اقبال متین نے اپنے دوستوں کی شخصیات پر بھی اظہارِ خیال کیا ہے۔سلیمان اریبؔ، شاذ تمکنت، حسن چشتی اور کشمیری لال ذاکر ان کے بے تکلف دوستوں اور چاہنے والوں میں تھے۔سلیمان اریبؔ پر لکھتے ہوئے انھوں نے ان کی ذاتی، مجلسی اور ادبی زندگی پر روشنی ڈالی ہے اور متضاد خصوصیتوں کی حامل ان کی شخصیت کو آشکار کیا ہے۔سلیمان اریبؔ حیدرآباد کے منفرد شاعر اور مشہور رسالہ 'صبا' کے مدیر تھے۔ وہ مجلسی آدمی ہونے کے ساتھ بے حد مخلص، دوست نواز، ظریف و بذلہ سنج، روشن خیال اور کشادہ ذہن قسم کے انسان تھے۔وہ بڑے جذباتی بھی تھے۔وہ جب طیش میں آتے تو اپنے سامنے کسی کو کچھ نہیں سمجھتے تھے لیکن ہوش میں وہ دوستوں کا بہت احترام کرتے اور کشادہ ذہنی سے ان کے کمال کا اعتراف کرتے۔وہ جتنے اصول پسند تھے، اتنے ہی لااُبالی بھی تھے۔ان کی دوست نواز، لااُبالی اور اصول پسند شخصیت کو اقبال متین اپنے لفظوں میں یوں بیان کرتے ہیں:

> ''اریب ان دوستوں میں سے تھا جس کی دوستی پر بجا طور پر فخر کیا جا سکتا تھا۔ بے لاگ، بے لوث، مصلحتوں کے منہ پر تھوک کر گزر جانے والا...وہ جتنا لااُبالی تھا اتنا ہی بااصول بھی تھا۔ایسے تضادات ہی اریب کی شخصیت کی تحریف بھی ہیں تکمیل بھی۔''(۱۱)

سلیمان اریب میں محبت و مروّت اور انسانیت و ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔خود بینی و خود

پسندی بھی ان کی شخصیت کا اہم وصف تھی۔ ان کی نرگسیت پسند شخصیت کو اقبال متین اس طرح بیان کرتے ہیں:

''ایک بار ایک منسٹر کے گھر گیا۔ 'صبا' کے لیے اشتہار کی فراہمی کا مسئلہ تھا۔ کچھ دیر بیٹھا رہا۔ باریابی جلد نہ ہوسکی، اٹھا اور چلا آیا۔ یہ سلوک اریبؔ نے خود سے کیا ہے اگر منسٹر سے مل لیتا تو اشتہار یقینی تھا اور بڑا تھا۔ جس کا علم اریبؔ کو تھا۔ الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وانہ ہوا، آج بھی اریبؔ کا خیال آتا ہے تو یہی سوچتا ہوں۔ اللہ میاں نے اگر اس کو خوش آمدید کہنے میں پانچ دس منٹ کی تاخیر کی ہوگی تو وہ لوٹ گیا ہوگا اور جانے کہاں کہاں آسمانوں میں سر پھوڑتا بے اماں پھر رہا ہو۔ بدمستی کے عالم میں ہر ایک کے ہاتھ سے شراب طہورہ جھپٹتا ہوا اور اس میں نشے کے لیے زہر گھولتا ہوا اور یہ سب کچھ وہ اس وقت تک کرے گا جب تک مشیت ایزدی مسکرا کر اس پر مہربان نہ ہو جائے۔''(۱۲)

اقبال متین کسی شخصیت پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے اس کے اچھے اور بُرے دونوں پہلوؤں کو سامنے لاتے ہیں اور خوبیوں کے ساتھ خامیوں کو بھی بیان کرتے ہیں تا کہ پوری شخصیت قاری کی نگاہوں کے سامنے نمایاں ہوسکے۔ دیکھئے شاذؔ تمکنت پر لکھتے ہوئے انھوں نے ان کی شخصیت کی کمزوریوں کو کس طرح اُجاگر کیا ہے۔ وہ ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

''شراب شاذ کی ایسی کمزوری بن گئی تھی کہ وہ اپنی خودساختہ بے سکون زندگی کو اضطراب کے ایسے آئینوں کا عکس بنا لیتا جن میں اچھی خاصی سامنے کھڑی زندگی کرچیاں بن کر بکھری ہوئی نظر آتی یہ حقیقت نہیں تھی، حقیقت کو کیموفلاج کرنے کا ہنر تھا جو شاذؔ کو آ گیا تھا۔ یہ بات بالکل الگ ہے کہ اسی کیموفلاج کے ہنر نے اس سے عشقیہ شاعری کی بڑی نازک منزلیں سلیقے سے طے کروالیں۔''(۱۳)

شاذؔ تمکنت حیدرآباد کے منفرد طرز کے معروف شاعر تھے۔ ان سے اقبال متین کی گہری دوستی اور بڑی بے تکلّفی تھی۔ اس کا ذکر انھوں نے بڑے والہانہ انداز میں کیا ہے۔ شاذؔ تمکنت متضاد خصوصیتوں کے حامل تھے۔ وہ بڑے وضع دار، غیور اور رکھ رکھاؤ کے مالک تھے، ساتھ ہی وہ بے حد عجلت پسند، خود بیں و خود پسند تھے۔ ان کی شخصیت پر اقبال متین یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں:

''وہ پیارا تھالیکن ضدی بھی تھا....دوستی میں جو شخص ترازو کے توازن پر نظر نہ رکھنے کو اپنی انا کی سبکی سمجھتا تھا اس شخص نے عشق میں ترازو ہی ہاتھ سے پھینک دی اور ہر پیمانے کو عشق کی اہانت جانا۔اس کے ساتھ ہی وہ باوضع اور رکھ رکھاؤ کا آدمی بھی تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ کبھی عالم مستی میں بھی اس نے مجھے آپ سے تم کہا ہو حالاں کہ اس کے ایغو کو ٹھیس لگنے پر بہت سوں کا پڑا کرتے میں نے اسے دیکھا ہے۔خود مجھے بھی اس نے صرف ایک بار نہیں بخشا تھا۔ راشد آذر کے گھر میں مجھ سے اور عزیز قیسی سے زیادتی کی۔ہم دونوں ہی دُکھی تھے۔لیکن دوسرا دن چڑھنے سے پہلے وہ میرے گھر پر موجود تھا۔''(۱۴)

شاذ تمکنت اور سلیمان اریب کے علاوہ حسن چشتی کی شخصیت کو بھی اقبال متین نے اپنے مضمون کا موضوع بنایا ہے۔حسن چشتی اقبال متین کی تحریر کے مداحوں، ان کے چاہنے والوں اور مخلص دوستوں میں تھے۔دیکھئے اقبال متین ان کی بے لوث شخصیت کا تعارف کس دلچسپ انداز میں کراتے ہیں:

''یہ شخص عجیب شخص ہے۔پیاسوں کو تلاش کرتا ہے اور پھر کنویں لے کر ان کی طرف دوڑتا ہے۔مجھ سے پہلی بار ملا تو ایسے ملا جیسے غرض مند ہو۔اور وہ آیا تھا میری غرض پوری کرنے۔''(۱۵)

حسن چشتی کا شمار حیدرآباد کی اہم شخصیتوں میں ہوتا ہے۔انھوں نے بہار کے گیا ضلع کے ایک گھرانہ میں حیدرآباد میں آنکھ کھولی۔وہ عثمانیہ یونیورسٹی کے پہلے منتظم سمیع احمد کے بیٹے تھے۔وہ اس یونیورسٹی کے انتظامیہ سے بھی متعلق تھے۔وہ حیدرآباد ایسوسی ایشن، جدّہ کے صدر بھی رہے۔انھوں نے اپنی زندگی کا آغاز شعر وادب سے کیا تھا مگر جلد ہی انھوں نے اپنے آپ کو انسانی فلاح و بہبود کے کاموں میں لگا دیا۔اپنی منتظمی اور صدارت کے دوران انھوں نے بہت سے فلاحی ورفاہی کام انجام دیئے اور حیدرآباد کے بے شمار مستحق اور کمزور لوگوں کو ان کی ذات سے فائدہ پہنچا۔اقبال متین ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اس نے انسانی فلاح و بہبود کے لیے وہ سب کچھ کیا جو اس کے بس میں تھا اور وہ سب کچھ دیا جو اس کے ورثے میں ذہن کی تربیت بن کر ہاتھ لگا تھا۔ اپنا غم بھول کر دوسروں کا غم اپنا لینا کچھ اتنا آسان بھی تو نہیں ہے۔یہ کام حسن چشتی بڑی مشاقی سے کرتا ہے۔''(۱۶)

حسن چشتی کی شخصیت خلوص ومحبت کا پیکر تھی۔ضبط وتحمل ان کا خصوصی وصف تھا۔ان میں انسان

دوستی اور ہمدردی کا بے پناہ جذبہ پایا جاتا تھا۔ وہ دوسروں کے دکھ تکلیف کو اپنا دکھ تکلیف سمجھتے تھے اور ان کے لیے بے حد فکرمند رہتے تھے۔ وہ دوسروں کی حتی الوسع مدد کرتے تھے۔ ان کی سیرت وسوانح اور ان کے سماجی وفلاحی کارناموں پر اقبال متین نے اس چابکدستی سے روشنی ڈالی ہے کہ ان کی پُرخلوص و ہمدرد، باعمل، فعال، چہیتی اور دوسروں پر جان نچھاور کرنے والی شخصیت بڑے پُراثر انداز میں سامنے آتی ہے۔

کشمیری لال ذاکر بھی اقبال متین کے مخلص دوست اور ان کے چاہنے والے تھے۔ ان پر اپنے تاثرات قلمبند کرتے ہوئے انھوں نے ان سے اپنی دوستی اور ان کے خلوص ومحبت کا ذکر بڑے والہانہ انداز میں کیا ہے۔ ایک مرتبہ دہلی میں ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس میں اقبال متین اور کشمیری لال ذاکر دونوں شریک تھے۔ کانفرنس ہال میں سیٹ خالی نہ ہونے کی وجہ سے دونوں کافی فاصلہ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ جب اقبال متین کے برابر کی سیٹ خالی ہوئی تو کشمیری لال ذاکر جاکر وہاں بیٹھ گئے۔ دیکھئے اقبال متین نے ان کے اس بیٹھنے کی تصویرکشی کرتے ہوئے کس منفرد انداز میں ان کی پُرخلوص شخصیت کا خاکہ کھینچا ہے۔

> ''کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ ایک صاحب میرے برابر کی خالی سیٹ پر آ بیٹھے۔ بہت پیار سے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے دیکھا کہ کشمیری لال ذاکر ہیں۔ میں ٹھیک ہو بیٹھا۔ بس اس طرح آکر چپکے سے بیٹھ رہے جیسے وؔلی دکنی کی زبان میں سینے میں راز آتا ہے۔ ہنستا ہوا چہرہ، جھکی جھکی نظریں۔ ان نظروں میں لگاوٹ کی کیفیت کا اظہار کچھ عجیب ڈھنگ سے تھا جیسے کوئی اخلاص کی دولت چھپا چھپا کر بانٹ رہا ہو۔'' (۱۷)

اس کانفرنس میں ملاقات کے دوران کشمیری لال ذاکر نے اقبال متین کو ہریانہ اردو اکادمی کے ایک سیمینار کے لیے بڑے چاؤ سے مدعو کیا۔ اقبال متین جب ہریانہ اردو اکادمی کے سیمینار میں تشریف لائے تو اس سیمینار کے دوران انھوں نے ان کی تواضع کی اور ان کے ساتھ خلوص ومحبت کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ اس ضمن میں اقبال متین کے تاثرات ملاحظہ کیجئے:

> ''سیمینار سے فرصت ملتی تو ہماری تفریح کا انتظام کردیتے اور ہم تفریح سے فرصت پاتے تو سیمینار کا اہتمام ہوجاتا... پیار سے رکھا، پیار سے تواضع کی۔ پیار سے جدا کیا۔ مجھ سے صرف اپنائیت نہیں برتی، خلوص دیا، محبت

دی۔‘‘(۱۸)

کشمیری لال ذاکر پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے اقبال متین نے ان کے خلوص ومحبت کا اعتراف بڑی عقیدت سے کیا ہے اوران کی دوست نواز شخصیت کی دلچسپ عکاسی کی ہے۔

اقبال متین نے جن ادبی شخصیات پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے ان میں صاؔبر دت بھی ہیں۔ انھوں نے اپنے مضمون بعنوان ’’زمانے سے خوں بہا وصول کرنے والا شاعر۔صاؔبر دت‘‘ میں ان کی شاعری کے تعلق سے اپنے تاثرات کا اظہار یوں کیا ہے:

’’صابر دت، شاعری میں نرم روئی، صباخرامی، سبک اندامی، خاک نوردی اور دل نشینی کے گر جان گیا ہے۔بعض بعض مقامات پر اس کا شعری ڈکشن لجلجا سا ہوجاتا ہے تب بھی سلوٹیں گداز پیدا کرلیتی ہیں۔اس نے زندگی کی ایسی تلخیاں بچپن سے جھیلی ہیں کہ شدید ردعمل کے طور پر بکھر بکھر کر سمٹ جانے اور ٹوٹ ٹوٹ کر سنبھلنے اور بہل جانے کے لیے اسے اپنا زادِ سفر اس طرح فراہم کرنا تھا کہ وہ زندگی سے قدم ملا سکے۔‘‘(۱۹)

اقبال متین نے اس مضمون میں ساؔحر لدھیانوی سے صاؔبر دت کی دوستی کا بھی ذکر کیا ہے۔صاؔبر دت جب معاشی بدحالی سے پریشان ہوکر بمبئی پہنچے تو ساؔحر لدھیانوی نے ان کی مدد کی۔اس مضمون میں اس کا بھی تذکرہ ملتا ہے۔صاؔبر دت کی زندگی کا ایک المناک واقعہ یہ ہے کہ جب تقسیم ہند کا خونیں سانحہ پیش آیا تو ان کا خاندان اُجڑ گیا اوران کی زندگی پے در پے حادثوں اورغموں کی نذر ہوتی چلی گئی۔ایسے موقع پر صاؔبر دت کو کسی کا سہارا بھی نہیں ملا۔ وہ زندگی بھر غموں سے اُبھر نہیں سکے۔غم کی یہ پرچھائیاں ان کی شاعری میں اس طرح نظر آتی ہیں کہ ان کی شخصیت ان کی شاعری میں دیکھی جاسکتی ہے۔ان کی شخصیت اورشاعری کے ان ہی پہلوؤں پر اقبال متین نے روشنی ڈالی ہے۔

اقبال متین نے اپنے شاعروادیب دوستوں کے علاوہ حیدرآباد کی مشہور ہستیوں پر بھی مضامین لکھے ہیں۔ڈاکٹر سید عبدالمنان، مولانا ابراہیم ہارون سیٹھ، زاہد علی خاں اور مولانا اعجاز فرخ حیدرآباد کے قابل ذکر اور معروف لوگوں میں ہیں۔ڈاکٹر سید عبدالمنان کا شمار حیدرآباد کے چوٹی کے ڈاکٹروں میں ہوتا تھا۔وہ شاہی کوٹھی میں اعلیٰ حضرت حضور نظام کے خاص فزیشین رہے تھے۔ان کے ہاتھ میں خدا نے بڑا اثر دیا تھا۔جو بھی مریض ان کے یہاں جاتا، معمولی پیسے اور معمولی دوائی میں شفایاب ہوکر آتا۔اتنے بڑے اور

باکمال ڈاکٹر ہونے کے باوجود وہ بے حد منکسر مزاج اور قلندر صفت انسان تھے۔ وہ زندگی بڑی سادگی سے گزارتے تھے۔ وہ خفیہ طور پر بہت سے غریبوں اور یتیموں کی کفالت کرتے تھے۔ وہ بڑے نرم دل اور انسانیت و دردمندی کے جذبہ سے پُر تھے۔ ان کی زبان بے حد شیریں تھی۔ ان کے بات کرنے کا سلیقہ مندمزاحیہ انداز دلوں کو موہ لیتا تھا۔ انھیں نام ونمود اور شہرت وناموری کی مطلق خواہش نہیں تھی۔ ان میں عام ڈاکٹروں جیسی صفت نہیں پائی جاتی تھی۔ انھوں نے طب کے پیشے کو کسبِ معاش کے لیے ضرور اختیار کیا تھا لیکن اسے انھوں نے حصولِ دولت کا ذریعہ کبھی نہیں بنایا بلکہ اس پیشہ کو انھوں نے خدمتِ خلق کے لیے وقف کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے شہر کے لوگوں کے دلوں میں گھر کر گئے اور ان کے چہیتے بن گئے تھے۔ پورا شہر ان کا دیوانہ ہو گیا تھا۔ بے شمار خوبیوں کی حامل ان کی شخصیت کو اقبال متین یوں بیان کرتے ہیں:

> ''منان بھائی کی شخصیت بھی بڑی چوکھا شخصیت ہے بلکہ وہ ایک مثمن ہیرا ہیں۔ ان کی شخصیت کا احاطہ کرنے کے لیے ان پر آٹھوں کھونٹ وار کرنے پڑیں گے۔ یہ مثمن ہیرا ہر نظر کو خیرہ کئے ہوئے ہے کیا اپنا کیا پرایا، سب کے سب گھائل بھی ہیں، قائل بھی ہیں... منان بڑے آدمی ہیں۔ ضروری نہیں کہ ہر بڑا آدمی اتنا ہی پیارا بھی ہو جتنے منان ہیں۔ ان کی شخصیت کی طرح داری، ان کے لہجے کی گھلاوٹ، ان کی بات چیت کی نرم نرم سپردگی۔ تکلم کی بے ساختگی میں مزاح کی چاشنی۔ جو بھی ان سے ملتا ہے انھیں کا ہو رہتا ہے۔ بھری محفل سے آدمی کو چرالیں گے اور اس سرقے میں سب سے زیادہ دخل ان کی انسان دوستی کو رہے گا جو ان کی فطرت ہے، ان کا مزاج ہے۔'' (۲۰)

ڈاکٹر سید عبدالمنان کی شخصیت بے حد فعّال تھی۔ وہ علمی و ادبی اور فلاحی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے تھے۔ وہ کئی اصلاحی وفلاحی اداروں کے سربراہ اور ادبی انجمنوں کے روح رواں تھے۔ وہ ادیبوں سے بڑی محبت سے پیش آتے تھے۔ ان کا ادبی ذوق بھی نکھرا ہوا تھا۔ دیکھئے اقبال متین ان کی فعال اور باکمال شخصیت کو چند لفظوں میں کیسے پیش کرتے ہیں:

> ''ہر ادبی انجمن ان کی زنبیل میں ہر اصلاحی اور فلاحی ادارے کے وہ کرتا دھرتا ہر امدادی یا خیراتی درس گاہ کے وہ ان داتا۔ ساری نیکیاں بس اسی ایک نام کے ساتھ منسوب سارا علم وہنر ان کا۔ ساری دانشوری اور باشعوری ان

کی۔ جب کوئی بت بن کر سامنے اس طرح کھڑا ہو جائے کہ ہر دیکھنے والے کی نظریں جھک جھک جائیں تو ہمارے لیے بھی پوجنے کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔'' (۲۱)

ڈاکٹر سید عبدالمنان جب مریضوں سے فیس لیتے تو ان کا انداز عام ڈاکٹروں سے مختلف ہوتا۔ دیکھئے اقبال متین ان کے فیس لینے کے انداز کا دلچسپ نقشہ کھینچتے ہوئے ان کے بارے میں کتنی پتے کی باتیں بتاتے ہیں:

''منان فیس اس طرح لیتے ہیں جیسے کسی معشوق کا خط لے رہے ہوں۔ گھبرائے گھبرائے، خجل خجل۔ بند مٹھی کا بھرم بند مٹھی سے رکھیں گے ڈرائر میں اس طرح فیس ڈال دیں گے کہ خود ان کی نظر بھی نہ پڑے۔ اردو شاعری معشوق کی بے اعتنائی سے بھری پڑی ہے۔ لیکن منان کے اکثر مریض ان سے اردو شاعری کا سا سلوک نہیں کرتے۔ بھلا ایسے پیارے آدمی کو کون شرمندہ کرے بس اسی حساب سے ڈاکٹر منان کے ڈرائر میں فیس پہنچتی ہے۔ سینکڑوں مریض شہر میں میری طرح سفاک ہیں اور اسی شہر میں اگر کوئی نجیب الطرفین کے ساتھ ساتھ اجتماع ضدین بھی پکارا جا سکے تو وہ میرے منان بھائی ہی ہیں۔ فیس لے کر اداس سے لگیں گے اور فیس نہ پا کر ایسے شاداں وفرحاں کہ چہرے کی کرنیں چھپائے نہیں چھپیں گی۔'' (۲۲)

اقبال متین نے ڈاکٹر سید عبدالمنان کی شخصیت پر لکھتے ہوئے ان کی منفرد خصوصیات، امتیازات وکمالات اور بلند اخلاقی اوصاف کو اس خوبی سے بیان کیا ہے کہ ان کی مسیحا صفت اور مثالی شخصیت جیتی جاگتی اور پُر اثر انداز میں سامنے آتی ہے اور قاری کے دل کو موہ لیتی ہے۔ مضمون کا اندازِ بیان رواں دواں اور طرزِ تحریر بڑا دلکش ہے۔

ڈاکٹر سید عبدالمنان کے علاوہ مولانا ابراہیم ہارون سیٹھ بھی حیدر آباد کے باوقار اور موثر لوگوں میں تھے۔ وہ اقبال متین کے قریبی رشتہ دار اور ان کے چاہنے والوں میں تھے۔ وہ بڑے دیانتدار تاجر، محنتی، متحمل مزاج اور اعتدال پسند انسان تھے۔ اقبال متین ان پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے ان کی شخصیت کے مذکورہ اوصاف پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:

''اپنی تجارتی دیانتداری کو ہمیشہ ملحوظ رکھا۔ اور استحصال سے ہمیشہ اجتناب کیا۔ اللہ نے آرام وآسائش کے دن دکھائے تب بھی ہارون سیٹھ نے وقت

کی نزاکتوں کو کبھی نظرانداز نہیں کیا۔اعتدال پسندی، تحمل، محنت اور محبت جیسا کہ میں نے دیکھا ہے ان کے مزاج کا ایسا وصف تھا کہ جو بھی ان سے ملتا ان کا گرویدہ ہو جاتا۔ پیشہ تجارت میں یہی ہنر ان کی کامیابی و کامرانی کا باعث ہوا۔‘‘(۲۳)

مولانا ابراہیم ہارون سیٹھ ایک عالم باعمل اور مردِ مجاہد تھے۔صبر و تحمّل ان کے مزاج کا وصف تھا۔ وہ محنت و مشقّت سے کبھی جی نہیں چراتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ دوسری جنگِ عظیم کے دوران جب ان کے کپڑے کا کاروبار ماند پڑ گیا تو انھوں نے ہمّت نہیں ہاری بلکہ مختلف دواؤں کی کمپنیوں کی ایجنسیاں حاصل کیں اور سائیکل پر دوائیں لے کر حیدرآباد سے سکندرآباد اور سکندرآباد سے حیدرآباد کا چکّر لگاتے رہے۔ان بُرے دنوں میں بھی انھوں نے اپنی شخصیت کے توازن کو برقرار رکھا اور حیدرآبادی وضع قطع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اقبال متین نے اپنی فنّی ہنرمندی سے ان کی شخصیت کا خاکہ اس طرح کھینچا ہے۔اقتباس ملاحظہ کیجیے:

’’منھ میں پان کی گلوری، شیروانی کے بٹن کھلے ہوئے اس وضع قلندرانہ میں بھی حیدرآبادی تہذیب کو رومی ٹوپی کی صورت میں سر پر اٹھائے رکھا اور سیکل پر حیدرآباد سے سکندرآباد اور سکندرآباد سے حیدرآباد چکر لگاتے رہے۔ اپنی محنت شاقہ سے اپنے برے دنوں کو زیر کیا۔ کسی کام سے عار نہیں کیا۔ وہی پندار، وہی توازن طبع جھک کر ملنا شعار تھا۔ دب کر ملنا آیا ہی نہیں۔ کیسے آتا بھلا، جو شخص مسند چھوڑ کر پیدل چل پڑے اور پھر پاؤں کی گرد جھاڑ کر مسند نشیں ہو جائے اس کے پاس کوئی اونچ نیچ نہیں رہتی۔‘‘(۲۴)

مولانا ابراہیم ہارون سیٹھ بڑے غیور و خوددار طبیعت کے مالک تھے۔ بڑے بڑے تاجروں سے مراسم ہونے کے باوجود انھوں نے کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ انھوں نے ہمیشہ خفیہ طور پر ضرورت مندوں کی مدد کرنے کو اپنا شیوہ بنائے رکھا۔انھوں نے حکومت کے سامنے مسلم اقلیتوں کے لیے بڑے خلوص سے آواز اُٹھائی اور ان کی نمائندگی کی۔ وہ تجارت پیشہ لوگوں میں بھی بے حد مقبول تھے۔اسی مقبولیت کی بنا پر انھیں ایک مرتبہ حیدرآباد ٹریڈ ایسوسی ایشن کا جنرل سکریٹری بنایا گیا۔ان کی شخصیت خلوص ومحبّت کا پیکر اور ایسے بلند اخلاقی اوصاف کی حامل تھی جس سے اقبال متین اور دوسرے بہت سے لوگ

بے حد متاثر تھے۔ ایسی ہی موثر شخصیت روزنامہ سیاست کے مدیر زاہد علی خاں کی تھی۔ وہ روزنامہ سیاست کے بانی عابد علی خاں کے بیٹے تھے۔ انھوں نے اپنے اخبار کے ذریعے اقلیتوں کے ساتھ ہوئے مظالم، ناانصافیوں اور استحصال کے خلاف نہ صرف آواز اُٹھائی بلکہ اس کے سدِّ باب کے لیے بھی کوششیں کیں۔ اس کی بنا پر وہ مظلوم و مجبور لوگوں کے مسیحا کے روپ میں سامنے آئے اور ان کے دلوں کی دھڑکن بن گئے۔ انھوں نے آندھرا پردیش اردو اکیڈمی کی بدعنوانیوں اور سازشوں کو بھی بے نقاب کیا۔ اس کی وجہ سے وہ باضمیر اور بااصول ادیبوں اور شاعروں کی نظروں میں محبوب و مقبول بن گئے۔ انھوں نے اپنی صحافتی وادارتی ذمّہ داریوں کو بے باکی سے انجام دے کر اور فرض شناسی اور دیانت داری کا مظاہرہ کر کے ایک موقر صحافی اور محترم مدیر ہونے کا ثبوت پیش کیا۔ ان کی شخصیت کے ان پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے اقبال متین نے ان کی وضع دار، فرض شناس، اصول پسند، اور ایماندار طبیعت کی حامل شخصیت کو پیش کیا ہے۔ ایسی ہی نیک طبیعت کے مالک ان کے بھائی علامہ اعجاز فرخ تھے۔ ان کا شمار حیدرآباد کی مشہور علمی ہستیوں میں ہوتا ہے۔ تحریر و تقریر میں انھیں غیر معمولی مہارت حاصل تھی۔ وہ جتنا اچھا بولتے تھے اتنا اچھا لکھتے بھی تھے۔ ان کی طنزیہ و مزاحیہ تحریروں میں بیان کی خوبی اور طرزِ تحریر کی دلکشی کے باعث جادو کا اثر تھا جو دلوں کو چھوتا تھا۔ انھوں نے اپنی تحریروں سے سماج کی بدعنوانیوں اور بُرائیوں کو بے نقاب کیا، ظلم و ناانصافی کے خلاف آواز اُٹھائی اور حق گوئی کا کام لیا۔ وہ طنز و مزاح نگار ہونے کے علاوہ، بے حد فعّال انسان تھے۔ جب وہ آندھرا پردیش اردو اکیڈمی کے انتظامیہ سے متعلق ہوئے تو انھوں نے اپنی جدّ و جہد، لگن اور دیانت داری سے ایسا صاف ستھرا اور شفاف نظم و نسق قائم کیا کہ اس کی مثال اس سے پہلے کبھی دیکھنے کو نہیں ملی۔ ان کی کوششوں سے حیدرآباد کے اردو ادیبوں اور شاعروں کو وقت پر ایوارڈ ملا اور اکیڈمی خاصی فعّال ہوگئی۔ ان کی شخصیت پر اپنے تاثرات قلمبند کرتے ہوئے اقبال متین نے نظم و نسق کے سلسلہ میں ان کی غیر معمولی مہارت، دیانت داری، حق گوئی و بے باکی اور ان کے علمی کارناموں پر اس منفرد انداز میں روشنی ڈالی ہے کہ ان کی شخصیت اپنی منفرد خصوصیات کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔

اقبال متین نے اپنے ہم عصروں کے علاوہ سروجنی نائیڈو اور خواجہ الطاف حسین حالؔی کی شخصیت پر بھی مضامین لکھے ہیں۔ ان دونوں شخصیتوں سے انھیں بڑی محبت و عقیدت رہی ہے۔ سروجنی نائیڈو کا ان

کے گھر آنا جانا تھا۔ ان کے تایا بیرسٹر اکبر علی خاں کے گھرانے سے سروجنی نائیڈو کے اس درجہ مشفقانہ تعلقات تھے کہ اکبر علی خاں انھیں ماں کہتے تھے۔ اقبال متین اپنی امی کی زبانی سروجنی نائیڈو کی جوانی کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں:

> ''امی کہتی تھیں کہ سروجنی دیوی کا رنگ کم تھا لیکن چہرے پر ایسی موہنی، نمک اور ملاحت تھی کہ نواب خاندان کی گوری چٹی بیگمات انھیں اپنی نظروں میں چوری چوری بھر لیتیں۔ امی عمر میں سروجنی دیوی سے بہت چھوٹی تھیں لیکن ان کی جوانی کی قسم کھاتی تھیں۔'' (۲۵)

سروجنی نائیڈو بڑی خوبیوں کی مالک تھیں۔ ان کی خوبیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے اقبال متین رقم طراز ہیں:

> ''سروجنی نائیڈو بڑی نرمی سے، بڑے پیار سے ہر ایک کے ساتھ پیش آتیں۔ صاف صاف دوٹوک باتیں کرتیں، غلط بحث کا شکار نہ خود ہوتیں اور نہ کسی کو ہونے دیتیں۔'' (۲۶)

سروجنی نائیڈو بچپن سے آزادی فکر و نظر کی حامی تھیں۔ وہ ایک عظیم سیاستداں، جمہوریت کی علم بردار اور سیکولر قدروں کی پاسدار تھیں۔ وہ ذات پات، اونچ نیچ کی سخت مخالف تھیں اور انسانیت پر یقین رکھتی تھیں۔ وہ ہر مذہب اور ہر ذات کا دل سے احترام کرتی تھیں۔ ان پہلوؤں پر روشنی ڈال کر اقبال متین نے سروجنی نائیڈو کی جمہوریت پسند اور سیکولر مزاج طبیعت اور ان کی انسان دوست اور وسیع المشرب شخصیت کی جھلک دکھائی ہے۔ سروجنی نائیڈو کے علاوہ خواجہ الطاف حسین حآلی سے بھی اقبال متین کو بڑی عقیدت رہی ہے۔ ان کی شخصیت پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے اقبال متین نے ان کے بچپن کی زندگی اور پانی پت سے دہلی تک ان کے علمی سفر کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے کہ پورا منظر نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ دیکھئے اقبال متین نے مصائب و آلام سے پُر ان کے بچپن اور ان کے سفرِ دہلی کی عکاسی کس طرح کی ہے:

> ''ایک ۱۸ سال کا نوعمر لڑکا جس کے سر سے باپ کا سایہ بچپن میں اٹھ گیا تھا اور ماں فاطر العقل تھیں۔ گھربار یہاں تک کہ اپنی دلہن کو چھوڑ کر پاپیادہ پانی پت سے دلی کے لیے نکل پڑا۔ سینے میں قرآن، تلاوت میں خوش الحان،

زادراہ کے طور پر نہ بوریا نہ بستر، نہ گٹھری نہ سامان، بس میں کچھ بھی نہیں۔
اللہ نگہبان اور یہی جزو ایمان۔ اس طرح اپنا سب کچھ تج کر کوئی جاتا ہے؟
اور پھر لالچ کیا تھی۔ نہ عیش و عشرت راہ تکتے تھی نہ چاہنے والوں کی رفاقت کا
تصور۔ ساتھ کچھ تھا تو عسرت تھی اور لوہے کے چنے چبانے کا عزم صمیم۔ نہ
سامنے کوئی نقش پا کہ راستہ سجھائے۔ بڑے بھائی کی محبت انھیں کو سونپ
دی۔ نہ التفات گوارہ نہ انبساط کی ہوس، تالو میں بیٹھا کوئی چلاتا تھا، تم کچھ ہو
تمہیں کچھ ہونا ہے۔'' (۲۷)

اقبال متین نے خواجہ الطاف حسین حالؔی کے بچپن کی عکاسی کرتے ہوئے ان کی علمی لگن اور جد وجہد کی روداد بیان کی ہے اور ان کے ان منفرد اوصاف کو نمایاں کیا ہے جو ان کی عظمتوں کے ضامن بنے۔ یہاں اقبال متین نے حالؔی کی عظیم شخصیت کا مکمل احاطہ تو نہیں کیا ہے مگر ان کی شخصیت عظیم کیسے بنی، اس پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی عظمتوں کی طرف ہلکا اشارہ ضرور کیا ہے۔ حالؔی کی شخصیت پر یہ مختصر خاکہ نما مضمون بہت زیادہ موثر تو نہیں ہے مگر دلچسپی سے خالی بھی نہیں ہے۔

اقبال متین نے مذکورہ شخصی مضامین کے علاوہ خاکے بھی لکھے ہیں۔ ان کی کتاب ''سوندھی مٹی کے بُت'' میں جن شخصیتوں کے خاکے ملتے ہیں ان میں تمکینؔ سرمست، پروفیسر یوسف سرمست، لطیف ساجدؔ، راشد آزرؔ، ڈاکٹر غیاث صدیقی، ابراہیم شفیق اور مولانا سید فخر الدین ہیں۔ تمکینؔ سرمست اقبال متین کے چچا تھے۔ وہ ممتاز عالم و فاضل اور قادر الکلام شاعر تھے۔ ان کی نظمیں تواتر سے نگار میں چھپتی تھیں۔ انھیں اپنے خاندان سے لے کر ادبی حلقوں تک میں بے پناہ مقبولیت حاصل تھی۔ وہ بڑے صابر و شاکر، قناعت پسند، رحمدل اور دوسروں کے ہمدرد و خیر خواہ اور صوفی مزاج انسان تھے۔ ان کا دل انسانیت و محبت سے لبریز تھا۔ وہ بے حد خوددار، وضع دار اور خلیق و ملنسار تھے۔ ان کے خاکے میں اقبال متین نے ان تمام پہلوؤں پر اس دلچسپ انداز میں روشنی ڈالی ہے کہ ان کی عالمانہ، شاعرانہ، پُر خلوص اور بے لوث شخصیت پُر اثر انداز میں سامنے آتی ہے۔ دیکھئے اقبال متین نے ان کی محبوب، پُر خلوص اور بے لوث شخصیت کی مرقع کشی کس دلکش انداز میں کی ہے۔ اقتباس ملاحظہ کیجئے:

''سوچتا ہوں ان کا چہرہ کبھی میرے ذہن میں اس طرح بھی آئے کہ وہ خفا
ہیں برہم ہیں ہائے ہائے اس شخص نے کبھی کسی پر غصہ ہی کیا ہوتا کہ ہم کو اپنی

بیزارگی کا جواز ملتا۔شاید آج کا دور محبت کے لیے ساز گار ہی نہیں ہے۔لیکن
چچا صاحب اس دور میں بھی سراپا محبت تھے۔محبت ہی محبت ۔ سچ کہتا ہوں،
بلا مبالغہ محبت میں اندھے۔ بالکل اندھے اور اس اندھے نے شروع ہی
سے اپنے کو دنیا کی غیبتوں سے بلند و برتر رکھا...کہیں کچھ سنا تو اس طرح سنا
جیسے کان نہ تھے۔محفل سے اٹھا تو محبتیں بٹور لیں۔رنجشیں اس طرح چھوڑ
دیں جیسے ان کا کوئی واسطہ ہی نہیں اور اب تو صرف آنکھیں رہ گئی تھیں۔...
وہ آنکھیں جن کی ایک نظر سے دوشیزاؤں کے ماتھے عرق عرق ہو جاتے تھے
وہ آنکھیں جو کتابوں سے علم وبصیرت چن کر اس طرح ذہن کا حصہ بنا لیتیں
کہ جیسے ورق ورق سادہ ہو گیا ہو....محبت میں اندھی یہ آنکھیں، سدا کی
اندھی رہیں۔جن کو چاہا، ٹوٹ کر چاہا۔اپنا آپ بھلا کر چاہا سود دیکھا نہیں۔
سود و زیاں میں بس زیاں ہی زیاں سے دل بہلائے رکھا۔محبت کا یہ اندھا
کھلاڑی بھی عجب عجب کھیل، کھیل گیا ہے۔''(۲۸)

تمکین سرمست میں جو خوبیاں پائی جاتی تھیں، تقریباً ان میں سے بیشتر اوصاف ان کے چہیتے بیٹے پروفیسر یوسف سرمست میں موجود تھے۔وہ اردو دنیا میں ایک معتبر ادیب کی حیثیت سے مشہور و معروف ہوئے اور ان کی غیر معمولی تحقیقی و تنقیدی نوعیت کی کتاب ''بیسویں صدی میں اُردو ناول'' کو سند کا درجہ حاصل ہوا۔ان کے خاکے میں اقبال متین نے ان کی شخصیت کی نشو ونما، ان کی محنت ولگن، فطری شرافت اور ان کی ادبی حیثیت پر بڑے دلچسپ انداز میں روشنی ڈالی ہے۔انھوں نے ان کے بچپن کی زندگی کا نقشہ یوں کھینچا ہے۔

''نہ کسی سے لڑنا جھگڑنا نہ کسی بات پر ضد کرنا۔زندگی کی ہر صعوبت سے اس
طرح سمجھوتہ کر لینا جیسے کوئی خوشی مل گئی ہو۔خواہشوں کا سلسلہ بس اتنا کہ ختم
تو کیا ہوتا جب کہ شروع ہی نہ ہوتا تھا۔چھوٹے تھے تو برف کے لڈو پر نہیں
جھپٹے۔ذرا اور سیانے ہوئے تو نہ گیند اچھالا نہ بلا گھمایا۔اسکول میں داخل
کرائے گئے تو کتابوں ہی کو اوڑھنا بچھونا سب کچھ سمجھ لیا۔پرائمری اسکول
سے مڈل اسکول تک بھیا صاحب کا صوفیانہ لڑکپن وہی ترکِ تمنا کی منزلیں
طے کرتا رہا۔''(۲۹)

یوسف سرمست خود فراموش طبیعت کے مالک تھے۔وہ اکثر باتیں کرتے، چلتے پھرتے کھو جاتے

تھے۔ان کی خودفراموشی کو اقبال متین ایک واقعہ کی مدد سے یوں بیان کرتے ہیں۔اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> ''ایک دن یوں بھی ہوا کہ بھیا صاحب اپنی شریک زندگی شہناز کے ہمراہ صنعتی نمائش دیکھنے چلے۔ بچہ بھی انگلی پکڑے ساتھ تھا۔ نمائش گاہ میں گھومتے پھرتے بھیا صاحب نے اپنے بچے سالٹو کو گود میں اٹھالیا۔ کچھ دیر بعد وہ اچھے خاصے چلتے پھرتے حواس باختہ پکار اٹھے۔عرفان کہاں ہے... شہناز نے بھی پریشان ہوکر بھیڑ میں آگے پیچھے دیکھا.... بھیا صاحب رُوہانسے سے ڈھونڈھ رہے تھے۔ جب شہناز کی نظر پڑی تو انھوں نے فرطِ مسرت سے قریب قریب چلاکر کہا۔ ''آپ کی گود ہی میں تو ہے'' بھیا صاحب نے اضطراری طور پر بچے کو چھوکر دیکھا اور چمٹالیا۔''(۳۰)

یوسف سرمست بے حد شریف، خلیق اور محنتی انسان تھے۔صبر وضبط اور تحمل ان کے مزاج کا نمایاں وصف تھا۔ وہ کبھی بیکار نہیں بیٹھتے بلکہ زیادہ تر وقت وہ مطالعہ میں منہمک رہتے۔انھوں نے بچپن سے دنیا و مافیھا سے بے نیاز ہوکر اپنے آپ کو علمی وادبی کاموں کے لیے وقف کردیا تھا۔ان کی شخصیت کے ان پہلوؤں کو اقبال متین نے اس خوبی سے بیان کیا ہے کہ محنت ولگن سے پُر یوسف سرمست کی زندگی اور ان کی غیر معمولی ادبی شخصیت کا جیتا جاگتا نقشہ نگاہوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔

اقبال متین نے اپنے دوستوں کے بھی خاکے لکھے ہیں۔لطیفؔ ساجد ان کے جگری وجانی دوست تھے۔دونوں سٹی کالج حیدرآباد میں پڑھتے تھے۔دونوں کا ایک دوسرے کے گھر آنا جانا تھا۔دونوں کے درمیان چھیڑ چھاڑ اور شوخیاں بھی ہوتی تھیں۔لطیفؔ ساجد بے حد نازک مزاج اور زود رنج تھے۔اس کی وجہ سے وہ زندگی بھر معاشی پریشانیوں اور ذہنی وجسمانی اذیتوں میں مبتلا رہے۔ وہ کثرت سے مئے نوشی کرتے تھے۔انھیں آوارگی بھی بہت پسند تھی۔آوارہ مزاج ہونے کے باوجود وہ اپنے دوست، احباب، ملنے جلنے والوں اور ان کے خاندان والوں سے بڑے خلوص ومحبت اور سلیقہ سے پیش آتے تھے۔ان کے خاکے میں اقبال متین نے ان تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور ان کی پُرخلوص اور محبت کرنے والی شخصیت کی جھلک دکھائی ہے۔لطیفؔ ساجد کے علاوہ راشد آزرؔ سے بھی اقبال متین کی بے تکلّف دوستی تھی۔ان کے خاکے میں انھوں نے ان کی منفرد شخصیت کا تعارف یوں کرایا ہے:

> ''اقلیم سخن کا ایک سفید بھک شہزادہ اپنے احباب میں راشد آزر اور خاندان

میں راشد علی خاں کے نام سے جانا پہچانا بھی جاتا ہے، چاہا بھی جاتا ہے۔
مارکسزم اور ارسٹوکریسی (Aristocracy) میں سمجھوتہ ناممکن ہو یا نہ ہو،
راشدآزر نے اس کو ممکن کر کے دکھا دیا ہے۔ وہ لڑکا جس نے بچپن میں فرش
کے نیچے پیر میلے نہیں کئے۔ ہوش سنبھالا تو زندگی کی گندگیوں کو دور کرنے کا
سودا اس کے سر میں سما گیا تھا۔''(۳۱)

راشدآزر بااصول، وضع دار، بردبار اور رکھ رکھاؤ والے انسان تھے۔ وہ سلیقہ مند اور نفاست پسند بھی تھے۔
ان کی نفاست پسندی اور ان کے احساس جمال کو اقبال متین اپنے لفظوں میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

''وہ نفاست جو نفس مطمئن کو حسن دوام بخشتی ہے۔ راشد کی شخصیت کا ایک جز
ہے۔ اس کا بانکپن اس کے صاف ستھرے کردار کا عکس لگتا ہے وہ شاہزادوں
کی طرح مثالی زندگی گزارتا ہے۔ اس کا احساس جمال قدم قدم پر دامن دل
کھینچتا ہے۔
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست ''(۳۲)

راشدآزر ایک اہم فنکار اور بہت سی خوبیوں کے مالک ہونے کے ساتھ، سیماب صفت بھی تھے۔
ان کی سیماب صفت شخصیت کا خاکہ اقبال متین نے اس طرح کھینچا ہے۔ اقتباس ملاحظہ کیجئے:

''راشد جب بحث شروع کرتا ہے تو دو ہی باتیں اس کے سامنے ہوتی ہیں۔
یا قائل ہو جائے یا اپنے مخالف کا پڑا کر کے رکھ دے۔ اہل مجلس اہل محبس
ہو جائے اور اہل خانہ، اہل عزا خانہ، اسے کوئی فکر نہیں رہتی۔ وہ خلط مبحث کا
شکار نہ ہوگا۔ لیکن دلائل و براہین کی تلاش میں اپنا وجود معنوی بھی کھو بیٹھے گا۔
......راشد کی پاک باطنی کا میں معترف ہوں۔ دل میں جو ہوگا، زبان پر بھی
وہی ہوگا۔ دکھ وہ پہونچائے گا نہیں۔ کسی اور سے دکھ پہنچے تو وہ برداشت بھی
کم ہی کرے گا۔''(۳۳)

اقبال متین نے اپنے لفظوں میں راشدآزر کی خوبیوں اور خامیوں کی تصویر کشی اس فنکاری سے کی ہے کہ ان کی شخصیت اپنی تمام منفرد خصوصیات و اوصاف کے ساتھ قاری کی نگاہوں کے سامنے موثر انداز میں جلوہ گر ہوتی ہے۔

ڈاکٹر غیاث صدیقی بھی اقبال متین کے بے تکلّف دوستوں میں تھے۔ وہ ایک معتبر ڈاکٹر، منفرد شاعر اور دوست نواز انسان تھے۔ ان کے خاکے میں اقبال متین نے ان کی شخصیت کے مذکورہ تینوں

پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کی شاعرانہ حیثیت پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے اقبال متین نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

''غیاثؔ کو شاعر کی حیثیت سے میں نے بہت دنوں بعد آہستہ آہستہ تسلیم کیا کہ بڑی رچی ہوئی اور وقیع غزلیں کہتے ہیں۔ شعر کے مزاج میں ''گداختگی اور ربودگی'' سے زیادہ طنطنہ اور شوکت لفظی ملے لیکن اس کے باوجود بھی کلاسیکل رمزیت ان کے لہجے کی پہچان رہی..... البتہ انھوں نے اپنے فن کے تعلق سے کبھی بھی وہ رویہ اختیار نہیں کیا تھا جس کا طرز تشہیر آج کل عام ہو گیا ہے کہ دوسروں کے کان پر منھ رکھ کر اپنی ہی تعریف وتوصیف میں گلا پھاڑ پھاڑ کر چلاؤ۔ بلکہ وہ تو شاعری کو ثانوی حیثیت دیتے رہے دوستی کو اولیت۔ ڈاکٹری کو کون سی حیثیت دی اس کا نہ مجھے علم ہے نہ خود ان کو۔'' (۳۴)

ڈاکٹر غیاث صدیقی وضع دار اور رکھ رکھاؤ کے مالک تھے۔ انھیں دوستوں سے گھل کر ملنا، انھیں خوش رکھنا اور انھیں کھلانا پلانا بہت پسند تھا۔ اس کے علاوہ بھی ان میں کئی طرح کی خوبیاں پائی جاتی تھیں۔ ان کی دوست نوازاور خوبیوں کی حامل شخصیت کو اقبال متین نے اپنے منفرد پیرائے میں اس طرح بیان کیا ہے:

''غیاثؔ بڑے دوست نواز بلکہ دل نواز آدمی ہیں۔ کھلا پلا کر اتنا ہی خوش ہوتے ہیں جیسے کھا پی کر خوش ہوتے ہیں۔ لیکن اس میں ایک ذرا سا نکتہ ہے۔ پلا کھلا کر خوش ہونا اور پی کھا کر خوش ہونا انھیں نہیں آتا۔ ہم جیسے آوارہ منش لوگوں کے لیے غیاث کی یہی طرحداری اور یہی رکھ رکھاؤ عذاب ہے۔ آدمی کو اتنا بھی اچھا نہیں ہونا چاہئے کہ ہر سماجی اور مذہبی اچھائی اس کے حصے میں آجائے اس لیے ان کی کچھ برائیاں بھی ٹٹولوں کہ کہیں تو انھیں انتقاماً ہی سہی برا بھی ٹھہرا سکوں۔'' (۳۵)

غیاثؔ صدیقی کے اس خاکے میں اقبال متین نے ان کی ذاتی زندگی کے احوال اور دوسرے واقعات بیان کر کے ان کی شخصیت کے منفرد پہلوؤں کو اس طرح اُجاگر کیا ہے کہ شخصیت کے پورے خدوخال نمایاں ہو جاتے ہیں اور اس کا خارجی وداخلی دونوں روپ نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔

اقبال متین نے اپنے دوستوں کے علاوہ شخصیتوں کو بھی اپنے خاکے کا موضوع بنایا ہے۔ ابراہیم شفیق ان کے دوست نہیں تھے مگر علمی وادبی اعتبار سے ان کی شخصیت اہمّیت کی حامل تھی۔ ان کے خاکے میں

اقبال متین نے ان کی موت کی خبر پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے ان کے جنازے کی منظر کشی کی ہے۔ان کے جنازے میں شہر کے کچھ لوگ اور ان کے چند دوست احباب شریک ہوئے تھے۔ان کی موت کی خبر بھی اخباروں میں معمولی طریقے سے چھاپی گئی تھی۔حالاں کہ وہ حیدرآباد کے اہل علم خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور منفرد و ممتاز نثر نگار تھے۔ وہ بڑی بے لوث شخصیت کے مالک تھے۔ وہ اپنے شاعر و ادیب دوستوں کو بے حد چاہتے تھے لیکن ان کے دوستوں نے انھیں اپنی محبتوں سے محروم رکھا۔اس محرومی کا نقشہ کھینچتے ہوئے اقبال متین نے ان کے امتیازات و کمالات پر روشنی ڈالی ہے اور ان کی باکمال شخصیت کی ہلکی جھلک دکھائی ہے۔ یہ خاکہ بہت زیادہ موثر نہیں ہے کیوں کہ اس میں شخصیت کی مرقع کشی اس طرح نہیں کی گئی ہے کہ اس کی تصویر نگاہوں کے سامنے گھوم جائے۔ بلکہ شخصیت کو یہاں سرسری انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

اقبال متین نے اپنے ایک برادر نسبتی مولانا سید فخر الدین کی شخصیت پر بھی خاکہ لکھا ہے۔ وہ ان کی چچازاد بہن اختر سلطانہ کے شوہر تھے۔ وہ متضاد شخصیت کے مالک تھے۔ان کی متضاد شخصیت کے بارے میں اقبال متین لکھتے ہیں:

> ''تضادات کو یکجا جمع کر کے کسی خاکی پتلے میں جان ڈال سکیں تو فخر میاں سامنے کھڑے ملیں گے۔ ہمدرد اتنے کہ دوست احباب کے برے وقت کو اپنے برے وقت سے زیادہ سمجھیں گے۔دن دیکھیں نہ رات اس کے لیے وہ سب کچھ کریں جو وہ کر سکتے ہیں۔لیکن ان کا مشورہ ایسے میں بے چوں و چرا تسلیم کر لینا ضروری ہوتا ہے۔ میں نے اپنے خاندان میں ایسے ''بعض'' اوصاف والا شخص نہیں دیکھا جو میاں فخر کے لیے مختص ہو گئے تھے۔ برائیوں کو نیکی کا روپ دے دینا۔ پھر نیکی کے بطن سے برائیاں پیدا کر کے کرشمہ دکھانا فخر میاں کے بائیں ہاتھ کا داؤ تھا۔'' (۳۶)

مولانا سید فخر الدین بچپن میں بڑے منکسر مزاج، فرماں بردار اور عالی ظرف تھے۔ان ہی اوصاف کے باعث وہ اقبال متین اور ان کے خاندان والوں کے دلوں میں گھر کر گئے تھے لیکن جوانی میں جب وہ جدّہ سے معاشی طور پر خوش حال ہو کر لوٹے تو وہ ایسے مغرور و متکبّر ہوئے کہ اپنے آپ کو اپنے دوست احباب، خاندان اور ملنے جلنے والوں سبھوں سے برتر سمجھنے لگے۔اب وہ ایک رعونت پسند شخص میں تبدیل

ہو گئے۔ اب وہ اپنی بڑائی خود بیان کرتے اور دوسروں کی دل شکنی سے بھی باز نہیں آتے۔ اب ان کی شخصیت خودساختہ فضیلت و برتری کا شکار ہو گئی تھی۔ ان کی شخصیت کا یہ روپ اقبال متین کی زبان میں ملاحظہ کیجیے:

> ''فخر نے کچھ عرصے سے اپنا یہ شعار بنا رکھا تھا کہ زبان کو ایسا ہتھیار بنا کر استعمال کرے جس سے اگر دوسروں کی دل شکنی ہو تو ہو لیکن اس کی اپنی فوقیت کا کوئی پہلو نکلے۔ اس نے اپنے اس ہتھیار سے کئی مواقع پر خود مجھے مجروح کیا تھا۔ وہ اپنے اور اپنے بچوں اور اپنے اجداد کے سوا کسی کو اہمیت دینا تو دور رہا لائق اعتنا بھی نہیں سمجھتا تھا۔ اس فوقیت کا اور چھور کیا تھا۔ کس کنارے سے یہ شروع ہوتی تھی اور کس کنارے پر اس کا انت تھا اس کا علم سوائے اس کے کسی کو نہ تھا۔ اللہ میاں کو بھی نہیں۔ بس ایک خودساختہ فضیلت تھی جس کو وہ اپنے خاندان میں تبرک کی طرح تقسیم کرتا پھرتا۔'' (۳۷)

مولانا سید فخرالدین معمولی پڑھے لکھے تھے لیکن وہ اپنے آپ کو سب سے بڑا عالم و فاضل کہلانا پسند کرتے اور اپنی خودساختہ علمی فضیلت و برتری کا بھرم رکھنے کے لیے دنیا کے ہر موضوع پر گفتگو کرنا اپنا پیدائشی حق سمجھتے تھے۔ وہ علمی و ادبی محفلوں میں اپنی جھوٹی ہمہ دانی کا مظاہرہ کرنے سے کبھی نہیں چوکتے اور گفتگو اس انداز میں کرتے کہ دوست احباب کی حقارت کا پہلو نکل آتا۔ وہ اپنی غلط بات کو بھی صحیح ثابت کرنے پر تل جاتے اور اس کے لیے قرآن و حدیث کی غلط تشریح بھی کرتے اور اپنے عمل قبیح کو شرع بنا کر پیش کرتے۔ وہ اپنی ہر بات کو حرفِ آخر سمجھتے تھے۔ ان کے ان رویوں سے سارے لوگ دل برداشتہ تھے۔ دل شکنی اور دلآزاری ان کا شیوہ بن گیا تھا۔ ان کے خاکے میں اقبال متین نے ان تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی خود پسند طبیعت اور متکبر و رعونت پسند شخصیت کو اس طرح پیش کیا ہے کہ قاری کو اس سے نفرت ہونے لگتی ہے۔ یہ خاکہ خاصا طویل ہے۔ غیر ضروری واقعات کی شمولیت سے اس میں بوجھل پن کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے اور دلچسپی کا عنصر ماند پڑ گیا ہے۔ یہ اس کتاب ''سوندھی مٹی کے بت'' کا آخری خاکہ ہے۔ ان کی خاکہ نگاری پر غلام جیلانی نے اپنی رائے کا اظہار یوں کیا ہے۔ وہ رقم طراز ہیں:

> ''اردو کے صف اول کے افسانہ نگار اور شاعر اقبال متین نے جن شخصیتوں پر خاکے لکھے ہیں، ان کے ساتھ گذارے ہوئے یادگار لمحات اور تجربات کی بوقلمونی کو اپنی تحریر کے برش میں سمو کر صفحہ قرطاس پر ایسی پیکر تراشی کی ہے کہ یہ

فسوں ساز ہستیاں اپنے انفرادی خدوخال، وضع قطع اور طبع وعادات کے ساتھ نظروں کے سامنے آ کھڑی ہوتی ہیں اور پھر جگ بیتی میں آپ بیتی کے امتزاج کی فن کاری ملتی ہے۔ ہم مصنف کے ساتھ ان سے پیار بھی کرتے ہیں۔ ان سے خفا بھی ہوتے ہیں۔ اور ان کے فسوں سے متاثر بھی ہوتے ہیں۔.... بھیا صاحب ہوں، یا راشد آزر، ڈاکٹر منان ہو یا حسن چشتی، یہ خاکے پڑھنے والوں کے دلوں میں ان کی چاہت کو اور بڑھا دیتے ہیں جو لوگ ان سے نہیں ملے ہیں، ان سے ملنے کے لیے بے قرار ہو جائیں گے۔'' (۳۸)

انور خان نے اقبال متین کے خاکوں کے مجموعہ 'سوندھی مٹی کے بت' پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اقبال متین ایک اچھے افسانہ نگار ہیں۔ ''سوندھی مٹی کے بت'' میں انھوں نے اپنے ہم عصر ادیبوں شاعروں کی شخصیت پر لکھا ہے۔ مخدوم کا نام تو حیدر آباد سے ایسے جڑ گیا ہے کہ ایک کا ذکر ہو تو دوسرا خود بخود ذہن میں آتا ہے۔ شاذ تمکنت، سلیمان اریب، یوسف سرمست، راشد آزر، ابراہیم شفیق حیدر آباد کے معروف ادیب ہیں۔ اقبال متین نے ان کے ساتھ جو شب و روز گزارے ان پر یہ ایک اچھی کتاب ہے۔ کتاب کا بنیادی وصف یادنگاری ہے۔ اس کتاب میں نہ تو خود کو ایک اہم شخصیت ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے نہ جن شخصیتوں پر لکھا گیا ہے ان کا قد بلند کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ بلکہ خاکے پڑھنے کے بعد یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ شخصیتیں واقعی بڑی سوندھی مٹی کی بنی ہوئی تھیں جن کی خوشبو ان صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اور ان کی یادوں سے ہمارے ادب کا گلزار آج بھی مہک رہا ہے ..... ادبی شخصیتوں کے علاوہ اور شخصیتوں سے بھی ہماری ملاقات ہوتی ہے۔ اقبال متین کے خاکوں کی خوبی یہ ہے کہ یہ تمام شخصیتیں انسانی خوبیوں اور کمزوریوں کے ساتھ ہمارے سامنے آتی ہیں جیسے سب ہی انسان ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ ہمیں اور عزیز ہو جاتے ہیں۔'' (۳۹)

قاضی سلیم 'سوندھی مٹی کے بت' پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''واہ واہ کیا کتاب ہے، کیا انداز بیان ہے! کیا نثر ہے، مزا آ گیا! ... اس کتاب کی بنیادی خوبی ہے کہ پڑھنے والا آپ کے ہاتھوں بے بس ہو کر رہ جاتا ہے۔ ایک کے بعد دوسرا، دوسرے کے بعد تیسرا انشائیہ پڑھنے پر مجبور، یہاں تک کہ کتاب ختم ہونے تک وہ کسی اور کام کے قابل ہی نہیں رہتا۔... پڑھنے والے کو اپنے ساتھ لگالانے کا فن آپ جانتے ہیں کہ ہم جب آپ

کے ساتھ چل نکلتے ہیں، آپ کے موضوع سخن سے بھی کم ہی سروکار رہ جاتا ہے۔ وہ مخدوم ہوں اریب یا عبدالمنان سب آپ کے تخلیق کردہ کردار لگتے ہیں۔ ... جہاں تک انداز بیان کا تعلق ہے، وہ آپ کی ذہنی رو کا تابع ہے۔ آپ آگے آگے چلتے ہیں، الفاظ آپ کے نقش بناتے چلتے ہیں۔ اچھی نثر لکھنے کی صلاحیت کم ہی لوگوں کو میسر آتی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ خدا کی دین ہے یا اکتساب سے حاصل کی جاسکتی ہے۔.... آپ کی تحریر کی ایک اور خصوصیت کا ذکر یہاں ضروری ہے۔ اللہ میاں نے آپ میں ایک حیرت انگیز صلاحیت ودیعت کی ہے کہ راہ چلتے کسی کردار کے اندر گھس کر اپنی دھڑکنوں کو اس کے سینے کے بھتے سے جوڑ لیں جیسے ڈاکٹر لوگ سانس کی مشین کو کسی کوما میں جانے والے انسان سے جوڑ دیتے ہیں۔ یہ ایک پختہ مشق کہانی کار ہی کرسکتا ہے، اس لیے کہ اسے مرے ہوؤں کو بھی کہانی کے ایک موڑ تک زندہ رکھنا ہوتا ہے۔ آپ جس حقیقی یا تخلیقی کردار کی تصویر کشی کرتے ہیں، دس پانچ آڑی ترچھی لکیروں ہی میں وہ شباہت دینے لگتا ہے۔ آپ کے چند جملے کسی شخص کے اندر باہر کی ساری سچائیوں کو کھنگال کر رکھ دیتے ہیں۔.... آپ نے مختلف اور متضاد شخصیتوں کے خاکے کچھ اس دردمندی سے ترتیب دیئے ہیں کہ اچھائیاں کچھ اور روشن ہوجاتی ہیں اور نفسیاتی جواز دے کر بُرائیوں کو بھی قابل قبول بنادیا ہے۔..... ان میں سب سے اچھے خاکے سلیمان اریب اور ڈاکٹر عبدالمنان کے ہیں، مخدوم، شاذ، راشد آذر کے ابواب میں بھی جہاں تہاں بصیرت کی کھڑکیاں سی کھل جاتی ہیں۔ میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ سارے باب ہم پایہ ہیں، ان میں کچھ سرسری (لطیف ساجد کے بارے میں)، رسمی (عابد روڈ کے سیٹھ کے بارے میں)، غیر ضروری (فخرو بھائی کے بارے میں) شریک ہیں۔ مگر اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا، کتاب کا مجموعی تاثر جادوئی چھڑی سے سب کو چھوتا، ان میں جان ڈالتا چلا جاتا ہے۔ ہم دکھنیوں کے لیے تو ایک بیش بہا سرمایہ ہے۔ دکن کی عظیم تہذیب جن کے رگ وپے میں رچی بسی ہے، ان کے لیے یہ متفرق مضامین ایک مربوط ناول کا کینوس بن جاتے ہیں۔ وہ سب جیتے جاگتے چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ جو اپنا اپنا رول ادا کرکے پردے کے پیچھے جاچکے ہیں یا جو آج بھی مٹتی قدروں کا بوجھ اٹھائے پھر رہے ہیں۔ یہ سب ایک ہی عہد کے پروردہ ہیں جنھوں نے ایک دوسرے سے بہت کچھ سیکھا ہے، ایک دوسرے کو بنایا بگاڑا ہے۔ ایک اور باطنی ربط بھی ہے۔ باہمی ہمدردانہ قسم کا ربط جو مصنف اور ان سب کے بیچ آخر

تک قائم رہتا ہے۔‘‘(۴۰)

اقبال متین کی خاکہ نگاری کے تفصیلی جائزہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان کے سارے خاکے یکساں نوعیت کے نہیں ہیں۔ کچھ خاکے تاثراتی مضمون معلوم ہوتے ہیں جیسے زاہد علی خاں، صابر دت، ابراہیم شفیق اور لطیف ساجد کے خاکے۔ ان خاکوں میں بھرپور انداز میں شخصیت کی جیتی جاگتی تصویر سامنے نہیں آپاتی۔ مولانا سید فخرالدین کے خاکے میں غیرضروری واقعات کی شمولیت اور بے جا طوالت نے اس کے ادبی حُسن ودلکشی کو مجروح کیا ہے۔ ان خاکوں سے قطع نظر، ان کے کچھ خاکوں کا شمار بہت اچھے خاکوں میں ہوتا ہے جیسے ڈاکٹر سید عبدالمنان، سلیمان اریبؔ، شاذؔ تمکنت، حسن چشتی، پروفیسر یوسف سرمست اور راشد آزرؔ کی شخصیت پر لکھے گئے خاکے۔ ان خاکوں میں شخصیت کو اس دلکش انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ اس کی تصویر نگاہوں کے سامنے گھوم جاتی ہے۔ ان خاکوں میں فنِ خاکہ نگاری کی بیشتر خصوصیات نظر آتی ہیں۔ اقبال متین کی خاکہ نگاری کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے جن شخصیتوں کے خاکے لکھے ہیں، ان کی خوبیوں کے ساتھ خامیوں کو بھی بے نقاب کیا ہے۔ انھوں نے شخصیت کی کمزوریوں کو اس دلچسپ اور ہمدردانہ انداز میں بیان کیا ہے کہ قاری کو ان کمزوریوں پر ترس آنے لگتا ہے۔ انھوں نے شخصیت کی برائیوں کو بیان کرنے کے لیے طنزیہ ومزاحیہ پیرایہ بیان کا سہارا لیا ہے اور اپنی فنکارانہ مہارت سے اسے بھی گوارا اور دلچسپ بنادیا ہے۔ انھوں نے شخصیت کی منفرد خصوصیات، اس کے علمی وادبی اور سماجی کارناموں، عادات واطوار اور نفسیاتی کیفیات پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کا تجزیہ اس طرح کیا ہے کہ اس کی خارجی وداخلی تصویریں موثر اور دلکش انداز میں سامنے آتی ہیں۔ ان کے اچھے خاکوں میں شخصیت اس طرح مہک اُٹھتی ہے اور اس انداز میں جلوہ گر ہوتی ہے کہ اس کا نقش ذہن پہ مُرتسم ہوجاتا ہے اور اس کا کردار ہمارے ذہن میں بس جاتا ہے۔ اقبال متین کی خاکہ نگاری کے مجموعی جائزہ کی روشنی میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ان کے خاکوں میں فنی خامیاں بھی پائی جاتی ہیں مگر کچھ فنی خامیوں سے قطع نظر، انھوں نے اس فن میں بھی مہارت وکمال کا مظاہرہ کیا ہے جس کی بنا پر وہ اُردو کے منفرد وممتاز خاکہ نگاروں میں شمار ہوتے ہیں

اقبال متین کی یادنگاری کا فنی مطالعہ

فن یادنگاری کی تعریف:

یادنگاری بھی خاکہ نگاری کی طرح غیرافسانوی نثری صنف ہے۔ یہ صنف آپ بیتی سے قریب ہے۔اس میں آپ بیتی کے اوصاف بھی پائے جاتے ہیں اوراس میں خاکے کے عناصر بھی ملتے ہیں۔ یادیں،اپنے اور دوسری علمی وادبی شخصیتوں اوردوست احباب کے بارے میں کسی ادیب کی یادداشت پر مبنی تاثراتی تحریریں ہیں۔اس میں یادنگار اپنے اور دوسری ہستیوں کے سوانحی واقعات کوبھی ایجاز واختصار کے ساتھ بیان کرتا ہے اور شخصیت کی جھلکیاں بھی پیش کرتا ہے۔ وہ اپنے اور دوسروں کے بارے میں تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے،شخصیت کے اچھے اور بُرے دونوں پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے۔ یادنگار ادبی شخصیتوں کو یاد کرتے ہوئے چند جملوں میں ان کےفن کی بھی تصویر کشی کرتا ہے۔ وہ طنزومزاح کے عنصر سے کام لے کر اپنی تحریر میں جاذبیت ودلکشی پیدا کرنے کی بھی کوشش کرتا ہے۔ یادنگار اپنی یادوں پر مبنی تحریروں میں اپنی ذاتی زندگی کی روداد، اپنے دوست، احباب اور ہم عصر ادیبوں سے اپنی ملاقاتوں کے احوال،ان سے اپنے روابط،ان کی شخصیت اوران کے کارناموں کواپنے منفرد ودلکش پیرایے میں اس طرح بیان کرتا ہے کہ ان کی،ان کے دوست،احباب اور متعلقہ ہم عصر ادیبوں کی زندگی،شخصیت اوران کے کارنامے بڑے پُراثر انداز میں سامنے آتے ہیں۔ان تحریروں میں فکروبصیرت کی لہریں بھی ہوتی ہیں۔ یہ تحریریں قاری کونئی معلومات بھی فراہم کرتی ہیں اورانھیں ادبی لطف وانبساط بھی عطا کرتی ہیں۔

یادنگاری کے اجزائے ترکیبی:

صداقت:

یادیں ایک طرح سے سوانحی واقعات ہوتے ہیں اور یہ صنف آپ بیتی سے بہت قریب ہے۔اس لیے

اس میں حقیقی واقعات بیان کیے جانے چاہئیں اور خیالی اور فرضی واقعات سے گُریز ضروری ہے۔ یادنگار کو سوانح نگار کی طرح سچائی اور دیانت داری کا بڑا لحاظ کرنا پڑتا ہے۔ وہ شخصیت، سوانحی واقعات اور اس کے کارناموں کو دلکش پیرائے میں بیان کر سکتا ہے لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہر حال میں سچائی کا دامن تھامے رہے۔

اختصار:

یادنگاری کا ایک اہم وصف ایجاز واختصار ہے۔ یادوں میں واقعات کی اس قدر بہتات نہیں ہونی چاہئے کہ اس میں ثقالت اور بوجھل پن کی کیفیت پیدا ہوجائے جو قاری کی بیزاری اور اکتاہٹ کا سبب بنے۔ اس میں یادنگار اپنے اور دوسرے ادیبوں سے متعلق چند اہم مخصوص ومنفرد اور انوکھے واقعات اور اہم کارناموں کا بیان ایجاز واختصار کے ساتھ اس ادبی انداز میں کرے کہ شخصیت اپنی خوبیوں اور خامیوں اور اپنے منفرد کارناموں کے ساتھ قاری کی نگاہوں کے سامنے جلوہ گر ہوجائے۔

کردارنگاری:

یادنگاری کا ایک اہم وصف کردارنگاری ہے۔ اچھی کردارنگاری کے لیے ضروری ہے کہ یادنگار کی انسانی نفسیات سے گہری واقفیت ہو۔ اچھا کردار وہ ہے جو اپنی خوبیوں، خامیوں اور اپنی متضاد ومنفرد خصوصیات کے ساتھ قاری کی نگاہوں کے سامنے جلوہ گر ہو۔ یادنگار اپنی اور دوسری شخصیتوں کے جذبات واحساسات، نفسیاتی کیفیات اور ظاہری وباطنی اوصاف کی عکّاسی اس مہارت وفنکاری سے کرتا ہے کہ کردار کا داخلی وخارجی روپ اپنی منفرد شان کے ساتھ قاری کی نگاہوں کے سامنے نمایاں ہوتا ہے جو اسے متاثر بھی کرتا ہے۔

واقعہ نگاری:

اس سے مراد یہ ہے کہ یادوں میں غیر ضروری واقعات کی بہتات نہیں ہونی چاہئے۔ بلکہ اہم اور منفرد واقعات کا انتخاب، ان میں ربط وتسلسل اور توازن کا سلیقہ بے حد ضروری ہے۔ یادنگاری کی دلکشی کا انحصار بڑی حد تک واقعات کے بیان پر ہے۔ اس لیے واقعات کا بیان اس مربوط ودلکش انداز میں ہونا چاہئے کہ واقعہ آنکھوں کے سامنے ہوتا ہوا دکھائی دے۔

منظرکشی:

شخصیت کے ظاہری وباطنی خدّوخال اور اس کے کارناموں کو بیان کرنے کے لیے منظرنگاری کا بھی سہارا لینا پڑتا ہے۔ منظرنگاری سے مراد یہ ہے کہ منظر کو اس طرح بیان کیا جائے کہ شخصیت جس ماحول میں

پروان چڑھی ہے اور جن حالات و کیفیات کا اس کو سامنا کرنا پڑا ہے، وہ سب نگاہوں کے سامنے آ جائے۔

زبان و بیان:

کسی بھی ادبی صنف میں زبان و بیان کا بہت اہم رول ہوتا ہے۔ یادنگاری میں بھی اس کی بڑی اہمّیت ہے۔ یادنگار کو اپنے بیان میں زور پیدا کرنے کے لیے موزوں الفاظ، حسین تشبیہات، دل کش استعارات اور دوسری صنعتوں سے مدد لینی پڑتی ہے تاکہ حقیقی شخصیت بھی اُبھر کر سامنے آئے اور یادوں میں ادبی لطف و چاشنی بھی پیدا ہو۔ یادنگار کو چاہئے کہ وہ ایسا انداز بیان اختیار کرے کہ شخصیت بُرے پہلوؤں کے باوجود دلچسپ معلوم ہو۔ اس کے علاوہ یادوں میں یہ ضروری ہے کہ واقعات کے بیان کا انداز اور اسلوب حقیقی ہوتے ہوئے بھی ایسا حسین و دلکش ہو جو پڑھنے والے کو اپنی جانب متوجّہ کر لے اور اپنا اسیر بنا لے۔

یادنگاری کے یہی وہ اجزائے ترکیبی ہیں جن سے مل کر بہترین یادیں وجود میں آتی ہیں اور اس میں فن کی اچھی خوبیاں پیدا ہوتی ہیں۔ یادوں میں ان فنّی آداب کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

اُردو میں یادنگاری کے اولین نقوش سجّاد ظہیر کی ''روشنائی''، فیض احمد فیضؔ کی ''مہ و سال آشنائی'' اور ظفر الحسن کی ''دکن اُداس ہے یارو'' وغیرہ میں ملتے ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر ادیبوں نے بھی اس طرف توجّہ دی ہے۔ عصر حاضر میں جن ادیبوں نے اس صنف کو اپنایا اور اسے پروان چڑھایا، ان میں اقبال متین کا نام نمایاں ہے۔

''باتیں ہماریاں'' اقبال متین کی یادوں کا مجموعہ ہے جو سترہ مضامین پر مشتمل ہے۔ ان مضامین کے عنوانات اس طرح ہیں۔ ''بچپن جو سانحہ نہ ہوا''، ''بہاؤ کا گنا ندی کا اور مشاعرے عیدگاہ کے''، ''کامریڈ محمود مشیر اور لیڈر رجواد رضوی''، ''کچھ اپنا کچھ پرایا''، ''زندگی کاہے کو ہے''، ''دو بلندیاں۔ مخدوم و شاہدؔ''، ''رفاقت کے دو نام۔ قاضی اور غیاث''، ''ایک کالی نیکی جو کتابوں میں بھٹک گئی۔ باقر مہدی''، ''ایک قدر شناس و خود شناس نوجوان۔ مغنی تبسم''، ''وفا آثار بے ریائی کا دوسرا نام''، ''ہاشم بھائی اور ان کی وحید بی بی''، ''ایک جہدِ مسلسل ختم ہوئی۔ کاظم بھائی کے ہاشم بھائی''، ''دوسرا نام اخلاص و اُنسیت کا۔ حسن چشتی''، ''اپنا لہو بھی سُرخی شام و سحر میں ہے''، ''قدم بڑھاؤ کہ سب راستے تمہارے ہیں''، ''یادیں ماضی کی کھوج

میں''، ''کل کی حقیقت، آج کہانی''۔ ان مضامین میں اقبال متین نے اپنی ذاتی زندگی کی روداد قلمبند کی ہے اور اپنے ہم عصر ادیبوں، دوستوں اور احباب کو یاد کیا ہے۔ انھوں نے جن شخصیتوں کو یاد کیا ہے، وہ کامریڈ محمود مشیر، لیڈر جواد رضوی، صفی اورنگ آبادی، علی اختر، مولانا فخر الدین، مخدوم محی الدین، شاہد حسینی، قاضی عبدالستار، غیاث احمد گدّی، باقر مہدی، مغنی تبسم، ہاشم علی اختر ان کی بیگم وحید بی بی، حسن چشتی اور کشمیری لال ذاکر ہیں۔ ان شخصیتوں پر اپنے تاثرات قلمبند کرتے ہوئے، درمیان میں انھوں نے دوسرے دوستوں، عزیزوں اور دوسری ہستیوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہ وہ شخصیتیں ہیں جن سے ان کے ذاتی اور علمی وادبی روابط رہے ہیں اور جن سے وہ متاثر ہوئے ہیں۔ ان شخصیتوں کی سیرت وسوانح، کارناموں، خوبیوں اور خامیوں پر انھوں نے اس چابکدستی سے روشنی ڈالی ہے کہ یہ تمام شخصیتیں اپنی منفرد خصوصیات کے ساتھ قاری کی نگاہوں کے سامنے آتی ہیں۔

اس کتاب کا پہلا مضمون بعنوان ''بچپن جو سانحہ نہ ہوا'' ہے۔ یہ اقبال متین کی آپ بیتی ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے بچپن کی زندگی کو یاد کرتے ہوئے، اس سے متعلق کچھ اہم واقعات کو اس طرح بیان کیا ہے کہ ان کے بچپن کا منظر نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ بچپن میں اقبال متین اپنی طبعی شرافت، منکسر مزاجی اور ذہانت کی وجہ سے اپنے والدین اور خاندان والوں کی نظروں میں محبوب اور چہیتے تھے۔ ان کے خاندان والے ان کی شرافت کی مثال دیتے اور ان کی تعریف کرتے تھے۔ ان کے بچپن کا یہ پہلو ملاحظہ ہو:

> ''بچپن کیا اور اس کی روزمرّہ زندگی کیا۔ بندھے، ٹکے مسائل، ڈانٹ اور گھر کی سے بچ کے جی لینے کی خواہش۔ تعریف کے دو بول، پھلا کر گول گپھا بنادیں، ایسے میں یہ اعزاز کیا کم ہے کہ خاندان میں کسی نے کہہ دیا: ''اپنی بگڑی ہوئی اولاد کو راہ راست پر لانا ہے تو اسے منجھلے بھائی کے پاس بھجوادو۔ اُن کی محبت، دلہن شہزادی (میری امی جو خاندان میں زیادہ تر اسی اپنائیت سے پکاری جاتی تھیں) کی تربیت اور اقبال جیسے لڑکے کی صحبت، جو ہر سال کلاس میں اول آتا ہے۔ وہ بھلا اس کی کتابیں بھلی۔ کہے دیتا ہوں تمہارا لاڈلا سدھر جائے گا۔''(۱)

اقبال متین کو بچپن سے شعر وادب کا خصوصاً کہانیاں پڑھنے اور سُننے کا چسکہ لگ گیا تھا۔ یہ چسکہ لگانے میں ان کی علاتی ماں کا بڑا ہاتھ تھا جو انھیں ان کی حقیقی ماں سے بھی زیادہ چاہتی تھیں۔ اسی لئے وہ

اپنی علاتی ماں اوران کے اعلیٰ اخلاقی اوصاف کو بڑے خلوص سے یاد کرتے ہیں۔وہ لکھتے ہیں:

''یہ چاٹ مجھے چھٹ پن سے میری مماں نے ڈالی تھی۔وہ میری علاتی ماں تھیں، لیکن ان کی چاہتیں کچھ ایسی تھیں کہ اس بدنام زمانہ رشتے کو سرے سے جھٹلا دیا تھا۔......کبھی وہ ابا سے کہہ کر بڑے چاؤ سے مجھے بلوا لیتیں۔ امی جیسے سوچ میں پڑ جاتیں کہ ان دونوں میں میری حقیقی ماں کون ہے۔ابا کے کہنے پر مجھے وہ کسی ملازم کے ساتھ مماں کے پاس بھجوا دیتیں اور میں دنوں وہیں رہ جاتا۔ وہ میری خواہشیں پوچھ پوچھ کر پورا کرتیں، اس طرح جیسے خواہشیں پیدا کر رہی ہوں اور پورا کر رہی ہوں۔ یہ سب کچھ ہوجاتا تو کہانیوں کے تانے بانے ان کے اور میرے اطراف بنے جاتے۔ایسے دل چسپ پیرائے میں کہانیاں سناتیں کہ میں ڈاکوؤں اور لٹیروں سے یہاں تک کہ جنات سے بھی لڑ بھڑ کر شہزادے کو ان کے چنگل سے چھڑالاتا۔اور نچلا نہ بیٹھتا۔خیالوں میں اڑان بھرنے والا میرا ننھا سا دل پریوں کی تلاش میں نکل جاتا۔''(۲)

اقبال متین بچپن سے شعر کہنے لگے تھے اوران کے اشعار بچوں کے رسالہ 'سب رس' میں شائع ہونے لگے تھے۔اس کی وجہ سے ان کے اساتذہ، والدین اور خاندان کے بڑے بوڑھے انھیں عزّت کی نگاہ سے دیکھنے لگے تھے اور انھیں خاندان کے دوسرے بچّوں پر اہمّیت وفوقیت دی جانے لگی تھی۔ان باتوں پر بھی انھوں نے ایجاز واختصار سے روشنی ڈالی ہے۔اقبال متین بچپن سے منکسر مزاج تھے جب کہ ان کے خاندان کے دوسرے بچے تکبر اور رعونت میں مبتلا تھے۔اس پر گہرا طنز کرتے ہوئے انھوں نے اپنے چچازاد بھائی یوسف سرمست جو ان کی طرح عجز وانکساری سے پیش آتے تھے، کو اپنے منفرد انداز اور خوبصورت پیرائے میں یوں یاد کیا ہے:

''ایک ہی شخص ملنگ نکلا۔ یہ بھی غنیمت ہے۔غنیمت سے زیادہ نہیں۔ نام ہے یوسف شریف الدین، آج یوسف سرمست کے نام سے اس طرح پہچانا جاتا ہے کہ اردو ادب میں اس کی شناخت مسلم ہے، مجھے پتا ہے کہ وہ میری طرح نیچے نیچے جھرنے والے پانیوں میں پاؤں تلے بچھی ہریالی میں، پرواز سیکھتے پرندوں کی ڈار میں، چٹانوں کے درمیان سے پھوٹتے اکھوؤں کی بالیدگی میں، مسکراہٹوں کو بھگوتی ہوئی آنکھوں کی نمی میں اپنی ''میں'' کو تلاش

کرتا ہوگا۔ مجھے تو ہاتھ نہ آیا کچھ،اس سے ملوں تو پوچھوں گا۔''(۳)

اقبال متین نے اپنے اس مضمون میں اپنے بچپن کے دو سانحوں کا ذکر کیا ہے۔ایک حادثہ کا شکار ہوکر چچا سید دستگیرالدین کی موت کا سانحہ۔دوسرا چھت گرنے کا سانحہ۔ان سانحوں کا ان کے بچپن پر بڑا گہرا اثر پڑا تھا۔اس کے علاوہ اس مضمون میں انھوں نے اپنے مرحوم بچوں فرید،معید اور نشید کو بھی یاد کیا ہے جو ہنستے، بولتے اور کھیلتے کودتے ان سے جُدا ہوگئے۔ان بچوں کو یاد کرتے ہوئے وہ جذباتی ہوگئے ہیں۔ان کی موت سے انھیں بڑا رنج وغم پہنچا۔اس رنج وغم کا اظہار انھوں نے اس فن کاری سے کیا ہے کہ اس میں قاری کو بھی شریک کرلیا ہے۔

اس مضمون میں اقبال متین نے اپنے بچپن کی زندگی سے متعلق کچھ منفرد نوعیت کے واقعات کو اس موثر اور دلکش انداز میں بیان کیا ہے کہ ان کے بچپن کا نقشہ نگاہوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔اس مضمون کی اہم خوبی اس کا سادہ اور دلکش اندازِ بیان ہے۔اس میں سلیس زبان کا استعمال کیا گیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس میں ادبی لطافت وچاشنی پائی جاتی ہے۔

''بہاؤ کا گنا ندی کا اور مشاعرے عیدگاہ کے'' کے عنوان سے اقبال متین کا مضمون بھی ان کی آپ بیتی ہی ہے۔اس میں بھی انھوں نے، اپنے پہلے مضمون کی طرح اپنے بچپن کی زندگی کے واقعات بیان کئے ہیں۔اس میں انھوں نے اپنے کاگنا ندی کے بہاؤ کی زد میں آنے اور ڈوبتے ڈوبتے بچنے اور عیدگاہ کے مشاعرہ جس میں انھوں نے اپنا پہلا شعر سُنایا تھا، کی روداد اس دلچسپ انداز میں قلمبند کی ہے کہ ان کے بچپن کی زندگی کا جیتا جاگتا منظر نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ایک مرتبہ بچپن میں اقبال متین اپنے ہم عمر بچوں کے ساتھ ناؤ لے کر کاگنا ندی گئے اور ناؤ ندی میں ڈال دی۔ندی اپنی طغیانی پر تھی اور اس کا بہاؤ بہت تیز اور بپھرا ہوا تھا۔اتفاق سے ناؤ بہاؤ کی زد میں آگئی اور سب ڈوبتے ڈوبتے بچے۔اس خوشی میں اقبال متین کے ابا کے اردلی قطب میاں نے گھر کے پاس عیدگاہ کے چبوترے پر ایک مشاعرہ کا اہتمام کیا جس میں اقبال متین نے اپنا پہلا شعر سُنایا تھا۔وہ پہلا شعر یہ تھا:

ادھر دیکھوں تو دلدل ہے ادھر دیکھوں تو آتش ہے
کہاں جاؤں، کدھر جاؤں رسول اللہ رسول اللہ (۴)

اس شعر کے بارے میں اقبال متین لکھتے ہیں: ''حیات کی شاعری کا پہلا شعر یہی تھا جواب بے

حیات ہوئے تو متین ہو گئے۔'' آگے چل کر اقبال متین کا کلام بچوں کے رسائل پیامِ تعلیم، پھول اور غنچے میں شائع ہونے لگا۔ بچپن میں وہ مسیح الدین خاں حیات کے نام سے جانے جاتے تھے۔ بعد میں وہ متین پھر اقبال متین کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان باتوں کو بھی انھوں نے پُر لطف انداز میں بیان کیا ہے۔ یہ مضمون قاری کو خود نوشت سوانح کا تاثر دیتا ہے۔

''باتیں ہماریاں'' میں شامل تیسرا مضمون بعنوان ''کامریڈ محمود مشیر اور لیڈر جواد رضوی'' ہے۔ اس میں اقبال متین نے محمود مشیر اور جواد رضوی کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ یہ دونوں اپنی طالب علمی کے زمانہ میں کمیونسٹ پارٹی سے گہرے طور پر جُڑے ہوئے تھے اور اس کے لئے ہمہ تن سرگرم رہتے تھے۔ ان دونوں پر پارٹی کا کچھ ایسا نشہ سوار ہوا کہ ان دونوں نے اپنے آپ کو اس کے لئے وقف کر دیا اور یہ دونوں شب و روز اس کے لئے جدّ وجہد کرنے لگے۔ جواد رضوی اسٹوڈنٹ یونین کے بایاں محاذ کے لیڈر تھے۔ اس زمانہ میں کمیونسٹ پارٹی پر پابندی عائد کر دی گئی تھی اور اس کے لیڈروں کو گرفتار کیا جانے لگا تھا۔ جب جواد رضوی کی گرفتاری کا اعلان ہوا تو وہ روپوش ہو گئے۔ کچھ دنوں جواد رضوی اقبال متین کے گھر میں بھی روپوش رہے۔ ان کے حلیہ کو اقبال متین نے اپنے لفظوں میں یوں بیان کیا ہے:

> ''گھنی داڑھی اور داڑھی پر جھکی ہوئی موچھیں۔ جواد رضوی واقعی اپنے چہرے کی موہنی اور معصومیت کھو چکا تھا۔ بہ یک نظر اس کو پہچان لینا بہت مشکل تھا۔ اچھا خاصا شریف قسم کا آدمی ڈاکو لگنے لگے تو کیا ہو۔'' (۵)

کامریڈ محمود مشیر پر بھی کمیونسٹ پارٹی کا گہرا نشہ تھا۔ وہ دن دن بھر سائیکل چلا کر پارٹی کے روپوش لوگوں تک کھانا، کمیونسٹ اخبار اور کتابچے پہنچاتے تھے۔ وہ دن رات پارٹی کے کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ پارٹی سے ان کی جنون کی حد تک وابستگی پر اقبال متین نے اس طرح روشنی ڈالی ہے۔ وہ رقم طراز ہیں:

> ''اس زمانے میں کیسے کیسے اوصاف والے کمیونسٹ پارٹی کے چاہنے والے تھے۔ محمود مشیر ان سب کا سرخیل تھا۔ کمیونسٹ پارٹی کو اپنے دماغ میں بسانے والے تو مل سکتے تھے، سر پر اٹھا کر گلی گلی پھرنے والا صرف محمود مشیر تھا۔ چھلاوا تھا وہ۔ جب کمیونسٹ پارٹی کے سارے لیڈر گرفتاری سے بچنے کے لئے روپوش ہو گئے تھے۔ محمود مشیر، ان روپوش ہونے والوں سے بے نیاز، ان کی پاپوش بن کر گلی گلی پھرتا تھا اور کمیونسٹ پارٹی اس کے کندھوں پر

بیٹھی غوں غاں کرتی تھی۔''(۶)

محمود مشیر اقبال متین کے چھوٹے سالے تھے۔شادی سے پہلے جب اقبال متین نے منیرہ کو چاہنا شروع کیا تو خاندان کے کچھ لوگ اس کی مخالفت کرنے لگے۔ایسے مخالف ماحول میں محمود مشیر نے ان دونوں کے درمیان عشق ومحبت کی راہ کو ہموار کرنے میں بڑا اہم رول ادا کیا۔ان کے اس احسان کو اقبال متین نے بڑے خلوص سے یاد کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''عقد سے پہلے منیرہ سے اس درجہ قربت میرے اور منیرہ کے لئے محمود مشیر کا سب سے بڑا انعام تھی۔انگلی کبھی دانتوں تک پہنچتی ہی نہ تھی سو ہمیں انگشت بدنداں ہونا ہی نہ آیا۔وہ اس گھر کی چھوٹی سی دنیا کا مختار کل تھا۔چاہتا تو مجھے منیر سے جدا کر کے زہر پلوا دیتا۔لیکن اس نے پھوپی امی کو بھی منیرہ کے حق میں موم بنا رکھا تھا۔....میرا گھر بسانے والے ہاتھوں میں سب سے مضبوط ہاتھ محمود مشیر کے ہیں۔''(۷)

اقبال متین محمود مشیر کو اپنا محسن، ہمدرد اور معاون مانتے ہیں۔ایک جگہ وہ اپنے ظریفانہ انداز میں ان کا خاکہ یوں کھینچتے ہیں:

''سانولی رنگت، ناک نقشہ درست، لیکن اوپر کے ہونٹ میں ایسا واضح شگاف کہ موچھ بڑھا لینے پر بھی جھانک جھانک کر چغلی کھائے پھر بھی موچھوں نے اس عیب کو بڑی حد تک چھپا لیا تھا۔حد درجہ دل چسپ شخصیت دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے رہو، وہ کبھی محسوس بھی نہیں کرے گا کہ دوسروں کے لئے خوشیوں کے سامان فراہم کر رہا ہے۔اپنی پروردہ ایسی لگن میں مست جس کی کوئی قلندری نہیں۔اور چھور کچھ بھی نہیں۔محمود مشیر نے ایک منظر بنا لیا اور وہ منظر اسی کے نام سے منسوب ہو کر رہ گیا۔بس زود آشنا، زود رنج، زود پشیماں۔''(۸)

اقبال متین نے اپنے اس مضمون میں کمیونسٹ پارٹی سے محمود مشیر اور جواد رضوی کی جذباتی وابستگی پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو بے نقاب کیا ہے۔انھوں نے ان دونوں کی بے ریا، بےلوث، مخلص، چہیتی اور محبوب و ہر دلعزیز شخصیت کی ایسی تصویریں پیش کی ہیں جو قاری کی نگاہوں کے سامنے پُر اثر انداز میں سامنے آکر ان کے دل کو چھوتی ہیں۔

اس کتاب کا چوتھا مضمون ''کچھ اپنا کچھ پرایا'' کے عنوان سے ہے۔ اس میں اقبال متین نے مختلف شخصیتوں کے بارے میں اپنے تاثرات قلمبند کئے ہیں۔ دیکھئے انھوں نے اپنے ایک جانی دوست نذر کے بارے میں کس دلچسپ تاثرات کا اظہار کیا ہے اور کس خوبصورت پیرائے میں ان کی شخصیت کی تصویر کشی کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''میرا ایک دوست نظروں میں کھپ جانے والا۔ ملے تو جی چاہے اس کی باتیں سنتے رہو اس کو دیکھتے رہو گورے رنگ پر پان کی دھڑی سے سرخ ہونٹ بات کرتا تو خوشبو کے بھبکے منہ سے نکلتے، مرنجاں مرنج ذہین آدمی اپنے سینے میں غموں کو دل بنا کر جتن سے رکھ چھوڑا تھا جس لڑکی کو ٹوٹ کر چاہا وہ کسی اور کی ہو رہی، اچھی اچھی باتیں کرتا، بہت ہنستا بہت قہقہے لگاتا پھر یک لخت خاموش ہو جاتا اور چل دیتا۔

کہاں چلے یہ نہ پوچھو
کب آؤ گے یہ بھی نہ پوچھو

ہنستے بولتے سیاست کے اکھاڑے میں کود پڑا اور دیکھتے ہی دیکھتے منسٹر بن بیٹھا۔ چاہے جانے میں اس کا جواب نہیں تھا۔ جس سے ملتا اس کو اپنا بنا لیتا اسی طرح دوسروں کا ہو رہتا۔''(۹)

اس مضمون میں اقبال متین نے چیتا پور میں چیتا شاہ ولی کی درگاہ میں ہونے والے عرس اور مشاعرے کی تصویر کشی دلکش انداز میں کی ہے۔ ان کے والد محترم عبدالقادر ناصؔر تعلقہ چیتا پور کے تحصیل دار تھے۔ یہ گاؤں ایک بزرگ چیتا شاہ کے نام پر بسا تھا۔ ہر سال وہاں ان کا عرس ہوا کرتا تھا۔ جب ناصر صاحب وہاں کے تحصیل دار بنے تو انھوں نے وہاں عرس کے موقع پر ایک مشاعرہ کا اہتمام کیا۔ اس میں اس زمانے کے سبھی بڑے شعراء مدعو کیے گئے۔ علی اختر، صفی اورنگ آبادی، مخدوم محی الدین، نظر حیدرآبادی، صمد رضوی ساز، حسینی شاہد، لطیف ساجد، علی صائب میاں، نذیر دہقانی اور بھی بہت سے شعراء اس میں شریک ہوئے۔ چیتا شاہ ولی کی درگاہ ایک جنگل میں تھی۔ لیکن عرس کے موقع پر حقیقی معنوں میں جنگل میں منگل منایا جاتا تھا۔ اس عرس کی گہما گہمی کی کیفیت اقبال متین یوں بیان کرتے ہیں:

''ہر سال درگاہ شریف کا عرس ہوتا تھا۔ رنگ برنگی کھلونوں اور بتاشوں کی دکانیں سجتی تھیں۔ مشروبات اور قلفیاں، فالودے کی کٹوریاں، ٹھیلوں پر بکتی

تھیں۔ درگاہ کی داہنی جانب بازار بھرتا تھا اور بائیں جانب خیمے، ڈیرے، شامیانے راوٹھیاں۔ دن کو ہو کہ سرِشام قہقہوں کی کمندیں پھینکی جاتیں اور رات کو روشنیاں اس طرح بکھرتیں کہ گھنے درختوں کے سائے، روشنیوں سے چھپتے پھرتے اور جنگل کے سناٹوں کا قہقہے تعاقب کرتے۔ اور یہ اہتمام، شعر وسخن، ادب وثقافت کی پذیرائی کے لیے ہوتا۔ سرخیل رندان ہوتے میرے چچا تمکین سرمست، شعر وسخن کی تہذیب وثقافت، رندی کی مرہون منت رہی ہے۔''(۱۰)

اس مشاعرے میں حضرت صفی اورنگ آبادی اور حضرت علی اختر دونوں کو مدعو کیا گیا تھا کیوں کہ یہ دونوں حضرت تمکین سرمست کے قریبی دوست تھے۔ یہ دونوں متضاد شخصیتوں کے مالک تھے۔اس لیے ان دونوں کے لیے الگ الگ خیمے نصب کیے گئے اور ان کے اپنے مزاج کے مطابق اہتمام کیا گیا تھا۔ اس واقعہ کو اقبال متین اس خوبی سے بیان کرتے ہیں کہ پورا منظر نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے:

''ایک بار چچا تمکین صاحب نے اپنی رواداری کا کمال دکھایا۔ حضرت صفی اورنگ آبادی اور حضرت علی اختر دونوں کو ایک ساتھ مدعو کر لیا۔ صبح صبح تحصیل دار وقت کے اہتمام سے فراہم کی ہوئی۔ سینڈھی تاڑی ایک چھوٹے شامیانے میں سارے لوازمات کے ساتھ فراہم کر دی جاتی۔ رکھے تو جاتے کانچ کے گلاس بھی کہ شاعر کو کسی چیز کی کمی نہ رہے۔ لیکن حضرت صفی مٹی کے آب خوروں کو ترجیح دیتے۔.....کچھ ہی فاصلے پر پندرہ بیس قدم ادھر ادھر ایک اور شامیانہ نصب ہوا۔ گھڑونچیوں میں وضو کے لیے پانی۔ وضو کرنے کے لیے زمین سے ذرا سی اونچی چوبی چوکی۔ سارے شامیانے کے اندر بچھی ہوئی نرم نرم پرال کی گھانس اور پوال پر بچھی دریاں۔ ان پر فرش لیکن ایک گوشہ اسی خیمے میں صاف ستھری زمین پر بچھی جانماز کے لیے مختص، کہ بہ وقت نماز گھٹنے گدیلے کی نرمی سے محروم رہیں۔ جانماز کا ایک کونہ الٹا ہوا۔ اسی پر تسبیح دھری ہوئی۔

وہ حضرت صفی اورنگ آبادی کا شامیانہ تھا اور یہ حضرت علی اختر کا۔ بابا کے حسن انتظام نے درمیان میں ایک گھنے املی کے درخت کو چن لیا تھا جو دونوں شامیانوں کی ماحولیاتی تنظیم میں جٹا رہتا کہ ادھر کی بو ادھر اور ادھر کی آواز ادھر نہ آئے۔ علی اختر صاحب اگزیما میں بھرے پیروں کے اوپری حصے کو بھی

وضو کے وقت پانی سے تر کر کے احتیاط سے صاف کرتے۔ وضو کے آگے اپنی بیماری کا خیال انھوں نے کبھی نہیں کیا۔ وضو کرتے، تسبیح خوانی کرتے۔ وقت پر نماز ادا کرتے۔ اور جی لگے تو لگتا شعر موزوں کر رہے ہیں۔ بات چلی تھی برابر دھری ہوئی جنت اور دوزخ کی سرحدوں کی اور ڈر تھا کہ آپ معترض ہوں گے۔ میں گناہ گار ساتویں آسمان کا جغرافیہ کیا جانوں۔ ہوسکتا ہے کہ دوزخ اور جنت کی سرحدیں اتنی دور دور ہوں گی کہ یہاں کی جھلسنے والی لو کے جھونکے وہاں نہیں پہنچ سکتے ہوں گے۔ وہاں کی ٹھنڈی سکون بخش پروائیاں یہاں کا رخ کرتے ہی جھلس جاتی ہوں گی۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ میرے حساب سے میں نے املی کے پیڑ کے سائے میں جنت بھی دیکھی، دوزخ بھی۔

یہ اللہ میاں کا کاروبار بھی انسانی سمجھ سے باہر ہے۔ جب نواز نے پر آتے ہیں تو نہ اپنا دیکھتے ہیں نہ پرایا۔ صفی اورنگ آبادی کو نواز دیا، علی اختر کو محروم کر دیا۔ اب ہم کیا کریں سر پیٹ لیں۔ لطیف ساجد املی کے گھنے پیڑ کی طرف اشارہ کر کے کہتا یہ حضرت صفی ہیں ان کا یہ سایہ حضرت علی اختر کو جھلس نہ دے کہیں۔ لیکن صفی صاحب جتنے پھکڑ تھے اتنے ہی موقع محل سے وضع داری نبھانے میں یکتا تھے۔ انھوں نے احتساب نفس کو چھوٹ نہیں دی۔ جب بھی علی اختر صاحب سے سامنا ہوتا بہت احترام سے ملتے۔ کچھ اس طرح جیسے اپنے اطوار کا محاسبہ کر رہے ہوں۔ عالم مدہوشی میں یہ التزام حواس بھی تو خدا ترس ہونے کی احسنت کی دلیل ہے۔ ہم تو اسی دوزخی کے گرویدہ تھے۔"(۱۱)

یہاں اقبال متین نے مشاعرے کے دونوں شامیانوں کی منظر کشی کرتے ہوئے، دونوں شاعروں صفی اورنگ آبادی اور علی اختر کی منفرد شخصیت کو بھی عیاں کیا ہے۔ یہ دونوں دکن میں اپنے وقت کے اہم اور نمائندہ شاعر تھے۔ لیکن ان کو وہ شہرت نہیں ملی جس کے وہ مستحق تھے۔ ان کی گمنامی و ناقدری پر اقبال متین یوں روشنی ڈالتے ہیں:

"استاد صفی اورنگ آبادی کو ہندوستان گیر شہرت حاصل نہیں ہوئی۔ اس کا سبب ان کی قلندری تھی۔ حیدر آباد کے باہر۔ صفی کا نام لیجئے تو لوگ صفی لکھنوی کو یاد کرتے ہیں۔ ورنہ صفی اورنگ آبادی بھی ہندوستان بھر میں ان

استادان سخن میں تھے جو انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ اسی قلندری اور تساہل کے سبب حیدر آباد ہندوپاک کے ادبی افق سے آہستہ آہستہ غائب ہوتا جا رہا ہے۔ حیدر آباد میں شعر و نثر کے میدان میں ہنروروں کی کمی نہیں۔ نابغہ و نایاب ہستیاں اپنی اپنی مسجد میں سربسجود ہوتیں تو بھی اللہ میاں حرکت کے بغیر برکت نہیں دیتے۔ علی اختر کی مثال سامنے ہے۔ استادان فن میں شامل تھے لیکن ہندوپاک تو کیا انھیں حیدر آباد بھی نہ ملا۔'' (۱۲)

''باتیں ہماریاں'' میں پانچواں مضمون ''زندگی کا ہے کو ہے'' کے عنوان سے ہے۔ یہ مضمون اقبال متین نے اپنے ایک قریبی رشتہ دار سید فخر الدین پر قلمبند کیا ہے۔ ان کی شخصیت پر اقبال متین نے خاکہ بھی لکھا ہے جو ان کے خاکوں کے مجموعہ ''سوندھی مٹی کے بت'' میں شامل ہے۔ اس مضمون اور خاکہ میں فرق یہ ہے کہ مضمون مختصر ہے اور خاکہ طویل ہے مگر دونوں میں ایک جیسی باتیں بیان کی گئی ہیں۔ خاکہ میں بھی ان کی متکبر اور رعونت پسند شخصیت کو دکھایا گیا ہے اور اس مضمون میں بھی ان کی مغرور و خود پسند طبیعت کو پیش کیا گیا ہے۔

اقبال متین نے فخر الدین کی خود پسند شخصیت کو پیش کرتے ہوئے ان کے متکبّرانہ طور طریقوں، رعونت آمیز رویّوں اور ان کے مضحکہ خیز حرکات و سکنات پر بڑا گہرا طنز کیا ہے۔ انھوں نے ان کی کمزوریوں کو اس انداز میں بیان کیا ہے کہ قاری کو لطف آنے کے ساتھ ان سے ہمدردی بھی ہونے لگتی ہے۔ ان کی شخصیت کو انھوں نے اس طرح پیش کیا ہے کہ ان کی شخصیت اپنے تمام تضادات اور خصوصیات کے ساتھ قاری کی نگاہوں کے سامنے جلوہ گر ہوتی ہے۔ اس مضمون میں اقبال متین نے اپنی طنزیہ بصیرت سے بہت کام لیا ہے۔

''دو بلندیاں، مخدوم و شاہد'' کے عنوان سے اپنے مضمون میں اقبال متین نے مخدوم محی الدین اور شاہد حسینی کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ مخدوم محی الدین ایک اہم ترقی پسند شاعر تھے۔ وہ عوام میں بے حد محبوب و مقبول اور ہر دلعزیز شخصیت کے مالک تھے۔ دوستوں میں بھی انھیں بڑی مقبولیت حاصل تھی۔ وہ دوستوں کو بے انتہا چاہتے اور ان کے ساتھ خلوص و محبت کا مظاہرہ کرتے تھے۔ وہ ان کی محفل میں اس طرح گھل مل کر بیٹھتے کہ وہ ان کے دیوانے ہو جاتے۔ وہ تن کے کالے ہونے کے

باوجود من کے اُجلے تھے۔ وہ منفرد خصوصیات کے حامل تھے۔ان کی ہردلعزیز اور پہلودار شخصیت کو اقبال متین اپنے لفظوں میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

''بعض نعمتیں اللہ میاں شاید انتقاماً نواز دیتے ہیں۔ میرے حیدرآباد میں ایک شخص تھا۔ کالا رنگ ساتھ ہی بڑے تیکھے نقوش، آواز میں لحنِ داؤدی کا رس، احساس کی آنچ کو اطراف لپیٹے پھرتا تھا۔ شاید اس حرارت کو خلقتِ خدا نے پیار کی گرمی سمجھ رکھا تھا اور چپکے سے اس کے ساتھ ہو گئی تھی۔ اب جو اس شخص نے دیکھا کہ اللہ سے انکار کرتا ہوں تو اللہ کے بندے پیچھا نہیں چھوڑتے اور وہ جو محبتیں ان کے لیے میرے دل میں بس گئی ہیں وہ مجھے بھی بے آرام رکھتی ہیں۔ آدمی ہشیار تھا۔ اللہ سے سمجھوتہ کر لیا۔ چپ کے سے دل ہی دل میں اللہ میاں سے گڑگڑا کر عرض کی: دیکھئے صاحب آپ اپنا عرش وفرش سنبھالئے اور اپنے فرش فلکِ اول کے حدود سے نیچے نہ آیئے۔ آپ کی زمین اور باقی سارے کا سارا ہم سنبھالتے ہیں۔ اللہ میاں نے سوچا آدمی ڈھنگ کا ہے۔ ہمیں بھی تو پسند ہے۔ چلو ایک چھوٹی سی زمین کا ٹکڑا اس کے حوالے کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ وہ ہمارے بندوں کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے۔ اللہ میاں کو رضامند پا کر یہ شخص گاتا گنگناتا نکل پڑا۔ جس گھر میں جاتا اس گھر کے چھوٹوں کو، بڑوں کو سب کو اپنا لیتا۔ دوستوں کی محفل میں ایسا گھل مل کر بیٹھتا جیسے گھلاوٹ کا لفظ اسی کی محفلوں سے چلا ہو۔ شکر کو آپ نے دودھ میں گھلتے ہوئے دیکھا ہے۔....اگر دیکھا ہے تو شکر کو پانی میں گھلتے ہوئے بھی دیکھا ہوگا۔ اب آپ ہی بتایئے کتنا فرق ان دونوں کی گھلاوٹ میں ہے۔ پانی میں شکر گھلنے تک آپ سے اپنا وجود تسلیم کرواتی رہے گی۔ لگے گا۔ یہ کاروبار دل سے نہیں ہو رہا ہے آپ جبراً شکر گھول رہے ہیں اور وہ گھلنے کے لیے تیار نہیں۔ دودھ کا معاملہ الگ ہے۔ آپ نے شکر ڈالی اور وہ بن گئی دودھ کا حصہ۔ یہ کاروبار لگتا ہے عشق ومحبت کے سے کاروبار ہیں۔ بس کچھ اسی ادا سے یہ شخص دوستوں کی محفلوں میں گھلتا گھلاتا رہتا تھا۔ ایک بار مل لیجئے ــــــ آپ کی شخصیت کی ساری مٹھاس، ساری کڑواہٹیں آپ اس کو دے دیں گے اور جو نہ دیں گے تو وہ خود جھپٹ کر آپ سے چھین لے گا اور اپنے میں انڈیل کر مسکرائے گا۔ جیسے کہہ رہا ہو، جناب ڈھونڈ نکالیے خود کو ــــــ کہاں ہیں آپ؟ ...تن کا کالا من کا اجلا

مخدوم اندر سے تن کا بھی اُجلا نکلا تو ہم کو حیرت نہ ہوئی۔''(۱۳)

مخدومؔ محی الدین کچھ اردو ادیبوں کے زیر اثر اردو کے دیوناگری رسمِ خط کے قائل ہوگئے تھے۔اس سلسلہ میں اقبال متین کے اعتراض کرنے پر وہ برہم ہوگئے تھے مگر غور وفکر کے بعد جلد ہی انھیں اپنی غلطی کا احساس ہوگیا اور انھوں نے اپنا موقف تبدیل کرلیا۔اردو رسمِ خط کے بارے میں ان کے موقف کو بیان کرتے ہوئے اقبال متین نے ان کے سیاسی اور ادبی رویّوں پر اس طرح روشنی ڈالی ہے:

''ہاں تو یہ عجیب بات تھی۔مخدوم ''پارٹی'' کے معاملے میں بہت سخت تھے۔ شعر وادب کے معاملے میں کبھی ضد نہیں کی ___ وہاں کی سخت کوشی کو جان کی طرح چاہا ہوگا۔ادب وفن کے اس کوچۂ قاتل میں اپنا سیاسی پندار سینے میں دبائے جھک کر چلنے اور کاروانِ شعروسخن کے نقشِ جمیل کو اور سجل اور سجل کرنے میں فولاد کو موم بنا لینے کا ہنر صرف مخدوم کا حصہ تھا۔''(۱۴)

اقبال متین نے اس مضمون میں حسینی شاہد کی باعظمت شخصیت کو بھی پیش کیا ہے۔وہ سٹی کالج، حیدرآباد میں اقبال متین کے جگری دوست تھے۔ان کی طالب علمی کے زمانہ پر انھوں نے یوں روشنی ڈالی ہے:

''طالب علمی کے زمانے میں وہ مخدوم بھائی کا اس حد تک دیوانہ تھا کہ پہناوے سے لے کر چال ڈھال تک اپنا لینے کے جتن کرتا۔اس کی ٹیڑھی رومی ٹوپی مخدوم کی کج کلاہی کو مات دیتی تھی ___''(۱۵)

حسینی شاہد ابتداءً شاعری کرتے تھے لیکن بہت جلد انھوں نے شاعری ترک کر کے تحقیق کی طرف قدم بڑھایا اور ''سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ حیات اور کارنامے'' کے موضوع پر ایسا جامع تحقیقی مقالہ لکھا کہ مشہور محقق پروفیسر گیان چند جین نے ان کی تحقیقی کاوش کو سراہا اور انھیں ایک معتبر محقق قرار دیا۔اس پہلو پر بھی اقبال متین نے روشنی ڈالی ہے۔حسینی شاہد اقبال متین کو بے انتہا چاہتے تھے۔ایک مرتبہ انھوں نے انجمن ترقی پسند مصنفین کے صدر کی حیثیت سے اقبال متین کا نام پیش کیا اور دوستوں نے حسینی شاہد کے اشارے پر انھیں صدر چن لیا۔اس خلوص ومحبت کا اعتراف کرتے ہوئے اقبال متین نے ان سے اپنی آخری ملاقات کا ذکر کیا ہے۔یہ آخری ملاقات حسینی شاہد کی گمبھیر علالت کے دوران ان کے گھر پر ہوئی تھی۔ملاقات کے بعد جب اقبال متین اپنے گھر کی طرف لوٹے تو بھولے سے انھوں نے حسینی شاہد کی

عینک پہن لی اوران کی عینک وہیں چھوٹ گئی۔ دیکھئے اس بات کو وہ اپنے منفرد اوراچھوتے اسلوب میں کس طرح بیان کرتے ہیں:

''میں روانہ ہونے کے لیے اٹھا تو اس نے ہمیشہ کی طرح پھر آنے کا وعدہ نہیں لیا۔ ہم نے ایک دوسرے کو کچھ دیکھا، کچھ نہیں دیکھا ____ یا شاید بہت دیکھا یا دیکھا ہی نہیں۔ کچھ دور جانے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ میری آنکھیں تو میرے ساتھ ہیں لیکن نظریں کہیں رہ گئی ہیں۔ میں نے اسکوٹر رکوائی ___ عینک اتار کر دیکھی۔ میری نہیں تھی ___ شاہد کی عینک سے آنکھیں ڈھانک لینا اتنا آسان نہیں تھا ___ میں نے نظریں اس سے چرائی تھیں اس نے اپنی نظریں ساتھ کر دیں۔ میں اس کی بصارت کے بوتے پر کتنا چل سکتا تھا۔ اس کی بصیرت کہاں سے لاتا۔''(۱۶)

اقبال متین نے اس مضمون میں مخدوم محی الدین اور حسینی شاہد کے امتیازات وکمالات پر اس پُر اثر انداز میں روشنی ڈالی ہے کہ دونوں شخصیتیں اپنی منفرد خصوصیات اور بلند و بالا قد و قامت کے ساتھ قاری کی نگاہوں کے سامنے آتی ہیں۔ ان کے بارے میں اقبال متین کے دلچسپ تاثرات کو پڑھ کر قاری کو ان شخصیتوں کی مختلف خوبیوں سے آگہی ہوتی ہے اور دل میں ان سے محبت پیدا ہونے لگتی ہے۔

''رفاقت کے دو نام۔ قاضی اور غیاث''۔ اس مضمون میں اقبال متین نے قاضی عبدالستار اور غیاث احمد گدّی پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ یہ دونوں ادیب ان کے ہم عصروں اور بے تکلّف دوستوں میں ہیں۔ ان دونوں شخصیتوں سے وہ بے حد متاثر تھے اور ان کی اہمّیت کے بھی قائل تھے۔ ۱۹۶۷ء کے آس پاس جب اقبال متین کے عزیز دوست سلیمان اریبؔ نے ماہنامہ صبا کے افسانوی حصے کی ادارت کی ذمہ داری انھیں سونپ دی تھی تو انھوں نے اس ادبی رسالہ میں قاضی عبدالستار کے ناول صلاح الدین ایوبی کو شائع کیا تھا اور اس پر ایک تعارفی نوٹ لکھا تھا۔ اس تعارفی نوٹ میں انھوں نے بڑی چابکدستی سے ان کی شخصیت و سوانح اور ان کے ناول کا تعارف کرایا تھا۔ اس تعارفی نوٹ کو بھی انھوں نے اپنے اس مضمون میں نقل کیا ہے۔ انھوں نے ان کی تحریر کی انفرادی شان کو اُجاگر کرتے ہوئے، ان کی منفرد اور دلچسپ شخصیت کا تعارف اپنے اچھوتے انداز میں یوں پیش کیا ہے:

''میری نسل کا ایک ایسا ادیب جس کی تحریر ہزاروں میں پہچانی جائے۔ جس

کو زبان پر اس قدر قدرت حاصل ہو کہ اس کی لفظیات کے سجے سنورے پیکر دلہنوں کو شرماتے ہوں۔ بند حجرے میں چاندنی بکھیرتے ہوں۔ پھولوں کی خوشبو کو پکڑ رکھنے کا فن جانتے ہوں اور پھر وقت پڑے تو دن میں تلوار کی کاٹ سے زیادہ جو ہر دکھاتے ہوں۔ میدانِ وغا میں دشمنوں پر لفظ لفظ گولیوں کی بوچھار کرتے ہوں۔ جلال و جمال دونوں کی صورت گری و پیکر طرازی میں حاکمانہ دسترس رکھنے والا یہ ہنر مند ایسا نہیں ہے کہ اپنی اہمیت سے واقف نہیں ہے۔ وہ تو بڑا ایگو اسٹک ہے۔ کم ہی لوگوں کو خاطر میں لاتا ہے۔ لیکن جب اس کا ذہن کسی اور ہنر مند کو پہچان لیتا ہے تو وہ اپنے ذہن کے ذریعہ بھاؤ تاؤ کر کے دوسرے کی ہنر مندی کا مول تول کرتا ہے۔ اور جب وہ اس کی تخلیقی کسوٹی پر کھرا اترتا ہے تو وہ اپنا سارا پندار نیلام پر لگا کر دل جیسی شئے سے اس ہنر مند کا سودا کرتا ہے۔ اور دل دے دیتا ہے تو پھر وہ چاہنے والا بھی ہے محبوب بھی سچا دوست یارِ طرح دار، مصلحتوں کے منہ پر تھوک کر پھکڑ پن کی حد تک سچ بولنے والا۔ جتنا اچھا لگتا ہے اتنا ہی اچھا بولتا ہے۔''(۱۷)

ایک مرتبہ قاضی عبدالستار نے اقبال متین کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کے ایک سیمینار میں بڑے چاؤ سے مدعو کیا۔ جب اقبال متین یونیورسٹی کیمپس پہنچے تو قاضی عبدالستار نے ان کا پُر تپاک استقبال کیا اور سیمینار ہال میں ان کی بے حد عزّت افزائی کی۔ سیمینار کے دوران انھوں نے اپنی جانب سے ان کی خاطر و مدارات اور دلجوئی کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ سیمینار کے اختتام پذیر ہونے کے بعد جب وہ انھیں سفر خرچ اور اعزازی رقم دینے کے لیے ان کے کمرے پہنچے تو ان کی کیفیت اقبال متین کی زبانی ملاحظہ کیجیے:

''بند لفافہ لے کر وہ چوروں کی طرح میرے کمرے میں آئے ــــــ شرمسار سے، قصوروار سے، جھکی جھکی نظریں، عرق آلود پیشانی ــــــ لگتا تھا انگلی اور انگوٹھے کی مدد سے پسینہ ابھی ابھی پونچھا ہے۔ آہستہ سے ہاتھ بڑھا کر لفافہ اس طرح میرے ہاتھ میں تھمایا جیسے میری ہی جیب سے کچھ نکال رہے ہوں۔ لفافہ دے کر ایک سکنڈ کو نہیں ٹھہرے۔ بھاگ کھڑے ہوئے۔ میں تو ان کے بھاگنے سے پہلے ہی ان کے اندر اتر چکا تھا۔''(۱۸)

اس اقتباس میں قاضی عبدالستار بے حد نادم وشرمسار دکھائی دیتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ان کے ساتھ جتنا کچھ کر سکتے تھے، بعض اصول وضوابط کی وجہ سے نہیں کر سکے۔ ان کے مخلصانہ انداز کی اقبال متین نے ایسی تصویرکشی کی ہے کہ ان کی پُرخلوص شخصیت بڑے موثر انداز میں سامنے آتی ہے۔ اس سیمینار میں اقبال متین کے ساتھ غیاث احمد گدّی بھی تھے۔ ایک دن دونوں انور عظیم کے یہاں مدعو تھے۔ دعوت سے فراغت کے بعد جب دونوں ان کے گھر سے لوٹنے لگے تو اقبال متین نے صاف کہہ دیا کہ انھیں قاضی عبدالستار کے گھر کا راستہ معلوم نہیں ہے۔ انور عظیم ساتھ چلنے کے لیے کھڑے ہوئے مگر غیاث احمد گدّی نے انھیں آنے سے روک دیا اور بڑے اعتماد کے ساتھ اقبال متین کو ساتھ لے کر فٹفٹی میں سوار ہوئے۔ جب کافی دیر تک دونوں انجان راستوں پر بھٹکتے رہے تو اس دوران دونوں میں بڑی دلچسپ چھیڑ چھاڑ ہوئی۔ ملاحظہ کیجیے:

''میں نے گدّی کو چھیڑا ___ بہار کے گوالوں کے ساتھ محبت نباہنے کا شاید
یہی انجام ہوتا ہے۔
گدی نے کہا، سنا ہے تم حیدرآباد کے نوابوں میں ہو۔ ہم گوالے نوابوں سے
ایسا ہی سلوک کرتے ہیں ___ وہ لوگ ہمارے ہی دودھ اور ہماری ہی ملائی
پرفربہی کا بوجھ بخوشی اٹھاتے ہیں لیکن ہمیں بروقت پیسہ ادا نہیں کرتے۔
میں چُپ ہو رہا ___ گدی نے کہا ___ کیوں بھئی چپ ہو رہے ہو۔
میں نے کہا ___ چپ نہ ہو رہوں تو کیا کروں ___ اس معاشرے میں یہ
آپس کا بیر تمہارے اور میرے خاندان کو ورثے میں ملا ہے۔'' (۱۹)

اس سیمینار کے دوران اقبال متین غیاث احمد گدّی کے علاوہ اور بھی کئی دوستوں سے ملے۔ سیمینار سے دہلی واپسی میں ان کی ملاقات کمار پاشی اور بلراج مین را سے ہوئی۔ ان پُرلطف ملاقاتوں کو ایجاز و اختصار کے ساتھ خوبصورت پیرائے میں بیان کرتے ہوئے اور قاضی عبدالستار سے اپنی آخری ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے مضمون کا اختتام درج ذیل شعر پر کیا ہے:

جن کے دم سے تھیں بستیاں آباد
آج وہ لوگ ہیں کہاں آباد

اقبال متین نے اس مضمون میں قاضی عبدالستار اور غیاث احمد گدّی سے اپنی پُرخلوص رفاقت کا ذکر

اس دلکش انداز میں کیا ہے اورانھوں نے ان کے اہم اوصاف وخصوصیات پراس خوبی سے روشنی ڈالی ہے کہ ان کی منفرد اور پُر خلوص ادبی شخصیتیں پُر کشش انداز میں قاری کے سامنے آتی ہیں۔

''ایک کالی نیکی جو کتابوں میں بھٹک گئی'' کے عنوان سے اپنا تاثراتی مضمون اقبال متین نے باقر مہدی پر لکھا ہے۔اس میں انھوں نے متضاد خصوصیات کی حامل ان کی شخصیت کو اپنے تاثرات کی مدد سے یوں بیان کیا ہے:

> ''باقر اندر سے بہت پیارا آدمی ہے۔ نرم، بھیگا ہوا۔ اس قدر ملائم کہ آنسوزدہ لگے لیکن باقر بہت دیر، بہت دیر بعد ہاتھ لگتا ہے۔ اوراس آدمی کے ہاتھ لگنے تک جو باقر چادر اوڑھ کر ساتھ رہتا ہے وہ اس کی روح بھی نہیں ہے۔ ہیولا ہے۔ طاغوتی ہیولا وہ بہت پڑھتا ہے اوراپنے بہت پڑھنے پر اسے اتنا زعم ہے کہ وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا۔ وہ شاید پڑھتا اسی لئے ہے کہ تعلق خاطر کا لفظ اس کی لغت میں شامل نہ رہے۔ لیکن اس لفظ کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دینے میں وہ کامیاب نہ ہوسکا۔ وہ اپنے پر تنقید تو بہت دور کی بات ہے اپنے خلاف ایک جملہ بھی برداشت نہیں کرسکتا۔'' (۲۰)

باقر مہدی جب کسی علمی وادبی محفل میں گفتگو کرتے تو وہ اپنی علمیت کا اظہار کچھ اس طرح کرتے کہ بڑے بڑے لوگ ان کے سامنے خاموش ہوجاتے اوران پران کا رعب طاری ہوجاتا۔ وہ اتنے بارعب اور سخت مزاج تھے کہ ان سے ملنے کے بعد ان سے دوستی کرنا مشکل اور اگر دوستی ہوجائے تو نبھانا مشکل۔ ان کی شخصیت کے اس پہلو کو اقبال متین نے کاگناندی کی تشبیہہ کے ذریعہ یوں اُجاگر کیا ہے:

> ''کاگناندی سے اس کی ایک اور مماثلت بھی ہے۔ وہ علم کا بہتا ہوا مواج ہی نہیں متعفن دریا ہے۔ بچے بالے اس کے پاٹ دار بہاو میں کاغذ کی ناؤ لے کر نہیں اتر سکتے۔ اس کا علم جب طوفان آمادہ ہوجاتا ہے تو بڑے بڑوں کے لئے کنارے کھوجاتے ہیں۔ باقر سے ملنے کے بعد دوست ہونا مشکل ہے دوست ہوجائیں تو نبھانا مشکل۔'' (۲۱)

باقر مہدی سے اقبال متین کی دوستی اور بڑی بے تکلّفی تھی۔ اقبال متین نے ان سے اپنی پُر لطف ملاقاتوں، اپنے اوران کے درمیان ہوئی چھیڑ چھاڑ اور شوخیوں کو اس دلکش پیرائے میں بیان کیا ہے کہ ان کی شخصیت کا منفرد روپ سامنے آتا ہے۔ اقبال متین نے اپنے نام ان کے دو خطوط بھی نقل کئے ہیں۔ ان

خطوط کو پڑھ کر قاری کو حیرت ہوتی ہے کہ کیا اتنا کھرا اور سخت مزاج آدمی اتنا بے تکلّف بھی ہوسکتا ہے۔ اقبال متین نے اس مضمون میں باقر مہدی کے تعلق سے کچھ انوکھے قسم کے واقعات بیان کر کے ان کی ظاہری کیفیات اور باطنی نفسیات کی ایسی تصویر کشی کی ہے کہ ان کی شخصیت اپنی جداگانہ صفات کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔ باقر مہدی کی شخصیت پر یہ ایک اچھوتا تاثراتی مضمون ہے۔

''ایک قدر شناس وخودشناس نوجوان۔مغنی تبسم''۔ اس مضمون میں اقبال متین نے مغنی تبسم کو قدر شناس کی حیثیت سے یاد کیا ہے۔ مغنی تبسم اور سہام مرزا ان کے قدر دانوں میں تھے۔ اس وقت جب حیدرآباد نے انھیں قدر و منزلت نہیں دی، ان دونوں نوجوانوں نے انھیں اور ان کے فن کو قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ آگے چل کر سہام مرزا تو پاکستان چلے گئے لیکن مغنی تبسم حیدرآباد، ہندوستان ہی میں رہے۔ انھوں نے زندگی بھر اقبال متین کے ناز اُٹھائے اور ان کے فن کی قدر کی۔ ان کے تعلق سے اقبال متین لکھتے ہیں۔ ''مغنی مسکرا کر ہر بات مان جاتے ہیں اور اس مان جانے میں انکار کے پہلو چھپا لیتے ہیں۔'' مغنی تبسم کی قدر شناسی کو یاد کرتے ہوئے اقبال متین نے حیدرآباد میں اپنی ناقدری کا شکوہ کیا ہے۔ شروع میں حیدرآباد نے انھیں وہ توجّہ نہیں دی جو حیدرآباد سے باہر کے اہم ادبی رسائل نے دی۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

> ''مجھے میرے حیدرآباد نے کبھی نوازا نہیں سو میں اپنا نام ہندوستان بھر سے اٹھالایا۔ جہاں جہاں اردو شعر و ادب کی کسمساہٹ مجھے محسوس ہوئی میں اپنا نام لے کر وہاں پہنچ گیا۔'' (۲۲)

اقبال متین نے اپنے اس مضمون میں اپنی ادبی زندگی کے ابتدائی دنوں پر روشنی ڈالی ہے اور اپنے تئیں حیدرآباد کی بے اعتنائی کے رویّہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انھوں نے ان لوگوں کو بڑی محبت سے یاد کیا ہے جنھوں نے ان کے فن کو قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ مغنی تبسم کو انھوں نے اس لیے پیار بھرے انداز میں یاد کیا ہے کہ انھوں نے ہمیشہ ان کے ساتھ ناز برداری کا سلوک کیا اور ان کے فن کی پذیرائی کی۔ مغنی تبسم ایک مشہور ومعروف ادیب وشاعر اور اہم ناقد تھے۔ انتظامی امور میں بھی انھیں بڑی مہارت حاصل تھی۔ ان کی شخصیت کے کئی پہلو تھے۔ انھوں نے بڑے کٹھن حالات میں ایوانِ اردو کی مسند نشینی سنبھالی تھی۔ ان کی پہلو دار شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے اقبال متین نے لکھا ہے:

’’مغنی تبسم نے مخمل کی ٹوپی سمجھ کر جو کانٹوں کا تاج اپنے سر پر رکھ لیا ہے وہ مخمل کی ٹوپی ہی ثابت ہوگا اور ایوانِ اردو میں ان کی تصویر بھی سب کے ساتھ امر ہو جائے گی۔....ادب کے کتنے ہی کاروبار شوق ہیں جو چلتے رہیں گے اور ان کاروبار کے چلانے میں مغنی ماہرانہ دسترس رکھتے ہیں۔تخلیق سے ذرا ہٹ کر تحقیق کی جاں کاہی بھی مغنی کے حصے میں آ گئی ہے اسی لیے وہ کسی نہ کسی ذہنی تساہل کو بے ریا دوستی اور بے ثمر محبت کا نام دے کر مگن ہیں۔لیکن ہاتھ میں بروقت پتھر آ جائے تو یہ دوستی بے ثمر بھی نہیں ہے اور مغنی کو اس بات کا بخوبی علم ہے۔شاید یہی مرغوبیت مغنی کا جنونِ محبت ہے یا شکستِ آگہی۔ مغنی یہ بھول گئے ہیں کہ ان کی پہلودار شخصیت کتنے خانوں میں بٹ کر کہاں کہاں چھپ گئی ہے۔کبھی کبھی ان کی عمر آج خود ان سے اپنی بھری جوانی کا مطالبہ کرتی ہے اور وہ اس کا قرض چکانے کے لیے آئینے کا عکس خضاب اور جامہ زیبی کو سونپ دیتے ہیں۔‘‘ (۲۳)

اقبال متین نے مغنی تبسم کے شعری مجموعہ ’’مٹی مٹی میرا دل‘‘ پر اپنے دلچسپ تنقیدی تاثرات کا اظہار کیا تھا۔ان تاثرات کو درج کرنے کے بعد، انھوں نے ان کے کچھ اشعار کو نقل کیا ہے اور ان سے اپنے تعلق خاطر کو اس والہانہ انداز میں بیان کیا ہے کہ خلوص و محبت سے پُر ان کی شخصیت کا دلکش روپ سامنے آتا ہے۔

اقبال متین نے ’’باتیں ہماریاں‘‘ میں جن شخصیتوں پر اپنے تاثرات قلمبند کئے ہیں، ان میں ہاشم علی اختر بھی ہیں جو ملک کی دو بڑی یونیورسٹیوں عثمانیہ یونیورسٹی اور علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہ چکے تھے۔ان کی غیر معمولی علمی شخصیت اور حیرت انگیز انتظامی صلاحیت سے اقبال متین بے حد متاثر تھے۔ان کی شخصیت پر انھوں نے تین مضامین لکھے ہیں۔پہلا مضمون ’’وفا آثار بے ریائی کا دوسرا نام‘‘ کے عنوان سے ہے۔اس میں انھوں نے اختصار کے ساتھ ان کی سوانح کو بیان کرتے ہوئے ان کے علمی کارناموں اور انتظامی فتوحات پر روشنی ڈالی ہے۔ہاشم علی اختر بچپن سے پڑھنے لکھنے میں بڑے ذہین اور محنتی تھے۔ انھوں نے میٹرک سے لے کر ایم،ایس،سی (زولوجی) تک سارے امتحانات امتیازی نمبروں سے پاس کئے۔اپنی غیر معمولی ذہانت اور محنت و لگن کی بنا پر انھوں نے حیدرآباد سول سروسیز کے امتحان میں پہلی پوزیشن حاصل کی اور حکومت کے اہم عہدوں پر فائز ہوئے۔وہ حیرت انگیز انتظامی صلاحیتوں کے مالک، دیانتدار اور دور اندیش تھے۔انھوں نے اپنی ملازمت کے دوران دیانتداری اور دور اندیشی سے

کام لیتے ہوئے اپنی غیر معمولی قابلیت وصلاحیت کا ایسا مظاہرہ کیا کہ حکومت کی نظروں میں قابل اعتماد بن گئے۔ان کی قابل اعتماد شخصیت اور ان کی غیر معمولی قابلیت وصلاحیت پر اقبال متین نے نریندر لوتھر کے مضمون کے حوالے سے اس طرح روشنی ڈالی ہے۔

> ''ہاشم بھائی غیر معمولی قابلیت کے افسر رہے ہیں۔سکریٹریٹ میں ایک پوسٹ تھی جو خاص طور پر قابل اور قابلِ اعتماد افسر کو دی جاتی تھی۔ڈپٹی سکریٹری پولیٹکل (جس کا رتبہ اب بڑھا کر سکریٹری کر دیا گیا ہے) یہ پوسٹ راست چیف سکریٹری کے تحت تھی اور تمام خفیہ اور راز کے اموراسی کے تحت رہتے تھے۔چیف سکریٹری نے اعتراض کیا کہ اس پوسٹ پر کسی مسلم افسر کو لگانا دانش مندی نہیں ہوگی۔اس وقت کے چیف منسٹر سنجیوا ریڈی نے اس اعتراض کو ٹھکرا دیا اور خاص طور پر ہاشم بھائی کے تعلق سے کہا کہ اگر وہ بھروسے کے قابل نہیں تو ریاست میں کوئی افسر بھی بھروسے کے قابل نہیں ہوسکتا۔ہاشم بھائی اس پوسٹ پر پانچ سال تک فائز رہے اور جب وہاں سے ان کا تبادلہ ہوا تب چیف منسٹر برہمانند ریڈی نے ان کو یہ بات بتائی اور ساتھ ہی ان کا شکریہ ادا کیا کہ وہ ان کے اعتماد پر پورے اترے۔''(۲۴)

ہاشم علی اختر بڑے منصف مزاج اور محنتی انسان تھے۔ان میں حق گوئی و بے باکی،صداقت پسندی اور ایمانداری کا جذبہ بے حد پایا جاتا تھا۔جب وہ افسر بنے تو انھوں نے بڑی محنت ولگن اور ایمانداری سے کام کیا۔اس کی وجہ سے وہ عوام سے لے کر حکومت تک کی نظروں میں محبوب ومقبول ہوگئے اور حکومت کے اعلی سے اعلی عہدوں پر فائز ہوتے چلے گئے۔وہ اپنی غیر معمولی قابلیت وصلاحیت اور محبوبیت ومقبولیت کی بنیاد پر عثمانیہ یونیورسٹی اور علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی بنے۔وہ انتظامی امور کے ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ بڑی اہم علمی شخصیت کے بھی مالک تھے۔انھوں نے ملک و بیرونِ ملک کے اہم سیمیناروں میں شرکت کی اور اپنے زولوجی کے موضوع پر علمی مقالات پڑھے۔انھوں نے اپنے موضوع سے متعلق کئی مستند کتابیں بھی لکھیں۔ان تمام باتوں کو اقبال متین نے اس طرح بیان کیا ہے کہ ان کی دیانتدار اور ہمہ گیر شخصیت اپنی علمیت اور قابلیت کے ساتھ موثر انداز میں سامنے آتی ہے۔

اقبال متین نے ہاشم علی اختر کی شخصیت پر دوسرا مضمون ''ہاشم بھائی اور ان کی وحید بی بی'' کے

عنوان سے لکھا ہے۔اس میں انھوں نے ہاشم علی اختر کے ساتھ ان کی بیگم وحید بی بی کی شخصیت کو بھی پیش کیا ہے۔دونوں میاں بیوی بلند اخلاق و کردار کے حامل تھے۔ ہاشم علی اختر کے بارے میں جیسا کہ گذشتہ مضمون میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ وہ ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ان میں بے شمار خوبیاں تھیں۔حق گوئی، بے باکی اور منصف مزاجی ان کا اہم وصف تھی۔وہ ایک ایماندار افسر اور کامیاب و دوراندیش منتظم تھے۔وہ عوام سے لے کر حکومت تک اور اپنے خاندان والوں سے لے کر ساتھیوں اور دوستوں تک کی نگاہوں میں بے حد محبوب و مقبول تھے۔وہ غیر معمولی قابلیت و صلاحیت اور بڑی علمی شخصیت کے مالک تھے۔ان کی غیر معمولی شخصیت کو اقبال متین اپنے لفظوں میں یوں بیان کرتے ہیں:

''ہاشم علی اختر کسی شخص کا نام نہیں ہے۔ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جس نے بلندیوں کے سر کرنے کو اتنی اہمیت نہیں دی جتنی وسعتوں کی پہنائیاں ناپنے کو۔طالبِ علمی کے زمانے میں کلاس کی مانیٹری سے لے کر ہندوستان کی دو اہم ترین جامعات کی وائس چانسلری تک علم و عمل کی پہنائیاں ناپنے والی شخصیت نے بہ حیثیت پولیٹکل سکریٹری سیاسی نظم و نسق کی پہنائیاں ناپ کر رکھ دیں جب کہ کسی بھی مسلمان افسرِ اعلیٰ کے لیے اس ساعت دار و گیر میں سانس لینا بھی ممکن نہ تھا۔ایسے ذہین، بے خوف اور باعمل آدمی کے لیے جو اپنے اخلاص کو دوسروں کی ملکیت سمجھتا رہا ہو اور جس کے بے شمار دوستوں نے اسے ٹوٹ کر چاہا ہو اور جس کے چاہنے والوں میں طالبِ علمی کے زمانے سے آج تک اتنے لوگ نکل آئیں جن کا احاطہ کرنا مشکل ہو۔وحید بی بی کا اس کی زندگی میں اس طرح سرایت کر جانا صرف ازدواجی بندھن کی بات نہیں تھی۔ہاشم بھائی کی شخصیت وہ تھی جس کو ان کے چاہنے والوں نے مل کر چاہا ہے، سن کر چاہا ہے، پڑھ کر چاہا ہے۔ان میں نام ور ہستیاں بھی ہیں، بے نام و نمود گوشہ نشیں بھی۔''(۲۵)

ایک جگہ اقبال متین نے ہاشم علی اختر کی شخصیت پر اس طرح روشنی ڈالی ہے۔وہ رقم طراز ہیں:

''ہاشم بھائی کی پہلودار شخصیت کا احاطہ کرنا چاہوں تو دفتر کھولنا نہیں دفاتر کھولنے پڑیں گے۔سب سے اہم ترین بات یہ کہ جو انفرادیت اپنی جگہ فطرت انسانی کی بوقلمونی کا احساس رکھتی ہے اس کے لیے یہ بات بعید از فہم نہیں رہ جاتی کہ کوئی جی نی ایس (Genius) اگر اس تحمل اور نظم و ضبط کا یارا

بھی رکھتا ہو جو زمانے بھر کی بے جا مخالفتیں یہاں تک کہ دشنام طرازیاں یوں سہہ جاتا ہو کہ اذیت پہنچانے والے ردعمل کے طور پر خود ہی اذیت کوشی کا شکار ہو جائیں تو یہ بات ہر کس و ناکس کے بس میں نہیں ہوتی۔ ہاشم بھائی کی بڑائی اسی میں ہے کہ انھوں نے اپنی حق شناسی و حق گوئی کے آگے شورِ سگاں کو اہمیت نہیں دی۔''(۲۶)

اقبال متین نے عظمت کی حامل ہاشم علی اختر کی شخصیت کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی بیگم وحید بی بی کی شخصیت پر بھی اظہارِ خیال کیا ہے۔ وہ ایک مثالی خاتون تھیں۔ اپنے شوہر کی طرح وہ بھی بلند اخلاق و کردار کی مالک تھیں۔ وہ بڑی وفا شعار اور شوہر پرست بیوی تھیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ دونوں میاں بیوی کے مزاج میں بڑی یکسانیت تھی۔ دونوں ظریف الطبع اور بذلہ سنج تھے۔ دونوں اپنی ظرافتِ طبعی اور بذلہ سنجی سے ایک دوسرے کو خوش کرنے کی کوشش کرتے رہتے۔ اس سے دونوں کے درمیان زبردست جذباتی رفاقت پیدا ہوئی اور دونوں ایک دوسرے کے دل میں گھر کر گئے۔ دونوں کے مزاج کی ہم آہنگی اور یک دلی نے ان کی گھریلو زندگی کو مثالی بنا کر رکھ دیا تھا۔ اقبال متین نے دونوں میاں بیوی کے مزاج کی ہم آہنگی اور ان کے درمیان رفاقت پر روشنی ڈالتے ہوئے وحید بی بی کی بلند کردار شخصیت کو یوں بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''وحید بی بی نے اپنی وفا شعاری، معاملہ فہمی، زودرسی اور شوہر پرستی کے وہ گل گھر کے آنگن میں کھلائے کہ ہاشم بھائی ان پودوں کی آبیاری میں مگن ہو گئے جسے وحید نے محبت و ظرافت سے سینچا تھا ہاشم بھائی اپنے آدرش کو شکست و ریخت سے بچانے کے لیے ہمیشہ قدم بڑھاتے رہے۔ وہ ہاشم بھائی جن کی زودرس ذہانت اور شعور کی صلابت نے ان کی مہم پسندی کو کبھی پس پشت نہیں رکھا اور ان کی آنکھوں نے مہیب اندھیروں کی ہر چادر کو ایسی کرنوں سے جگمگا دیا جو راستے سجھاتی رہیں اور اگر کبھی کہیں رک کر ٹھٹک کر سوچتے بڑھتے قدم ذرا کی ذرا روک لیے تو وحید بی بی نے ان کا ہاتھ تھام لیا اور دونوں آگے بڑھ گئے۔ وحید بی بی نے ہاشم بھائی کی ہشت پہلو شخصیت کو جو آہستہ آہستہ قوم کی امانت بن گئی تھی کچھ اس طرح اپنی آسودہ و آفریدہ توانائیوں کا ماحصل بنا لیا کہ دونوں غیر محسوس طور پر ایک دوسرے کے احساس کی قوت بن گئے۔ ازدواجی زندگی میں ایسی یگانگت و مفاہمت بہت

کم میسر آتی ہے۔ عام آدمی اپنے گھر کی چار دیواری میں یا باہر کے محدود حصار میں اپنی شریکِ حیات سے مطمئن تو رہ سکتا ہے لیکن کوئی غیر معمولی شخصیت جو کسی قوم کا اثاثہ بن کر سارے ماحول کی وسعتوں پر کمندیں پھینکنے کا یارا رکھتی ہے اس کی حساس ترین زندگی میں اس کے اٹھائے ہوئے قدموں کے نیچے زمین بچھاتے رہنے کا کام وحید بی بی نے جب بھی ان کی ضرورت پڑی کچھ اس سلیقے سے انجام دیا کہ ہاشم بھائی نے وحید بی بی کو اپنے دل کے گوشے میں کسی قیمتی شئے کی طرح چھپا کر رکھ لیا۔ ....وحید بی بی اور ہاشم بھائی کی یک دلی نے ان کی گھریلو زندگی کو مثالی بنا رکھا تھا۔'' (۲۷)

وحید بی بی غیر معمولی سمجھ بوجھ کی مالک خاتون تھیں۔ انھوں نے اپنے شوہر کا بھرپور ساتھ دیا اور ہمیشہ ان کے جذبات اور قوتِ ارادی کو سہارا دیا۔ اس بلند کردار خاتون کی شخصیت کا اعتراف ان کے شوہر ہاشم علی اختر نے اقبال متین کے نام ایک خط میں یوں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''وحید کی غیر معمولی شخصیت اور سمجھ بوجھ کی وجہ سے میری خانگی زندگی اس قدر پُرسکون رہی کہ میں سرکاری زندگی میں سخت مخالفتوں، تعصب اور دشمنیوں کے باوجود کامیاب رہا۔ ان کی کیا کیا باتیں یاد کروں۔ وحید بی بی کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ اپنے اور میرے خاندان کے لوگوں میں کوئی فرق نہیں کرتی تھیں۔ میرے رشتہ داروں کی بھی اس طرح خاطر تواضع کرتی تھیں جیسے اپنوں کی۔ ان میں سے بعض کے حالا خراب تھے۔ ان کی مجھے بتائے بغیر مدد کر دیتی تھیں اور مجھے بعد میں پتا چلتا تھا۔ مجھے احساس ہے کہ علی گڑھ یونیورسٹی کی وائس چانسلری کے دور میں میرا Sense of Humour میرے بہت کام آیا اور میری پوری زندگی میں وحید کے Sense of Humour نے مجھے بہت کچھ دیا۔ میری تسکین اور مسرت کے سامان فراہم کیے۔'' (۲۸)

ہاشم علی اختر کی غیر معمولی کامیابیوں میں ان کی حیرت انگیز ذہانت اور قابلیت وصلاحیت کے ساتھ ان کی بیگم کا بھی ہاتھ تھا جنھوں نے اپنی فہم وفراست اور دوراندیشی سے اپنے شوہر کی زندگی کو پُرسکون بنائے رکھا اور ان کے ہمّت وحوصلوں کو تقویت دی۔ کہا جاتا ہے کہ ہر کامیاب مرد کے پیچھے عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ ہاشم علی اختر کی کامیابی میں بھی ان کی بیگم وحید بی بی کا اہم رول تھا۔ ہاشم علی اختر نے حکومت کے

اعلیٰ عہدوں پر فائز ہو کر اپنی محنت و لگن اور دیانتداری سے عوام کی بڑی اہم خدمات انجام دیں۔ اس کی وجہ سے وہ عوام اور حکومت کی نظروں میں چہیتی شخصیت کے مالک بن گئے۔ انھوں نے عثمانیہ یونیورسٹی اور علی گڑھ یونیورسٹی کا وائس چانسلر رہ کر بھی بڑے اہم کارنامے انجام دیئے۔ ان کی خدمات اور کارناموں پر روشنی ڈال کر اقبال متین نے ان کی غیر معمولی شخصیت کو پیش کیا ہے۔ ہاشم علی اختر اور ان کی بیگم وحید بی بی دونوں بے حد خلیق وملنسار، غیور و خوددار، وضع دار اور رکھ رکھاؤ کے مالک تھے۔ دونوں میں زبردست خوبیاں پائی جاتی تھیں۔ دونوں کے مزاج میں بڑی ہم آہنگی تھی۔ دونوں نے کامیاب اور مثالی ازدواجی زندگی گزاری۔ ان دونوں کی منفرد خصوصیات واوصاف اور ان کی شخصیت کے منفرد پہلوؤں کو اقبال متین نے اس خوبی سے بیان کیا ہے کہ دونوں کا بلند کردار بڑے دلچسپ اور موثر انداز میں سامنے آتا ہے جو قاری کے ذہن پر نقش ہو جاتا ہے اور دونوں کی کامیاب ازدواجی زندگی قاری کو بے حد متاثر کرتی ہے۔

اقبال متین نے ہاشم علی اختر کی شخصیت پر تیسرا مضمون ''ایک جہدِ مسلسل ختم ہوئی، کاظم بھائی کے ہاشم بھائی'' کے عنوان سے لکھا ہے۔ دراصل ''جہدِ مسلسل'' کے عنوان سے ہاشم علی اختر کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر کاظم حسین نے ان کی غیر معمولی شخصیت پر ایک طویل مضمون لکھا تھا جس میں انھوں نے ان کی پوری زندگی کو دکھاتے ہوئے ہر زاویے سے ان کی شخصیت کا احاطہ کیا ہے۔ یہ طویل مضمون اگرچہ کہیں شائع نہیں ہو سکا مگر یہ ایک بھرپور مضمون ہے۔ اسی مضمون کی روشنی میں اقبال متین نے اپنا یہ مضمون لکھا ہے۔ اس میں انھوں نے ہاشم علی اختر کی باضمیر، بااصول اور درویش صفت شخصیت کو دکھایا ہے۔ ہاشم علی اختر ایک محنتی اور ایماندار سرکاری عہدہ دار تھے۔ وہ ذاتی منفعت، مصلحت پسندی اور مفاد پرستی سے کوسوں دور تھے۔ انھوں نے اپنی ملازمت کے دوران اپنے ضمیر اور اصول پسندی سے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ سخت اصول پسند ہونے کی وجہ سے انھیں بد دماغ اور مغرور بھی کہا گیا۔ اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے اقبال متین رقم طراز ہیں:

> ''ہاشم علی اختر کو سنی سنائی پر کتنوں نے بد دماغ کہا مغرور اور گھمنڈی جانا اور جتایا۔ نہ آگے بڑھ کر اپنا تعارف کرانے کی زحمت کی نہ اس تکبر کو ٹٹولا جس کے وہ شاکی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ہاشم علی اختر سے پہلی ملاقات ہی میں یہ محسوس کرتے کہ اس کی فقیری میں کوئی شاہی پناہ لیتی ہے اور اسی شاہی کے دوش بدوش کوئی فقیری بے نیاز این و آں ہے۔'' (۲۹)

ہاشم علی اختر سخت اصول پسند ہونے کے ساتھ مضبوط قوتِ ارادی کے مالک، بڑے محنتی اور ایماندار تھے۔ انھوں نے اپنی محنت ولگن، دیانت داری اور اصول پسندی سے دفتری زندگی کی دھاندلیوں کوختم کیا اوراس کے معیار ووقار کو بلند کیا۔اس پہلو پر اقبال متین نے ڈاکٹر کاظم کے حوالے سے روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

''''جہدِ مسلسل'' میں ڈاکٹر کاظم نے اپنے بھائی جان کی بے لوث شخصیت کا ہرزاویے سے مشاہدہ کیا ہے۔سرکاری ملازمت کی بے اصل دفتری زندگی جو دھاندلیوں کے سبب بے پیندی کا بدھنا کہلاتی رہی ہے اس کی افراتفری کا سدِ باب یقیناً ایسے دیانت داراور باضمیر عہدہ داروں کے ہاتھوں ہی ممکن ہوا ہے جنھوں نے اپنی بے طمع سرشت کو حاصلِ دیانت ودین جان کر خدمت خلق کوروا رکھا ہے ورنہ حق وباطل کی جنگ میں ایمان وایقان کی قوت اسی وقت سلب ہوجاتی ہے جب نفسانی غیرانسانی خواہشات اپنی منفعت کے آگے جائز وناجائز آمدنی کا فرق بھول کر اپنی امارت کی عمارت کھڑی کر لیں۔اس کے بعد انتفاعِ ذات کے سوا کچھ نہیں رہ جاتا۔'' (۳۰)

ہاشم علی اختر عوام اور حکومت کی نظروں میں مقبول ہونے کے ساتھ اپنے خاندان میں بھی چہیتی شخصیت کے مالک تھے۔ وہ اپنے چھوٹے بھائی ڈاکٹر کاظم کی نظروں میں بھی بے حد محبوب تھے۔ وہ ان پر جان چھڑکتے تھے اور فخر کرتے تھے۔ دونوں بھائی کے دل میں ایک دوسرے کے لیے بڑی محبت وچاہت تھی۔ دیکھئے اقبال متین اس بات کو اپنے منفرد انداز میں کس خوبی سے بیان کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''ہاشم بھائی وکاظم بھائی ماڈرن رام لکشمن ہیں۔ شیروشکر بھی، آب وپارہ بھی۔کاظم ہاشم بھائی کو چھیڑ چھیڑ کر دنیا بھر کے موضوعات پر گفتگو کرتے ہیں اور ہاشم بھائی سے استفادے کا انھوں نے ایسا سلیقہ ایجاد کیا ہے کہ دونوں بھائی اس لین دین میں مگن رہتے ہیں۔ کاظم بھائی کا کہنا ہے کہ ان کے بھائی دریا ہیں اور وہ چلّو بھر بھر کے اپنا چشمہ بھر لیتے ہیں۔'' (۳۱)

اقبال متین نے اس مضمون میں ڈاکٹر کاظم کے مضمون کی روشنی میں ہاشم علی اختر کی غیر معمولی شخصیت اوران کے کارناموں کا تعارف اس خوبصورتی سے کرایا ہے کہ ان کی باضمیر، بااصول، درویش صفت، ایماندار اور محبوب ومقبول شخصیت بڑے دلکش اور موثر انداز میں جلوہ گر ہوتی ہے۔

اقبال متین نے اپنی یادوں کے مجموعہ ''باتیں ہماریاں'' میں حسن چشتی اور کشمیری لال ذاکر کی شخصیت پر بھی اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے حسن چشتی پر ''دوسرا نام اخلاص واُنسیت کا، حسن چستی'' کے عنوان سے اور کشمیری لال ذاکر پر ''قدم بڑھاؤ کہ سب راستے تمہارے ہیں'' کے عنوان سے مضامین لکھے ہیں۔ ان دونوں شخصیتوں پر انھوں نے خاکے بھی لکھے ہیں جو ان کے خاکوں کے مجموعہ ''سوندھی مٹی کے بت'' میں شامل ہیں۔ یہ خاکے اور مضامین دونوں یکساں ہیں۔ دونوں میں ایک جیسی باتیں کہی گئی ہیں اور دونوں میں ان کی پُرخلوص اور محبت کرنے والی شخصیت کو بیان کیا گیا ہے۔ اقبال متین نے ''باتیں ہماریاں'' میں اپنے عزیز چاہنے والوں کے بارے میں بھی اظہارِ خیال کیا ہے۔ ''اپنا لہو بھی سرخی شام وسحر میں ہے'' کے عنوان سے اپنے مضمون میں انھوں نے ''اعجاز پریس'' کے مالک نور محمد پر اپنے تاثرات قلمبند کئے ہیں۔ اس مضمون میں انھوں نے اپنے چند اور عزیزوں اور ان کے بلند اخلاق و کردار پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ نور محمد ان کو بے حد چاہتے تھے اور ان کے ساتھ بڑے خلوص سے پیش آتے تھے۔ ان کے خاکوں اور شخصیات کے مجموعہ ''سوندھی مٹی کے بت'' کو نور محمد نے ہی پہلی مرتبہ اعجاز پریس سے شائع کیا تھا۔ اقبال متین نور محمد کی پُرخلوص اور محبت کرنے والی شخصیت کو اپنے خوبصورت پیرائے میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

> ''ایک اور شخص ہے۔ زبان سے محبت کا اظہار کیے بغیر چپ کے سے دل میں اتر جانے والا۔ میں کہہ نہیں سکتا اس بیر بہوٹی جیسی مخملی شخصیت نے کیسے پیر سکیڑ رکھے تھے۔ مٹی میں اپنا پن ڈھونڈنے والا۔ مٹی کی سگندھ، برسات کی پھوار سے چھو کر اپنے میں بسائے بسائے پھرنے والا۔ مٹی اپنے ساتھ اٹھائے میرے سینے تک آپہنچا۔ مجھے پتہ بھی نہیں چلا کہ وہ سینے میں کب اتر گیا۔ اب جو اسے ڈھونڈتا ہوں تو محسوس ہوا کہ وہ سینے میں پہنچ کر بہت آہستہ رینگتا ہوا میرے دل میں پہنچ گیا ہے۔ اور ایک گوشے میں اطمینان سے پیر پھیلائے بیٹھ گیا، اب جو میں اسے الگ کرنا چاہوں تو میرے لیے مشکل یہ آپڑی ہے کہ یہ سرخ اور گداز بیر بہوٹی میرے دل کے لہو میں اپنا رنگ ملا کر اس طرح چھپ گئی ہے کہ میں نے اس کی علاحدہ پہچان ہی کھو دی۔ اس کے ڈھنگ نرالے ہیں۔ مجھ سے وعدہ لیتا ہے کہ آپ آٹو میں آئیں گے آٹو میں جائیں گے۔ کبھی آٹو تک آکر آٹو میں بٹھا دیتا ہے۔ پھر

میں اسی آٹو میں اسے اس کے گھر تک چھوڑتا ہوں۔ پھر اس کی بینائی نے
آنکھ میں پھول آجانے کے سبب اسے محتاط بنادیا کہ وہ شام ڈوبنے پر تھوڑا
فاصلہ بھی نہ طے کرے۔ اللہ رکھے یہ میرا ایسا دوست ہے جس کے پاس علم
کی فضیلت کے ساتھ اپنے سے عمر میں بڑے احباب کا احترام لازم وملزوم
ہے۔'' (۳۲)

اقبال متین نے نور محمد کے تعلق سے اور بھی کئی دلچسپ باتیں بیان کی ہیں اور ان کے منفرد اوصاف پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی صداقت پسند اور خلوص ومحبت سے پُر شخصیت کی جھلک دکھائی ہے۔

اقبال متین کی ''باتیں ہماریاں'' میں دو اور مضامین ملتے ہیں۔ ''یادیں ماضی کی کھوج میں'' اور ''کل کی حقیقت آج کہانی''۔ ''یادیں ماضی کی کھوج میں'' کے عنوان سے اپنے مضمون میں اقبال متین نے اختصار کے ساتھ بابری مسجد اور گجرات کے سانحوں کو بیان کرتے ہوئے ان دونوں سانحوں کے تعلق سے دو تحریروں عابد سورتی کے ناول ''کتھا واچک'' اور زاہد علی خاں کے مضمون ''شاید کہ تیرے دل میں اتر جائے مری بات'' کا ذکر کیا ہے۔ ''کتھا واچک'' بابری مسجد کے سانحہ پر لکھا گیا ناول ہے اور ''شاید کہ تیرے دل میں اتر جائے مری بات'' سانحہ گجرات پر تحریر کیا گیا مضمون ہے۔ ان دونوں تحریروں میں سچائیوں کو بڑی دردمندی سے بیان کیا گیا ہے اور سانحہ کا پورا منظر نگاہوں سامنے زندہ ہوجاتا ہے۔ ان دونوں تحریروں سے اقبال متین بے حد متاثر تھے۔ ان کے بیٹے وحید اقبال جو لاُابالی پن کا شکار تھے، سانحہ گجرات سے متاثر ہوکر خبریں دیکھنے کی طرف مائل ہوئے۔ اسی درمیان اقبال متین نے انھیں زاہد علی خاں کا مذکورہ مضمون پڑھنے کو دیا۔ اسے پڑھ کر ان کی اندرونی کیفیت میں تبدیلی ہوئی اور ان کے اندر نیک وصالح جذبہ پیدا ہوا۔ تحریر کی اس خوبی پر اقبال متین اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''مبارک ہے وہ قلم جو ذہنوں کی سوچ بدل دیتا ہے۔ جو نوجوانی کی گمرہی کو
راستہ سجھا کر سنجیدگی عطا کرسکتا ہے۔ جو ہمارے ماضی کو اٹھا کر مستقبل کے
حوالے اسی طرح کرسکتا ہے کہ اسلاف کا صالح ذہنی اثاثہ مستقبل کی باوقار
شادابی بن سکے۔ خدا کرے ہندوستان بھر کا ہر نوجوان اس شادابی کو پہچان
سکے۔'' (۳۳)

اس مضمون میں اقبال متین نے مذکورہ دونوں تحریروں کے حوالے سے یہ بیان کیا ہے کہ اگر تحریر میں

دردمندی اور صداقت ہو تو تحریر قلم کی توقیر کا سامان بھی فراہم کرتی ہے، ماضی کی حقیقی تصویر بھی سامنے آتی ہے اور ذہنوں کی آبیاری میں بھی اس سے مدد ملتی ہے۔ ''کل کی حقیقت آج کہانی'' کے عنوان سے اپنے مضمون میں اقبال متین نے اپنی گھریلو مصروفیتوں، الجھنوں اور محرومیوں کو بیان کرتے ہوئے اپنے گذشتہ زندگی کی جھلک دکھائی ہے۔ یہ ''باتیں ہماریاں'' کا آخری مضمون ہے۔ معروف ناقد وہاب اشرفی نے ''باتیں ہماریاں'' پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے۔ وہ رقم طراز ہیں:

> ''باتیں ہماریاں'' دراصل اقبال متین کی بعض یادداشتوں پر مشتمل ایک کتاب ہے۔...اقبال متین نے اپنی یادداشتوں کو افسانوی نہج اور دھج دینے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ ان کی یادداشتوں کا ہر فرد حقیقی ہونے کے باوجود افسانوی رنگ ڈھنگ اختیار کر لیتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ متعلقہ پیکر سامنے کھڑا ہے۔ ... ہاشم علی اختر کی بیگم وحید بی بی کا کردار جس طرح سامنے آیا ہے وہ بڑا دلکش ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وحید بی بی ہمارے سامنے زندہ و تابندہ کھڑی ہیں۔ اقبال متین کی یادیں آپ بیتی سے مختلف کیفیت رکھتی ہیں۔ کاش کہ وہ اپنی یادوں کو سرگذشت بنا سکتے اور ایک بھرپور کتاب اس موضوع پر لا سکتے جس کے وہ ہر طرح اہل ہیں۔ یہ منتخب یادیں اردو والوں کے لیے ایک بیش قیمت تحفہ ہے۔ اقبال متین کی زبان سہل، رواں، دلکش اور پرکشش ہے۔'' (۳۴)

ڈاکٹر محمد علی اثر نے ''باتیں ہماریاں'' پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے۔

> ''باتیں ہماریاں'' اقبال متین کی بے مثال یادوں کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب میں مصنف کی سترہ تحریریں ہیں جن میں متین صاحب نے ماضی کی یادوں کو ذہن کے پردے پر یکجا کر کے ان سے زندگی کے گزرے ہوئے واقعات کی تجدید کی ہے۔ یہ دلچسپ یادیں اردو والوں کے لیے ایک گراں قدر تحفہ ہیں۔ اقبال متین کی زبان رواں دواں سہل اور پرکشش ہے اور اپنے اندر بلا کی جاذبیت رکھتی ہے۔'' (۳۵)

یوسف ناظم نے ''باتیں ہماریاں'' کا مطالعہ کرتے ہوئے اپنے تاثرات کا اظہار یوں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''باتیں ہماریاں'' کی دو خوبیاں روز روشن کی طرح نمایاں ہیں۔ ایک تو کتاب کا نام بالکل صحیح النسب ہے۔ دوسرے اس میں سچ ہی سچ ہے جب

کہ اس نوع کی کتابوں میں زیب داستاں باتوں کی کھلی اور غلوٹی کی جو دروغ گوئی کی حدوں کو چھوتا ہو، مخفی اجازت ہے۔ کتاب میں گھریلو اور نجی محفلوں کی دل چسپ اور دل گداز رودادیں بھی شامل ہیں جن میں محبت، یگانگت اور خلوص کی بہتات، افراط اور نشاط انگیز خوشبو میں رواں دواں ہیں۔ وہیں کہیں کہیں آنسوؤں اور دبی دبی سسکیوں کی بھی آمیزش ہے۔ ان رودادوں کو قلم بند کرتے ہوئے پتہ نہیں مصنف کے دل پر کیا گزری ہوگی لیکن ان کے سچ اور ۲۴ قیراطی سونے سے ملتا جلتا عن و من پیش کرنے کے سلیقے نے اقبال متین کی تحریر کو چندے آفتاب چندے ماہتاب بنا دیا۔ قلم کہیں لڑکھڑایا نہیں۔ اقبال متین کتنے خوش قسمت ہیں کہ انہیں لکھنے کے لیے لوہے کا قلم ملا ہے جس میں روانی اور تیز رفتاری زبردست ہے کہ قلم کو اشہب قلم بنا دیتی ہے۔.... یہ کتاب نہیں سفرنامہ بھی نہیں ہے۔ پھر یہ کیا ہے ... یہ اقبال متین کا اعمال نامہ ہے اور ان کی نجات کا سرنامہ.... قلم ہو تو ایسا ہو اور حافظہ ہو تو ایسا... مبارکباد کا لفظ تو بہت چھوٹا پڑے گا۔ اس لیے میں دم بہ خود رہنا پسند کروں گا۔" (۳۶)

اقبال متین کی یادنگاری کے تفصیلی جائزہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ انھوں نے اپنی یادوں پر مبنی تاثرات کی مدد سے اپنی اور دوسری شخصیتوں کی جو تصویریں دکھائی ہیں وہ جاذب نظر اور پرکشش ہیں۔ اقبال متین کی یہ یادیں کئی اعتبار سے اہمّیت کی حامل ہیں۔ انھوں نے اپنی یادوں میں اپنے ہم عصر ادیبوں، دوستوں اور اہم شخصیتوں سے اپنی ملاقاتوں کی روداد اس فنکاری سے بیان کی ہے کہ قاری اپنے آپ کو اس محفل میں شریک پاتا ہے۔ ان یادوں میں حیدرآباد کی اہم ادبی شخصیتیں اپنی رنگارنگ خصوصیات کے ساتھ نظر آتی ہیں اور وہاں کی علمی و ادبی محفلوں کی تصویریں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ اس میں شخصیت کے حوالے سے اور ادب اور ادبی رجحانات کے حوالے سے بڑی اہم باتیں دلکش انداز میں بیان کی گئی ہیں جس کو پڑھ کر قاری کی بصیرت و آگہی میں بھی اضافہ ہوتا ہے اور ادبی لذّت و چاشنی بھی حاصل ہوتی ہے۔ یہ یادیں ایک طرح سے ادبی منظرناموں اور ادبی شخصیتوں کے دستاویز کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان یادوں کو پڑھ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس میں یادنگاری کے فن کی بیشتر خوبیاں موجود ہیں اور اقبال متین نے اس فن میں بھی اپنے کمال کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال متین اردو کے ایک اہم اور منفرد و ممتاز یادنگار کی حیثیت سے بھی ادب میں اہم مقام رکھتے ہیں۔

اقبال متین کی مضمون نگاری کا موضوعاتی مطالعہ

مضمون، بھی خاکہ اور یادنگاری کی طرح ایک غیر افسانوی نثری صنف ہے۔اس میں لکھنے والا اپنے خیال اور تجربے کو مرتب انداز میں پیش کرتا ہے۔اس کے لیے موضوع کی کوئی قید نہیں ہے۔مضمون نگار کسی بھی موضوع پر مربوط انداز میں مضمون لکھ سکتا ہے۔اس میں خیالات کا تسلسل ضروری ہے۔قاضی افضال حسین صنف مضمون اوراس کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''مضمون' نثر میں اظہار کی ایک ہیئت/فارم ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے ترکیب بند، ترجیع بند یا مسدس شاعری میں اظہار کی ہیئتیں ہیں۔مضمون کو صنف کا درجہ اس کے مواد اوراس مواد کی پیش کش کے شناختی امتیازات اور طریقۂ کار سے حاصل ہوتا ہے۔....مضمون کی ہیئت کے لیے پہلی اور بنیادی شرط الفاظ اور صفحات کی تحدید ہے، جو متعین نہیں اور جس کا انحصار موضوع کے امکانات پر ہوتا ہے۔ چونکہ مضمون کسی ایک موضوع کے کسی ایک پہلو/جہت کا بیانیہ ہوتا ہے۔مثلاً 'میر'، 'غالب'، 'تہذیب'، یا 'اخلاق'، یا کسی کھیل کے متعلق اپنے خیالات قلم بند کرتے ہوئے مضمون نگار اپنے موضوع کے کسی ایک پہلو یا جہت کا انتخاب کرتا اور پھر اس پہلو کے امکانات وجہات کا جائزہ لیتا ہے۔مضمون کے متعلق لکھنے والے بعض ناقدین نے اس صفت کو یک جہتی یا عدم تکمیل کا نام دیا ہے، اس طرح:
''موضوع کے کسی ایک پہلو/جہت پر مضمون نگار کے مرتب کیے ہوئے متن کو مضمون کہتے ہیں۔''(۱)

ڈاکٹر سیّدہ جعفر مضمون کی تعریف کرتے ہوئے اس کی اہمّیت ومعنویت پر یوں روشنی ڈالتی ہیں۔وہ لکھتی ہیں:

''اسے کسی خاص موضوع کے بارے میں لکھنے والے کے خیالات اور

جذبات کے ردِّعمل کا پرتو ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسا ادب پارہ ہوتا ہے جس میں بیک وقت فکرانگیزی، خیال کی رعنائی، تاثرات کی دلفریب ترجمانی، اسلوب کا نکھار اور تصوّر کی لطافت، سب ہی عناصر سموئے ہوئے ملتے ہیں۔ اسے ہمارے ذہن کو ایک خاص ذوق آگاہی بخشتا ہے اور ہمارے جذبات میں ایک انبساط پرور تازگی اور تابنا کی پیدا کرتا ہے۔ اسے کی صنف میں بڑی لچک اور اس کے موضوعات میں بڑی ہمہ گیری اور وسعت پائی جاتی ہے۔ اس صنفِ ادب کے ذریعہ سے بہت سے کام لئے گئے ہیں۔ کبھی مضمون نگاری سماجی اور ذہنی بیداری کے حربے کے طور پر استعمال ہوتی ہے تو کبھی اصلاحی وافادی مقصد کی اشاعت اور کبھی انسانی جذبات کی حسین اور رنگین مرقع کشی کے لیے۔ مضامین کے ذریعہ سے مزاح اور ظرافت کی پھلجھڑیاں بھی چھوڑی گئی ہیں اور طنز کے تیر بھی برسائے گئے ہیں۔''(۲)

مضمون، انشائیہ سے الگ ہوتا ہے۔ مضمون کا اہم وصف سنجیدگی ومتانت ہے۔ یہی وصف مضمون کو انشائیہ سے الگ کرتا ہے۔ مضمون اور انشائیہ کے درمیان فرق کو واضح کرتے ہوئے نظیر صدّیقی رقم طراز ہیں:

''مضمون اور انشائیے کا بنیادی فرق صرف یہ نہیں کہ مضمون غیر شخصی ہوتا ہے اور انشائیہ شخصی۔ بلکہ ان دونوں میں ایک بنیادی فرق یہ بھی ہے کہ جہاں مضمون ہر اعتبار سے (موضوع، مقصد، اندازِ نظر، اندازِ بیان سے) سنجیدہ ہوتا ہے، وہاں انشائیہ کسی نہ کسی اعتبار سے غیر سنجیدہ یعنی لائٹ ہوتا ہے۔''(۳)

مضمون، مقالہ سے بھی علیحدہ ہوتا ہے۔ مقالہ میں تحقیق کا پہلو حاوی رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مقالہ بھاری بھرکم ہوتا ہے۔ اس میں گہرائی وگیرائی اور متانت وسنجیدگی کے اوصاف بہت زیادہ پائے جاتے ہیں۔ یہ اوصاف مضمون میں بھی ملتے ہیں مگر مقالہ کے مقابلہ میں اس میں کم پائے جاتے ہیں۔ مضمون میں مضمون نگار مختلف موضوعات پر ہلکے فلسفیانہ رنگ میں اپنے تاثرات بیان کرتا ہے جن سے نفس موضوع سے متعلق کوئی نکتہ یا پہلو سامنے آتا ہے۔ جہاں تک موضوعات کا تعلق ہے تو دنیا کے سارے موضوعات پر مضامین لکھے جاسکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ موضوع کے اعتبار سے مضمون کی مختلف اقسام ہیں جیسے علمی، ادبی، سیاسی، سماجی، تہذیبی، ثقافتی، مذہبی اور معلوماتی وغیرہ۔ جن مضامین میں ادب یا کسی ادبی پہلو پر گفتگو کی جاتی ہے انھیں ادبی مضامین کے زمرہ میں شمار کیا جاتا ہے۔

مضمون نگاری کے فنّی آداب:

مضمون نگاری کا فنّی تقاضا یہ ہے کہ مضمون نگار کسی موضوع پر مربوط انداز میں اظہار خیال کرے۔ وہ پہلے اپنے موضوع کا تعارف کرائے پھر درمیان میں مختلف پیرا گراف میں نفسِ موضوع کی مختلف جہتوں کا احاطہ کرتے ہوئے موضوع سے متعلق خوبیوں اور خامیوں کا ذکر کرے اور آخر میں بحث کی تمام جہتوں کو سمیٹ لے یا اس بحث سے جو نتائج نکلتے ہوں، انھیں مرتب کردے۔ قاضی افضال حسین لکھتے ہیں:

> ''مثالی مضمون کی باقاعدہ ایک ''وضع'' (Structure) ہوتی ہے، جس کے اجزا قابلِ شناخت ہوتے ہیں۔ مثلاً کوئی مضمون اپنے موضوع کے تعارف سے شروع ہوگا اور پھر موضوع زیر بحث کی ہر جہت کا، اس کی اہمیت کے اعتبار سے مختلف پیرا گراف میں بہ ترتیب احاطہ کیا جائے گا۔ مثالی مضمون میں اختتامیہ بحث کی تمام جہتوں کو یا تو سمیٹ رہا ہوگا یا اس بحث سے جو نتائج برآمد ہوں گے، انہیں مرتب کیا گیا ہوگا۔ مضمون کے یہ تمام اجزا مل کر متن کو ایک وحدت کی شکل دیتے ہیں۔ مضمون کی یہ وحدت ایک اچھے مضمون کا امتیاز تصور کی جاتی ہے۔''(۴)

مضمون کو بہتر بنانے میں زبان و بیان کا بہت اہم رول ہوتا ہے۔ مضمون میں اس کے موضوع کے مطابق زبان و بیان اختیار کی جانی چاہئے۔ مناسب و موزوں اندازِ بیان ہی سے مضمون میں بے ساختگی پیدا ہوتی ہے۔

اُردو میں مضمون نگاری کا آغاز سرسیّد کی تحریروں سے ہوتا ہے۔ سرسیّد اور ان کے معاصرین نے مضمون نگاری کو سماجی اصلاح کے ایک وسیلے کے طور پر استعمال کیا۔ اس عہد میں سماجی موضوعات کے علاوہ علمی، ادبی، فلسفیانہ اور تہذیبی و معاشرتی موضوعات پر بھی مضامین لکھے گئے اور مضمون نگاری ایک صنف کی حیثیت سے رائج ہوئی۔ خواجہ الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی، محمد حسین آزاد، ڈپٹی نذیر احمد، میر ناصر علی، نیاز فتح پوری، رشید احمد صدّیقی، مہدی افادی، سجّاد انصاری، خواجہ حسن نظامی، مرزا فرحت اللہ بیگ، محفوظ علی بدایونی، مولانا ابوالکلام آزاد، اور خواجہ غلام السیّدین وغیرہ اردو کے اہم مضمون نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔

اُردو میں مضمون نگاری ایک مقبول اور ترقی یافتہ صنف کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کی ایک وقیع اور

توانا روایت ہے۔ اُردو کے تقریباً تمام یا بیشتر ادیبوں نے اس صنف کو اپنایا اور اسے پروان چڑھانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ اردو کے دیگر ادیبوں کی طرح اقبال متین نے بھی مضامین لکھے ہیں اور وہ مضمون نگار کی حیثیت سے بھی اپنی شناخت رکھتے ہیں۔

''اعتراف وانحراف'' اقبال متین کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ کتاب دس مضامین پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں شامل مضامین کے عنوانات اس طرح ہیں۔ ''قاضی عبدالستار ایک کم آمیز دل نشینی''، ''جینے والا، عابد سہیل''، ''نجات سے پہلے' کا شاعر، قاضی سلیم''، ''ایک فن کار صلیب بدوش، ناصر بغدادی''، ''محنت ومحبت کا دوسرا نام، محبوب حسین جگر''، ''زمانے سے خوں بہا وصول کرنے والا شاعر، صابر دت''، ''افسانوں کی افسانوی لڑکی، بانو سرتاج اب ایک خاتونِ محترم ہے''، ''چھُپا چھُپا قد آور کہانی کار، بلراج ورما''، خالد رحیم، کرنوں سے پٹا غبار راہ گزر''، ''آہنگ کے حوالے سے''۔ یہ تعارفی وتبصراتی نوعیت کے مضامین ہیں۔

اقبال متین نے یہ مضامین اپنے ہم عصر ادبی شخصیتوں قاضی عبدالستار، عابد سہیل، قاضی سلیم، ناصر بغدادی، محبوب حسین جگر، صابر دت، بانو سرتاج، بلراج ورما اور خالد رحیم پر قلم بند کئے ہیں۔ ان شخصیات سے اقبال متین کا رابطہ رہا ہے اور ان سے ان کے علمی وادبی تعلقات رہے ہیں۔ ان مضامین میں ان پہلوؤں کا بھی بیان ملتا ہے۔ ان مضامین میں اقبال متین نے مذکورہ ادبی ہستیوں کی شخصیت وفن کے تعلق سے اپنے دلچسپ تاثرات وخیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان خیالات میں تنقیدی بصیرت کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔ اقبال متین نے یہ مضامین مذکورہ فن کاروں کے اعتراف میں لکھے ہیں۔ اس لیے انھوں نے ان کی خامیوں کو کم خوبیوں کو زیادہ اُجاگر کیا ہے۔ ان مضامین میں مضمون نگار کا شخصیت و فن کو دیکھنے کا مخصوص تخلیقی انداز اسے منفرد بناتا ہے۔ بعض مضامین جیسے ''جینے والا، عابد سہیل'' اور ''ایک فن کار صلیب بدوش، ناصر بغدادی'' فکشن کی تنقید کے اعتبار سے وقیع نوعیت کے حامل ہیں۔ ان میں فن کے منفرد پہلوؤں کو جس طرح اُجاگر کیا گیا ہے، وہ ان کی فنّی ہنرمندی پر دال ہے۔

''اعتراف وانحراف'' میں شامل پہلا مضمون ''قاضی عبدالستار، ایک کم آمیز دل نشینی'' کے عنوان سے ہے۔ اس میں اقبال متین نے قاضی عبدالستار پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے ان کی شخصیت وفن

کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔اس کا موضوع قاضی عبدالستار کی شخصیت وفن کا تعارف ہے۔ان کی شخصیت وفن پر اقبال متین نے اپنی کتاب ''باتیں ہماریاں'' میں شامل مضمون بعنوان ''رفاقت کے دونام،قاضی اورغیاث'' میں بھی اظہارِخیال کیا ہے۔دونوں مضامین یکساں ہیں۔دونوں میں اقبال متین نے ان کی شخصیت وفن کی خوبیوں کا تعارف بڑے دلچسپ انداز میں کرایا ہے۔اقبال متین قاضی عبدالستار کے دوستوں میں تھے۔قاضی عبدالستار بہ حیثیت تخلیق کار اپنی نسل کے لوگوں میں اقبال متین کو بے حد پسند کرتے تھے۔وہ ان کے ساتھ بڑے خلوص سے پیش آتے تھے۔انھوں نے علی گڑھ کے کئی سیمیناروں میں انھیں مدعو کیا،ان کی عزّت افزائی کی اوران کے ساتھ خلوص ومحبّت کا برتاؤ کیا۔ان باتوں پرروشنی ڈالنے کے ساتھ اقبال متین نے ان سے ہوئی پُرلطف ملاقاتوں اوران کے خلوص ومحبت کو بڑے والہانہ انداز میں بیان کیا ہے۔

اس کتاب میں شامل دوسرا مضمون بعنوان ''جینے والا عابد سہیل'' ہے۔اس میں اقبال متین نے عابد سہیل کی افسانہ نگاری پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔انھوں نے ان کے افسانوی فن پر اپنے وقیع خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ان کی انفرادیت پراس طرح روشنی ڈالی ہے۔وہ رقم طراز ہیں:

> ''عابد سُہیل بڑی نرمی اورگھلاوٹ سے اپنی کہانیوں میں زندگی کے گوناگوں رجائی اورقنوطی جذبے آنکھ بچا کر سمیٹتا جاتا ہے پھر ماجرے کا اظہار کچھ اس طرح کرتا ہے جیسے وہ خود اپنی کہانی میں کچھ نہیں کہہ رہا ہے بلکہ اس کی کہانیاں خود اس سے اور اپنے قاری سے تخاطب کو بیانیہ کا وسیلہ بنائے ہوئے ہیں۔اس طرح کہانی میں پوری طرح سما کر کہانی سے الگ ہوجانا یا ان میں کرداروں کے ساتھ دوستی نباہتے نباہتے اس طرح اجنبی ہوجانا جیسے ان کے ساتھ رہنے کی علت سے کرداروں کی آزادہ روئی سلب ہوکر رہ جاتی ہے۔عابد سہیل کا ایک ایسا ہُنر ہے جو بڑی کہانی کے امکانات کوتقویت دیتا ہے اوراس کی انفرادیت کے لئے کوئی اشتباہ نہیں رہ جاتا۔عابد سُہیل میری پیڑھی کے ان افسانہ نگاروں میں سے ہے جس کی کہانی سوچی سمجھی پرداختہ دانش وری کے سہارے،استعارہ سازی وفلسفہ طرازی کو روانہیں رکھتی کہ بوجھل ہوکر بیانیہ کی رواں دواں زیریں سطح کے تخلیقی بہاؤ کا سدباب کرے جو پڑھنے والے کے ذہن سے راست ارتباط کی موانست کے منافی ہو۔وہ

بڑی نرمی سے کہانی کی چلت پھرت کو نوکِ قلم سے چھوتا رہتا ہے اور کہانی
اپنے آپ سے گزرتی رہتی ہے۔''(۱)

اقبال متین نے عابد سہیل پر گفتگو کرتے ہوئے ان کے بارے میں کئی دلچسپ باتیں بیان کی ہیں۔ مثلاً عابد سہیل نے اپنے معاصر فن کاروں پر توجّہ دی اور انھیں سراہا۔انھوں نے اقبال متین پر بہ طور خصوصی توجّہ دی۔ان کے ناولٹ ''چراغِ تہہِ داماں'' کو جسے آندھرا پردیش اردو اکیڈمی نے فحش قرار دے کر انعام سے مسترد کر دیا تھا، پہلی مرتبہ عابد سہیل نے ہی شائع کیا تھا اور اس کے بارے میں اپنے تنقیدی خیالات کا اظہار کیا تھا۔ان کے تنقیدی جملوں نے اس ناولٹ پر سنجیدہ تنقیدی بحث کی بنیاد فراہم کی۔اس کے نتیجہ میں اس ناولٹ پر کئی اچھے تنقیدی مضامین لکھے گئے جس میں ناولٹ کی فنی خوبیوں کا اعتراف کرتے ہوئے اس کی پذیرائی کی گئی اور ناولٹ نگار کو انعامات واعزازات سے سرفراز کیا گیا۔یہ سب عابد سہیل کی توجہ اور ان کی پذیرائی سے ہوا۔اس لیے اقبال متین نے ان کی توجہ،عنایت اور خلوص ومحبت کا ذکر بڑی عقیدت سے کیا ہے۔اقبال متین کے بارے میں کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی نے حوصلہ افزا کلمات کہے تھے۔ یہاں انھوں نے اس کا بھی ذکر کیا ہے اس کے علاوہ انھوں نے اپنے ہم عصر تخلیق کاروں، ادیبوں اور ناقدوں کے مثبت ومنفی رویّوں کے تعلق سے بھی اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ بر سبیل تذکرہ ان باتوں کو بیان کرنے کے علاوہ اقبال متین نے اس مضمون میں دراصل عابد سہیل کے افسانوں کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے اور اس کی فکری وفنی خوبیوں سے بحث کی ہے۔ایک جگہ انھوں نے ان کی افسانہ نگاری کے تعلق سے لکھا ہے۔

''عابد سہیل کہانی کو برتنے اور جھوٹی ہونے لگے تو مانج کر افسانویت کے بازار میں چورا ہے پر بیٹھا اپنی ہی دھن میں صیقل کرنے کا کاروبار کئے جاتا ہے کہ اس کی تحریر کو اچٹتی نظروں سے دیکھ کر گزر جانے والا مجبور محض ہو کر ٹھہر جاتا ہے عابد سہیل نہ کوئی آواز لگاتا ہے نہ گذر جانے والے کو روکتا ہے وہ بخیہ گری میں مصروف ہے۔آپ رُکیں تب بھی تکمہ لگے گا آپ نہ رکیں تب بھی ٹانکے نہیں الجھیں گے۔وہ کبھی کہانی کے آغاز سے پڑھنے والے کا ذہن پکڑ لیتا ہے اور کبھی اپنی کہانی میں خود اپنے ہی سے الجھا الجھا سا رہتا ہے۔ قاری سے اس کی تحریر کا رشتہ 'جڑنے' میں دیر لگ جاتی ہے تو وہ شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر (وہی جانے) قاری کے ذہن کو دو جملوں میں اپنی گرفت

میں لے لیتا ہے۔'' (۲)

اقبال متین نے عابد سہیل کے چند افسانوں کے تجزیے بھی کیے ہیں۔ ان تجزیوں میں انھوں نے جس مہارت سے افسانوں کی فکری وفنی خوبیوں اوراس کی معنویت کو آشکار کیا ہے اس کی وجہ سے یہ تجزیے بڑے خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔ ان تجزیوں میں فکشن تنقید کے عمدہ نمونے بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اقبال متین نے اس مضمون میں جس تنقیدی بصیرت سے عابد سہیل کی افسانہ نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی خوبیوں کو اُجاگر کیا ہے اوراس کی انفرادیت پر روشنی ڈالی ہے، اس کی وجہ سے وہ فکشن کے اچھے پارکھ کی شکل میں سامنے آتے ہیں۔ عابد سہیل کی افسانہ نگاری پر یہ ایک اچھوتا مضمون ہے۔ اس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا موضوع بہ حیثیت افسانہ نگار عابد سہیل کی انفرادیت واہمّیت ہے۔

اس کتاب کا تیسرا مضمون ''نجات سے پہلے کا شاعر، قاضی سلیم'' ہے۔ یہ ایک طویل تبصراتی مضمون ہے۔ اس میں اقبال متین نے قاضی سلیم کے شعری مجموعہ ''نجات سے پہلے'' پر تبصرہ کیا ہے۔ یہ ایک غیر رسمی تبصرہ ہے جس میں اقبال متین نے اردو نظم نگاری کے منظر نامہ پر روشنی ڈالتے ہوئے قاضی سلیم کی نظموں کا جائزہ لیا ہے۔ اس کا موضوع قاضی سلیم کی نظم نگاری کی انفرادیت 'نجات سے پہلے' کی روشنی میں ہے۔ دیکھیۓ اقبال متین نے 'نجات سے پہلے' پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کی نظم نگاری کے منفرد پہلوؤں کو کس خوبی سے بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''قاضی سلیم کے فنی اظہار میں حسین وجمیل دھجی دھجی چیدہ پیکروں کی رفوگری اور پھر پیوندکاری کا ہنر ہے۔ وہ موضوع میں بکھرے ہوئے احساس کے ٹکڑے چن کر نظم کی قبا میں ٹانکتے جاتے ہیں، اس طرح جو فرغل سامنے آتی ہے، اس میں زندگی کے کئی رنگ تکمے کا کام دیتے ہیں۔ ان کی اکثر اچھی نظمیں، لگتا ہے اختتام سے شروع ہورہی ہیں۔ جب ہم نظم پڑھتے پڑھتے کسی بند کی تکمیل پر ٹھہرتے ہیں تو نظم ہمارے سامنے اپنے معانی کا دفتر لئے ختم ہوتی ہے۔ لیکن ان کے احساس کی پنہاں پنہاں استقامت اور ادراکِ فن کی صلابت، نظم کی معنوی تہہ داری اور غنائی کشش کو لے کر آگے بڑھ جاتی ہے اور نظم کے ختم ہونے تک ایسے دو چار مقام اور آسکتے ہیں اور یہ بند دفتر ورق ورق کھلتا ہے۔ الفاظ میں امیجری کو اس کی دیدہ ور، پرتاثیر وسعتوں کے ساتھ سمیٹ لینا، قاضی سلیم کا وصف خاص ہے۔ طویل نظم ہو کہ

مختصر نظم، ان کے اظہار میں بڑی درایت ہے۔"(۳)

اقبال متین نے قاضی سلیم کے شعری مجموعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کی نظموں کی انفرادیت پر اس طرح روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "قاضی سلیم کو ان کی شعری لفظیات کا تازہ کار برتاؤ، ان کی آواز کا نیا لہجہ، نیا پن ان کے ہم عصروں میں اس حد تک منفرد بنا دیتا ہے کہ وہ صاف پہچانے جاتے ہیں۔ ان کی شاعری میں الفاظ کا استعمال کار شیشہ گراں کے طور پر نہیں ہوتا، مٹی کے ایسے کھردرے بت ڈھالنے کا کام کرتا ہے، جو مفہوم کی ندرت کو کھرچ کھرچ کر زبان و بیان کا یارا بناتے ہیں۔"(۴)

اقبال متین نے اس مضمون میں قاضی سلیم کی نظموں کے کچھ بند بھی نقل کئے ہیں اور اس کے فکر انگیز تجزیے کئے ہیں۔ انھوں نے ان کی نظموں کے تعلق سے اپنے مخصوص و منفرد انداز میں بڑے کام اور پتے کی باتیں کہی ہیں اور اس کے فکری و فنی محاسن کو اُجاگر کیا ہے۔ قاضی سلیم کے شعری مجموعہ "نجات سے پہلے" پر یہ ایک طویل لیکن غیر رسمی اور بھرپور تبصرہ ہے۔ "ایک فن کار صلیب بدوش، ناصر بغدادی" کے عنوان سے اپنے طویل مضمون میں اقبال متین نے ناصر بغدادی کے افسانوی مجموعہ "مصلوب" کے افسانوں کا جائزہ لیا ہے۔ اس جائزہ کے دوران انھوں نے ان کے افسانوی بیانیہ کے تعلق سے اظہارِ خیال کیا ہے کہ ناصر بغدادی کا تخلیقی بیانیہ فکری و فنی تہہ داری سے لبریز ہے جو قاری کو اپنی گرفت میں لیتا ہے۔ یہ سپاٹ بیانیہ نہیں ہے۔ ایک جگہ اقبال متین نے ناصر بغدادی کی افسانہ نگاری کی فنی ہنرمندی کے تعلق سے لکھا ہے۔

> "یہ عجیب بات ہے کہ ناصر کے افسانوں کی قرات آشنائی یا مطالعہ پذیری (READABILITY) آپ کو اول و آخر سے خود بچا لے جاتی ہے جہاں آپ نے افسانہ پڑھنا شروع کیا وہیں آپ افسانے کے ہو رہے۔ ....سعادت حسن منٹو جس کو میں موپاساں سے بڑا افسانہ نگار مانتا ہوں اس کے پاس وہی رواں دواں اظہار تحریر کی جان بنتا جاتا ہے اور آپ کسی رکاوٹ کے بغیر لفظ لفظ افسانے کے ہوتے جاتے ہیں۔ ناصر بغدادی کے افسانے اسی لئے منٹو کے پاس دھرے ہوئے ملتے ہیں کہ بیانیہ کی نامیاتی قوت سے دونوں فن کاروں نے اس حد تک فائدہ اٹھایا ہے کہ موڈ اور وقت

کو گرفت میں رکھتے ہوئے ان کی افسانے کبھی ہنستے رقص کرتے، کبھی منہ بسورتے بین کرتے قاری کو افسانے کا جز بنالیتے ہیں اور یہ ہنر کچھ ایسا آسان نہیں۔'' (۵)

ناصر بغدادی جدیدیت کے دور کے نمائندہ افسانہ نگار ہیں۔ انھوں نے افسانے کم ضرور لکھے مگر اچھے افسانے لکھے ہیں۔ ان کا شمار اردو کے ممتاز وقد آور افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ وہ اپنے معاصرین میں بھی منفرد شناخت رکھتے ہیں۔ ان کی انفرادیت کے تعلق سے اقبال متین رقم طراز ہیں:

''ناصر بغدادی کے افسانوں میں بیانیہ کی تجریدی انفرادیت اسے اپنے ہم عصر لکھنے والوں سے اسی وصف کی بناپر الگ کرتی ہے کہ وہ بیانیہ افسانے کا آرٹ بنانے پر قدرت رکھتا ہے۔ اس کے افسانوں میں تجریدیت کرداروں کے اعمال وافعال سے ہویدا ہوتی ہے اوران کے ذہنی انتشار کی نفسیاتی گرہیں ناصر کے قلم کی مرہون منت ہوکر کھلتی ہیں۔'' (۶)

اقبال متین نے اس مضمون میں ناصر بغدادی کے چندافسانوں کے بصیرت افروز تجزیے کئے ہیں۔ ان تجزیوں کو پڑھ کر ان کی تنقیدی بصیرت اورفن کارانہ مہارت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ انھوں نے ''مصلوب'' کے افسانوں کا بھرپور جائزہ لینے کے بعد ناصر بغدادی کے فن کے تعلق سے اپنی رائے کا اظہار یوں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''مجھے بہت اعتماد کے ساتھ یہ کہنا ہے کہ ناصر بغدادی کے دوسرے مجموعے ''مصلوب'' میں ناصر کی کہانیاں نہ صرف اس کے، اس خاص موضوع سے جو انسانیت کو درندگی کے تابع کئے ہوئے ہے اور شہر کا شہر قتل گاہ بنا ہوا ہے کچھ اس طرح انصاف کرتی ہیں کہ اس کی تحریر کی دردمندی اور علامتی بیانیہ کی ایسی تہہ داری واسلوبیاتی انفرادیت اس کو دوسرے افسانہ نگاروں سے نہ صرف ممیّز کرتی ہے ایک ایسی بلندی کی طرف لے جاتی ہے جس کا وہ تنہا مسافر ہے۔ اب جب کہ اس کی تحریر کی فن کاری کا منفرد مزاج تسلیم کیا جاچکا ہے تو موضوعات کے تنوع میں بھی اس کی انفرادیت کی چھاپ قائم ہوگئی ہے۔ میں پھر کہوں گا کہ افسانے کے اس یکا وتنہا مسافر کو افسانے کا مستقبل بغیر کسی کی اعانت کے گلے لگالے گا اور اس کو نظرانداز کرنے والے اس کا منہ دیکھتے رہیں گے۔'' (۷)

اس مضمون کا موضوع ناصر بغدادی کی افسانہ نگاری کی انفرادیت واہمیّت 'مصلوب' کی روشنی میں ہے۔ اقبال متین نے اپنی تنقیدی بصیرت سے کام لیتے ہوئے بڑی محنت ومشقت سے یہ مضمون لکھا ہے۔ اس میں انھوں نے عمیق نظر سے ناصر بغدادی کے افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے اوراس کے منفرد پہلوؤں کوتلاش کیا ہے۔ ناصر بغدادی کی افسانہ نگاری پر یہ ایک جامع اور فکرانگیز مضمون ہے۔

''اعتراف وانحراف'' میں شامل پانچواں مضمون ''محنت ومحبت کا دوسرا نام، محبوب حسین جگر'' کے عنوان سے ہے۔ اس میں اقبال متین نے محبوب حسین جگر کی شخصیت اوران کی صحافتی خدمات پر روشنی ڈالی ہے۔ یہی اس مضمون کا موضوع ہے۔ محبوب حسین جگر اور عابدعلی خاں روزنامہ سیاست کے بانی تھے۔ دونوں نے مل کراس اخبار کی ترقی کے لیے بڑی کوششیں کیں، خصوصاً محبوب حسین جگر نے اس کے لیے بڑی محنت کی اور محبت کے جذبہ سے کام کیا۔ اسی لیے اقبال متین نے ان کی شخصیت کومحنت ومحبت کا دوسرا نام دیا ہے۔ محبوب حسین جگر بے لوث قسم کے انسان تھے۔ نام ونمود اور شہرت ونا موری سے وہ کوسوں دور تھے۔ وہ درویش صفت بھی تھے۔ استغنا ان کے مزاج کا حصّہ تھا۔ ان میں دوسروں کے کام آنے کا جذبہ بے پناہ تھا۔ انھیں نہ صلہ کی تمنّا تھی اور نہ ستائش کی پرواہ۔ انھوں نے بڑی محنت ولگن اور خلوص ومحبت سے روزنامہ سیاست کے لیے کام کیا۔ دیکھئے اقبال متین نے ان کی پُرخلوص شخصیت اوران کی محنت ولگن کا تعارف کس دلچسپ انداز میں کرایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''وہ دیکھو وہ اخبار سیاست کے دفتر کے شیشوں میں گھرا ہوا، اپنے ہی تنفس سے کھیلتا ہوا ریڑھ کی ہڈی کے درد کو نرم توشکوں، گدیوں سے بچا کر گرم سلاخوں سے داغتا ہوا ایک شخص اس طرح بیٹھا ہے جو شیشوں کے باہر سے دکھائی نہیں دیتا۔ قریب پہنچو تو خود باہر ہی باہر سے دکھائی دیتا ہے، اندر سے ہرگز دکھائی نہیں دیتا۔ اور کام کیے جاتا ہے۔ کام کیے جاتا ہے۔ کیوں؟ کس کے لیے؟ اس شخص کی شناخت کیا ہے؟ روزنامہ سیاست، جانی جگری دوست عابد صاحب لیکن یہ خود کیا ہے، کون ہے، کیوں ہے۔ ایک بھٹکتی ہوئی نیکی جس کو خود اپنا پتا نہیں ہے۔ ایک نامی گرامی جس کو خود اپنا نام معلوم نہیں ہے۔ میں اس جذبے کے آگے سر جھکاتا ہوں جو ہر جذبے سے عاری ہے۔ میں اس گم نامی کو سلام کرتا ہوں جو اپنا نام ہی جاننا نہیں چاہتی۔....

اوپر چڑھ کر جب آپ جگر بھائی سے ملتے ہیں تو بنگلے کے صاف وشفاف چمکتے ہوئے فرش پر ایک ایسی خاک نشینی سے سامنا ہوتا ہے جومٹی سے اپنی تجسیم کر کے شاہی کرنے میں مگن ہے۔ نہ کپڑوں کی سدبد نہ اپنی اہمیت وفضیلت کا احساس۔ یہ ہیں میرے جگر بھائی۔‘‘(۸)

محبوب حسین جگر اصول پرست انسان تھے۔انھوں نے روز نامہ سیاست کے دفتر میں اصولوں کے معاملہ میں سختی سے کام لیا۔ان کی سخت گیری اس اخبار کے حق میں بڑی مفید ثابت ہوئی۔اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے اقبال متین نے لکھا ہے:

’’ایک بار کسی نے انھیں’’سیاست‘‘ کا اڈیٹر کہہ دیا اور وہ برہم ہو گئے۔ کہنے والے سے کہا کہ آپ کو اتنا شعور بھی نہیں ہے کہ کس سے کیا بات کریں۔ اڈیٹر عابد علی خاں صاحب ہیں آپ کون ہوتے ہیں مجھ پر نوازش کرنے والے۔ وہ اتنے سخت گیر نہ ہوتے تو دفتر سیاست کی مشنری کا پرزہ پرزہ اپنی جگہ فٹ نہ رہتا۔‘‘(۹)

محبوب حسین جگر میں بے شمار اچھائیاں تھیں۔ وہ نیکیاں ضرور کرتے تھے لیکن اس کی تشہیر کبھی نہیں کرتے تھے۔’’سیاست‘‘ کے بانی ہوتے ہوئے بھی محبوب حسین جگر کے حج پہ جانے کی خبر اس میں شائع نہیں ہوئی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کی خوبیوں کو لوگ عابد علی خاں کی خوبیاں سمجھنے لگے تھے۔ایسی گمنام، بے لوث، محنتی اور پُرخلوص شخصیت کے مالک محبوب حسین جگر نے’’سیاست‘‘ کو اپنے خون جگر سے سینچا تھا اور اہم صحافتی خدمات انجام دی تھیں۔ان کی صحافتی خدمات کے اعتراف میں یہ ایک موثر مضمون ہے۔’’اعتراف وانحراف‘‘ میں ایک مضمون بعنوان’’زمانے سے خوں بہا وصول کرنے والا شاعر، صابر دت‘‘ ہے۔اس میں اقبال متین نے صابر دت کی شخصیت وفن کا جائزہ لیا ہے۔ یہ مضمون ان کی کتاب’’سوندھی مٹی کے بت‘‘ میں بھی موجود ہے۔اس کتاب پر تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے اس مضمون کا جائزہ لیا جا چکا ہے۔

اقبال متین نے بانو سرتاج اور بلراج ورما پر بھی مضامین لکھے ہیں۔ بانو سرتاج پر ان کا مضمون ’’افسانوں کی افسانوی لڑکی، بانو سرتاج اب ایک خاتونِ محترم ہے‘‘ کے عنوان سے ہے۔اس کا موضوع بانو سرتاج کی افسانہ نگاری کا اجمالی جائزہ ہے۔ بانو سرتاج نے اپنی افسانہ نگاری کا آغاز اُردو کہانیوں

سے کیا لیکن بہت جلد وہ ہندی کی طرف مراجعت کر گئیں۔اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت بیدی، کرشن چندر،عصمت چغتائی اور احمد ندیم قاسمی جیسے قدآور افسانہ نگاروں کے سامنے نئی نسل کو اپنی پہچان بنانا بہت مشکل تھا۔اس لیے بانوسرتاج نے ہندی کی طرف رُخ کیا۔ہندی میں ان کی کہانیوں کے تین مجموعے شائع ہوئے۔ایک عرصہ کے بعد بانوسرتاج پھر اُردو کی طرف واپس آئیں اور اردو زبان میں انھوں نے ایسی خوبصورت اور دلکش کہانیاں لکھیں کہ وہ ایک منفرد فن کار کی حیثیت سے سامنے آئیں۔ان باتوں کو ایجاز واختصار کے ساتھ بیان کرتے ہوئے اقبال متین نے ان کی افسانہ نگاری کے ارتقائی سفر پر روشنی ڈالی ہے۔انھوں نے ان کی کہانیوں کا مطالعہ کرتے ہوئے اس کے امتیازی پہلوؤں کی نشان دہی اس طرح کی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

>''بانوسرتاج کو پڑھتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ جس تجسس کو انھوں نے اپنا شعار بنا رکھا ہے اسی تجّسس نے ان کی کہانیوں میں تنوع کے کتنے ہی روزن بنا رکھے ہیں جن سے وہ جھانکتی ہیں۔...کیوں؟۔کیا؟۔اور کس طرح؟ کی تثلیث تخلیقی جبلت کو صیقل کرتی ہے۔وہ کہانی کو چھونے سے پہلے اس کے اندر اتر جانے کا گُر جان گئی ہیں۔جیسے غم آنسو بننے سے پہلے دل میں اُتر جاتا ہے۔''(۱۰)

اقبال متین نے بانوسرتاج کے افسانوں کے موضوع اور زبان وبیان کی خوبیوں اور خامیوں پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

>''عورت اور اس کے نِت نِت روپ کا گمبھیر تقدس بانوسرتاج کا خاص موضوع ہے۔....افسانے کے لئے بانوسرتاج کافی سلجھی ہوئی ستھری زبان لکھتی ہیں۔بعض جگہ بے تکلف ہندی الفاظ کا استعمال کرتی ہیں لیکن بعض وقت فارسی یا عربی کی آمیزش کے شوق میں جملے کے معنی ہی بدل کر رکھ دیتی ہیں۔''(۱۱)

بانوسرتاج افسانے تو بڑے سلیقہ سے لکھتی ہیں لیکن ان کے افسانوں میں فنی اعتبار سے ایک آنچ کی کمی رہ جاتی ہے جس کی وجہ سے ان کے افسانے فنی پختگی کی اعلیٰ منزل میں داخل نہیں ہو پاتے۔اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے اقبال متین نے لکھا ہے:

>''بانوسرتاج کہانی کو بڑے ڈھنگ سے سمیٹتی ہیں۔لیکن بعض وقت جب وہ

گول (Goal) کی جانب بڑھتی ہیں تو قریب پہنچ کر اتنی طاقت وراور نپی تلی کِک (Kick) نہیں لگا پاتیں کہ گیند گول میں دھنس جائے۔ان کا قاری جو ایسے میں ان کا گول کیپر بھی ہے گیند کو پکڑ لیتا ہے۔ وہ تحیّر کی اس کیفیت سے نہیں گزر پاتا کہ میرے چھلانگ لگا کر گیند کو روکنے کے باوجود گیند کس طرح گول میں گھُس پڑی۔'' (۱۲)

اقبال متین نے اس مضمون میں بانو سرتاج کی افسانہ نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی فنی خوبیوں اور خامیوں دونوں پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور مبالغہ سے کام لئے بغیر بانو سرتاج کو وہی حیثیت دینے کی کوشش کی ہے جس کی وہ مستحق ہیں۔ انھوں نے نہ تو انھیں صفِ اول کا افسانہ نگار بنانے کی کوشش کی ہے، نہ انھیں بالکل کمزور ثابت کرنے کی کوشش کی ہے بلکہ انھوں نے متوازن انداز میں ان کی افسانہ نگاری کے منفرد پہلوؤں کو بیان کر کے انھیں ایک منفرد افسانہ نگار کی حیثیت سے دکھایا ہے۔ ان کی افسانہ نگاری کے اعتراف میں یہ ایک اچھوتا مضمون ہے۔ ان کے علاوہ اقبال متین نے بلراج ورما پر بھی ایک مضمون لکھا ہے۔ ان پر ان کا مضمون ''چھُپا چھُپا قد آور کہانی کار، بلراج ورما'' کے عنوان سے ہے۔ اس میں انھوں نے بلراج ورما کو ایک قد آور افسانہ نگار کی حیثیت سے متعارف کرایا ہے۔ یہی اس مضمون کا موضوع بھی ہے۔ اس میں اقبال متین نے بلراج ورما کی افسانہ نگاری کا تعارف کراتے ہوئے ان کی چند کہانیوں کے مختصر تجزیے بھی کئے ہیں۔ اس تجزیے کے دوران انھوں نے ان کی کہانیوں کی ہیئت وتکنیک، کردار، مکالمہ، زبان و بیان اور موضوعات کے برتاؤ کا تنقیدی جائزہ لیا ہے اور اس کی فنی خوبیوں کو اُجاگر کیا ہے۔ اقبال متین کا خیال ہے کہ بلراج ورما کی کہانیوں میں چھوٹے چھوٹے نازک انسانی جذبوں کا بیان فنکارانہ انداز میں ملتا ہے جو قاری کو بے حد متاثر کرتا ہے۔ انھوں نے ان کی کہانیوں کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد اس کے تعلق سے اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے۔ وہ رقم طراز ہیں:

''وہ زندگی کی بوقلمونی کو برت برت کر جینے کے لیے اپنے کرداروں کو کھُلی چھوٹ دیتا ہے جو فطرت انسانی کے عین مطابق ہوتے ہوئے بھی جذبے کے آماج کو یک رو نہیں کرتا۔...بلراج ورما جنس کی پذیرائی میں اخلاقی جواز کو جب کبھی آدرش یا نصب العین بنا لینے کی سعی کرتا ہے تو دونوں انسانیت کے ہاتھوں مجروح ہو جاتے ہیں۔ جنس بھی آدرش بھی۔ جب وہ اس ملاوٹ

سے بچ کر چلتا ہے تو ''ابھیشاپ''، ''الیوژن'' اور ''اب یہاں کوئی نہیں آئے گا'' جیسی کہانیاں دے جاتا ہے۔...اس کی کہانیوں کی اس خوبی سے بھی انحراف ممکن نہیں ہے کہ کہانی شروع ہوتے ہی اپنے قاری کو گرفت میں لے لیتی ہے اور اپنے اختتام کو پہنچنے تک قاری کے ذہن میں ہر راہ سے محسوسات کی آماج بنی رہتی ہے۔ ورما کی کہانیاں پڑھتے وقت محسوس ہوتا ہے کہ داخل وخارج کی کیفیات کو شعور اور تحت الشعور کو وہ کھل کھیلنے کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔ اور جس آئینہ خانے میں قاری کہانی کے ساتھ ہوجاتا ہے، کہانی قاری کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر اس کو ساتھ لیے لیے گھومتی ہے اور طرح طرح سے اس کے عکس اس کو کہانی کے کرداروں کی صورت میں نظر آتے ہیں۔''(۱۳)

اقبال متین نے بلراج ورما کی کہانیوں کی خامیوں کی طرف بھی نشان دہی کی ہے کہ ان کی کہانیوں میں کہیں کہیں سنسکرت کے ثقیل الفاظ کا استعمال بیانیہ کو بوجھل بنا دیتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی کہانیوں میں کہیں کہیں فنی کمزوریاں بھی نظر آتی ہیں۔ ان کی کہانیوں کی فنی خوبیوں اور خامیوں دونوں پہلوؤں سے بحث کرتے ہوئے اقبال متین نے ان کے فن کے مختلف زاویوں سے قاری کو روشناس کرایا ہے۔ بلراج ورما کی افسانہ نگاری پر یہ ایک بصیرت افروز مضمون ہے۔

اقبال متین کا ایک بہت ہی اہم مضمون خالد رحیم پر ہے جس کا عنوان ''کرنوں سے پٹا غبار راہ گزر، خالد رحیم'' ہے۔ یہ دراصل ایک طویل تبصرہ ہے جو انھوں نے خالد رحیم کے پہلے شعری مجموعے ''کرنوں سے پٹا غبار راہ گزر'' پر لکھا تھا۔ اس میں اقبال متین نے درک وبصیرت سے خالد رحیم کی شاعری کا جائزہ پیش کیا ہے۔ انھوں نے اپنی تنقیدی بصیرت سے ان کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی شعریات کو اپنے منفرد انداز میں یوں بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''انسانی فطرت اور جبلت کا ارتکاز شعری لفظیات کے سہارے اپنی پیکر تراشی میں نت نئے گل کھلاتا ہے۔ داخلی معصومیت بیرونی سفلے پن سے شعوری اور غیر شعوری مجادلے میں کبھی ہزیمت اٹھاتی ہے کبھی کامراں ہوکر اتراتی ہے۔ اسی شکست وریخت سے شاعر کا مسلسل تصادم نہ صرف اس کے راستوں کا تعین کرتا ہے اس کی زندگی میں ایک خواب آسا کیفیت بھی پیدا کرتا ہے۔ یہ خواب اس کے ماضی کی آلودگی کو دھونے لگتے ہیں اور ایک نِتھرا

ستھرا وژن (Vision) آ گہی کا حصہ بن جاتا ہے۔ خالد رحیم کی شاعری میں یہ تصادمات بار بار آتے ہیں اور اس کے اشعار کسی ایسی داخلی کیفیت کو اپنی طاقت بنا لیتے ہیں کہ وہ اپنے خواب ٹوٹنے نہیں دیتے۔ خوابوں کا یہ سلسلہ اس کی خارجی دنیا کے عوامل سے برسر پیکار ہو کر اس کی داخلی وسعتوں کا ایک جہان معانی نہ صرف آباد کرتا جاتا ہے بلکہ حالات کی گراں جانی کو بھی اسے مسمار کرنے نہیں دیتا۔ خالد رحیم آج کی شعریات کی بازی گری میں شاید اس لیے سبھی تیکھا شاعر نظر آتا ہے کہ اس کے پاس خیال کی رعنائی اظہار کی ژولیدگی سے کبھی ہم کنار نہیں ہوتی۔ اس کے شعر کا حسن نکھرتا ہی اس لیے ہے کہ وہ جانتا ہے کہ کوئی نازک سے نازک خیال سبھی لفظ کے پیکر میں سج دھج کر اس وقت تک ذہن کے دریچے وا نہیں کر سکتا جب تک حسن اظہار ذہن سے ہو کر غیر محسوس طور پر دل میں اتر جانے کی اہلیت نہ رکھے۔'' (۱۴)

اقبال متین نے مشرقی شعریات کے اصولوں کی روشنی میں خالد رحیم کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ ان کی شاعری میں اپنی تہذیب اور مٹی کی خوشبو، فکری انفرادیت، کلاسیکی روایات کا مثبت شعور، حسن اظہار اور زبان کا موثر استعمال، یہ تمام فنی خوبیاں موجود ہیں جس کی وجہ سے ان کی شاعری میں ادبی لطف و انبساط کی کیفیت اور متاثر کرنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ ایک جگہ اقبال متین نے خالد رحیم کی شاعری کا فکری و فنی جائزہ لیتے ہوئے اپنے محسوسات کا اظہار اس طرح کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''خالد رحیم کو پڑھ کر پہلا احساس یہی ہوتا ہے کہ زندگی کے کھو کھلے پن کو اس درجہ ادراک اور احساس جمال کے ساتھ آمیز کر کے اپنے تجربات کو شعری پیکر کے ایسے تیکھے قالب عطا کرنا عمر کی اس منزل میں ہر شعری بصیرت کے حصے میں نہیں آتا۔ اس کی شعریات میں تازہ کاری و شادابی کے ساتھ دبا دبا اندوہ گیں انبساط، اس مسائلی زندگی کی گراں جانی کو ایسی ڈھکی چھپی دردمندی سے قبول کرتا ہے جس کا اظہار وہ اسی دردمندی کے ساتھ بڑی شائستگی سے کرنے پر قادر ہے۔'' (۱۵)

خالد رحیم کے شعری مجموعہ پر اقبال متین کا یہ طویل تبصرہ ایک بھرپور تنقیدی مضمون کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں اقبال متین نے اپنی تنقیدی بصیرت کا جس طرح ثبوت دیا ہے اس کی وجہ سے یہ مضمون

گراں قدر نوعیت کا حامل ہو گیا ہے۔ خالد رحیم کی شاعری پر یہ ایک فکر انگیز اور بصیرت و معنویت سے پُر مضمون ہے۔ اس کتاب ''اعتراف وانحراف'' میں شامل آخری مضمون ''آھنگ کے حوالے سے'' ہے۔ یہ بھی دراصل اقبال متین کا تبصرہ ہے جو انھوں نے رسالہ آہنگ پر کیا ہے۔ اس تبصرہ میں اقبال متین نے افصح ظفر کی ادارت میں شائع شُدہ آھنگ کے پہلے شمارہ اور دوسرے شمارہ کا موازنہ کرتے ہوئے، پہلے شمارہ کی خوبیوں اور دوسرے شمارہ کی خامیوں کو اُجاگر کیا ہے۔ انھوں نے مدیر سے ان کے طفلانہ سلوک کا شکوہ کیا ہے اور انھیں اپنے پن کا احساس دلا کر رسالہ کے تعلق سے کچھ مفید مشورے دیے ہیں۔ یہ مشورے ادبی رسالہ کے حوالے سے بڑے اہم ہیں اس لیے بیان کیے جاتے ہیں۔

''مجھے ہمیشہ کی طرح یا کل کی طرح آج بھی اپنا ہی سمجھئے۔ آھنگ کے نئے روپ کو ضخامت کا رہین منت مت کیجئے۔ صحت الفاظ اور املا کی طرف خاص طور پر توجہ دیجئے۔ ضخامت اگر کسی ادبی رسالے کی پہچان بنالی جائے تو وہ ردی تولنے کی میزان کے لیے گراں تو ہو سکتی ہے معیار کے لیے گراں بہا نہیں ہو سکتی اور مدیر محترم کی تساہل پسندی کو اپنے حواریوں پر یہاں تک تکیہ کرنا پڑتا ہے کہ مصرع نہیں، شعر نہیں تبصرے کا تبصرہ لڑ جاتا ہے۔ اس دلچسپ مثال (جو اقبال متین نے بیان کی ہے) کو پڑھ کر رونا آئے تو آنسو ضبط کیجئے، ہنسنا آئے تو اس طرح قہقہہ لگائیے کہ اس کا بلند آھنگ، آھنگ گیا، کے لیے خود احتسابی کی آہٹ بن سکے کیوں کہ ہر ضخیم رسالہ، فنون، اوراق یا بادبان نہیں ہو سکتا۔'' (۱۶)

آھنگ، گیا پر اقبال متین کا یہ تیکھا تبصرہ ہے۔ اس میں انھوں نے مدیر کو ادبی دیانت داری اور ادبی خیانت کے پہلوؤں سے آگاہ کرتے ہوئے انھیں اپنی ذمّہ داریوں کا احساس دلایا ہے۔ یہ تبصرہ آج کے مدیروں کے لیے درسِ عبرت ہے کہ انھیں اپنے ادبی رسالہ کے معیار و وقار کو برقرار رکھنے کے لیے ادبی دیانت داری کا پاس و لحاظ رکھنا چاہئے اور کسی طرح کے سمجھوتہ سے حتی الامکان گریز کرنا چاہئے۔ اقبال متین کا یہ تبصرہ بھی تنقیدی مضمون کی حیثیت رکھتا ہے جس کی ادبی اہمّیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اقبال متین کی مضمون نگاری کے موضوعاتی مطالعہ سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ انھوں نے اپنے مختلف ہم عصر ادیبوں کے فکر وفن کو موضوع بنا کر دلچسپ نوعیت کے مضامین لکھے ہیں۔ اپنے مضامین میں

انھوں نے جن ادیبوں اور علمی شخصیتوں پر اظہارِ خیال کیا ہے، ایجاز واختصار کے ساتھ ان کی شخصیت وسوانح پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے فکر وفن کا جائزہ موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ ان مضامین میں کہیں کہیں تاثراتی تنقید اور عملی تنقید کے بھی نقوش پائے جاتے ہیں۔ اقبال متین کے یہ بصیرت افروز مضامین انھیں ایک منفرد وممتاز مضمون نگار کی شکل میں سامنے لاتے ہیں۔

اقبال متین کی مضمون نگاری کے فنی محاسن

اقبال متین اردو ادب میں منفرد و ممتاز مضمون نگار کی حیثیت سے بھی جانے جاتے ہیں۔''اعتراف وانحراف'' ان کے مضامین کا مجموعہ ہے۔اس میں ان کے وہ مضامین ہیں جو انھوں نے اپنے ہم عصر علمی وادبی شخصیتوں قاضی عبدالستار، عابد سہیل، قاضی سلیم، ناصر بغدادی، محبوب حسین جگر، صابر دت، بانو سرتاج، بلراج ورما اور خالد رحیم پر قلم بند کئے ہیں۔ان ہستیوں سے ان کے علمی وادبی روابط اور دوستانہ مراسم رہے ہیں۔ان کے خلوص ومحبّت اور ان کے علمی وادبی کارناموں سے وہ خاصے متاثر رہے ہیں۔ان پہلوؤں پر انھوں نے اپنے دلچسپ تاثرات کا اظہار اس فنکارانہ انداز میں کیا ہے کہ قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ان کے مضامین کی نمایاں خوبی یہ ہے کہ انھوں نے مذکورہ شخصیتوں پر لکھتے ہوئے ان کی شخصیت وسوانح اور فکر وفن کا تعارف اپنے منفرد انداز میں اس طرح کیا ہے کہ قاری ان ہستیوں کی شخصیت کے دلچسپ پہلوؤں اور ان کے فکر وفن کے مختلف زاویوں سے بھی روشناس ہوتا ہے اور طرزِ بیان کی دلکشی سے بھی محظوظ ہوتا ہے۔دیکھئے انھوں نے قاضی عبدالستار کی شخصیت وفن کا تعارف اپنی فنکارانہ مہارت سے کس دلکش انداز میں کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''میری نسل کا ایک ایسا ادیب جس کی تحریر ہزاروں میں پہچانی جائے۔جس کو زبان پر اس قدر قدرت حاصل ہو کہ اس کی لفظیات کے سجے سنورے پیکر دلہنوں کو شرماتے ہوں۔ بند حجرے میں چاندنی بکھیرتے ہوں۔ پھولوں کی خوشبو کو پکڑ رکھنے کا فن جانتے ہوں اور پھر وقت پڑے تو دن میں تلوار کی کاٹ سے زیادہ جوہر دکھاتے ہوں۔میدانِ وغا میں دشمنوں پر لفظ لفظ گولیوں کی بوچھار کرتے ہوں۔جلال وجمال دونوں کی صورت گری وپیکر طرازی میں حاکمانہ دسترس رکھنے والا یہ ہنرمند ایسا نہیں ہے کہ اپنی

اہمیت سے واقف نہیں ہے۔ وہ تو بڑا ایگواسٹک ہے۔ کم ہی لوگوں کو خاطر میں لاتا ہے۔ لیکن جب اس کا ذہن کسی اور ہنرمند کو پہچان لیتا ہے تو وہ اپنے ذہن کے ذریعہ بھاؤ تاؤ کر کے دوسرے کی ہنرمندی کا مول تول کرتا ہے۔ اور جب وہ اس کی تخلیقی کسوٹی پر کھرا اترتا ہے تو وہ اپنا سارا پندار نیلام پر لگا کر دل جیسی شئے سے اس ہنرمند کا سودا کرتا ہے۔ اور دل دے دیتا ہے تو پھر وہ چاہنے والا بھی ہے محبوب بھی سچا دوست یارِ طرح دار، مصلحتوں کے منہ پر تھوک کر پھکڑ پن کی حد تک سچ بولنے والا۔ جتنا اچھا لگتا ہے اتنا ہی اچھا بولتا ہے۔''(۱)

اقبال متین نے عابد سہیل پر ''جینے والا، عابد سہیل'' کے عنوان سے بڑا دلچسپ مضمون لکھا ہے۔ اس میں انھوں نے ان کی افسانہ نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی انفرادیت کو یوں اُجاگر کیا ہے۔ وہ رقم طراز ہیں:

''عابد سُہیل بڑی نرمی اور گھلاوٹ سے اپنی کہانیوں میں زندگی کے گونا گوں رجائی اور قنوطی جذبے آنکھ بچا کر سمیٹتا جاتا ہے پھر ماجرے کا اظہار کچھ اس طرح کرتا ہے جیسے وہ خود اپنی کہانی میں کچھ نہیں کہہ رہا ہے بلکہ اس کی کہانیاں خود اس سے اور اپنے قاری سے تخاطب کو بیانیہ کا وسیلہ بنائے ہوئے ہیں۔ اس طرح کہانی میں پوری طرح سما کر کہانی سے الگ ہو جانا یا ان میں کرداروں کے ساتھ دوستی نباہتے نباہتے اس طرح اجنبی ہو جانا جیسے ان کے ساتھ رہنے کی علت سے کرداروں کی آزادہ روئی سلب ہو کر رہ جاتی ہے۔ عابد سہیل کا ایک ایسا ہُنر ہے جو بڑی کہانی کے امکانات کو تقویت دیتا ہے اور اس کی انفرادیت کے لئے کوئی اشتباہ نہیں رہ جاتا۔ عابد سُہیل میری پیڑھی کے ان افسانہ نگاروں میں سے ہے جس کی کہانی سوچی سمجھی پرداختہ دانش وری کے سہارے، استعارہ سازی وفلسفہ طرازی کو روا نہیں رکھتی کہ بوجھل ہو کر بیانیہ کی رواں دواں زیریں سطح کے تخلیقی بہاؤ کا سدباب کرے جو پڑھنے والے کے ذہن سے راست ارتباط کی موانست کے منافی ہو۔ وہ بڑی نرمی سے کہانی کی چلت پھرت کو نوکِ قلم سے چھوتا رہتا ہے اور کہانی اپنے آپ سے گزرتی رہتی ہے۔''(۲)

اقبال متین نے اس مضمون میں عابد سہیل کے چند افسانوں کے خوبصورت تجزیے بھی پیش کئے ہیں۔ اس میں انھوں نے جس تنقیدی بصیرت کا ثبوت دیا ہے اور جس دلکش انداز میں اپنے خیالات وتاثرات کا اظہار کیا ہے اس کی وجہ سے وہ فکشن کے اچھے پارکھ اور منفرد نثر نگار کے روپ میں سامنے آتے

ہیں۔ عابد سہیل کی افسانہ نگاری پر یہ انتہائی جامع اور فکر انگیز مضمون ہے۔ اس کی خوبیوں سے متاثر ہوکر عابد سہیل نے اقبال متین کو ایک خط میں لکھا تھا:

''تمہارے مضمون کی سب سے بڑی خوبی (میرے نزدیک) یہ ہے کہ میں نے اس سے خود اپنی متعدد کہانیوں کو سمجھا۔ سچ جانو کئی افسانوں کے تجزیوں میں تم نے ایسے پہلو پر سے پردے اٹھائے ہیں جو شعوری طور پر میرے اپنے ذہن میں نہ تھے لیکن تمہارا مضمون پڑھنے کے بعد جیسے یکا یک احساس ہوا کہ ان جذبوں سے تو دل و دماغ کی پرانی آشنائی ہے۔ اس مضمون کا شمار بھی تمہارے بہترین مضامین میں بھی ہوگا، اپنی ٹھہری ہوئی فکر کی آنچ لئے سنجیدہ لیکن ایسی کہ کوئی شروع کر دے تو چھوڑے نہ بنے، زبان کے لیے۔ میں دل ہی دل میں اپنی نثر کی بڑی تعریف کیا کرتا تھا لیکن تمہاری نثر پڑھ کر سارا بھرم کھل گیا۔ حیرت ہے، تم نے ہر وہ کہانی پکڑ لی جو مجھے پسند ہے۔... مضمون تو سارا ہی بہت خوب ہے لیکن آخری دو پیراگراف، خاص طور سے پہلا تو لاجواب قرار پائے گا۔''(۳)

اقبال متین کے مضمون کی ایک اہم خوبی، بے ساختہ طرز اظہار اور طنزیہ ومزاحیہ انداز بیان ہے۔ ان کی دیگر تحریروں کی طرح ان کے مضامین میں بھی طنز و مزاح کی حسین آمیزش پائی جاتی ہے۔ انھوں نے اپنے مخصوص طنزیہ ومزاحیہ پیرائے میں شخصیت کی کمزوریوں کو بھی بڑے دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ دیکھئے اقبال متین نے قاضی سلیم کی شخصیت سے متعلق ایک معمولی بات کو اپنے مزاحیہ انداز میں کس خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔

''پندرہ سال سے قاضی اور بنت عنب کے تعلقات اس قدر کشیدہ تھے کہ معلوم ہوا کہ قاضی نے طلاق نہیں دی۔ خود بنتِ عنب نے خلع کے لئے اصرار کیا۔ قاضی نہ مانے بات عدالت تک پہنچی اب قاضی سلیم کو کسی قاضی القضاۃ کی حاجت تھی۔ یہ صدارت عدلیہ قاضی ہی کے بھانجے ڈاکٹر قمر انصاری کو سونپی گئی اور انھوں نے قاضی کے سر اور سینے کو مجرم ٹھہرایا اور فیصلہ بنت عنب کے موافق کر دیا۔ اب قاضی سلیم کو باقی زندگی اس پری وش سے تعلقات توڑ کر گزارنی تھی جسے لوگ انگور کی بیٹی کے نام سے جانتے ہیں۔ قاضی سلیم کو اس کے حسب نسب سے واسطہ نہ تھا وہ تو اس کے صرف

اس لئے گرویدہ تھے کہ کبھی کبھی احساس کی شمع اس کی رفاقت سے زیادہ روشن ہوجاتی تھی لیکن قاضی سلیم نے اس سے جدا ہوکر اپنے اطراف وجدان وآگہی کی روشن دنیا آباد کرلی۔‘‘(۴)

درج بالا اقتباس میں اقبال متین نے جس طرح قاضی سلیم کی شخصیت پر اظہارِخیال کیا ہے، اس سے ان کا بے تکلّف اندازِ بیان سامنے آتا ہے جو قاری کو متاثر کرتا ہے۔ ایک جگہ انھوں نے ان کی شاعری کا محاکمہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

’’قاضی سلیم کے فنی اظہار میں حسین وجمیل دھجی دھجی چیدہ پیکروں کی رفوگری اور پھر پیوندکاری کا ہنر ہے۔ وہ موضوع میں بکھرے ہوئے احساس کے ٹکڑے چن کر نظم کی قبا میں ٹانکتے جاتے ہیں، اس طرح جو فرغل سامنے آتی ہے، اس میں زندگی کے کئی رنگ تکمے کا کام دیتے ہیں۔ ان کی اکثر اچھی نظمیں، لگتا ہے اختتام سے شروع ہورہی ہیں۔ جب ہم نظم پڑھتے پڑھتے کسی بند کی تکمیل پر ٹھہرتے ہیں تو نظم ہمارے سامنے اپنے معانی کا دفتر لئے ختم ہوتی ہے۔ لیکن ان کے احساس کی پنہاں پنہاں استقامت اور ادراکِ فن کی صلابت، نظم کی معنوی تہہ داری اور غنائی کشش کو لے کر آگے بڑھ جاتی ہے اور نظم کے ختم ہونے تک ایسے دو چار مقام اور آسکتے ہیں اور یہ بند دفتر ورق ورق کھلتا ہے۔ الفاظ میں امیجری کو اس کی دیدہ ور، پرتاثیر وسعتوں کے ساتھ سمیٹ لینا، قاضی سلیم کا وصف خاص ہے۔ طویل نظم ہو کہ مختصر نظم، ان کے اظہار میں بڑی درایت ہے۔‘‘(۵)

قاضی سلیم کی شاعری پر یہ منفرد نوعیت کا مضمون ہے جس میں ان کی شاعری کا جائزہ درک وبصیرت سے لیا گیا ہے۔ اقبال متین نے ناصر بغدادی پر جو مضمون لکھا ہے، وہ بھی بے حد اہم ہے۔ اس میں انھوں نے ناصر بغدادی کے افسانوی مجموعے ’’مصلوب‘‘ کے افسانوں کے موضوعات، اسلوب، زبان وبیان اور ان کے افسانوی بیانیہ کا جائزہ فنکارانہ مہارت سے لیا ہے۔ انھوں نے ان کے چند افسانوں کے دلکش تجزیے بھی پیش کئے ہیں۔ اس مضمون کو پڑھ کر قاری مضمون نگار کی تنقیدی بصیرت اور ان کے منفرد اندازِ بیان دونوں سے متاثر ہوتا ہے۔ اس مضمون کو پڑھ کر ڈاکٹر قمر رئیس نے اپنے تاثرات کا اظہار یوں کیا تھا۔

’’مصلوب کے افسانوں پر آپ کا مبسوط تجزیاتی مضمون پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ سچ مچ آپ نے غیر معمولی محنت اور محبت سے یہ مضمون لکھا۔ اور ناصر

کے فن کے منفرد پہلوؤں کو جس درک و بصیرت سے تلاش کیا وہ آپ کے
شعور فن پر دلالت کرتا ہے۔'' (۶)

اقبال متین نے قاضی عبدالستار، قاضی سلیم، عابد سہیل اور ناصر بغدادی کے علاوہ محبوب حسین جگر، صابر دت، بانو سرتاج، بلراج ورما اور خالد رحیم پر بھی بڑے دلکش مضامین لکھے ہیں۔ ان مضامین میں بھی انھوں نے مذکورہ ادیبوں کی شخصیت کے دلچسپ گوشوں اور ان کے فکر و فن کے منفرد پہلوؤں کو دلکش اور موثر انداز میں بیان کیا ہے۔ اقبال متین نے ایک مضمون ''آہنگ کے حوالے سے'' کے عنوان سے لکھا تھا۔ یہ دراصل رسالہ آہنگ، گیا پر ان کا تبصرہ تھا۔ یہ تبصراتی مضمون بھی وقیع اہمّیت کا حامل ہے۔ اس مضمون کو پڑھ کر ابراہیم اشک نے اپنے تاثرات کا اظہار اس طرح کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

'''رنگ و بو' اکتوبر میں آپ کا مضمون آہنگ کے حوالے سے پڑھ کر آپ کے کھرے پن کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ یہ پورا مضمون دورِ حاضر کا ایک اہم دستاویز ہے جس میں آپ نے ادبی منظرنامے کو حسن و خوبی اُجاگر کر دینے کی بیساکھی دکھائی ہے۔ میں آپ کی جرأت کو سلام کرتا ہوں'' (۷)

ڈاکٹر محمد علی اثر اقبال متین کے مضامین کے مجموعہ ''اعتراف وانحراف'' کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''جہاں تک ''اعتراف وانحراف'' کا تعلق ہے، اس میں قاضی عبدالستار، عابد سہیل، قاضی سلیم، ناصر بغدادی، محبوب حسین جگر، صابر دت، بانو سرتاج بلراج ورما اور خالد رحیم کے انشائیہ نما خاکے ہیں۔ ان میں بھی یادنگاری کا فن ابھر کر سامنے آتا ہے۔'' (۸)

ڈاکٹر غضنفر اقبال، اقبال متین کے مضامین کے مجموعہ 'اعتراف وانحراف' کا جائزہ لیتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''اقبال متین بلند قامت فن کار ہیں۔ اعتراف وانحراف میں اقبال متین نے ان مضامین کا انتخاب کیا ہے جو انھوں نے اپنے معاصر فن کاروں پر قلم بند کئے تھے۔ زیر نظر کتاب میں قاضی عبدالستار، قاضی سلیم، عابد سہیل، محبوب حسین جگر، ناصر بغدادی، بانو سرتاج، بلراج ورما، صابر دت اور خالد رحیم اقبال متین کے ایسے ہم عصر ہیں جنھوں نے اردو شعر، ادب اور صحافت کو بہت کچھ دیا ہے۔ اقبال متین عمر کی اس منزل پر ہیں جہاں یادوں کی انجمن جنم لیتی ہے۔ کتاب کے مضامین میں مذکورہ قلم کاروں کی فکری اور فنی جہتوں

کے علاوہ ان کے شخصی اور سوانحی اشاریے بھی دلچسپ انداز میں بیان ہوتے ہیں۔اقبال متین نے قاضی عبدالستار کو کم آمیز دلنشیں فنکار مانا ہے وہیں پر اردو شعروادب کے ایک اور قاضی، قاضی سلیم کے پہلے مجموعے ''نجات سے پہلے'' کے تناظر میں قاضی سلیم کی شاعری کا محاکمہ کیا ہے۔ پاکستان کے ممتاز و معتبر افسانہ نگار و نقاد ناصر بغدادی کے افسانوں کے دوسرے مجموعے ''مصلوب'' کی روشنی میں اقبال متین نے ناصر بغدادی کے فکشن، فکروفن کا تعارف وتذکرہ مفصل کیا ہے۔ اس کے علاوہ عابد سہیل، بلراج ورما اور بانو سرتاج کے کہانی افسانے اور کتھا کے مطالعات بھی خوب سے خوب تر ہیں۔محبوب حسین جگر والے مضمون میں مصنف جگر صاحب کی صحافتی وادبی خدمات کو محنت اور محبت کا دوسرا نام قرار دینے میں حق بہ جانب ہیں۔ صابر دت اور خالد رحیم کی شعریات پر بھی اقبال متین نے اچھا فوکس کیا ہے۔افسانوی انداز کی حامل اقبال متین کی نثر فکشن کو اُجالنے کا کام کرتی ہے۔شخصیت کے سلسلے میں واقعات بیان کرنے کا انوکھا انداز مضامین کی جان ہے۔ اعتراف وانحراف کا قاری اقبال متین کے قلم کا اعتراف ہی کرے گا جو مصنف کی متاع اور حاصل ہے۔''(۹)

اقبال متین نے جو مضامین لکھے ہیں، وہ اعترافی نوعیت کے ہیں جس میں انھوں نے اپنے ہم عصر علمی وادبی ہستیوں پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے ان کی شخصیت وفن کا اعتراف کیا ہے۔ان مضامین میں اقبال متین نے اپنے ہم عصر ادیبوں کی شخصیت وسوانح کو بھی چابکدستی سے بیان کیا ہے اور اپنی تنقیدی بصیرت سے کام لے کر ان کے فکروفن کا جائزہ بھی دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔ان مضامین میں کہیں کہیں تاثراتی تنقید اور عملی تنقید کے نقوش بھی پائے جاتے ہیں اور کہیں کہیں شخصی مضامین اور خاکے کے عناصر بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔طنزیہ ومزاحیہ اندازِ بیان سے بھی ان مضامین میں دلکشی پیدا کی گئی ہے۔ مضمون نگار کا شخصیت وفن کو دیکھنے اور اسے پیش کرنے کا مخصوص تخلیقی انداز ہی ان مضامین کو منفرد بناتا ہے۔ان مضامین کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ایک شخصیت کے حوالے سے کئی شخصیتوں کا بیان ملتا ہے اور مختلف ادبی محفلوں کی روداد اور ادب میں فکری وفنی اعتبار سے آنے والے اُتار چڑھاؤ کو بھی منفرد انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ان مضامین کی نمایاں خوبی یہ ہے کہ یہ قاری کو بصیرت وآگہی بھی بخشتے ہیں اور

اپنے حُسنِ بیان سے بھی متاثر کرتے ہیں۔ اقبال متین کے یہ دلچسپ مضامین فکر انگیز اور بصیرت افروز ہونے کے ساتھ ساتھ انداز بیان کی دلکشی سے بھی پُر ہیں جو انھیں اردو مضمون نگاری میں نمایاں اہمیت کے مستحق قرار دیتے ہیں۔

حوالے

(الف)

(۱) پروفیسر شمیم حنفی، مرتب: آزادی کے بعد دہلی میں اُردو خاکہ، اُردو اکادمی، دہلی، ۲۰۰۹ء، ص، ۱۶۔

(۲) ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، اُردو میں خاکہ نگاری، مشمولہ، دید و دریافت، آزاد کتاب گھر، دہلی، ۱۹۶۴ء، ص، ۱۸۔

(۳) ڈاکٹر اشفاق احمد ورک، آزاد: اُردو کا پہلا خاکہ نگار، مشمولہ، موقف، کتاب سرائے پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص، ۶۵۔

(۴) یحیٰ امجد، اُردو میں خاکہ نگاری، مشمولہ، اردو نثر کا فنّی ارتقا، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۵ء، ص، ۳۷۳۔

(۵) پروفیسر شمیم حنفی، آزادی کے بعد دہلی میں اُردو خاکہ، ص، ۹ تا ۱۱۔

(۶) ڈاکٹر صلاح الدین، مرتب: دلّی والے، اُردو اکادمی، دہلی، ۱۹۸۶ء، ص، ۲۵۔

(۷) یحیٰ امجد، اُردو میں خاکہ نگاری، مشمولہ، اردو نثر کا فنّی ارتقا، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ص، ۳۶۴ تا ۳۶۵۔

(۸) ڈاکٹر صابرہ سعید، اردو ادب میں خاکہ نگاری، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۱۳ء، ص، ۹ تا ۱۰۔

(۹) اقبال متین، سوندھی مٹی کے بت، ناشر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۰ء، ص، ۳۰۔

(۱۰) ڈاکٹر محمد علی اثر، اقبال متین ۔ شخصیت اور فن کے چند زاویے، مشمولہ، اقبال متین سے اُنسیت، مرتب، نور الحسنین، ناشر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۲ء، ص، ۲۸۸۔

(۱۱) قبال متین، سوندھی مٹی کے بت، ص، ۴۷۔

(۱۲) ایضاً، ص، ۵۵۔

(۱۳) ایضاً، ص، ۵۹۔

(۱۴) ایضاً، ص، ۶۲۔

(۱۵) ایضاً، ص، ۹۰۔

(۱۶)ایضاً،ص،۹۶۔

(۱۷)ایضا،ص،۱۴۴۔

(۱۸)ایضا،ص،۱۴۸۔

(۱۹)ایضا،ص،۱۲۷۔

(۲۰)ایضا،ص،۷۷،۷۹۔

(۲۱)ایضا،ص،۸۳۔

(۲۲)ایضا،ص،۸۷تا۸۸۔

(۲۳)ایضا،ص،۱۱۲،۱۱۳۔

(۲۴)ایضا،ص،۱۱۷۔

(۲۵)ایضا،ص،۱۶۵۔

(۲۶)ایضا،ص،۱۶۷۔

(۲۷)ایضا،ص،۱۷۷۔

(۲۸)ایضا،ص،۲۰۴تا۲۰۵۔

(۲۹)ایضا،ص،۲۱۰۔

(۳۰)ایضا،ص،۲۱۲۔

(۳۱)ایضا،ص،۲۱۹۔

(۳۲)ایضا،ص،۲۲۱۔

(۳۳)ایضا،ص،۲۲۴تا۲۲۵۔

(۳۴)ایضا،ص،۲۲۹تا۲۳۰۔

(۳۵)ایضا،ص،۲۳۰۔

(۳۶)ایضا،ص،۲۵۵۔

(۳۷)ایضا،ص،۲۵۲۔

(۳۸)غلام جیلانی،سوندھی مٹی کے بت،مشمولہ،اقبال متین سے اُنسیت،مرتب،نور الحسنین،ص،۴۱۸تا۴۱۹۔

(۳۹)انورخان، سوندھے لوگوں پر سوندھی کتاب سوندھی مٹی کے بت،مشمولہ، اقبال متین سے اُنسیت، مرتب، نور الحسنین،ص،۴۲۱تا۴۲۲۔

(۴۰) قاضی سلیم، سوندھی مٹی کے بت (خط بہ نام مصنف)، مشمولہ، اقبال متین سے اُنسیت، مرتب، نورالحسنین، ص، ۴۱۱تا۴۱۷۔

(ب)

(۱) اقبال متین، باتیں ہماریاں، ناشر، گونج پبلیکیشنز، اردو گھر، احمدی بازار، نظام آباد، ۲۰۰۵ء، ص، ۳۷۔

(۲) ایضاً، ص، ۳۸تا۳۹۔

(۳) ایضاً، ص، ۴۲۔

(۴) ایضا، ص، ۶۰۔

(۵) ایضا، ص، ۶۸۔

(۶) ایضا، ص، ۶۴۔

(۷) ایضا، ص، ۶۳۔

(۸) ایضا، ص، ۶۴۔

(۹) ایضا، ص، ۷۴تا۷۵۔

(۱۰) ایضا، ص، ۷۸۔

(۱۱) ایضا، ص، ۷۹تا۸۰۔

(۱۲) ایضا، ص، ۸۶۔

(۱۳) ایضا، ص، ۱۰۱تا۱۰۲۔

(۱۴) ایضا، ص، ۱۱۹۔

(۱۵) ایضا، ص، ۱۱۳۔

(۱۶) ایضا، ص، ۱۱۶۔

(۱۷) ایضا، ص، ۱۲۱تا۱۲۲۔

(۱۸) ایضا، ص، ۱۲۴۔

(۱۹) ایضا، ص، ۱۲۵۔

(۲۰) ایضا، ص، ۱۲۹۔

(۲۱) ایضا، ص، ۱۳۰

(۲۲) ایضا، ص، ۱۳۷۔

(۲۳) ایضاً،ص،۱۴۳۔

(۲۴) ایضاً،ص،۱۶۰۔

(۲۵) ایضاً،ص،۱۸۱۔

(۲۶) ایضاً،ص،۱۹۶۔

(۲۷) ایضاً،ص،۱۸۲تا۱۸۳۔

(۲۸) ایضاً،ص،۲۰۰تا۲۰۱۔

(۲۹) ایضاً،ص،۲۰۴۔

(۳۰) ایضاً،ص،۲۱۲۔

(۳۱) ایضاً،ص،۲۱۸۔

(۳۲) ایضاً،ص،۲۳۱تا۲۳۲۔

(۳۳) ایضاً،ص،۲۵۴۔

(۳۴) وہاب اشرفی، تبصرہ ''باتیں ہماریاں''، مشمولہ، مباحثہ، پٹنہ، شمارہ:۲۷، جنوری تا مارچ، ۲۰۰۷ء، ص، ۱۸۵ تا ۱۸۶۔

(۳۵) ڈاکٹر محمد علی اثر، اقبال متین: شخصیت اور فن کے چند زاویے، مشمولہ، بادبان، (اقبال متین نمبر)، شمارہ:۱۳، جولائی تا ستمبر، ۲۰۱۰ء، ص، ۲۷۱۔

(۳۶) یوسف ناظم، ''باتیں ہماریاں'' کے بارے میں کچھ ہماری باتیں، مشمولہ، بادبان، (اقبال متین نمبر)، ص، ۸۳تا۸۵۔

(ج)

(۱) قاضی افضال حسین، صنفیات، ناشر: مصنف، ۲۰۱۶ء، ص، ۲۳۳۔

(۲) ڈاکٹر سیّدہ جعفر، اُردو مضمون نگاری، ناشر: مصنف، ۱۹۷۲ء، ص، ۳۔

(۳) نظیر صدّیقی، انشائیہ کیا ہے؟، مشمولہ، اردو نثر کا فنّی ارتقا، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۵ء، ص، ۲۳۳۔

(۴) قاضی افضال حسین، صنفیات، ص، ۲۳۴۔

(۵) اقبال متین، اعتراف وانحراف، ناشر، کل ہند اردو ریسرچ اسکالرس کونسل، ۲۰۰۶ء، ص، ۲۱۔

(۶) ایضاً،ص،۳۴۔

(۷)ایضا،ص،۴۱۔

(۸)ایضا،ص،۴۶۔

(۹)ایضا،ص،۴۹۔

(۱۰)ایضا،ص،۵۱۔

(۱۱)ایضا،ص،۷۹تا۸۰۔

(۱۲)ایضا،ص،۸۵تا۸۷۔

(۱۳)ایضا،ص،۹۱۔

(۱۴)ایضا،ص،۱۲۹۔

(۱۵)ایضا،ص،۱۳۱تا۱۳۲۔

(۱۶)ایضا،ص،۱۳۴۔

(۱۷)ایضا،ص،۱۳۶تا۱۴۵۔

(۱۸)ایضا،ص،۱۴۷۔

(۱۹)ایضا،ص،۱۵۷۔

(۲۰)ایضا،ص،۱۶۸۔

(د)

(۱)اقبال متین،اعتراف وانحراف،ناشر کل ہند اردو ریسرچ اسکالرس کونسل،۲۰۰۶ء،ص،۱۰تا۱۱۔

(۲)ایضا،ص،۲۱۔

(۳)عابد سہیل،خط اقبال متین کے نام،مشمولہ،بادبان،کراچی،(اقبال متین نمبر)،شمارہ،۱۳،جولائی تا ستمبر،۲۰۱۰ء،
ص،۴۷۳تا۴۷۴۔

(۴)اقبال متین،اعتراف وانحراف،ص،۴۰۔

(۵)ایضا،ص،۴۱۔

(۶)پروفیسر قمر رئیس،خط اقبال متین کے نام،مشمولہ،بادبان،کراچی،(اقبال متین نمبر)،ص،۴۶۸۔

(۷)ابراہیم اشک،خط اقبال متین کے نام،مشمولہ،بادبان،کراچی،(اقبال متین نمبر)،ص،۵۱۷۔

(۸)ڈاکٹر محمد علی اثر،اقبال متین:شخصیت اور فن کے چند زاویے،مشمولہ،بادبان،کراچی،(اقبال متین نمبر)،ص،۱۷۳۔

(۹)ڈاکٹر غضنفر اقبال،اعتراف وانحراف،مشمولہ،بادبان،کراچی،(اقبال متین نمبر)،ص،۱۸۴تا۱۸۵۔

باب چہارم

اقبال متین کی شعر گوئی

(الف) اقبال متین کی غزلوں کا تنقیدی مطالعہ

(ب) اقبال متین کی نظموں کا تنقیدی مطالعہ

اقبال متین کی غزلوں کا تنقیدی مطالعہ

اقبال متین کے بارے میں عرض کیا جا چکا ہے کہ وہ کثیر الجہات ادیب ہیں۔ انھوں نے اردو ادب کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ انھوں نے نثر کے ساتھ شاعری کو بھی اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے۔ وہ اردو ادب میں تو افسانہ نگار کی حیثیت سے مشہور و معروف ہیں مگر انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا۔ انھیں شعر گوئی کی تحریک اپنے اردگرد کے ماحول سے ملی۔ ان کے سوانحی کوائف میں اس بات کا ذکر کیا جا چکا ہے کہ ان کا گھرانہ علمی و ادبی گھرانہ تھا۔ ان کے والد سید عبدالقادر ناصؔر اور دو چچا سید قادر الدین تمکین سرمست اور نسیم قاسمی شاعر تھے۔ ان کے گھر پر شعر و سخن کی محفلیں سجتی رہتی تھیں۔ ان کے والد اور چچا کی کوششوں سے ایک مرتبہ ان کے گھر کے پاس چیتا شاہ ولی کی درگاہ پر چیتا شاہ ولی کے عرس کے موقع سے ایک یادگار مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا تھا جس میں حیدرآباد کے مشہور و معروف شعراء سلیمان اریؔب، لطیفؔ ساجد، نظؔر حیدرآبادی، علی صائبؔ میاں، نذیر دہقانؔی، تمکین سرمستؔ، صاحبزادہ میکشؔ، صمد رضوی سازؔ، شعیب حزیؔں، اور مخدوم محی الدین شریک ہوئے تھے۔ ایسے ادبی ماحول میں اقبال متین کا شعری ذوق پروان چڑھا اور وہ شعر گوئی کی طرف مائل ہوئے۔

اقبال متین کے شعری سفر کی ابتدا کی داستان خاصی دلچسپ ہے۔ بچپن میں انھیں ایک مرتبہ شرارت سوجھی اور وہ چند بچوں اور اپنے والد کے اردلی 'قطب' کے ہمراہ اپنے والد کی نظروں سے بچتے ہوئے، اپنے رشتے کے بھائی رفیع الدین سے چوری چھپے ایک ربر کی گول مول سی ناؤ لے کر کاگنا ندی میں تیرنے گئے۔ ندی اوپر سے خاموش نظر آتی تھی لیکن اندر سے اس میں ہلکی طغیانی تھی۔ انھیں اس کا اندازہ نہیں تھا۔ وہ ناؤ لے کر ندی میں تیرنے چلے گئے۔ اتفاق سے ناؤ ندی کے ہلکے بہاؤ کی زد میں آکر پھٹ

گئی اور سب لوگ ڈوبتے ڈوبتے بچے۔ یہ ناگہانی حادثہ تو ٹل گیا مگر اقبال متین کو ڈر تھا کہ کہیں ان کے والد کو ان کی اس شرارت کا پتہ نہ چل جائے۔ ان پر خوف و ہراس کی کیفیت طاری تھی۔ ایسے خوف کے عالم میں ان کے والد کے چپراسی قطب نے انھیں تسلّی دی اور کہا کہ کا گنا ندی کا یہ راز ان کے والد کو نہیں بتایا جائے گا لیکن اس خوشی میں ایک مشاعرہ ہونا چاہئے۔ چنانچہ اقبال متین کو اپنی اس شرارت کی قیمت مشاعرہ منعقد کر کے چکانی پڑی۔ یہ معمولی اور ہلکا پھلکا مشاعرہ ان کے گھر کے پاس بشیر آباد کی عیدگاہ میں قطب کی صدارت میں ہوا جس میں حسینی شاہ اور سید مصلح الدین سعدی کے ساتھ اقبال متین نے بھی اپنا ذاتی کلام سنایا۔ اس مشاعرے اور اس میں اپنے کلام سنانے کے تعلق سے اقبال متین نے اپنی یادوں کے مجموعہ ''باتیں ہماریاں'' میں لکھا ہے:

''ضروری تھا کہ سوائے صدر مشاعرے کے ہر شاعر اپنا ذاتی کہا ہوا کلام سنائے۔ مسیح الدین خاں حیاتؔ کا نام پکارا گیا۔ حیاتؔ کھڑے ہوئے ترنم میں سنایا۔ ابھی بچوں کے رسالے پیام تعلیم، پھول اور غنچے میں اشاعت تک رسائی نہیں ہوئی تھی۔ نعت تھی یا کیا تھی نہ خود ان کو معلوم تھا نہ دوسرے شعراء کو نہ صدر مشاعرہ کو۔

ادھر دیکھوں تو دلدل ہے　　　ادھر دیکھوں تو آتش ہے
کہاں جاؤں، کدھر جاؤں　　　رسول اللہ　رسول اللہ

حیات کی شاعری کا پہلا شعر یہی تھا جو اب بے حیات ہوئے تو متین ہو گئے''۔(۱)

اقبال متین کے اس بیان کے مطابق مذکورہ شعر ان کا پہلا شعر ہے۔ ان کی پہلی مطبوعہ نظم ''کب تلک'' ہے جو ۱۹۴۲ء میں 'سب رس' میں شائع ہوئی۔ ان کی دوسری نظم ''کیوں؟'' کے عنوان سے ۱۹۴۲ء ہی میں ماہ نامہ 'ارم' میں چھپی۔ ان نظموں کی اشاعت کے بعد وہ کہانی لکھنے کی طرف مائل ہوئے اور ۱۹۴۳ء میں انھوں نے اپنی پہلی کہانی ''چوڑیاں'' کے عنوان سے لکھی جو اردو کے مشہور رسالہ 'ادب لطیف' میں ۱۹۴۵ء میں شائع ہوئی۔ اس کہانی کے ساتھ ان کی تین چار دیگر کہانیاں بھی اردو کے معروف رسالوں کی زینت بنیں۔ انھوں نے اپنے ادبی سفر کی ابتدا تو شاعری سے کی مگر آگے چل کر وہ افسانہ کے ہو رہے۔ اس کا کیا سبب تھا، خود اقبال متین کی زبانی ملاحظہ ہو۔ دانش اقبال کو انٹرویو دیتے ہوئے انھوں نے کہا تھا:

''یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ میں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز شاعری سے کیا لیکن جلد ہی افسانے کا ہو کر رہ گیا۔ اس کی وجہ شاید یہی ہو کہ جو (Talent) اپنے تجربے سے گذر کر موضوع کی روح اپنی تخلیق میں سمیٹ نہیں سکتا وہ فن کا کوئی معیار قائم نہیں کرسکتا۔ میرا افسانہ اظہار کے دروبست میں میری شاعری سے زیادہ خوشی وانبساط فراہم کرتا رہا ہے۔ میں افسانے کا ہو رہا۔ اور یہ خوشی کسی فنکار کو اسی وقت حاصل ہوتی ہے جب کہ موضوع اور موضوع کو پیدا کرنے والے معروضی حالات سے تخلیق کار کا (Involvement) اٹوٹ ہو''۔(۲)

اقبال متین کے اس بیان کو پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ انھیں خود اپنی شاعری سے زیادہ اپنے افسانے عزیز ہیں۔ اس کے باوجود وہ اپنی شاعری کو ثانوی حیثیت دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ جب دانش اقبال نے ان سے انٹرویو لیتے ہوئے پوچھا کہ ''کیا آپ شاعری کو ثانوی حیثیت دیتے ہیں؟'' تو اس کے جواب میں اقبال متین نے فرمایا:

''میں صرف اس حد تک ترمیم چاہوں گا کہ آپ سکنڈری حیثیت کے الفاظ کو سکنڈری اہمیت سے بدل دیں۔ اس لیے کہ افسانہ نگار کے اندر جو شاعر چھپا ہوا ہے وہ بھی اس کو جھنجھوڑ کر شعر کہلوا لیتا ہے۔ چوں کہ وہ شعر بھی اعتماد کے ساتھ کہتا ہے اس لیے اس کو سکنڈری حیثیت دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اردو ادب کی یہ بدعت کہ جس صنف کے لیے کسی تخلیق کار کو تسلیم کرلیا جائے تو اس سے دوسری صنف ادب بالکلیہ چھین لی جاتی ہے''۔(۳)

اقبال متین کی شاعری ادبی اعتبار سے کیا حیثیت رکھتی ہے اور کس اہمیت کی مالک ہے، اس پر گفتگو کرنے سے قبل اس بات کی وضاحت کرتا چلوں کہ انھوں نے اپنے شعری سفر کا آغاز نظم نگاری سے کیا۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ ان کی پہلی نظم ''کب تلک'' کے عنوان سے اور دوسری نظم ''کیوں'' کے عنوان سے ۱۹۴۲ء میں شائع ہوئی۔ انھوں نے نظم اور غزل ان ہی دو شعری اصناف میں طبع آزمائی کی ہے، اس میں بھی نظموں کے مقابلہ میں غزلیں زیادہ کہیں۔ انھوں نے اپنی نظموں اور غزلوں کو کتابی صورت میں یکجا کر کے ''صریر جاں'' کے عنوان سے شائع کیا۔ ان کا یہی ایک شعری مجموعہ ہے جو کل ہند ریسرچ اسکالرس کونسل، حیدرآباد سے ۲۰۰۶ء میں چھپا۔ اس میں سولہ نظمیں اور چھیانوے غزلیں ہیں۔ یہاں ان کی

غزلیں ہی زیر بحث ہیں۔

اقبال متین کی غزل گوئی کا سفر تقریباً چار دہائیوں پر محیط ہے۔ ان کی غزلیں اردو کے مشہور و معروف اور غیر معروف دونوں طرح کے رسالوں میں شائع ہوئیں۔ ان کی غزلوں کی اشاعت اردو کے جن رسالوں میں ہوئیں، ان میں 'ماہنامہ''صبا''، حیدرآباد، 'ماہنامہ''کتاب''، لکھنؤ، 'ماہنامہ''ماہ نو''، دہلی، 'ماہنامہ''آہنگ''، گیا، 'ماہنامہ''سب رس''، حیدرآباد، 'ماہنامہ''جواز''، مالیگاؤں، 'ماہنامہ''ہم زباں''، مالیگاؤں، 'ماہنامہ''عصری آگہی''، دہلی، 'ماہنامہ''شب خون''، الہ آباد، 'ماہنامہ''فنکار''، حیدرآباد، 'ماہنامہ''نیا دور''، لکھنؤ، 'ماہنامہ''کتاب نما''، دہلی، 'ماہنامہ''ایوان اردو''، دہلی، 'ماہنامہ''آجکل''، دہلی، 'ماہنامہ''معلم اردو''، دہلی، 'ماہنامہ''گونج''، نظام آباد، 'ماہنامہ''افکار''، کراچی، 'ماہنامہ''دائرے''، کراچی، 'ماہنامہ''انشا''، کلکتہ، 'ماہنامہ''شاعر''، ممبئی، 'ماہنامہ''اردو چینل''، ممبئی، 'ماہنامہ''تیرِ نیم کش''، مرادآباد، 'ماہنامہ''مریخ''، پٹنہ، 'ماہنامہ''جمنا تٹ''، ہریانہ، 'سہ ماہی''تعمیر''، ہریانہ، 'سہ ماہی''سطور''، دہلی، 'سہ ماہی''ذہن جدید''، دہلی، 'سہ ماہی''بادبان''، کراچی، 'سالنامہ''اوراق''، لاہور، 'سہ ماہی''نیا ورق''، ممبئی اور 'سہ ماہی''دستک''، آندھرا پردیش قابل ذکر ہیں۔

یوں تو اقبال متین کی غزلیں مشہور و معروف رسالوں کی زینت بنیں لیکن اپنی غزلوں کے ذریعے ادبی حلقوں کو اپنی جانب متوجہ کرنے میں وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے افسانہ نگاری میں جس فنکارانہ کمال کا مظاہرہ کیا ہے، ایسا وہ اپنی غزلوں میں نہیں کر سکے ہیں۔ وہ اپنی شاعری کو بھلے ہی ثانوی حیثیت دینے کے لیے تیار نہ ہوں لیکن بطور ایک غزل گو شاعر وہ اپنی کوئی منفرد و ممتاز شناخت قائم نہیں کر سکے۔ ان کی غزلوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک اوسط درجے کے جدید غزل گو شاعر ہیں۔ جدید شاعر ہونے کے ناطے انھوں نے علامتی و استعاراتی طرز اظہار کو بھی اپنایا ہے اور سیدھے سادے انداز میں بھی غزلیں کہیں مگر ان کے اسلوب میں وہ ادبی چاشنی و دلکشی نہیں ہے جو قاری کے دل کو چھو سکے۔ انھوں نے غزل کی کلاسیکی روایات کا اثر ضرور قبول کیا ہے اور کلاسیکی آہنگ کو بھی برتنے کی کوشش کی ہے لیکن وہ اس میں بہت زیادہ کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ ان کی غزلوں میں ترقی پسندی کا اثر بھی دکھائی دیتا ہے مگر جدیدیت کا انداز غالب ہے۔

اقبال متین کی غزلوں کا خمیر روایت اور جدت کے آمیزے سے تیار ہوا ہے۔ ان کی غزلوں میں عشقیہ جذبات و احساسات کے ساتھ جدید دور کے انسان کی تنہائی، بے بسی و لاچاری، اس کی ذہنی و جذباتی بے چینی، ذات کا کرب، داخلی شکستگی و خستگی، بے چہرگی، ڈر، خوف، عدم تحفظ کا احساس، بے حسی، بے تعلقی، عمومی معاشرتی زوال، تہذیبی وسماجی انتشار، اخلاقی وانسانی قدروں کا بحران، رشتوں کا انہدام، ناقدری کا المیہ، مادیت کا غلبہ، روحانی اضطراب وکشمکش، بے اعتمادی و بے یقینی، جدید عہد کی زندگی کی ویرانی، اس کی بے معنویت اور اس کا کھوکھلا پن اور حالات کی ناسازگاری، یہ اور اس طرح کے بیشتر مسائل کا بیان ہوا ہے۔ لیکن ان کے طرزِ اظہار میں وہ فکری وفنی بے ساختگی، تازگی، فکر انگیزی، شگفتگی و دلکشی نہیں ہے جو قاری کو متاثر کر سکے۔ بعض جگہ تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے خیالات کو صرف منظوم انداز میں پیش کر دیا ہے۔ انھوں نے منفرد اسلوب اور لب ولہجہ اپنانے کی کوشش ضرور کی ہے لیکن وہ اس میں بھی ناکام رہے ہیں۔ عام طور پر وہ سادہ طرز بیان اختیار کرتے ہیں جو کبھی کبھی سطحیت اور سستے پن کا احساس دلاتا ہے۔ انھوں نے نجی علامتیں استعمال کرنے کی کوشش بھی کی ہے لیکن یہاں بھی وہ توازن برقرار نہ رکھ سکے جس کی وجہ سے ان کا اسلوب ابہام و پیچیدگی کا شکار ہو گیا۔ ان کی غزلوں میں تجربات کی وہ پختگی، مشاہدے کی وہ باریکی، احساس کی گہرائی و گیرائی اور وہ فلسفیانہ درک و بصیرت نہیں ہے جو اچھی غزل کا خاصہ ہے۔ انھوں نے لفظوں اور تراکیب کے انتخاب اور اوزان و بحور کے استعمال میں بھی غلطیاں کی ہیں۔ ان کی غزلوں کے بہت سے اشعار وزن سے گر گئے ہیں اور مصرعے دولخت ہو گئے ہیں۔ ان کی غزلیں شعریت، اثر آفرینی، معنی آفرینی، جذبات واحساسات کی شدّت، خیال کی جدت و ندرت، اظہار کی انفرادیت، موزونیت وموسیقیت، انوکھے پن، نغمگی و دلکشی اور فکری گہرائی وتنوع سے عاری ہیں۔ ان کی غزلیں فکری وفنی خامیوں سے پُر ہیں جن میں ایک دو اچھے اشعار بھی نکل آتے ہیں۔

مثال کے طور پر ان کی ایک عشقیہ رنگ کی غزل ملاحظہ ہو:

میرے اشکوں کی مری آہوں کی بن آئی ہے
یہ تری فوج ہے جو چھوڑ کے رن آئی ہے
بات کرنی ہمیں آئی نہیں جب تو آیا

اور اب پلکوں پہ سوغاتِ سخن آئی ہے
جب کبھی آنکھوں نے پڑھ لی ہے حنا کی تحریر
مجھ کو لینے تری خوشبوے بدن آئی ہے
میں تو ہر سوچ کو لفظوں میں اٹھا لایا ہوں
کون وہ ایسی کٹھن شئے مرے فن آئی ہے
رنگِ تصویرِ بتاں جب کھلا گلشن گلشن
اپنی شادابیِ جاں، سوختہ تن آئی ہے
لوگ کہتے تھے مری جان پہ بن آئے گی
لوگ کہتے ہیں مری جان پہ بن آئی ہے
وہ تو تک تک کے تجھے جان گنوا بیٹھا ہے
اب ترے چہرے پہ یہ کیسی پھبن آئی ہے
مجھ کو اقبال متین زورِ تموّج ہے عبث
باڑھ آئی ہے تو پھر تا بہ دہن آئی ہے (۴)

آٹھ اشعار پر مشتمل اس غزل میں تین ہی اشعار قابل توجہ ہیں۔ تیسرا، پانچواں اور ساتواں شعر۔ پہلے شعر میں دونوں مصرعے دولخت ہوگئے ہیں۔ دوسرے شعر میں بغیر کسی تلازمہ کے آنسو کے لیے سوغاتِ سخن کی ترکیب کا استعمال کیا گیا ہے، جو کہ غلط ہے۔ اردو کی ادبی روایت میں آنسو کے لیے یہ ترکیب رائج نہیں ہے۔ چوتھا شعر تعلیٰ کا ہے جس میں خلاف واقعہ بات کہی گئی ہے جس کی وجہ سے وہ تعلیٰ کا شعر نہیں بن سکا۔ چھٹے اور آٹھویں شعر میں عامیانہ پن اور سطحیت کا احساس ہوتا ہے۔ اس غزل میں شاعر نے عشق کی ناکامی کے مضمون کو باندھا ہے۔ مضمون تو اچھا ہے لیکن مضمون کو باندھنے کا طریقہ عامیانہ سا ہے۔ اشعار کی بندش بھی سُست ہے۔ شاعر کہہ رہا ہے کہ میرے اشک اور نالے ناکام ہوگئے۔ جب محبوب سامنے آیا تو اس کے سامنے میری زبان ہی نہیں کھل سکی اور اب جب کہ محبوب سامنے نہیں ہے تو اس کی یاد میں آنکھوں میں آنسو آگئے۔ جب بھی کسی حسین کے مہندی لگے ہاتھ پر میری نظر پڑی تو مجھے تیرا مہندی لگا ہاتھ یاد آیا۔ میں نے تم سے وابستہ اپنی تمام یادوں اور سوچ اور فکر کو لفظوں میں ڈھال دیا

ہےاور وہ کون سا خیال ہے جو مرے فن میں نہیں آسکا ہے۔اپنے محبوب کی تصویر کے رنگ کو کھلانے میں مجھے اتنی محنت کرنی پڑی کہ میں نے شاداب جیسی اپنی جان کو جلا لیا۔ پہلے لوگ کہا کرتے تھے کہ عشق میں سخت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا اور اب لوگ میرے عشق کی کیفیت کو دیکھ کر اس کی گواہی دے رہے ہیں۔اے محبوب وہ تو تجھے تک تک کر مر گیا۔اب ترے چہرے پہ یہ کیسی چمک ہے۔ تجھے تو افسُردہ ہونا چاہئے تھا۔اس ساتویں شعر میں ایک دوسرا قرینہ تجاہل عارفانہ کا ہے۔یعنی شاعر کو پتہ ہے کہ محبوب کے چہرے پہ عاشق کے خون کی چمک ہے۔ یہ معلوم ہونے کے باوجود شاعر تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے پوچھ رہا ہے کہ تیرے چہرے پہ یہ کیسی چمک ہے۔آخری شعر میں شاعر کہہ رہا ہے کہ جب خیالات کا زور بڑھتا ہے تو وہ خود بخود ذہن تک آجاتے ہیں۔ پوری غزل عشقیہ جذبات واحساسات پر مبنی ہے مگر اس میں اقبال متین عشق کی کیفیات کا صحیح اظہار نہیں کر سکے۔انھوں نے کلاسیکی لب ولہجہ کو اپنانے کی کوشش تو کی لیکن وہ اس میں بھی ناکام رہے جس کی وجہ سے ان کی یہ غزل ایک معمولی غزل بن کر رہ گئی۔

اقبال متین کی غزلوں میں فکری وفنی نقائص کی موجودگی سے انکار تو نہیں کیا جاسکتا لیکن ایسا بھی نہیں کہ ان کے یہاں اچھے اشعار بالکل نہیں ہیں۔ بلکہ ان کے بعض اشعار اپنی روانی، تخلیقیت کی آنچ اور احساس کی شدت سے دامن دل کو اپنی طرف کھینچتے محسوس ہوتے ہیں۔دیکھئے انھوں نے غزل کے درج ذیل اشعار میں عشق ومحبت کی مختلف کیفیات اور لطیف تر رومانی جذبات واحساسات اور اپنے محبوب سے اپنی جذباتی ونفسیاتی ہم آہنگی کا اظہار اس طرح کیا ہے کہ قاری اسے محسوس کیے بغیر نہیں رہتا:

ناگن بن کر جھومنے والی دشا دشا پر چھائیں تری
بن کے سپیرا، سہج سہج من بین بجانے والا میں
آنسو بن کر آنکھوں سے پلکوں پر آنے والا تو
تجھ کو اپنے دل میں رکھ کر سب سے چھپانے والا میں
منظر منظر تیرا پیکر، نفس نفس تیری ہی شبیہہ
تیرے بدن کو اپنے بدن کا راز بنانے والا میں
برساتوں میں آگ لگا کر مجھ کو جلانے والا تو

بھیگ بھیگ کر اپنے غم کی راکھ بجھانے والا میں
رات رات بھر مجھ میں چھپ کر باتیں کرنے والا تو
تجھ کو اپنے باہر لا کر پیار جتانے والا میں (۵)

اقبال متین کے یہاں عشق کے احترام کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ انھوں نے سنبھل کر اور متوازن انداز میں اپنی عشقیہ کیفیات کا اظہار کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اسلوب میں متانت و سنجیدگی اور کلاسیکی آہنگ کا احساس ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ فرمایئے:

رات تیری یادوں نے اس قدر ستایا ہے
جتنا مسکرائے ہیں اتنا جی بھر آیا ہے
فصلِ گل جو آئی ہے، شامِ غم بھی چمکے گی
ہم نے اشک بوئے تھے، ہم نے دل جلایا ہے
ہم وفا کے مارے تھے بارہا لرز اٹھے
جب چھوا کسی گل کو تو بھی ساتھ آیا ہے (۶)

اقبال متین نے محبوب سے وصال کی کیفیت اور محبوب کے گذر جانے کے بعد اپنے غمناک جذبات و احساسات کا اظہار بھی متوازن اور مہذب انداز میں کیا ہے:

کیا حسیں رات بنادی تو نے
چاندنی مجھ کو پلادی تو نے
میں تجھے دیکھ کے رو بھی نہ سکا
لو چراغوں کی بڑھادی تونے
کیسا یہ ہو کا سماں ہے سر شام
دل میں کیا راکھ اڑادی تونے (۷)

اقبال متین کو محبوب سے بے حد لگاؤ ہے۔ محبوب کے گذر جانے کے بعد ان کا دل اداس اور رنجیدہ ہے۔ آج بھی جب کبھی خوابوں میں محبوب سے ان کی ملاقات ہوتی ہے تو ان پر مدہوشی اور بے خودی کی

کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ دیکھئے انھوں نے اپنے دل کی ان مختلف کیفیات اور اپنے عشقیہ جذبات و احساسات کو اظہار کی شکل کس طرح دی ہے:

ہوائیں سرد تھیں، بارش تھی، جل رہے تھے ہم
کہیں بھی آگ نہ تھی، اور پگھل رہے تھے ہم
ہم اس کے پاس سے کل رات اس طرح گزرے
کہ جیسے خواب میں، آنگن میں چل رہے تھے ہم
نہ تجھ کو اپنا پتا تھا نہ ہم کو اپنی خبر
نفس نفس تری نس نس میں ڈھل رہے تھے ہم
نئے پرانے سبھی راستے اٹھ آئے ہیں
بس ایک بار ترے ساتھ چل رہے تھے ہم
یہی ہوا کہ ترے نقشِ پا بھی چھوٹ گئے
کہ اپنا آپ اٹھائے سنبھل رہے تھے ہم
کسی نے آنکھ اٹھا کر کبھی نہیں دیکھا
بجھی تھی راکھ تو چہرے پہ مل رہے تھے ہم (۸)

اقبال کی غزلوں میں نجی حالات و کیفیات اور زندگی کی تلخیوں کا اظہار کثرت سے ہوا ہے۔ عہد حاضر کے مشہور شاعر پروفیسر شہر یار نے ان کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اقبال متین کی شاعری کے بارے میں جو باتیں خاص طور سے کہی جاسکتی ہیں وہ یہ ہیں کہ شاعری (۱) خاصی Personal یعنی ذاتی ہے، (۲) غموں میں ڈوبی ہوئی ہے اور (۳) زندگی کی تلخی اور ماضی کے عذاب لیے ہونے کے باوجود خاصی مہذب ہے''۔(۹)

اقبال متین کی اپنی زندگی غموں اور پریشانیوں میں گھری ہوئی تھی۔ ان کی چہیتی بیوی جس کو انھوں نے بڑے ارمانوں سے حاصل کیا تھا اور دل و جان سے زیادہ چاہا تھا، بہت جلد انھیں داغِ مفارقت دے گئی۔ دیکھئے اس رنج و غم کا اظہار انھوں نے کس طرح کیا ہے:

مجھ سے جب بارِ امانت نہ اُٹھا
وہ امانت ہی اٹھادی تو نے
یہ بھی کیا طرزِ وفا ہے کوئی
رات لمبی تھی، گھٹادی تو نے
شہر سنسان تھا اقبالؔ متین
رات کس کس کو صدا دی تو نے (۱۰)

اقبال متین کے تین بیٹوں اور ایک بھتیجے کا نوعمری میں ہی انتقال ہوگیا تھا جس کا اثر اقبال متین پر یہ پڑا کہ ان کی زندگی بے کیف اور بے رنگ ہوگئی، مسرت وشادمانی عنقا ہوگئیں اور دل اداسی و ویرانی کی آماج گاہ بن گیا۔ اپنے اس درد وغم اور اپنی کربناک کیفیات کا اظہار انھوں نے اس طرح کیا ہے:

میں جام اُٹھا کے یہی سوچتا رہا اکثر
نشہ بھی لے گئے وہ لوگ جو نہیں ہیں اب
کبھی جو ساتھ تھے میرے، مری رگِ جاں تھے
دلوں کو چھوڑ کے محلوں میں جا گزیں ہیں اب
ہمیں نہ پا سکا آسیبِ ظلمتِ دوراں
ہر ایک خالی مکاں میں ہمیں مکیں ہیں اب
فرید و نشو و پپن کے ساتھ ہے عمران
پتا تو دے گئے ہوتے، جہاں کہیں ہیں اب
چلو متینؔ وہیں جا کے پھر انھیں ڈھونڈھیں
وہ صورتیں جو زمیں بن کے دل نشیں ہیں اب (۱۱)

اپنے محبوب بیٹے کی موت پر اقبال متین پر غم واندوہ کی کیفیت طاری ہے۔ اس غم نے ان کے اندر اضطراب وانتشار کو جنم دیا ہے۔ دیکھئے اس اضطراب وانتشار اور بے چینی کا اظہار انھوں نے کس طرح کیا ہے:

وہ شخص کیا ہوا وہ اُس کا گھر کہاں ہوگا
اب اس دیار میں، مجھ سے بسر کہاں ہوگا

میں جس کے سائے میں جا بیٹھتا تھا دن دن بھر
کوئی بتائے کہ اب وہ شجر کہاں ہوگا
ورق ورق ہیں کتابوں کے سینے شق پھر بھی
اس انتشار میں عرضِ ہنر کہاں ہوگا (۱۲)

وطن سے باہر بحیثیت افسانہ نگار اقبال متین کی خاطر خواہ پذیرائی ہوئی۔ ان کی شاعری کو بھی کچھ لوگوں نے پسند کیا لیکن اپنے وطن میں ان کے فن کی نہ تو خاطر خواہ پذیرائی ہوئی اور نہ اس طرح سراہا گیا جس کا ان کا فن مستحق تھا۔ اقبال متین کو اس کا بہت ملال تھا جس کا اظہار انہوں نے اس طرح کیا ہے:

شعر و سخن کی آن کہیں میں، افسانے کی جان کہیں
لیکن میرے گھر میں میری، ہو بھی تو پہچان کہیں (۱۳)

ایسی ناقدری کہ بے رحمی بھی شرما جائے
میں نہ جانوں کوئی میرا بھی وطن ہے کہ نہیں (۱۴)

اقبال متین کی غزلوں میں عہد حاضر کے المناک مسائل کی گونج صاف طور پر سنائی دیتی ہے۔ انھیں انسانیت اور اخلاقی و تہذیبی قدروں کے زوال کا بے حد ملال ہے۔ وہ قدیم تہذیب کے پروردہ انسان ہیں جہاں انسانیت اور محبت کی اہمّیت، اخلاقی و تہذیبی قدروں کا احترام اور رشتوں کا بڑا پاس و لحاظ تھا۔ اس کے برعکس آج کی نئی تہذیب میں خود غرضی، مفاد پرستی، ریاکاری، جھوٹ، فریب، مکّاری، عیّاری اور مادّیت کا بول بالا ہے۔ آج کے مادیت پرستانہ ماحول میں حسّاس اور باضمیر انسانوں کو فضول اور بے کار سمجھا جاتا ہے۔ لوگ ان کے ساتھ بہت ہی بے رُخی بلکہ نفرت و حقارت سے پیش آتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو آج کے سماج میں قدم قدم پہ سزا بھگتنی پڑتی ہے۔ اگر وہ ضمیر کی بہت زیادہ پرواہ کرتے ہیں تو ضروریات زندگی کی چیزیں ان سے چھوٹنے لگتی ہیں۔ مجبوراً انھیں کہیں نہ کہیں سمجھوتہ کرنا ہی پڑتا ہے۔ اس سمجھوتہ کرنے میں ان کے ضمیر کو شکست خوردگی کے احساس سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ ان تمام دردناک مسائل کا اظہار اقبال متین نے اس طرح کیا ہے کہ قاری بھی اس درد میں شریک ہو جاتا ہے:

ہم میں ہی ایسی خامی ہے کچھ، اک اک کر کے ہر گھر چھوٹا
یا ہم سچ کے آدھاری ہیں، یا جیون کا پل پل جھوٹا
سب اچھے ہیں ہم نے سب کو آنکھوں میں دل میں رکھا
ایک ہوا کا جھونکا آیا آنکھیں بھیگیں دل بھی ٹوٹا
سوکھی سوکھی اس دھرتی پر کتنے ارماں بولیتے ہو
یاد رکھو بھی غم ہی ملے گا پھوٹے گا جب بوٹا بوٹا
چلتے چلتے تھک کر گولی خشک زباں کے نیچے رکھنا
یہ تو نہیں جینے کا سلیقہ کون رکے گا گر دم ٹوٹا
صاحب جی! اقبال متینؔ اب کتنے رستے ناپوگے تم
دیکھو جی اب بیٹھ رہو بھی، یہ چھوٹا تھا یا وہ چھوٹا (۱۵)

اقبال متین ترقی پسند تحریک سے بھی وابستہ رہے ہیں۔ انھوں نے عام ترقی پسند شاعروں کی طرح جذباتی انداز میں سیاسی اور ہنگامی موضوعات کو بھی غزل میں پیش کیا ہے جس میں اشتہاریت اور رپورٹنگ جیسی منفی خصوصیات در آئی ہیں۔ مثال کے طور پر ان کے درج ذیل اشعار ملاحظہ ہوں:

شاطر تھا وہ شومی مجلس بہت بڑا بیوپاری تھا
میں نے شوشہ چھوڑ دیا تھا وہ بھی کب انکاری تھا
ہائے سیاست کے سب چہرے دست و گریباں ہوتے تھے
کوئی کسی کا باپ نہ بیٹا جو کچھ تھا سرکاری تھا
مانگے کے موٹر سے منہ میں پائپ دبا کر اترا تھا
اندر جتنا خالی تھا وہ اوپر اتنا بھاری تھا
جس کی بیٹی قتل ہوئی تھی بدکاروں کے ہاتھوں سے
ہوم منسٹر کا چاچا تھا گاؤں کا وہ پٹواری تھا (۱۶)

یہ اقبال متین کی ہلکی پھلکی غزل ہے۔ اس میں انھوں نے موجودہ دور کی شاطرانہ سیاست، اس کی ریشہ دوانیوں اور سیاستدانوں کی تصویر کشی تو کی ہے مگر یہ غزل خبر بن کر رہ گئی ہے۔ اس میں اظہار کا سلیقہ،

انداز بیان کی دلکشی، جدت وندرت، تازگی وطرفگی، کچھ نہیں ہے۔اس میں تہہ داری اور گیرائی بھی نہیں ہے۔ اس میں انھوں نے طنز تو کیا ہے لیکن ان کا طنز کوئی بڑا طنز نہیں بن سکا بلکہ عام خیالات کو عام انداز ہی میں نظم کردیا ہے۔ان اشعار کو پڑھ کر یہی کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے تفنن طبع کے طور پر یہ اشعار کہے ہیں۔

اقبال متین نے اپنی غزلوں میں اپنے عہد کے تلخ حقائق اور سنگین حالات کا بھی اظہار کیا ہے۔ان کی بعض غزلیں اپنے عہد کے پس منظر میں بڑی معنویت واہمیت کی حامل معلوم ہوتی ہیں۔ان کی ایک ایسی ہی غزل ہے جو انھوں نے ایمرجنسی کے پس منظر میں کہی ہے۔اس میں انھوں نے ایمرجنسی کے موقع پر درپیش سماجی وسیاسی صورت حال، حکمراں طبقہ کے جوروستم، عام انسانوں کی بےبسی ولاچاری اور خوفناک حالات کی عکّاسی کی ہے۔اس غزل میں اس وقت کی صورت حال کی بھرپور تصویر تو نہیں مگر ایک دھندلی تصویر ضرور سامنے آتی ہے۔ملاحظہ ہو:

کوئی صلیب اُٹھائے ملے، تو لٹکادو
مری گلی سے جو گزرو تو میرا گھر ڈھادو
یہ آنکھیں خشک ہیں، تم آنسوؤں سے چھلکادو
بہت اُداس ہے اس زندگی کو بہلادو
یہ لوگ بھاگتے پھرتے ہیں رات خوابوں میں
ذرا انھیں بھی سنبھالو گھروں کی بنیادو
میں اپنی جاگتی آنکھوں سے ڈر گیا ہوں بہت
تمہارے پاس جو نیندیں ہیں میری لوٹادو
یہ سارے پاس کے منظر تو کچھ عجیب سے ہیں
جو ہوسکے تو انھیں دور کرکے دُھندلادو
وہ یوں بھی بارِ سماعت کہاں اُٹھاتا ہے
ذرا سنبھل کے مرے دشتِ دل کی فریادو
برہنہ پا بھی ہوں، تپتی ہوئی زمین بھی ہے
بہت کڑی ہے ابھی دھوپ کچھ تو سایا دو

یہ کن مزاروں پہ یوں سر جھکائے بیٹھے ہو
متین تم ہو کہاں دفن یہ تو بتلادو (۱۷)

یہ پوری غزل ایمرجنسی کے وقت کی خوفناک صورت حال کو ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔ایمرجنسی میں اوراس کے بعد ہمارے سماج میں حبس اور گھٹن کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔اظہار خیال پر پابندی لگادی گئی تھی۔شکوک کی بنیاد پر گرفتاریوں کا سلسلہ عام تھا۔ ہرطرف خوف و ہراس کا عالم تھا۔زندگی میں اتنی تلخیاں بھرگئی تھیں کہ زندگی اپنی شیرینی اور نغمگی بلکہ اپنی معنویت بھی کھوچکی تھی اورفریب بن کررہ گئی تھی۔دیکھئے ان پہلوؤں کا اظہار اقبال متین نے درج ذیل اشعار میں کس طرح کیا ہے:

کوئی کوندہ سا لپک کرغم جاں بن تو گیا
رات اُمڈ کر نہ گھٹا چھائی نہ کھل کر برسا
روح پیاسی تھی بہت خون مگر پی نہ سکی
لوجھلس دے گی مرے جسم کومعلوم نہ تھا
اس پہاڑی پہ بھلا آگ لگادی کس نے
دیکھتے دیکھتے منظر وہ سبھی راکھ ہوا
نیند ٹوٹی ہے کہیں دور لتا گاتی ہے
تو کہاں ہے کہ اس آواز سے رشتہ ہے ترا
آنکھیں بھیگی تھیں کہ دروازے پہ آہٹ سی ہوئی
وہ کوئی تھا ہی نہیں صرف ہوا کا جھونکا (۱۸)

اقبال متین نے اپنی غزلوں میں اپنے عہد کے مختلف مسائل پر اظہار خیال کیا ہے۔انھوں نے اپنے عہد کی پامال ہوتی انسانی واخلاقی قدروں، درہم برہم ہوتی اجتماعی زندگی،سماجی انتشار، پل بھر میں بنتے بگڑتے رشتوں،اس کی ناپائیداری اوردم توڑتی انسانیت کی تصویرکشی اس طرح کی ہے:

میرے عہد کا کیا پوچھے ہو،ذہن میں کچھ ہے دل میں کچھ
میّا جی کی کوکھ کہیں ہے، پتا کہیں، سنتان کہیں

سارے رشتے سارے ناتے سب ہیں آن واحد کے
دوست نما دشمن سے ہزیمت اور مرا تاوان کہیں (۱۹)

ان اشعار میں اقبال متین نے اپنے عہد کی تلخ سچائیوں کا اظہار کیا ہے لیکن یہاں بھی انھوں نے عام سا انداز بیان اختیار کیا ہے۔ ان کے انداز بیان میں برہنہ پن ہے۔ ان کے ان اشعار میں وہ ایمائیت واشاریت، جدت وندرت، جذبات واحساسات کی شدّت اور اس میں تخّیل وتفکّر کی وہ آمیزش نہیں ہے جو اچھی غزل کی خصوصیات ہیں۔ بلکہ اس کے بجائے ان میں جذباتیت اور اکہرا پن ہے۔ ان اشعار میں اقبال متین نے طنز تو کیا ہے لیکن ان کا طنز سطحیت اور ہلکا پن لیے ہوئے ہے۔

اقبال متین نے اسی عمومی طنزیہ انداز میں اپنے عہد کے منافقانہ ماحول، نئی تہذیب کے کھوکھلے پن، مکروفریب، جھوٹ، تصنع، ریاکاری، انسانیت کی تحقیروتذلیل، ظاہری چمک دمک کی فریفتگی اور عیّاری کی عکّاسی اس طرح کی ہے:

اس کی چاہت کا دم بھرتے نکلے کیسے کیسے لوگ
ہم نے لگا کر جان کی بازی دیکھے جھوٹے سچے لوگ
دل میں کچھ ہے، کچھ ہے زباں پر، اوپر سائے اندر دھوپ
سجدے میں چہرے کو چھپا کر میری ہوک سے اٹھے لوگ
بانس کے بدّے باندھ کے نکلے، ٹخنوں پر گھٹنوں کے پیچ
ریت کے ٹیلوں پر ناچے ہیں، ٹھگنے، بونے، چھوٹے لوگ
ہم نے نظریں نیچی رکھیں، اونچائی پر جھوٹ بہت تھا
نظر اٹھی تو ہم نے دیکھا اونچائی سے گرتے لوگ
شورِ سگاں ہے چار طرف بھی، ہاتھ میں سنگ اٹھا لینا
یوں نہ کبیدہ خاطر ہونا، لوگ ہیں، رنگ بدلتے لوگ (۲۰)

جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے کہ اقبال متین قدیم تہذیب کے پروردہ ہیں۔ ایسی تہذیب جس میں انسانیت ومحبت، اپنائیت وقربت تھی۔ رشتوں کا احترام تھا۔ بھری پُری زندگی اور اس کی دلکشی ورعنائی

تھی۔ اس کے برعکس نئی تہذیب میں نہ تو انسانیت ومحبت احترام ہے اور نہ رشتوں کا پاس ولحاظ۔ نئی تہذیب ایک کھوکھلی تہذیب ہے جس کی بنیاد مادیت پر ہے اور جس میں خودغرضی، مفاد پرستی، جھوٹ، تصنع، منافقت اور ریاکاری کا رواج ہے۔ اس تہذیبی فضا میں بے حسی وبے ضمیری عام ہے۔ لوگ اپنے اپنے ذاتی مفادات کے اسیر ہیں۔ بغیر مفاد کے کوئی کسی سے ملنا جلنا پسند نہیں کرتا ہے۔ سماج میں محبت ورفاقت نہیں رہ گئی۔ انسانوں کی بھیڑ ہے اس کے باوجود انسان تنہا اور اُداس ہے۔ انسانی سماج میں ہر طرف تنہائی، اُداسی اور سنّاٹے کا عالم ہے۔ ایسے منافقانہ اور زر پرستانہ تہذیبی ماحول میں اقبال متین جیسے پرانی تہذیب کے پروردہ انسان کو قدیم تہذیب کے مٹنے اور قدیم تہذیب میں پلے بڑھے انسانوں کے چلے جانے کا بے حد دُکھ ہے۔ اس کرب اور جدید تہذیبی زندگی کے المیہ کا اظہار اقبال متین نے اس طرح کیا ہے:

مرے رفیق سفر سب ٹھہر گئے شاید
وہ میرے نقشِ قدم چھوڑ کر گئے شاید
رعونتوں کو تمیز آگئی ہے جھکنے کی
وہ جتنے سانپ تھے سینوں میں مر گئے شاید
عجیب طرح سے ہے زندگی نہ غم نہ خوشی
ہم اپنے آپ کو تقسیم کر گئے شاید
دیارِ دل سے دریار تک عجب ہو تھا
ہم اپنے آپ سے ہو کر گزر گئے شاید
بجز خوشی نہ بچا کچھ بھی اہلِ ثروت کو
غموں کے کھیت ہمیں لوگ چر گئے شاید (۲۱)

جدید عہد کی زندگی میں انسانی واخلاقی قدروں کی کوئی اہمیت ہے، نہ رشتوں کا کوئی پاس ولحاظ ہے۔ یہاں مادیت، ظاہر پرستی اور مکروفریب کا بول بالا ہے۔ جدید عہد کی زندگی میں بظاہر تو چمک دمک نظر آتی ہے مگر تہذیب کے کھوکھلے پن کی وجہ سے حقیقی معنوں میں اس میں نہ کوئی چہل پہل ہے اور نہ کوئی رنگارنگی۔ ہر جانب اُداسی، بے چہرگی، تنہائی اور بے حسی کا عالم ہے۔ زندگی بالکل بے کیف اور بے رنگ

ہوکر رہ گئی ہے۔اس بے کیف زندگی اور اس کی تلخیوں کا اظہار اقبال متین نے اس طرح کیا ہے کہ جدید سماج کا منظر نگاہوں کے سامنے زندہ ہوجاتا ہے:

کچھ اتنا بے نیاز ہوں جینے کے باب میں
جس طرح دریا خود کو چھپالے سراب میں
آ زندگی تلاش کریں کوئی اور زہر
اپنے لیے تو کچھ نہ رہا اب شراب میں
وہ عالمِ فراق تھا اللہ کی پناہ
ہر شے جھلس رہی تھی شبِ ماہتاب میں
میں بھی جہاں سے اس طرح اٹھ جاؤں گا متیںؔ
جس طرح ترک رکھ کے اٹھا ہوں کتاب میں (۲۲)

اقبال متین نے اپنی غزلوں میں اپنے ذاتی غم، اپنے عہد کی زندگی کی تلخیوں، اپنے عہد کے المناک حالات کا نقشہ تو کھینچا ہے لیکن ان کے یہاں وہ معنویت وتہہ داری اور گہرائی وگیرائی پیدا نہیں ہوسکی جوان کے عہد کے ممتاز غزل گوشعرا، سلیمؔ احمد، شاذؔ تمکنت، حسنؔ نعیم، ساقیؔ فاروقی، نشترؔ خانقاہی، مخمورؔ سعیدی، محمدؔ علوی، زیبؔ غوری، بانیؔ، خلیل الرحمٰن اعظمی، ابنؔ انشا، منیرؔ نیازی، احمد فرازؔ، بشرنواز اور شہریارؔ وغیرہ کی غزلوں میں ملتی ہے۔اقبال متین نے اپنے ذاتی غم کا اظہار تو کیا ہے لیکن وہ اسے بڑا اور آفاقی غم نہیں بنا سکے۔انھوں نے طنزیہ لب ولہجہ بھی اپنایا لیکن ان کا طنز بھی کوئی بڑا طنز نہیں بن سکا بلکہ معمولی طنز بن کر رہ گیا۔انھوں نے جدید لفظیات وتراکیب کے ساتھ فارسی الفاظ وتراکیب کو بھی اپنایا۔جیسے سوادِ شب، ردائے تیرگی، کرمکِ شب تاب، دیدۂ خونناب، حرزِ رائگاں، صریرِ خامۂ انگشت خوں چکاں، سرشکِ سر مژہ، نقیب طالعِ ہنگام دشمناں، ستم طرازی دشنامِ دوستاں، ستارۂ شب ہجراں کی کہکشاں، دام آگہی، کارِ بودوہست، رازکشادوبست، جذبِ دروں کی جست، گلشن، دریچے، دشت اوراست وغیرہ۔اقبال متین نے اپنی دلی کیفیات، اپنے عہد کے دردوغم اور زندگی کی تلخیوں کے اظہار کے لیے نئی اور کلاسیکی دونوں طرح کی تراکیب کا استعمال کیا ہے۔جیسے بے شجر دھوپ، شیشۂ دل، آشفتہ حواس، غم شناس، ننگے پاؤں،

روزنِ دل، دیدہ پر آب، گلِ شاداب کا نم، دلِ ناشاد، ریزہ ریزہ خواب، ویراں دل، سنسان رستہ، شہرِ دل، شہرِ خموشاں، سیاست کے چہرے، مسجد کی چوکھٹ، لرزتا ہوا دل، پیراہن رنگیں، حسرتوں کے اندھیرے، خوں کی چاشنی، ارمانوں کے اندھیرے، چڑھتی دھوپ، خون کا گرداب اور پیاس کا زہراب وغیرہ۔ اقبال متین کی شاعری کے مطالعہ سے احساس ہوتا ہے کہ انھیں اردو و فارسی روایات سے واقفیت ہے اور کلاسیکی لفظیات کا بھی وہ علم رکھتے ہیں لیکن اس کے استعمال میں وہ خوش سلیقگی اور فنی دروبست کا مظاہرہ نہیں کر پائے ہیں۔ انھوں نے جن نئی تراکیب کا استعمال کیا ہے اس میں بھی وہ ناکام رہے ہیں۔ انھوں نے علامتی انداز بیان بھی اختیار کیا مگر ان کی بیشتر علامتیں معنویت اور تہہ داری کی صفات سے عاری ہیں اور نجی علامتیں بن کر رہ جاتی ہیں۔ علامتی انداز بیان کے علاوہ انھوں نے عام طرزِ اظہار بھی اختیار کیا ہے۔ ان کی غزلوں کے مجموعی جائزہ کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے تفنن طبع کے طور پر غزلیں کہی ہیں۔ وہ اپنی غزلوں میں فکری و فنی صلاحیتوں کا مظاہرہ نہیں کر پائے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بطور ایک غزل گو وہ اپنی شناخت قائم کرنے میں ناکام رہے ہیں۔

اقبال متین کی نظموں کا تنقیدی مطالعہ

اقبال متین کی ادبی زندگی کی ابتدا نظم نگاری سے ہوئی۔ ان کا پہلا غیر مطبوعہ شعر درج ذیل ہے جس کا ذکر انھوں نے اپنی یادوں کے مجموعہ ''باتیں ہماریاں'' میں کیا ہے:

ادھر دیکھوں تو دلدل ہے ادھر دیکھوں تو آتش ہے
کہاں جاؤں، کدھر جاؤں، رسول اللہ رسول اللہ (۱)

اقبال متین کی پہلی مطبوعہ نظم ''کب تلک'' اور دوسری ''کیوں؟'' ہے۔ یہ دونوں نظمیں بالترتیب ماہنامہ 'سب رس' حیدرآباد اور ماہنامہ 'ارم' حیدرآباد میں ۱۹۴۲ء میں شائع ہوئیں۔ ۱۹۴۲ء میں ان کی دو اور نظمیں ''انتساب'' اور ''تین پیکر'' منظر عام پر آئیں۔ ان نظموں کی اشاعت کے بعد وہ افسانہ نگاری کی طرف مائل ہوئے۔ افسانہ نگاری میں انھوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا ایسا مظاہرہ کیا کہ وہ ایک منفرد و ممتاز افسانہ نگار کی شکل میں سامنے آئے۔ اردو ادب میں ان کی شناخت تو افسانہ نگار کی حیثیت ہی سے ہے مگر انھوں نے اپنے ادبی سفر کے دوران اردو ادب کی مختلف اصناف جیسے خاکہ نگاری، یادنگاری اور مضمون نگاری میں طبع آزمائی کی اور تفنن طبع کے طور پر شاعری بھی کی۔ شاعری میں انھوں نے نظم اور غزل، ان ہی دو اصناف کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ انھوں نے نظم تو پہلے کہنا شروع کیا بلکہ اپنے ادبی سفر کا آغاز ہی نظم سے کیا اور غزل میں بعد میں دلچسپی لینی شروع کی لیکن انھوں نے غزلیں زیادہ کہی ہیں اور نظمیں کم۔ ان کے شعری مجموعہ ''صریر جاں'' میں کل سولہ نظمیں ہیں۔ اس کے علاوہ بھی ان کی کچھ نظمیں ہیں جن کو انھوں نے مجموعہ میں شامل کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ ان کی نظمیں اردو کے مختلف رسالوں میں شائع ہوئی ہیں۔ ایسے رسالوں میں 'ماہنامہ'' سب رس'' حیدرآباد'، 'ماہنامہ''ارم''، حیدرآباد'، 'ماہنامہ''شاہکار ادبی ڈائجسٹ''، الہ آباد'، 'ماہنامہ''مفاہیم''، گیا'، 'ماہنامہ''عصری ادب''، دہلی'،

'ماہنامہ'' تیر نیم کش''، مراد آباد،' سہ ماہی'' آہنگ''، گیا' اور' سہ ماہی' 'تمثیل''، بھوپال، قابل ذکر ہیں۔

اقبال متین کے بارے میں جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ وہ ایک اوسط درجے کے شاعر ہیں۔ انھوں نے فکشن نگاری میں جس فکری وفنی مہارت کا مظاہرہ کیا ہے، ایسا وہ اپنی غزلوں اور نظموں میں نہیں کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو ادب میں ان کی مقبولیت اور شناخت فکشن نگار کی حیثیت سے ہوتی ہے، نہ کہ غزل گو یا نظم نگار کی حیثیت سے۔ انھوں نے غزلیں اور نظمیں صرف تفنن طبع کے طور پر ہی کہی ہیں۔ ان کی غزلوں کی طرح ان کی نظمیں بھی فنی نقائص سے خالی نہیں البتہ ان کی نظموں میں ایک آدھ شعر اچھے نکل آتے ہیں۔ ان کی نظموں میں تجربے کی وہ پختگی، مشاہدے کی وہ باریکی اور احساس کی وہ گہرائی و گیرائی نہیں ہے جو اچھی نظم کی خصوصیات ہیں۔ ان کی نظمیں فکری وفنی شگفتگی، تازگی اور انوکھے پن کی صفات سے بھی عاری ہیں اور اظہار کا وہ فنی سلیقہ بھی ان نظموں میں نہیں ملتا جو نظم کا خاصہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظمیں عمومی تجربے کے بیان سے آگے نہیں بڑھ پاتیں۔ انھوں نے پابند اور آزاد دونوں ہیئتوں میں نظمیں کہی ہیں جن میں خود کلامی اور بیانیہ دونوں انداز پایا جاتا ہے۔ ان کی نظموں پر روایت کی چھاپ بھی ملتی ہے اور جدید طرز احساس بھی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ نظمیں داخلی اور دلی جذبات واحساسات اور اپنے عہد کی صورت حال سے نبرد آزما نظر آتی ہیں۔ ان کی ایک نظم'' کیوں؟'' کے عنوان سے ہے۔ اس نظم پر روایت کی چھاپ ہے۔ یہ پابند نظم ہے لیکن آخری شعر میں شاعر نے ردیف وقافیہ کی پابندی سے انحراف کیا ہے۔ اس آخری شعر کے علاوہ نظم کے بقیہ تمام اشعار میں ردیف وقافیہ کی پابندی کی گئی ہے۔ اس کی وجہ سے نظم میں غزل اور پابند نظم کی طرح آہنگ اور ترنم کا احساس ہوتا ہے۔ یہ نظم خود کلامی کے انداز میں ہے۔ نظم کا راوی خود شاعر ہے جو بظاہر تو اپنی اندرونی کیفیات کا اظہار کر رہا ہے مگر اصل میں وہ ذاتی حوالے سے سماجی صورت حال کو بیان کر رہا ہے۔ یہ نظم ۱۹۴۲ء میں لکھی گئی تھی۔ یہ وہ دور تھا جب دنیا میں ہر طرف دوسری عالمی جنگ کی تباہی کے اثرات نمایاں تھے۔ ہندوستان میں آزادی کی تحریک اپنے عروج پر تھی جس میں ہزارہا افراد مارے جا چکے تھے۔ عالمی اور ملکی پیمانے پر افراتفری، بے اطمینانی، اضطراب و انتشار اور بحران کا عالم تھا۔ زندگی ویرانیوں اور اُداسیوں میں گھر گئی تھی اور عام انسانوں پر بے کیفی اور بے دلی کی کیفیت طاری تھی۔ اس صورت حال کو شاعر نے تضادات کے ذریعے اس طرح بیان کیا ہے کہ اس

وقت کی صورت حال کا پورا منظر تو نہیں لیکن ایک دھندلا سا عکس نگاہوں کے سامنے ضرور آ جاتا ہے:

جب سرود و رقص و نغمہ ہوگئی ہو کائنات
دل ہم آہنگی نہیں کرتا ہے کیوں ادراک سے

چاند کی چوکھٹ پہ جب جھکتی ہے تاروں کی جبیں
روح کیوں ہوجاتی ہے سرکش خدائے پاک سے

تیز برساتوں سے جب ہوتی ہے دل کی آگ تیز
مسکراتا ہے کوئی کیوں دیدہ نمناک سے

رقص جب کرتی ہے فطرت آسمانی ساز پر
کھیلتا ہوں کیوں میں اپنے دامنِ صد چاک سے

وقتِ سجدہ بن کے کیوں مسجود آجاتے ہیں آپ
دیکھئے آواز دیتا ہے کوئی افلاک سے

لاکھ بہلائے دلِ شاعر بہلتا ہی نہیں
تار چھیڑے جارہے ہیں ساز بجتا ہی نہیں (۲)

اس نظم میں اقبال متین نے نئی تراکیب جیسے چاند کی چوکھٹ، تاروں کی جبیں اور آسمانی ساز کا بھی استعمال کیا ہے اور روایتی تراکیب جیسے دل کی آگ، دیدۂ نمناک اور دامنِ صد چاک کو بھی اختیار کیا ہے، اس کے باوجود اظہار بیان کی خوبی بہت زیادہ متاثر نہیں کرتی ہے۔ اس میں تجربے کی پختگی بھی نہیں ہے اور طرزِ اظہار بھی عمومی لہجہ لئے ہوئے ہے۔ یہ نظم نہ تو بہت اچھی کہی جاسکتی ہے اور نہ ہی بالکل پست درجے کی، بلکہ اسے اوسط درجے کی نظموں کے زمرے میں رکھا جاسکتا ہے۔

اقبال متین نے اپنے عہد کی صورت حال کا اظہار نظم ''تین پیکر'' میں بھی کیا ہے۔ اس نظم میں انھوں

نے اپنے عہد کے کسانوں کے المناک حالات کی تصویر کشی کی ہے۔ اقبال متین ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے جاگیردارانہ سماج، ان کے شب و روز اور اس سماج میں کسانوں پر ہونے والے جبر و استبداد کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ جاگیردارانہ سماج میں کسانوں کی حالت انتہائی ابتر تھی۔ کسان بے چارہ ہل چلا کر، رات دن محنت کر کے اس امید میں کھیتی کرتا اور فصل اُگاتا ہے کہ آنے والا کل بہتر ہوگا مگر جوں ہی فصل پک کر تیار ہوتی ہے، گرداور کے ذریعے اس کی فصل لوٹ لی جاتی ہے اور کسان بے چارہ لاچار و مجبور ہو کر دیکھتا رہتا ہے۔ کسان کی اسی بے بسی و مجبوری اور اس کے دُکھ درد کو اس نظم میں اُجاگر کیا گیا ہے۔ یہ نظم ترکیب بند میں ہے۔ اس نظم میں شاعر نے پہلے بند میں صبح، دوسرے بند میں دوپہر اور تیسرے بند میں شام کی ایسی منظر کشی کی ہے اور پہلے اور دوسرے بند کے آخری شعر اور تیسرے بند کے آخری دو شعروں میں کسان کی زندگی کو اس طرح اُجاگر کیا ہے کہ جاگیردارانہ سماج اور اس سماج میں کسانوں کی بے بسی و مجبوری کی ایک تصویر نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے۔ یہ تصویر بھرپور تو نہیں ہے لیکن بے جان بھی نہیں ہے۔ نظم ملاحظہ ہو:

صبح.......

صبح روپہلی تاروں کی جب جھل مل کم ہوجاتی ہے
چاند پہ چرخہ کاتنے والی بوڑھی جب سوجاتی ہے
نیندنگر کو جاتی ہے جب ٹولی سب مہ پاروں کی
اور یہ ٹولی چھپ جاتی ہے چوٹی پر کہساروں کی
کرنیں اپنے دامن میں جب اوس کے موتی رولتی ہیں
دور افق پر نیند کی پریاں اڑنے کو پر تولتی ہیں
جب جلوے سے دھندلے دھندلے سائے لپٹے رہتے ہیں
اوس کے موتی کرنوں کے دھاگے میں سمٹے رہتے ہیں
ایسے میں ہل کندھوں پر لے، مستقبل کا شہزادہ
بیلوں کی گھنٹی پر کچھ کچھ گاتا کھیت کو آتا ہے

دوپہر ....

چاندستارےاوس کےموتی،صبح کےسارےراگ گئے
دھن والےسوتےہیں اب تک،نردھن سارےجاگ گئے
سورج کا ہنس مکھ بچپن اب ہونے لگا چنچل سے جواں
اوس کے آنسو بننے لگے پھولوں کےغمگیں دل کا دھواں
بھاپ کی موجیں رقصاں ہیں، دھرتی کا تنفس بڑھنے لگا
آگ کے دریا کا دھارا ٹھاٹھیں بھرتا چڑھنے لگا
آگ کے شعلے کہساروں کی پیشانی کو چومتے ہیں
جیسے جہنم دوش پہ لے کر بھوت زمیں پر جھومتے ہیں
لیکن کھیت کے مالک کو ان باتوں سے کام ہی کیا
اپنی دھن میں گانے والا اپنی دھن میں گاتا ہے

شام ......

شاہ خاور نے جاکےشفق کی گودی میں دم توڑ دیا
دنیا کی پرچھائیں نے بھی دنیا سے منہ موڑ لیا
دور افق پر شب کی دیوی زلفوں کو بکھرانے لگی
نیند کی رانی چھپتے چھپتے ہر اک شئے پر چھانے لگی
اجلی اجلی سی بدلی میں چاند کی پیاری صورت ہے
یعنی مرمر کے مندر میں چاندی کی اک مورت ہے
دل کی اک بے نام خوشی اب کانوں میں کچھ بولتی ہے
کھیت کا راجا پھراس دھن میں گانے کولب کھولتا ہے
لیکن ایسے میں گرِداور دور سے کچھ چلاتا ہے
اس کا نغمہ آنسو بن کرآنکھوں سے بہہ جاتا ہے (۳)

نظم کا آخری مصرعہ بے پناہ کیفیت کا حامل ہے جو پوری نظم پہ بھاری ہے۔ اس نظم میں شاعر نے اسطوری علامتوں کا بھی استعمال کیا ہے جیسے چاند پہ چرخہ کاتنے والی بوڑھی۔ نظم میں شاعر نے منظر کشی اور پیکر تراشی کے لیے نئی تراکیب کو بھی اپنایا ہے جیسے روپہلی تاروں کی جھل مل، مہ پاروں کی ٹولی، کہساروں کی چوٹی، اوس کے موتی، نیند کی پریاں، کرنوں کے دھاگے، صبح کے راگ، پھولوں کے غمگیں دل کا دھواں، بھاپ کی موجیں، دھرتی کا تنفس، آگ کے دریا کا دھارا، شفق کی گودی اور شب کی دیوی وغیرہ۔ اس نظم میں اقبال متین نے نئی لفظیات وتراکیب کا استعمال تو کیا ہے لیکن اس میں بھی وہ فنکارانہ دروبست نظر نہیں آتا جس کی بنیاد پر اسے اعلیٰ نظموں میں شمار کیا جاسکے۔ یہ بھی اقبال متین کی اوسط درجے کی نظم ہے۔

اقبال متین کی ایک نظم ''انتساب'' کے عنوان سے ہے۔ یہ عشقیہ نظم ہے جس میں عشقیہ کیفیات اور لطیف جذبات واحساسات کا اظہار کیا گیا ہے۔ یہ نظم آزاد ہیئت میں ہے جو خود کلامی کے انداز میں لکھی گئی ہے۔ نظم کا راوی شاعر ہے جو روایتی قسم کا عاشق ہے۔ وہ اپنی محبوبہ کی جدائی کی آگ میں تڑپ رہا ہے۔ اسے سماجی بندشوں کا بھی ڈر ہے۔ وہ ہر رات اپنی محبوبہ کو خط لکھنا چاہتا ہے لیکن نہیں لکھ پاتا ہے۔ اپنی اس بے بسی کی کیفیات اور ہجر کے جذبات واحساسات کا اظہار شاعر نے اس طرح کیا ہے کہ قاری محسوس کیے بغیر نہیں رہتا:

ان کو!!!

اور انتظار کی تکلیف

رات خط کا جواب لکھنا ہے

چھپ کے دنیا کی ساری آنکھوں سے

ایک پیکر کو ہونٹ سے چھو کر

خوب نہلا کے اک تصور کو

دیدہ تر میں اپنے اشکوں سے

رات خط کا جواب لکھنا ہے

آج لفظوں میں ڈھال دینے کو

قلب کا اضطراب، سوزِ حیات

اور کاغذ میں دفن کر دینے

دل کے جذبات روح افسردہ

رات خط کا جواب لکھنا ہے

کیا ہوئیں آج نیند کی پریاں

کیا کسی کو بھی اذنِ خواب نہیں

کتنی نظروں کی زد مرے معبود!!

کچھ نہ لکھ پاؤں رات کٹ جائے

رات خط کا جواب لکھنا ہے

لو۔۔ یہ گھڑیال بجا۔۔ایک! یہ دو

ارے! کیوں ٹھیر گیا!! ٹھیک تو ہے؟

سرسراہٹ نہیں؟ سانسوں کی صدا!!!

کتنا کھویا ہوا انسان ہوں میں

رات خط کا جواب لکھنا ہے(۴)

یہ نظم قدرے اچھی نظم ہے۔اس میں اقبال متین نے متوازن اور شائستہ انداز میں اپنی دلی کیفیات کا اظہار اس طرح کیا ہے کہ یہ نظم ہجر وفراق کے مارے ہر عاشق کی نظم بن جاتی ہے۔ یہ نظم قاری کو متاثر بھی کرتی ہے۔ یہ نظم اگر چہ بہت معیاری نہیں ہے لیکن قدرے اچھی نظم ہے۔

اقبال متین کی قابل ذکر نظموں میں ''ہراسا'' اور ''بجوکا'' بھی ہیں۔ ''ہراسا'' مکالماتی اور ڈرامائی انداز میں لکھی گئی سوانحی نظم ہے۔اس میں اقبال متین نے اپنے بچپن اور جوانی کی زندگی کا موازنہ کیا ہے۔ بچپن میں جب وہ اپنی محبوبہ کے ساتھ کھیت کھلیانوں اور بغیچوں میں جاتے تو اپنی محبوبہ کو ہراسا کے خوف سے بچانے کے لیے خود آگے آگے چلتے اور ان کے پیچھے پیچھے ان کی محبوبہ ان کے ساتھ ہوتی۔بچپن میں وہ بے لوث جذبے کے تحت اپنی محبوبہ کو ہر طرح سے تحفظ فراہم کرنے کی کوشش کرتے رہے لیکن جب وہ بچپن سے جوان ہو گئے تو نامساعد حالات کے تحت وہ اپنی محبوبہ کو تحفظ فراہم کرنے سے قاصر ہو گئے۔اس

نظم میں اقبال متین نے اپنے ماضی کی بے لوث اور معصوم زندگی اور حال کی خوفناک صورت حال کا اظہار کیا ہے۔حال کی یہی وہ خوف ناک صورت حال ہے جس نے ان کے وجود کو ہراسا میں تبدیل کر دیا ہے اور ہراسا کوئی اور نہیں،خود ان کی ذات ہے جس سے ان کی محبوبہ خوف کھا رہی ہے:

ہراسا۔۔تجھ کو کھیتوں میں،بغیچوں میں
مرے بچپن نے دیکھا تھا
ٹھٹک کر رک گیا تھا میں
پکڑ کا ہاتھ منی کا،اسے اپنی طرف میں نے گھسیٹا تھا
کہا تھا۔۔تم مرے پیچھے چلو،پیچھے رہو۔۔۔دیکھو
کوئی ہے جو وہاں چھپ کر کھڑا ہے
ہاں وہیں پر پیڑ کے نیچے،ادھر دائیں طرف

☆

بہت پندار تھا تم کو
بہت مجھ سے محبت تھی
وہ کس جذبِ دروں نے عشق کو اتنی انا دی تھی
کہ تم ہر بار کہتے تھے
مرے پیچھے رہو،پیچھے چلو۔۔۔دیکھو
کوئی ہے جو وہاں چھپ کر کھڑا ہے
وہیں دائیں طرف،اس پیڑ کے نیچے
مگر اب کیا ہوا تم کو

☆

میں سایہ بھی نہیں ہوں
اور نہ میں آواز ہوں کوئی
نہ دستک ہوں
نہ آہٹ ہوں

ہوا کا کوئی جھونکا بھی نہیں ہوں میں
صبا ہوں اور نہ خوش بو ہوں
خیال و وہم کا بس اک کرشمہ ہوں
مگر تم ہو کہ اب تک میرے پیچھے پیچھے چلتے ہو
نہیں سوچا کبھی
برسوں ہوئے تم نے کہیں چھوڑا تھا مجھ کو بھی
ذرا جا کر تو دیکھ آؤ
کہ میں اب بھی وہیں، اس پیڑ کے نیچے، کھڑی ہوں
''ہراسا'' تو تمہیں ہو۔۔۔
تمھیں تو ہراسا ہو تم ہراسا ہو (۵)

اس نظم میں ماضی کی بازیافت بھی کی گئی ہے اور حال کی خوفناک حقیقت اور مستقبل کے اندیشے کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ اس نظم میں اس حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے کہ آج ہراسا کوئی اور نہیں بلکہ خود انسانی وجود ہی ہراسا بن کر رہ گیا ہے۔ اقبال متین کی یہ نظم پیکر تراشی اور منظر کشی کی عمدہ مثال ہے۔ اس میں ڈرامائی اور فلمی تکنیک سے بھی کام لیا گیا ہے۔ یہ اختر الایمان کی نظم ''ایک لڑکا'' سے ملتی جلتی معلوم ہوتی ہے لیکن اس میں وہ لحن اور آہنگ نہیں بن پایا جو اختر الایمان کے یہاں ہے۔ یہ نظم اقبال متین کی دیگر نظموں کے مقابلہ میں اچھی ہے۔ ''بجوکا'' بھی ان کی قابل ذکر نظم ہے۔ یہ افسانوی نظم ہے۔ اس میں انسان کی تخریبی صلاحیتوں، فطرت سے اس کی چھیڑ چھاڑ اور ایک خوفناک وجود میں اس کے تبدیل ہو جانے کو موضوع بنایا ہے۔ اس نظم میں دنیا کے شب و روز کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ دنیا میں آج ظلم و استبداد کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ اسی کے پہلو بہ پہلو فطرت، دنیا کی آرائش و زیبائش اور اسے رنگین بنانے میں مصروف ہے۔ فطرت اپنی نوازش ظالم اور مظلوم دونوں پر یکساں کرتی ہے لیکن تخریبی صلاحیتوں کے مالک انسان دنیا کے حسن و رنگینی کو مٹانے پر تلے ہوئے ہیں۔ اسی لیے آج بجوکا کوئی اور نہیں، بلکہ خود آج کا انسان ہے:

پرندے ڈار سے اپنی جدا ہو کر بھی حیراں ہیں
بجوکا یوں کھڑا ہے جیسے سب سنگسار کر دے گا

مگر تتلی اسی ماحول میں اتراتی پھرتی ہے
کبھی بھونرے نے یہ سوچا نہیں کہ وہ بجو کا تھا
وہ جس کی اڑتی بانہوں میں منٹ بھر کو پنہ لی تھی

☆

کرن یوں ٹوٹتی ہے گر کے ہر اک پھول پتی پر
کہ اس کو حسنِ فطرت میں کہیں تکمہ لگانا ہے
کہ اس کو پھول کی پتی سے شبنم کو اُٹھانا ہے
وہ شبنم جس کے موتی خار پر نوکِ سناں بھی ہیں

☆

مگر سورج کی کرنوں کو غرض اس سے نہیں ہے کچھ
سنہری تار کرنوں کے
کبھی تو پنکھڑی چومیں کبھی خارِ گلستاں کو

☆☆☆

اجالے ہیں تو سب کے ہیں
اندھیرے تھے تو کس کا کون تھا، کس کے اندھیرے تھے
ہوا کے نرم رو جھونکے
ہوا کے تند خو جھونکے
انہیں فرصت نہیں چھو کر گزرنے سے
پرندے ہوں کہ گل ہوں
خار و خس ہوں یا بجوکا ہو
مگر سورج کی کرنیں اب ہوا کا رُخ سمجھتی ہیں
وہ آدم جس کو معبودِ حقیقی نے تکبر کی سزا دے کر
کبھی روزِ ازل فردوس سے اپنی نکالا تھا
وہی آدم یہاں آ کر بجوکا بن گیا شاید
بجوکا یوں کھڑا ہے جیسے سب سنگسار کر دے گا

بجوکا یوں کھڑا ہے جیسے سب مسمار کر دے گا
ازل سے تا ابد آدم بجوکا ہی بجوکا ہے (۶)

اس نظم کے ایک مصرعے ''وہ آدم جس کو معبودِ حقیقی نے تکبر کی سزا دے کر'' میں خلاف واقعہ بات کہی گئی ہے۔ تکبر کی سزا ابلیس کو دی گئی تھی نہ کہ آدم کو۔ یہ شاعر کے مشاہدے اور تجربے کی کمزوری ہے۔ یہ نقص نہیں ہوتا تو نظم قدرے اچھی ہو جاتی۔ اس نقص سے قطع نظر یہ بھی اقبال متین کی قدرے بہتر نظم ہے۔

اقبال متین کی ایک طنزیہ نظم ''ایک طاغوت کی کہانی'' کے عنوان سے ہے۔ اس میں ایک کج نفسیات، متکبر و مغرور شخص کا بیان ہے جو اپنی جھوٹی علمیت و فضیلت کی بے جا نمود و نمائش کرتا ہے اور اپنے سامنے سب کو ہیچ سمجھتا ہے۔ وہ دنیا کا ہر وہ کام کرنا چاہتا ہے جو ممکن نہیں ہے۔ اس نظم میں اقبال متین نے طنز تو کیا ہے لیکن وہ گہرا اور کاری طنز نہیں کر سکے ہیں۔ یہ نظم بھی معمولی انداز بیان لیے ہوئے ہے البتہ نظم کا آخری مصرعہ ''کہا حضور مرے بال نذر کر دوں گا'' غضب کا مصرعہ ہے اور گہرے طنز کی کاٹ لیے ہوئے ہے۔

ان نظموں کے علاوہ اقبال متین کی دیگر نظموں میں ''دن رات''، ''ایک نظم''، ''وعدہ''، ''وراثت''، ''مشورہ''، ''بے زمینی''، ''تجسیمِ تصور''، ''ساجھا''، ''قرب'' اور ''سنو بھی'' ہیں جن میں اقبال متین نے اپنی زندگی کی تلخیوں، محرومیوں، ناآسودگیوں، اُداسیوں اور اپنی بے دلی اور بے کیفی کے جذبات و احساسات اور اپنے عہد کے دردناک حالات کا اظہار کیا ہے۔ اقبال متین کی نظموں میں دردمندی اور انسانی ہمدردی کا احساس تو ہے لیکن وہ فکری و فنی پختگی، گہرائی و گیرائی نہیں ہے جو ان کے عہد کے ممتاز نظم نگار شعرا اور شاعرات، سلیم احمد، خلیل الرحمٰن اعظمی، باقر مہدی، فہمیدہ ریاض، شہریار، زبیر رضوی، اجمل اجملی، حسن عابد، ظفر گورکھپوری، شہاب جعفری، عارف نقوی، عبدالاحد ساز، ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی، شہناز نبی اور نسیم سید وغیرہ کے یہاں محسوس ہوتی ہے۔ اقبال متین کی نظموں کے تفصیلی جائزہ سے جو بات سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے کہ انھوں نے تفننِ طبع کے طور پر نظمیں کہی ہیں۔ انھوں نے اپنی نظموں میں نہ تو فکری و فنی کمال کا مظاہرہ کیا ہے اور نہ ہی وہ نظم نگار کی حیثیت سے اپنی شناخت بنا سکے ہیں۔ ہاں انھیں ایک اوسط درجے کا نظم نگار ماننے میں کوئی تامل نہیں۔

حوالے

(الف)

(۱)اقبال متین، باتیں ہماریاں، ناشر: گونج پبلی کیشنز، اردو گھر، نظام آباد، ۲۰۰۵ء، ص:۵۹، ۶۰۔

(۲)اقبال متین، انٹرویو، مشمولہ، اقبال متین سے اُنسیت، مرتب: نورالحسنین، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۲ء، ص:۳۰۹۔

(۳)ایضاً، ص:۳۰۹، ۳۱۰۔

(۴)اقبال متین، صریرِ جاں، کل ہند ریسرچ اسکالرس کونسل، حیدرآباد، ۲۰۰۶ء، ص:۱۱۵۔

(۵)ایضاً، ص:۸۱۔

(۶)ایضاً، ص:۴۸۔

(۷)ایضاً، ص:۵۸۔

(۸)ایضاً، ص:۱۲۵۔

(۹)پروفیسر شہریار، صریرجاں: ایک تاثر، مشمولہ، اقبال متین سے اُنسیت، ص:۳۶۱۔

(۱۰)اقبال متین، صریرِ جاں، ص:۵۸۔

(۱۱)ایضاً، ص:۶۶۔

(۱۲)ایضاً، ص:۶۷۔

(۱۳)ایضاً، ص:۸۳۔

(۱۴)ایضاً، ص:۷۳۔

(۱۵)ایضاً، ص:۱۱۲۔

(۱۶)ایضاً، ص:۹۰۔

(۱۷)ایضاً، ص:۵۳۔

(۱۸)ایضاً، ص:۵۵۔

(۱۹)ایضاً، ص:۸۳۔

(۲۰)ایضاً، ص:۱۲۳۔

(۲۱)ایضاً، ص:۱۳۲، ۱۳۳۔

(۲۲)ایضاً،ص:۷۲۔

(ب)

(۱)اقبال متین، باتیں ہماریاں،ص:۶۰۔

(۲)اقبال متین،صریر جاں،ص:۱۴۶۔

(۳)ایضاً،ص:۱۴۴،۱۴۵۔

(۴)ایضاً،ص:۱۴۱،۱۴۲۔

(۵)ایضاً،ص:۱۵۵تا۱۵۹۔

(۶)ایضاً،ص:۱۶۸،۱۶۹۔

باب پنجم

معاصرین میں اقبال متین کا مقام و مرتبہ

معاصرین میں اقبال متین کا مقام ومرتبہ

اقبال متین آزادی کے بعد کے منفرد و ممتاز افسانہ نگار ہیں۔ کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی، حیات اللہ انصاری وغیرہ کے بعد افسانہ نگاروں کی جو نئی نسل سامنے آئی، اس میں وہ نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں اپنی فکری و فنّی نُدرت اور اپنے مخصوص لب ولہجہ کی بنا پر اپنے معاصرین میں بھی اپنی خاص پہچان رکھتے ہیں۔ ان کے معاصر افسانہ نگاروں میں جوگندر پال، غیاث احمد گدّی، قاضی عبدالستار، اقبال مجید، جیلانی بانو، رتن سنگھ اور عابد سہیل وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

جوگندر پال

جوگندر پال اردو کے ایک ممتاز اور مقبول افسانہ نگار ہیں۔ وہ ۵/ ستمبر ۱۹۲۵ء کو سیالکوٹ کے ایک گاؤں ''چاوناں'' میں پیدا ہوئے اور بی۔ اے تک کی تعلیم وہیں حاصل کی۔ ۱۹۴۷ء میں جب تقسیمِ ہند کا سانحہ پیش آیا تو وہ اپنے والدین کے ساتھ ہجرت کر کے انبالہ آ گئے۔ اس کا اثر ان کے فکر وفن پر بھی پڑا۔ ان کے تخلیقی سفر کا آغاز شعر گوئی سے ہوا مگر کہانیوں سے طبعی مناسبت کی وجہ سے وہ بہت جلد اس کی طرف مائل ہو گئے۔ اردو افسانہ کے معتبر محقق مرزا حامد بیگ کے مطابق ان کا پہلا افسانہ ''تعبیر'' ۱۹۴۴ء میں مرے کالج میگزین میں شائع ہوا تھا۔(۱)۔ ان کی باقاعدہ ادبی زندگی کا آغاز ان کی کہانی ''تیاگ سے پہلے'' سے ہوا۔ یہ کہانی ۱۹۴۵ء میں شاہد احمد دہلوی کے مشہور ومعروف رسالہ ''ساقی'' میں شائع ہوئی تھی۔ جوگندر پال اردو ادبی دنیا میں افسانہ نگار کی حیثیت سے اس وقت مشہور ومقبول ہوئے جب ان کا پہلا

افسانوی مجموعہ ''دھرتی کا کال'' کے عنوان سے ۱۹۶۱ء میں شائع ہوکر منظرِ عام پر آیا۔اس مجموعہ کے علاوہ ان کے دیگر افسانوی مجموعوں میں ''میں کیوں سوچوں''، ''رسائی''، ''مٹی کے ادراک''، ''لیکن''، ''بے محاورہ''، ''بے ارادہ''، ''کھلا''، ''کھودو بابا کا مقبرہ'' ہیں۔

جوگندر پال کا شمار اردو کے ان چند گنے چنے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے فکر وفن کے نئے دریچے کھولے اور فن افسانہ نگاری میں وسعت پیدا کی۔ان کے افسانوں میں موضوعات کا دائرہ خاصا وسیع ہے۔وہ اپنے افسانوں کے موضوعات براہ راست زندگی سے اخذ کرتے ہیں اور کرداروں کے مکالموں کے ذریعے اصل مسئلہ کی طرف کچھ اس طرح اشارہ کرتے ہیں کہ وہ قاری کے حافظہ کا حصّہ بن جاتا ہے۔موضوعات کی پیش کش کا یہ طریقہ جوگندر پال کی فکر کی گہرائی اور وسعت کو ظاہر کرتا ہے اور ان کی انفرادیت کا بھی پتہ چلتا ہے۔وہاب اشرفی ان کی افسانہ نگاری کے اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''جوگندر پال اپنے افسانوں کے موضوعات کے لیے زندگی کے مسائل کی طرف براہ راست رجوع کرتے ہیں اور ان پر اپنے کرداروں کی زبان سے خاصے تیکھے تبصرے کرواتے ہیں۔ان کے افسانوں کا یہ تیور انھیں ایک فکری ساخت دے دیتا ہے اور ان کی انفرادیت نئے لکھنے والوں میں مسلم ہوجاتی ہے۔''(۲)

جوگندر پال کی افسانہ نگاری کا ابتدائی زمانہ کینیا، جنوبی افریقہ میں گذرا۔وہاں وہ ایک طویل عرصہ تک مقیم رہے۔اس دوران انھوں نے وہاں کے لوگوں کی زندگی اور اس کی پیچیدگیوں کو بہت قریب سے دیکھا اور ان کی زندگی کے گونا گوں مسائل ومشکلات کو اپنے افسانوں میں سمونے کی کوشش کی۔اس لیے ان کے ابتدائی افسانے افریقی زندگی اور ماحول کے عکّاس نظر آتے ہیں۔ان افسانوں میں انھوں نے مشرقی افریقہ کے سیاسی اور سماجی ماحول کی عکّاسی کرتے ہوئے اس سرزمین پر انگریزوں کی لوٹ کھسوٹ اور انگریزوں کے ذریعے افریقیوں پر ہوئے مظالم واستحصال اور ان کی دُکھ بھری زندگی کو موثر انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔جوگندر پال جب جنوبی افریقہ سے مکمل طور پر واپس ہندوستان آئے تو وہ کچھ دنوں حیدرآباد میں رہے۔اس کے بعد ایک طویل عرصے تک اورنگ آباد پھر مکمل طور پر دہلی

میں قیام پذیر ہوئے۔ انھوں نے ہندوستان کے چھوٹے بڑے مختلف شہروں کی زیارت کی۔ اس سے انھیں انسانی زندگی کو الگ الگ رنگوں میں دیکھنے کا موقع ملا، ان کے مشاہدہ میں وسعت پیدا ہوئی اور مختلف مسائل وموضوعات نے ان کے افسانوں میں جگہ پائی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں کا کینوس وسیع نظر آتا ہے۔

جوگندر پال کی کہانیوں میں بیک وقت دو سطحیں دکھائی دیتی ہیں۔ ایک وہ جو عام قاری کے ابلاغ کی سطح ہوتی ہے۔ دوسری وہ جو کہانی کی داخلی سطح ہوتی ہے۔ اس میں فکر کا پہلو غالب ہوتا ہے۔ یہ سطح کہانی کو اس کے ظاہری مفہوم سے آگے لے جانے کا مطالبہ کرتی ہے اور اس طرح کہانی میں ایک نئی معنویت پیدا ہو جاتی ہے۔

جوگندر پال نے چھ دہائیوں سے زیادہ عرصہ پر محیط اپنے افسانوی سفر میں کئی نمائندہ افسانے اُردو ادب کو دیے جن میں ''بُو''، ''رسائی''، ''مہابھارت''، ''کتھا ایک پیپل کی'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ''بُو'' میں اس حقیقت سے پردہ اُٹھایا گیا ہے کہ سرکاری اسپتالوں میں کیسے نااہل ڈاکٹر عوام کے علاج ومعالجہ کی خدمات پر مامور کیے جاتے ہیں جن کی ساری توجّہ رشوت خوری اور کالے دھن کی کمائی پر ہوتی ہے۔ یہ نااہل ڈاکٹر اسپتال کی دوائی سے لے کر اوزار تک بیچ ڈالتے ہیں اور اپنی کمائی کے لیے عام انسانی جانوں کے ساتھ بھی کھیلواڑ کرتے ہیں۔ جب زندہ انسانوں سے ان کی ہوس پوری نہیں ہوتی ہے تو اسپتال میں پڑی لاشوں کو بھی فروخت کرنے کا کاروبار کرنے لگتے ہیں۔ افسانہ کا مرکزی کردار ڈاکٹر سروپ ہے جو سرکاری اسپتال کا ایک نااہل ڈاکٹر ہے۔ اسے رشوت کھانے اور کالے دھن کمانے میں بڑی مہارت ہے۔ اسے شراب کی زبردست لت لگی ہوئی ہے۔ انسانی واخلاقی اقدار اس کے لیے بے معنی ہیں۔ اسے اپنی بیوی بچّوں سے بھی محبّت وہمدردی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی پیاس ان سے بھی زندہ نہیں ہوتی۔ اس کی بیوی اس سے کہتی ہے۔

> ''ارے او سرو، تمہارے بیوی ہے، پھول سی بچّی ہے ہم سے تمہاری پیاس زندہ کیوں نہیں ہوتی؟'' پھر ناری کو یکلخت اپنی بے بسی پر غصّہ آنے لگتا ہے۔
> ''تم.... تم مُردوں کے ڈاکٹر ہو سرو، تم کیا جانو، کسی بے کل روح کی بچی کھچی سانسیں اکٹھّی کر کے اسے اپنے پیروں پر کیسے کھڑا کیا جا سکتا ہے؟'' (۳)

اس اقتباس میں جوگندر پال نے نااہل اور بےضمیر ڈاکٹر کی بےحسی پر بڑا گہرا طنز کیا ہے۔اس افسانہ میں انھوں نے عصر حاضر کے انسان کی بےضمیری پر ماتم کرتے ہوئے،سماج میں معدوم ہوتی ہوئی انسانیت کے المیہ کو فن کارانہ مہارت سے اُجاگر کیا ہے۔''رسائی'' میں جوگندر پال نے رشوت خوری، منافقت، ریاکاری اور چور بازاری جیسے مسائل کو بےنقاب کیا ہے۔افسانہ کا مرکزی کردار رام پرشاد ہے جو بظاہر بڑا اچھا جیوتشی ہے مگر دراصل ایک جیوتشی کے بھیس میں وہ نشیلی اشیاء کی سوداگری کرتا ہے اور بہت سارے ممالک کا جاسوس ہے۔اپنے اسی دھندے کی خاطر اس نے جیوتش کا پیشہ اختیار کیا ہوا ہے۔

> ''اب آپ سے کیا پردہ؟ دراصل یہی دھندا کرنے کے لیے میں نے جیوتش کا پیشہ اختیار کر رکھا ہے۔میرے پاس بےحساب کوکین، افیون، گانجا اور بھانت بھانت کی نشیلی جڑی بوٹیاں مشرقی ممالک سے پہنچتی ہیں اور میرے ایجنٹ میرے جیوتش کے پرستار بن کر آتے ہیں اور میرا مال فوراً کلئیر ہو جاتا ہے۔''(۴)

جوگندر پال نے اس افسانہ میں جاسوسی اداروں کی سازشوں کو بےنقاب کرتے ہوئے عصر حاضر کی گھناؤنی سیاست اور حکومت کی خودغرضانہ چالوں پر بڑا گہرا طنز کیا ہے۔ افسانہ کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

> ''ہمارے دور کا سارا کاروبار ''ڈرگز'' سے ہی چل رہا ہے۔ ہمارے فنانس منسٹرز اچھی خاصی ڈرگ لینے کے بعد ہی اپنی اپنی قوم کا سالانہ بجٹ پیش کرتے ہیں اور حزبِ مخالف کے ان گنت اعتراضات کا نہایت چین سے مسکرا مسکرا کر جواب دیتے ہیں۔''(۵)

''مہابھارت'' میں جوگندر پال نے دورِ حاضر کی خواتین کے استحصال کی جھلک پیش کی ہے اور ''کتھا ایک پیپل کی'' میں سماجی ناہمواری، طبقاتی نابرابری اور نچلے اور پست طبقے پر ہو رہے ظلم وستم کی پُراثر داستان بیان کی ہے۔ جوگندر پال نے اپنے بعض افسانوں میں شہری زندگی کے بہت اچھے نقوش کھینچے ہیں۔''سواریاں''اور''بازدید'' کا شمار ان کے ایسے ہی افسانوں میں ہوتا ہے جن میں شہر کی ہنگامہ خیزی، مشینی زندگی اور اس کی مشکلات ومسائل کو دلکش انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

جوگندر پال نے سیدھے سادے بیانیہ انداز میں بھی افسانے لکھے ہیں اور بہت سے افسانوں میں

علامتی طرزِ اظہار اختیار کیا ہے۔ان کے علامتی افسانوں میں علامت بھرتی کے لیے استعمال نہیں ہوتی بلکہ وہ کہانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ان کے کامیاب علامتی افسانے خارجی زندگی کے وسیع تر مفہوم کی ترجمانی کرتے ہیں۔انھوں نے اپنے افسانوں میں تجریدیت کے تجربے بھی کئے مگر بہت جلد وہ اس تجربہ سے تائب ہوکر کہانی پن اور کردارنگاری کی طرف واپس لوٹ آئے۔

جوگندر پال کے بیشتر افسانوں میں فکر کا عنصر غالب ہے اوران کا لب ولہجہ استفہامیہ ہے۔ان کے اکثر افسانے قاری کے لیے سنجیدہ سوال چھوڑ جاتے ہیں اور انھیں غوروفکر کی دعوت دیتے ہیں۔ ''عفریت''، ''عموذ''، ''وادیاں''، ''کھودو بابا کا مقبرہ''، ''بیک لین''، ''اس طرف'' وغیرہ اس نوع کے نمائندہ افسانے ہیں۔ جوگندر پال کا کمال یہ ہے کہ ان کے اس قسم کے افسانوں میں فکروفلسفہ اور استفہامیہ لب ولہجہ کی کارفرمائی کے باوجود کہانی میں بوجھل پن پیدا نہیں ہوتا بلکہ دلچسپی اور دلکشی کی کیفیت برقرار رہتی ہے۔وزیر آغا ان کی افسانہ نگاری پر اظہارِخیال کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''جوگندر پال ان ادیبوں میں سے ایک ہیں جن کی تحریروں میں سوچ کا عنصر روشنی کی درخشندہ گزرگاہوں کی طرح صاف نظر آتا ہے۔ان کی فکر شبنم کی طرح شفاف اور خوشبو کی طرح تازہ ہے۔ یہ کسی فلسفے یا نقطۂ نظر سے ماخوذ یا اس کی تشہیر کا وسیلہ نہیں بلکہ اس کے حسی تجربات سے پھوٹی ہے۔اور اسی لئے بے حد دلکش اور منفرد لگتی ہے۔''(۶)

پروفیسر قمر رئیس، جوگندر پال کی انفرادیت پر یوں روشنی ڈالتے ہیں۔وہ لکھتے ہیں:

> ''فن کے معاملے میں جوگندر پال نے اس کی ریاضتی تعریف کو قابل اعتنا نہیں سمجھا اورانہوں نے اپنے تخلیقی شعور اور جمالیاتی وجدان پر زیادہ بھروسہ کیا اور اپنے مواد کو تخلیقی اظہار کی ایسی سطح سے پیش کیا کہ افسانہ کی روح سے تعرض کئے بغیر اس کی ایک الگ شناخت بن گئی ہے۔افسانہ ہو یا ناول جوگندر پال کی ہر نئی تخلیق ایک نئی واردات، نئے تجربے کا مظہر ہوتی ہے۔ ان تخلیقات میں جو شئے مشترک ہوتی ہے وہ ہے مصنف کی دردمندی، عصری مسائل کا ادراک اور عام انسان کے دکھ درد سے گہری وابستگی۔وہ زندگی کے عام اور معمولی واقعات میں آسانی سے دوررس نفسیاتی اورتہذیبی حقائق کا مشاہدہ کرلیتے ہیں۔ ان کا وژن آفاقی ہے اور ان کے بیشتر

افسانے ایک نئی جمالیاتی حسّیت کا احساس دلاتے ہیں جس سے ان کے فن
کی منفرد شناخت قائم ہوتی ہے۔''(۷)

جوگندر پال کے افسانوں کے جائزے سے احساس ہوتا ہے کہ ان کے افسانوں میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک اچھے افسانہ نگار کے لیے لازمی ہیں۔ وہ کردار، واقعہ، قصہ پن اور پس منظر کے لوازم کا پورا خیال رکھتے ہیں۔ پلاٹ کی تشکیل میں وہ ایک خاص معیار قائم رکھتے ہیں۔ وہ واقعات کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ افسانہ پڑھتے وقت قاری کو اپنی طرف راغب کرتا ہے۔ کردار نگاری میں بھی ان کا فنّی شعور عروج پر ہے۔ وہ کردار کی داخلی وخارجی دونوں خصوصیات کو اُجاگر کرتے ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں ایک تخلیقی دنیا کو پیش کرتے ہیں اور فرضی واقعات کی مدد سے ایک ایسی صورتِ حال اُبھارتے ہیں کہ ان کی تصویر حقیقی نظر آتی ہے۔ زبان وبیان کے لحاظ سے بھی ان کے افسانے دلکش اور جاذبِ توجّہ ہیں۔ غرض یہ کہ انھوں نے اُردو افسانہ نگاری کے میدان میں اپنی فکری وفنّی مہارت اور اپنے فن کارانہ کمال کا ایسا مظاہرہ کیا ہے کہ ان کا شمار اپنے عہد کے بلند پایہ افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کی افسانہ نگاری کا مطالعہ کرتے ہوئے، م.م. راجندر نے بڑی دلچسپ رائے کا اظہار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

''جوگندر پال بلاشبہ اپنے عہد کے ایک ایسے جیالے اور پختہ کار افسانہ نگار
ہیں جنھوں نے اپنی لازوال تخلیقات سے اُردو افسانے اور ادب کو مالامال
کیا ہے۔''(۸)

غیاث احمد گدّی

آزادی کے بعد جو منفرد وممتاز افسانہ نگار اُبھر کر سامنے آئے ان میں اقبال متین کے ساتھ ساتھ غیاث احمد گدی نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ اقبال متین ان کی تحریروں کو بے حد پسند کرتے تھے۔ وہ اپنی کتاب ''باتیں ہماریاں'' میں لکھتے ہیں۔ ''میری نسل کے لکھنے والوں میں قاضی عبدالستار و غیاث احمد گدی کی اہمیت میں نے دل ہی دل میں محسوس کی تھی۔''(۹) غیاث احمد گدّی ۱۷/ فروری ۱۹۲۸ء کو جھریا، بہار کے گدّی (گوالہ) خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کا بچپن بھی اسی ماحول میں گذرا۔ وہ رسمی تعلیم سے محروم رہے البتہ انھوں نے اردو، عربی کی ابتدائی تعلیم گھر پر اور گدّی مدرسہ میں حاصل کی۔ انھوں نے کرشن

چندر سے متاثر ہوکر افسانہ نگاری کا آغاز کیا۔ مرزا حامد بیگ کے مطابق ان کا اوّلین مطبوعہ افسانہ ''جوار بھاٹا'' ہے جو دسمبر ۱۹۴۵ء میں ''عالمگیر'' لاہور میں شائع ہوا۔(۱۰) شاہد تسلیم رقم طراز ہیں: ''ان کا پہلا افسانہ 'ہمایوں' لاہور میں 'دیوتا' کے نام سے ۱۹۴۷ء میں چھپا۔'' (۱۱) ان کی تخلیقات میں ان کے افسانوں کے تین مجموعے ''بابا لوگ'' ۱۹۶۹ء، ''پرندہ پکڑنے والی گاڑی'' ۱۹۷۷ء، ''سارا دن دھوپ'' ۱۹۸۵ء اور ایک ناولٹ ''پڑاؤ'' ہے۔

غیاث احمد گدّی نے اس وقت لکھنا شروع کیا جب ترقی پسند تحریک عروج پر تھی۔ وہ اس تحریک سے متاثر بھی تھے۔ آگے چل کر وہ جدیدیت سے بھی خاصے متاثر ہوئے۔ ان دونوں کا اثر ان کے افسانوں پر دیکھا جا سکتا ہے۔ انھوں نے سیدھے سادے انداز میں بھی افسانے لکھے ہیں اور علامتی و استعاراتی انداز میں بھی۔ ان کی کہانیوں کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ استعاراتی و علامتی انداز بیان کے باوجود ان میں کہانی پن موجود ہے۔ انھوں نے اپنی افسانہ نویسی کی ابتدا خاص قسم کے معاشرتی افسانوں سے کی جن میں معاشرہ کے مختلف پہلوؤں کو مختلف زاویوں سے پیش کیا۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں عام انسانوں کے جذبات و احساسات کو لطیف پیرایہ میں بیان کیا ہے اور انسانی نفسیات کی عکاسی بڑی چابکدستی سے کی ہے۔ غیاث احمد گدّی سماج کے نچلے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ اس طبقے سے انھیں بڑی ہمدردی تھی۔ وہ سماج کو ظلم و استبداد کے پنجے سے آزاد دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ زندگی کے بے ڈھنگے پن سے نالاں تھے۔ سماج کے رستے ہوئے ناسوروں نے انھیں بے چین کر دیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے ہم عصر سماجی مسائل کو اپنے افسانوں میں بڑی خوبصورتی سے پیش کیا۔ سماجی موضوعات پر لکھے گئے ان کے افسانوں میں ''کیمیا گر''، ''قیدی''، ''کالے شاہ''، ''دیمک''، ''افعی'' اور ''پرندہ پکڑنے والی گاڑی'' قابل ذکر ہیں جن میں معاشرہ کی بدحالی، اخلاقی زوال، طبقاتی کشمکش، انسانی اقدار کی بے قدری، نچلے طبقے کی محرومیت و حق تلفی کو موثر پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔

''پرندہ پکڑنے والی گاڑی'' غیاث احمد گدّی کا نمائندہ افسانہ ہے۔ اس میں حالات کے جبر، عام لوگوں کی بے ضمیری اور باضمیر افراد کی بے بسی و لاچاری کو موضوع بنایا گیا ہے۔ افسانہ میں پرندہ پکڑنے والی گاڑی کو دکھایا گیا ہے جو شہر کے پرندوں کو پکڑ کر لے جاتی ہے اور قید کر لیتی ہے۔ یہ پرندہ پکڑنے والی

گاڑی دراصل ضمیر اور فکر وشعور کی آزادی کو چھیننے والی طاقت کی علامت ہے اور پرندہ سے مراد عام انسانوں کا ضمیر اور فکر وشعور کی آزادی ہے۔اس کہانی میں اس حقیقت کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ظالم وجابر حکمراں لوگوں کے ضمیر اور فکر وشعور کی آزادی کو چھین رہے ہیں مگر لوگوں کا ضمیر احتجاج نہیں کرتا۔اگر چند باضمیر افراد احتجاج کرتے ہیں تو سکّوں اور نوٹوں کے عوض انھیں بھی خرید لیا جاتا ہے۔تعجّب کی بات یہ ہے کہ یہ عمل اس خوش اسلوبی سے انجام دیا جارہا ہے کہ لوگوں کو یہ عمل بُرا لگنے کے بجائے اچھا لگنے لگتا ہے۔افسانہ کا مرکزی کردار واحد متکلم باضمیر افراد کا نمائندہ ہے۔اسے ضمیر اور فکر وشعور کی آزادی کی اہمّیت کا بے حد احساس ہے۔یہ ضمیر ہی ہے جو کسی بھی معاشرہ میں ظلم واستحصال کے خلاف آواز اُٹھاتا ہے۔یہ کسی بھی قوم کا قیمتی اثاثہ ہے۔ضمیر کا لُٹنا اور فکر وشعور کی آزادی کا سلب ہونا کسی بھی قوم ومعاشرے کے زوال اور ہلاکت وتباہی کی علامت ہے۔اس تباہی پر افسانہ کا مرکزی کردار بے حد متفکر ہے۔وہ معاشرہ کے دوسرے افراد کو بیدار کرنا چاہتا ہے مگر المیہ یہ ہے کہ لوگ بیدار نہیں ہوتے۔اس حالت کو دیکھ کر اسے بڑا صدمہ ہوتا ہے۔افسانہ کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ’’دُوسرے دن میں بازار کے سارے لوگوں سے کہتا پھرا۔جوتے گانٹھنے والے موچی سے، کپڑے بیچنے والے بزاز سے، بھیڑ میں گھرے رہنے والے ڈاکٹر سے، روٹی اور دال بیچنے والے سے، راہ گیروں سے، سفید پتلون والے سے، تیز رفتار بابو سے، بوجھ ڈھونے والے قلی سے، رنگین دوپٹّے والی خاتون سے، جو سڑک پر ہولے ہولے یوں چلتی ہے گویا سارے زمانے کو روند کر گذر جانے کا فیصلہ کر چکی ہے، دونوں سیاستدانوں سے، جو آپس میں سازشی انداز سے گفتگو میں مصروف لپکے چلے جارہے تھے۔میں ایک ایک آدمی سے پوچھتا پھرا، تیز رفتار گاڑیوں کو روکنے کی ناکامیاب کوشش کی کہ دس سالہ بچّے کی جوان بہن لقوہ کی مریض ہے اور حکیم جی نے دواؤں کے ساتھ لقا کبوتر کے پروں کی ہوا کے لئے کہا ہے۔اگر یہ گاڑی والے، بچّے کے کبوتر کو بھی لے گئے تو پھر کیا ہوگا؟
> مجھے کسی نے جواب نہیں دیا۔سب اپنی اپنی دنیا میں مصروف رہے۔اس لئے میں دس سالہ بچّے کے سوال کو پی گیا اور کوئی جواب نہیں دے سکا۔مجھے افسوس تھا۔اُداس، سر جھکائے چلا جارہا تھا، میرے پاؤں تھک گئے تھے۔‘‘(۱۲)

پرندہ پکڑنے والی گاڑی شہروں میں گشت کر کے آزاد پرندوں کو تو پکڑتی ہی ہے، گھریلو پرندوں کو بھی پکڑ کر لے جاتی ہے۔ وہ اس لقا کبوتر کو بھی لے جاتی ہے جس کے پروں کی ہوا کو حکیم جی نے دس سالہ بچّے کی جوان اور لقوہ میں مبتلا بہن کے لئے دواؤں کے ساتھ تجویز کیا ہے۔ یہاں افسانہ نگار نے معاملہ کی سنگینی کو بیان کرنا چاہا ہے۔ انھوں نے دکھانا چاہا ہے کہ حالات اس قدر گمبھیر ہیں کہ عام لوگوں کے جینے کے وسائل تک کو موجودہ سماجی وسیاسی نظام اپنے قبضہ میں لینے کی کوشش کر رہا ہے مگر موجودہ معاشرہ اس قدر میکانکی زندگی جینے کا عادی ہو چکا ہے کہ اسے اس کا احساس ہی نہیں ہے۔ دیکھئے اس بے حسی و بے ضمیری کے منظر کو افسانہ نگار نے کس خوبی سے اُبھارا ہے:

''شام ڈھلے، درختوں پر بسیرا لینے والی چڑیوں کی چہکار سنائی نہیں دیتی۔ لاجوردی آسمان پر سفید بگلے، توازن سے اُڑنے والے بگلے بھی دکھائی نہیں دیتے، بھری دوپہر کی خاموش فضا میں چیلوں کی درد بھری چیخ بھی سنائی نہیں دیتی۔ کبوتر کی غٹرغوں، پپیہے کی پی کہاں، مینا کی ٹوئیں ٹوئیں کی آواز سے کان محروم ہو جاتے ہیں۔ حتّٰی کہ مولوی صاحب کے مرغ کی اذان بھی کہیں کھوگئی ہے۔''

''لیکن بازار اور رونقِ بازار میں کوئی فرق نہیں آتا۔ خرید وفروخت جاری ہے۔ شور شرابہ، یکّے والوں کی کھٹ کھٹ، ٹم ٹم والوں کے گھوڑوں کی گھنٹیاں بجتی رہتی ہیں، لمبی اور خوبصورت کاریں زوں زوں کر کے گذرتی جاتی ہیں، آمد ورفت جاری ہے۔ کاروبار بدستور ہے، خریدنے والے اُسی طرح بازار کی دوکانوں پر جمے رہتے ہیں اور بیچنے والے اُسی انہاک سے سودا سلف بیچ رہے ہیں۔ ایک ہنگامہ ہے کہ جاری ہے۔ ایک دوڑ ہے کہ رُکنے کا نام نہیں لیتی۔''

''پھر دن ڈھلتا ہے، رات آتی ہے اور اپنے تمام چھوٹے بڑے، کھرے کھوٹے، سچّے جھوٹے بچوں پر آرام کی، سکون کی چادر تان دیتی ہے۔ پھر رات بھی چلی جاتی ہے، صبح نمودار ہوتی ہے اور خلقت بیدار ہوتی ہے۔''(۱۳)

اس افسانہ میں غیاث احمد گدّی نے موجودہ معاشرہ کے لوگوں کی مفاد پرستی، بے حسی، بے ضمیری، ان کی میکانکی زندگی، حالات کی سنگینی اور باحس افراد کی لاچاری و بےبسی کو بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔ اسی سے ملتا جُلتا افسانہ ''تج دو تج دو'' ہے۔ اس میں معاشی اور سیاسی بددیانتی کی گرم بازاری کو دکھایا گیا

ہے۔ افسانہ کا مرکزی کردار خود افسانہ نگار ہے جو حسّاس اور باضمیر ہے۔ وہ ظلم واستبداد اور ناانصافی وبددیانتی کے خلاف احتجاج کرتا ہے مگر معاشرہ کا کوئی فرد اس کا ساتھ نہیں دیتا ہے۔ایسے میں افسانہ نگار موجودہ مسائل کا حل تجویز دینے میں بتاتا ہے کیوں کہ معاشرہ کے لوگوں میں حس اور جذبۂ الفت ومحبت نہیں ہے جس سے وہ جدّ وجہد کریں اور مسائل کو حل کریں۔اس افسانہ میں افسانہ نگار نے سماج کی بددیانتی وبے ایمانی کو بھی اُجاگر کیا ہے اور اپنے عہد کی بے حسی اور بے ضمیری کی صورت حال پر بھی طنز کیا ہے۔

اپنے عہد کی المناک سماجی وتہذیبی صورت حال سے متاثر ہوکر غیاث احمد گدّی نے اور بھی کئی افسانے لکھے ہیں جن میں ''ناردُمنی''، ''ایک خون آشام شام'' وغیرہ ہیں۔ان دونوں افسانوں میں بھی سماج کے تاریک پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

غیاث احمد گدّی کے افسانوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا مطالعہ وسیع نہ سہی مگر ان کا مشاہدہ عمیق ہے اور حیات وکائنات کے اسرار ورموز سے انہیں گہری واقفیت ہے۔انھوں نے اپنے افسانوں کے لئے اپنے اردگرد پھیلی زندگی اور اس کی مختلف صورتوں سے مواد حاصل کیا ہے۔انھوں نے اپنے افسانوں میں انسان کے نفسیاتی رشتوں کی عکاسی بڑی فنکاری سے کی ہے۔اس سلسلہ میں وہ راجندر سنگھ بیدی سے متاثر معلوم ہوتے ہیں۔کردار نگاری میں بھی انھوں نے اپنی فنی مہارت کا مظاہرہ کیا ہے۔ان کے کردار جس ماحول ومعاشرے سے تعلق رکھتے ہیں اس کے سارے اوصاف ان میں پائے جاتے ہیں اور ان کے کرداروں کی زبان اور ان کا لب ولہجہ فطری معلوم ہوتا ہے۔

غیاث احمد گدّی اس اعتبار سے منفرد حیثیت کے حامل ہیں کہ ان کے افسانوں کا ایک خاص تہذیبی پس منظر ہوتا ہے اور اسی پس منظر میں ان کے کردار اپنے خدوخال ظاہر کرتے ہیں۔غیاث احمد گدّی جدید افسانہ کی ایک اہم کڑی ہیں۔ان کے موضوعات ان کے اردگرد کی انسانی زندگی کے مختلف مسائل سے گہری مطابقت رکھتے ہیں۔فرد اور معاشرے کی کشمکش، جنسی تھکن، نفسیاتی رشتوں کی پیچیدگی وغیرہ مسائل کی پیش کش اور روایتی وعلامتی اسلوب بیان، شعور کی رَو کی تکنیک کا استعمال وغیرہ ان کی تخلیقات کے اہم اجزا ہیں جن سے ان کی منفرد شناخت قائم ہوتی ہے۔مشہور افسانہ نگار حسین الحق رقم طراز ہیں:

''میرے خیال میں غیاث احمد گدی پر غور کرتے ہوئے چند اہم نکات کو پیش

> نظر رکھنا انتہائی ضروری ہے۔اول تو یہ کہ غیاث صاحب کے افسانے مسلمہ افسانوی ڈھانچے کی شکست کا نہیں بلکہ توسیع کا نشان ہیں۔جن کہانیوں پر جدید رجحان کے اثرات ہیں مثلاً ''پرندہ پکڑنے والی گاڑی''، ''تج دو تج دو''، ''آخ تھو'' ان میں بھی کہانی کا فارم ٹوٹتا نظر نہیں آتا۔ پھر یہ بھی کہ غیاث کے افسانوی ماحول کے بارے میں ایک مفروضہ پہلے تو یہ وضع کیا گیا کہ ان کے یہاں اینگلو انڈین ماحول کی عکاسی ہے، پھر دوسرا مفروضہ پیش کیا گیا کہ ''گدیوں'' (یعنی مسلمان گوالوں) کا ماحول ان کی کہانی کے لئے خام مواد کا کام کرتا ہے۔مگر سچ یہ ہے کہ یہ دونوں مفروضے ادھوری صداقت پیش کرتے ہیں۔ پورا سچ یہ ہے کہ ماحولیاتی پیش کش میں غیاث احمد گدی کے وسیع تر مشاہدے اور ہمہ جہت تخلیقی عمل نے بہت معاونت کی ہے۔ ''خانے تہہ خانے''، ''ڈوب جانے والا سورج''، ''پرندہ پکڑنے والی گاڑی'' جیسے افسانے وسیع مشاہدے اور ہمہ جہت تخلیقی عمل کا ثبوت ہیں۔ البتہ گدی کی کہانیوں پر بنگلہ کہانیوں کی جزئیات نگاری، تاثر آفرینی اور حزنیہ کیفیت کے اثرات ضرور نظر آتے ہیں۔مزید برآں یہ کہ گدی کی جزئیات نگاری بیدؔی کی یاد بھی دلاتی ہے۔فرق یہ ہے کہ راجندر سنگھ بیدی کھر درے سے کھر درے الفاظ اور از حد غیر متوازن بلکہ بے ڈھنگی صورت حال کے درمیان سے بھی ایک خوب صورت تخلیقی آہنگ تلاش کر لیتے ہیں جب کہ غیاث احمد گدی منصہ شہود پر نمایاں ہونے والے آہنگ کو نمایاں ہونے سے پہلے ہی شاید محسوس کر لیتے ہیں اور اسی مناسبت سے الفاظ اور صورت حال کا انتخاب کرتے ہیں، یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ ان کا تخلیقی آہنگ اپنے لئے صورت حال اور آہنگ کا خود ہی انتخاب کرتا ہے۔''(۱۴)

غیاث احمد گدّی نے اگر چہ کم لکھا ہے مگر انھوں نے افسانہ نگاری کے میدان میں جس فکری وفنّی مہارت کا مظاہرہ کیا ہے اس کی بنا پر وہ ایک منفرد وممتاز افسانہ نگار کے روپ میں سامنے آتے ہیں۔ترقی پسند افسانہ نگاروں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی اور حیات اللہ انصاری وغیرہ کے بعد افسانہ نگاروں کی جو نسل سامنے آئی، اس میں غیاث احمد گدّی اہم مقام رکھتے ہیں۔

قاضی عبدالستار

اقبال متین کے معاصر افسانہ نگاروں میں قاضی عبدالستار بھی بُلند مقام کے حامل ہیں۔ وہ ایک صاحب طرز افسانہ نگار ہیں۔ قاضی عبدالستار ۹/فروری ۱۹۳۳ء کو مچھریٹہ، ضلع سیتاپور، اتر پردیش میں ایک تعلقدار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم وطن میں اوراعلیٰ تعلیم لکھنو اور علی گڑھ میں حاصل کی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے پی، ایچ، ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد وہ وہیں درس وتدریس سے وابستہ ہوگئے۔ انھوں نے اپنا ادبی سفر شاعری سے شروع کیا مگر طبعی مناسبت کی وجہ سے وہ بہت جلد افسانہ نگاری کی طرف مائل ہوگئے۔ انھوں نے تفنّن طبع کے طور پر تنقیدی مضامین اور انشایئے بھی لکھے ہیں مگر ادبی دنیا میں وہ افسانہ نگار اور ناول نگار خصوصاً تاریخی ناول نگار کی حیثیت سے مشہور ومعروف ہیں۔ ''شکست کی آواز''، ''شب گزیدہ''، ''صلاح الدین ایوبی''، ''داراشکوہ''، ''غالب''، ''حضرت جان'' اور ''خالد بن ولید'' ان کے ناول اور ''مجّو بھیّا''، ''بادل'' اور ''غبارِ شب'' ان کے ناولٹ ہیں۔ ناول نگاری کے علاوہ افسانہ نگاری میں بھی وہ ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ ان کا پہلا افسانہ ''اندھا'' ہے جو ۱۹۴۶ء میں رسالہ 'جواب' لکھنو میں شائع ہوا۔ ان کی افسانہ نگاری کا باقاعدہ آغاز ''پیتل کا گھنٹہ'' سے مانا جاتا ہے۔ یہ افسانہ ۱۹۶۴ء میں ماہنامہ 'کتاب' لکھنو میں چھپا۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''پیتل کا گھنٹہ'' ہے جس میں پانچ افسانے شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے افسانوں کا ایک ضخیم مجموعہ بعنوان ''آئینہ ایام: قاضی عبدالستار کے بہترین افسانے'' ہے جسے ڈاکٹر محمد غیاث الدین نے ترتیب دیا ہے۔

قاضی عبدالستار حقیقت پسند افسانہ نگار ہیں۔ وہ ایک لمبے عرصے تک ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے۔ ان کے فن پر پریم چند کا اثر بھی پڑا ہے۔ دیہات کو اس کی روح کے ساتھ پیش کرنے میں وہ پریم چند کے مماثل نظر آتے ہیں۔ قاضی عبدالستار سماجی حقیقت پسند افسانہ نگار ضرور ہیں مگر ان کے اور پریم چند اور دوسرے ترقی پسند افسانہ نگاروں کے درمیان فرق ہے۔ پریم چند اور دوسرے ترقی پسند افسانہ نگاروں

نے سماج کے دبے کچلے غریب، مفلس اور مفلوک الحال عوام کی تباہی و بربادی کی عکاسی ہے جب کہ قاضی عبدالستار نے آزادی کے بعد کے زمیندار طبقے کی خانہ بربادی کو ہمدردی اور جذباتی شدّت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ پریم چند اور ترقی پسند افسانہ نگاروں کے یہاں زمیندار ظالم کے روپ میں سامنے آتے ہیں جب کہ قاضی عبدالستار کے یہاں زمیندار آزادی کے بعد قابل رحم اور افسوس ناک حالت میں نظر آتے ہیں۔ ان کی بعض کہانیوں میں جن میں آزادی سے قبل کے ماحول کو پیش کیا گیا ہے، زمیندار رحم دل اور منصف مزاج بھی دکھائی دیتے ہیں۔ دراصل قاضی عبدالستار نے کسی بنے بنائے اصول کے تحت سیاہ وسفید کا فیصلہ نہیں کیا ہے بلکہ جو کچھ انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور محسوس کیا اس کو ایک سچّے فنکار کی طرح بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

قاضی عبدالستار کے یہاں تین قسم کے افسانے ملتے ہیں۔ پہلی قسم ان افسانوں کی ہے جن میں سیتاپور (اودھ) کے زمینداروں کی شکستہ حالی اور ان کے آس پاس رہنے والے دوسرے لوگوں کی زندگی کے مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ دوسری قسم ان افسانوں کی ہے جن میں شہر کی مطلب پرست اور میکانکی زندگی کی عکاسی کی گئی ہے۔ تیسری قسم کے افسانوں میں تاریخی موضوعات کو پیش کیا گیا ہے۔ قاضی عبدالستار نے اگرچہ شہر کے مسائل اور تاریخی واقعہ کو بھی موضوع بنایا ہے لیکن ان کا اصل میدان دیہات ہے۔ دیہات سے متعلق ان کے افسانوں میں طرز معاشرت، رسم ورواج، توہم پرستی، مذہبی عقائد، اندھی عقیدت، تہوار، گنگا جمنی تہذیب، تفریح طبع کے سامان (مثلاً شکار کھیلنے اور مجریٰ سننے کا شوق) عورتوں کی نفسیات، جاگیرداروں کی عیّاشی، ان کے نشست وبرخاست کے آداب اور پھر آزادی کے بعد بدلی سیاسی وسماجی فضا میں ان کی بے بسی کی حقیقی عکاسی کی گئی ہے۔ آزادی کے بعد کسانوں کا اُبھرتا ہوا مالدار طبقہ بھی ان کے افسانوں کا موضوع بنا۔ اس ضمن میں ''ٹھاکر دوارہ''، ''رضو باجی''، ''پیتل کا گھنٹہ''، ''مالکن''، ''گرم لہو میں غلطاں''، ''مجریٰ''، ''لالہ امام بخش'' اور ''روپا'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ''رضو باجی''، ''پیتل کا گھنٹہ'' اور ''مالکن'' ان کے نمائندہ افسانے ہیں۔

افسانہ ''رضو باجی'' واحد متکلم اور رضو باجی کے ناکام عشق کی کہانی ہے۔ اس افسانہ میں رضو باجی کے کردار کے ذریعہ جاگیردارانہ معاشرے میں توہم پرستی، لڑکیوں کی نفسیات، ان کی بے بسی اور گھٹن،

کھوکھلی وضع داری اور ظاہری شان وشوکت کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ رضو باجی اس معاشرے میں رائج فرسودہ عقائد اور توہم پرستی سے اس قدر متاثر ہے کہ واحد متکلم کی شادی کے بعد بھی اسے کامل یقین رہتا ہے کہ عشق میں اسے کامیابی ملے گی اس لئے وہ دوسری جگہ شادی کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔ اس کردار کے ذریعے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ جاگیردارانہ معاشرے میں رہنے والی لڑکی تمام عمر کنواری رہنا گوارہ کرلیتی ہے مگر اپنے دل کی بات کسی پر عیاں نہیں ہونے دیتی۔ اس کے علاوہ اس افسانہ میں زمینداروں کی شکست خوردہ اور زبوں حال زندگی کی جھلکیاں اور ماضی میں ان کے تفریح طبع کے سامان کا ذکر بھی ملتا ہے۔

افسانہ ''پیتل کا گھنٹہ'' میں بھی زوال پذیر جاگیردارانہ معاشرہ اور اس کی دم توڑتی ہوئی تہذیب کو دکھایا گیا ہے۔ افسانہ کے کردار قاضی انعام حسین کبھی تعلقدار تھے اور پوری ریاست میں ان کی شان وشوکت تھی مگر زمینداری کے خاتمے کے بعد وہ اور ان کی بیوی کسمپرسی کی حالت میں صرف ماضی کی یادوں کے سہارے زندہ ہیں اور پرانی روایت کو قائم رکھنے کی انتھک کوشش کرتے ہیں لیکن آخر میں ناکامی ہی ہاتھ آتی ہے:

> ''ارے.... ارے دادی... آپ کیا کر رہی ہیں؟'' اپنی جیب میں جاتے ہوئے روپیوں کو میں نے پکڑ لیا۔
> ''چپ رہو تم..... تمہاری دادی سے اچھے تو ایسے ویسے لوگ ہیں، جو جس کا حق ہوتا ہے وہ تو دے دیتے ہیں .... غضب خدا کا، تم زندگی میں پہلی بار میرے گھر آؤ میں تم کو جوڑے کے نام پر ایک چٹ بھی نہ دے سکوں.... میں .... بھیّا، تیری دادی تو فقیرن ہوگئی.... بھکارن ہوگئی۔'' معلوم نہیں کہاں کا زخم کھل گیا تھا۔ وہ دھاروں دھار رو رہی تھیں۔'' (۱۵)

جاگیردارانہ تہذیب کے زوال کی کہانیوں میں ''مالکن'' قاضی عبدالستار کی ایک بہترین کہانی ہے۔ اس میں انھوں نے مالکن کی داخلی کشمکش اور ان کی نفسیات کی عکاسی فنکاری سے کی ہے۔ افسانہ کا زیادہ تر حصّہ حال کے واقعات کا احاطہ کرتا ہے جب کہ ماضی کی کچھ جھلکیاں مالکن کی خود کلامی کے ذریعہ سامنے آتی ہیں۔ آزادی کے بعد مالکن پر پے در پے کئی مصیبتیں نازل ہوئیں جن کا مقابلہ وہ ہمت اور ثابت قدمی سے کرتی ہیں لیکن انجام کار ناکام ہو جاتی ہیں۔ مالکن پر سب سے پہلی مصیبت یہ آتی ہے کہ ان کے شوہر میر محمد علی کا انتقال ہو جاتا ہے اور کسٹوڈین کا مسئلہ آن کھڑا ہوتا ہے۔ وہ حکومت کو یقین دلانے کے

لئے اپنے زیور بیچ کر مقدمہ لڑتی ہے کہ ان کے شوہر پاکستان نہیں قبرستان گئے ہیں۔ جب حکومت کو یقین ہو جاتا ہے کہ میر محمد علی واقعی مر گئے ہیں تو مالکن پر دوسری مصیبت یہ نازل ہوتی ہے کہ ان کی زمینداری کے خاتمے کا اعلان کر دیا جاتا ہے:

''برسوں کی مسلسل اور لکھ لٹ یقین دہانی کے بعد ایک رات چودھری الہ آباد سے یہ پروانہ لائے کہ حکومت نے مان لیا کہ واقعی میر محمد علی بیگ پاکستان نہیں قبرستان ہی گئے ہیں۔ وہ رات عجیب رات تھی۔ مالکن ساری رات جا نماز پر بیٹھی رہیں۔ ساری رات شکرانے کی نمازیں پڑھتی رہیں۔ عورتیں ساری رات حقے کی چلمیں بھرتی رہیں اور چلمیں سلگ سلگ کر جلتی رہیں اور صبح ہوتے ہی حویلی کے سامنے پٹواری نے ڈگی پیٹ کر زمینداری کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔'' (۱۶)

مالکن کسٹوڈین کے مسئلہ میں کامیابی سے حوصلہ پا کر اپنی زمینداری بچانے کے لئے اپنے ایک نمک حلال نوکر گلاب نرائن کے ذریعے حکومت کے خلاف مقدمہ لڑتی ہے لیکن اس لڑائی میں اس کے پاس لق ودق خالی حویلی کے علاوہ کچھ بھی نہیں بچتا۔ بعدازاں مالکن اپنی خاندانی وجاہت کو بالائے طاق رکھ کر اپنی خودداری کو بچانے کے لئے دوسروں کے کپڑے سیتی ہے۔ اس پر وہ بُرے دن بھی آتے ہیں کہ اس کے بارے میں اس کے نوکر گلاب نرائن کے ساتھ اس کے ناجائز تعلقات کی افواہ اُڑائی جاتی ہے۔ وہ اس افواہ کو اگرچہ انگیز کر لیتی ہے مگر اس کی خودداری شدید طور پر مجروح ہوتی ہے۔ اس الزام کے بعد اس کا نوکر گلاب نرائن خودکشی کر لیتا ہے۔ یہاں نوکر کا کردار مالکن کے تئیں اپنی وفاداری سے قاری کو بے حد متاثر کرتا ہے۔ مالکن کا کردار قابل رحم حالت میں نظر آتا ہے جس سے قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس افسانے میں اپنی جڑوں سے جُڑے رہنے کا بھی شدید احساس ملتا ہے۔ جب ایک دور کا رشتہ دار مالکن کو پاکستان اپنے پاس بلانے کا پیغام بھیجتا ہے تو مالکن گلاب نرائن سے کہتی ہے:

''مجھ کم بختی کی ماری پر اب ایسے بپمبری وقت پڑ گئے ہیں کہ موئے ایروں غیروں کے ساتھ دوسرے مُلک سدھار جاؤں گی۔ اس سے کہنا کہ اپنے ہوتوں سوتوں کو سمیٹ لے جائیے اپنے ساتھ پاکستان کو ..... مجھے تو اب ایک ہی جگہ جانا لکھا ہے جب تک حکم نہیں آتا تبھی تک بیٹھی ہوں۔'' (۱۷)

مذکورہ افسانوں کے علاوہ قاضی عبدالستار نے ''گرم لہو میں غلطاں'' اور ''مجریٰ'' میں بھی زوال پذیر

جاگیردارانہ معاشرے اوراس کے اقدار کی تصویر کشی کی ہے۔ ’’لالہ امام بخش‘‘ اور’’روپا‘‘ میں انھوں نے زمینداروں کے آس پاس رہنے والے لوگوں کے سماجی مسائل، ان کی زندگی کے نشیب وفراز اوران کی نفسیات کی عکاسی کی ہے۔ ان افسانوں میں دیہات کی زندگی کو پیش کیا گیا ہے۔ دیہات کے علاوہ قاضی عبدالستار نے شہر کی زندگی کو بھی اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ ان کے ایسے افسانوں میں بیگانگی کا احساس ملتا ہے جن میں شہر کی میکانکی اور مشینی زندگی کے علاوہ بھیڑ، بے کاری، بے پناہ مصروفیت، دھوکا، ریاکاری اور متوسط طبقے کے مسلم گھرانوں کی پردہ نشین خواتین کی دبی ہوئی جنسی خواہشات اور گھٹن کی عکاسی کی گئی ہے۔ اس ضمن میں ’’ایک دن‘‘، ’’کتابیں‘‘ اور’’ماڈل ٹاؤن‘‘ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ افسانہ ’’ایک دن‘‘ میں شہر کی میکانکی زندگی کو دکھایا گیا ہے۔ افسانہ کا مرکزی کردار سلمٰی اوراس کا شوہر ہے۔ سلمٰی کا شوہر ایک روٹین کے تحت مشینی زندگی گزارتا ہے۔ وہ جدید صنعتی شہروں میں رہنے والے ان لوگوں کی نمائندگی کرتا ہے جن کی زندگی میکانکی اور مشینی ہوگئی ہے۔ سلمٰی اپنے شوہر کی میکانکی زندگی، ان کے مشینی برتاؤ اور ماحول کی یکسانیت سے اس قدر بیزار ہو جاتی ہے کہ اس کا گھر چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ جاتے وقت وہ اپنے شوہر کے نام ایک خط لکھ کر میز پر رکھ دیتی ہے جس میں وہ ان خیالات کا اظہار کرتی ہے:

> ’’مجھے یقین ہے آپ نے پوری فلم دیکھی ہوگی۔ پورا کھانا کھایا ہوگا جو کچھ بچا ہوگا اسے فریج میں رکھ دیا ہوگا اور اب آئس کریم کھانے کے بعد میرا خط پڑھ رہے ہوں گے۔ مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ آپ نے شکایت کا موقع ہی کہاں دیا، کاش! آپ ایک جدید ترین آٹومیٹک مشین ہیں۔‘‘(۱۸)

افسانہ’’کتابیں‘‘ میں شہر کے متوسط طبقے کے مسلم گھرانوں کی پردہ نشین خواتین کی دبی ہوئی جنسی خواہشات اور گھٹن کو پیش کیا گیا ہے اور’’ماڈل ٹاؤن‘‘ میں دہلی شہر کی بے پناہ مصروفیت، بھیڑ، بے کاری، دھوکا، زندگی کی یکسانیت اور احساس بیگانگی کی عکاسی کی گئی ہے۔ قاضی عبدالستار نے چند تاریخی موضوعات کو بھی افسانے کے قالب میں ڈھالا ہے۔ ’’نیا قانون‘‘، ’’بھولے بسرے‘‘، اور’’آنکھیں‘‘ وغیرہ کا شماران کے تاریخی افسانوں میں ہوتا ہے۔ ’’نیا قانون‘‘ میں اودھ کے نواب واجد علی شاہ کی معزولی کے واقعہ کو بیان کیا گیا ہے۔ ’’بھولے بسرے‘‘ میں ۱۸۵۷ء کی ناکام تحریک آزادی اور مغلیہ

سلطنت کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کی معزولی سے قبل اور انگریزوں کے لال قلعہ فتح کرنے کے بعد تک کے واقعات پیش کیے گئے ہیں۔''آنکھیں'' میں بادشاہ جہانگیر کے منصفانہ جذبات اور مغلیہ سلطنت کے عہد زریں کی طرز معاشرت کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

قاضی عبدالستار کے افسانوں کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ افسانے کے فن وتکنیک پر ان کی گرفت مضبوط ہے۔ وہ موضوع کے موافق اسلوب تشکیل دیتے ہیں۔ان کی کہانیوں میں ایجاز واختصار، تاثر، کہانی پن، پلاٹ، کردار، ہر چیز کا اہتمام ملتا ہے۔ وہ چند جملوں میں پورا سماں باندھ دیتے ہیں۔ان کا کمال یہ ہے کہ وہ ایک ماحول کی تخلیق کرتے ہیں جس میں قاری کھو جاتا ہے اور پھر تھوڑی دیر کے لئے وہ اسی افسانے کا ایک کردار بن جاتا ہے جو سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوتا ہے۔قاضی عبدالستار کو جذبات کی ترجمانی اور فنکارانہ جزئیات نگاری میں بھی ملکہ حاصل ہے۔ وہ ایک ایک منظر، ایک ایک واقعے کی تفصیل اس کی پوری جزئیات کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔شمس الرحمٰن فاروقی ان کی افسانہ نگاری پر اظہار خیال کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''قاضی عبدالستار Paradoxes کے بادشاہ ہیں۔ان کا فن ایڈگر ایلن پو کی یاد دلاتا ہے۔ان کے قلم میں گزشتہ عظمتوں اور کھوئے ہوئے ماحول کو دوبارہ زندہ کرنے کی حیرت انگیز قوت ہے۔ان کی سب سے بڑی قوت ان کی حاضراتی صلاحیت ہے جو دو جملوں میں کسی مکمل صورت حال کو زندہ کر دیتی ہے۔''(۱۹)

قاضی عبدالستار موضوع کے انتخاب اور اس کی پیش کش دونوں سطحوں پر اپنی خاص پہچان رکھتے ہیں۔انھوں نے روایتی اور بیانیہ انداز کے افسانوں کے علاوہ جدید تکنیکی تجربوں سے بھی استفادہ کیا ہے اور دونوں طرح کے افسانوں میں اپنی فن کارانہ مہارت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کا شمار کرشن چندر، منٹو، بیدی وغیرہ کے بعد اُبھرنے والے نمائندہ افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔

اقبال مجید

اقبال متین کے ہم عصر افسانہ نگاروں میں ایک اہم نام اقبال مجید کا ہے۔انھوں نے افسانوں کے ساتھ ساتھ ناول اور ڈرامے بھی لکھے۔ان کا شمار آزادی کے بعد کے ممتاز افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔

ان کی پیدائش ۱۲/ جولائی ۱۹۳۴ء کو اتر پردیش کے مرادآباد ضلع میں ہوئی۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز ان کی طالبِ علمی کے زمانہ میں صنف افسانہ سے ہوا۔ انھوں نے اپنا پہلا افسانہ ''دو بھیگے ہوئے لوگ'' ۱۹۵۵ء میں لکھا۔ ان کا دوسرا افسانہ ''عدو چچا'' اور تیسرا افسانہ ''ٹوٹی چمنی'' کے عنوان سے منظر عام پر آیا۔ ان کے تین افسانوی مجموعے ''دو بھیگے ہوئے لوگ'' (۱۹۷۰ء)، ''ایک حلفیہ بیان'' (۱۹۸۰ء) اور ''شہرِ بدنصیب'' (۱۹۹۷ء) شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی ان کے دیگر افسانے منظر عام پر آ چکے ہیں۔

اقبال مجید نے اپنے ادبی سفر کی شروعات ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر کی۔ ان کے ابتدائی دور کے افسانوں میں ترقی پسند خیالات کا اثر نمایاں ہے۔ وہ ترقی پسند تحریک اور اس کی فکر سے ضرور متاثر تھے مگر انھوں نے ادب میں داخل ہونے والے نئے فنی رویوں کو اختیار کرنے سے گُریز نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بعد کی تخلیقات میں بیک وقت ترقی پسند اور جدید افسانہ، دونوں کے عناصر موجود ہیں۔ ان کے یہاں سیدھا سادہ اور علامتی اسلوبِ بیان دونوں کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ انھوں نے عہدِ حاضر میں رونما ہونے والے سماجی، سیاسی، معاشی اور تہذیبی مسائل کے گونا گوں پہلوؤں کو موضوع بحث بنایا ہے۔ ان کے افسانوں میں موضوعات کا تنوع نظر آتا ہے۔ شاہد تسلیم اپنے تعارفی خاکے میں اقبال مجید کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''ان کا تاریخی شعور کافی نکھرا ہوا ہے۔ وہ اپنے عہد کے ہر قسم کے سیاسی، سماجی، اقتصادی حالات سے گہری واقفیت رکھتے ہیں، جس کے سبب ان کے افسانوں میں تنوع پیدا ہو جاتا ہے۔ ان کے دو افسانوی مجموعے ''بھیگے ہوئے لوگ'' اور ''ایک حلفیہ بیان''، تکنیکی تنوع، عصری حسّیت اور اسلوب کی ندرت کی وجہ سے ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں۔'' (۲۰)

اقبال مجید کے بیشتر افسانے عصری ماحول اور حالات میں رونما ہونے والے مختلف النوع مسائل کے عکاس ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں اپنے عہد کی زندگی اور اپنے گرد و پیش کے حالات و واقعات کی بہترین مرقع کشی کی ہے۔ ان کے افسانوں میں معاشی بدحالی کے زیرِ اثر پیدا شدہ مسائل مثلاً غریبی، فاقہ کشی، بے روزگاری، نئی نسل کی بے راہ روی، مسلم متوسط طبقے کی حالت، عورتوں کا استحصال، اخلاقی اقدار کی شکست و ریخت، تہذیبی کشمکش، نئی اور پرانی نسل کے درمیان تصادم، تہذیبی فوقیت کی لڑائی

کے سبب پیدا شدہ ہندو مسلم تنازعہ، ہندو پاک اور ہندو چین جنگ، ایمرجنسی کا قہر، عہد حاضر کی سیاست میں سرایت کردہ عیاری و مکاری، مکر و فریب، جھوٹ و دھوکہ، بے یقینی و بے ضمیری، بے ایمانی و بدعنوانی اور سیاست دانوں کا غیر ذمہ دارانہ رویّہ اور ان کی دل بدلی کے علاوہ دہشت گردی اور فرقہ واریت جیسے عصری مسائل کو موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں ''دو بھیگے ہوئے لوگ''، ''رگ سنگ''، ''ٹوٹی چمنی''، ''میراث''، ''پوشاک''، ''مدافعت''، ''جنگل کٹ رہے ہیں''، ''سڑی ہوئی مٹھائی'' اور ''موٹی کھال'' وغیرہ ان کے قابل ذکر افسانے ہیں۔ اس کے علاوہ ''بارودی سرنگیں'' اور ''سایۂ شجر'' میں بھی دور جدید کی زندگی کے نشیب و فراز کی پراثر عکاسی ملتی ہے۔ ان کے چند افسانوں جیسے ''دسترس'' وغیرہ میں عہد حاضر کی مصروف زندگی اور تناؤ کی کیفیت کا شدید احساس ہوتا ہے۔

اقبال مجید نے عہد حاضر کی بے ایمان و بدعنوان سیاست پر کئی دلچسپ افسانے لکھے ہیں۔ ''جنگل کٹ رہے ہیں'' اسی موضوع پر لکھا گیا ان کا نمائندہ افسانہ ہے۔ اس افسانہ میں انھوں نے موجودہ سیاسی صورت حال کی عکاسی کرتے ہوئے اس کی مکروہ صورتوں کو یوں بے نقاب کیا ہے۔

''یہ ساٹھ ہزار روپیہ ہے اسے سنبھال کر رکھو۔'' منتری جی بولے۔
قدرت سمجھ گیا کہ منتری جی بمبئی کیوں آئے تھے۔ بولے:
''تمھیں یہ روپیہ چناؤ چھیتر میں امبو بابو کو پہنچانا ہے۔''
''جی۔''
''ان سے کہنا ہمارا کینڈیڈیٹ جیتنا نہیں چاہئے۔''
''جی کس کو جیتنا نہیں چاہئے۔''
''رام دھن گوسوامی کو۔'' جواب ملا
گوسوامی ان کی ہی پارٹی کا آدمی تھا۔ بڑا نیک، ایمان دار، پچھلے تیس سال سے بال بچوں کو چھوڑ کر پارٹی کی چوکھٹ پر سو رہا تھا۔ اسے ٹکٹ ملا تو لوگ خوش ہوئے تھے۔ امبو بابو اس کا حریف تھا۔
''یہ آپ کیا کہلوا رہے ہیں۔ وہ تو اپنی پارٹی کا آدمی ہے۔'' قدرت اللہ بولا۔
''صرف کہلوا ہی نہیں رہا ہوں، بلکہ اس کام کے لئے ساٹھ ہزار روپیہ بھی بھیج رہا ہوں۔''

''اپنی پارٹی کے آدمی کو آپ ہرانا چاہتے ہیں!''
اپنی پارٹی کا ہے پر اپنے گروپ کا نہیں ہے، میاں جی۔''
''مطلب؟''قدرت اللہ کے منھ سے نکل گیا۔
''اگر تم چاہتے ہو کہ ہم مکھ منتری بنیں تو گوسوامی کا ہارنا ضروری ہے۔''
''میں سمجھا نہیں۔''
''ستا خالی پارٹی سے نہیں، اپنے لوگوں سے ملتی ہے۔ہم کوئی نئی بات نہیں کر رہے ہیں۔جنہیں ستا میں ٹکنا ہوتا ہے ان سب کو یہی کرنا پڑتا ہے۔''(۲۱)

اس افسانہ میں افسانہ نگار نے سیاست میں سرمایہ کے استعمال پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ سیاست دانوں کی مفاد پرستی، گٹ بازی، مکاری، عیاری اور بے ضمیری کو بھی عیاں کیا ہے۔عہد حاضر کی سیاست کا ایک بڑا المیہ یہ ہے کہ مفاد پرستی اور موقع پرستی کو اس کا سب سے اہم وصف مانا جاتا ہے۔ سیاست دانوں نے اپنے مفاد کے تحت اپنے لیے سب کچھ روا رکھا ہے۔لوٹ کھسوٹ اور استحصال ان کا شیوہ بن چکا ہے۔حیرت کی بات تو یہ ہے کہ اب وہ فطرت سے بھی چھیڑ خانی کرنے لگے ہیں۔ان کے قریبی لوگ جنگل کاٹ کاٹ کر مال و دولت اکٹھا کر رہے ہیں اور داد عیش دے رہے۔جنگلوں کے بے تحاشا کٹنے کی وجہ سے ماحولیاتی توازن اتنا بگڑ چکا ہے کہ اب بارش نہیں ہو رہی ہے اور زمین العطش العطش کی صدا لگا رہی ہے۔اس تلخ حقیقت کی طرف افسانہ نگار نے یوں اشارہ کیا ہے:

''ابّا تمہاری شان، تمہارا عیش آرام، تمہاری دریاں، تمہارے قالین، تمہارا دسترخوان اور تمہاری ضیافتیں، جنگل لگانے پر نہیں جنگل اُجاڑنے پر قائم ہیں۔''
''اس لئے کاٹو کاٹو۔''
ہواؤں نے کہا۔دیکھو ہم سوکھ جائیں گے اور پھر لُو چلے گی۔
مگر جنگل کٹتا رہا۔
بادلوں نے کہا ہمیں کون روکے گا۔دیکھو ہم برسنا چھوڑ دیں گے۔
مگر جنگل کٹتا رہا۔
زمین نے کہا، ہم پیاسے مرے تو ایک اکھوا بھی دیکھنے کو ترس جاؤ گے۔مگر جنگل کٹتا رہا۔
گل کے موسم کل آئیں گے آج کی رُت تو اپنی ہے۔

ہم سب اپنے اپنے جنگل کاٹ رہے ہیں۔
ہوائیں دھیرے دھیرے سُوکھ رہی ہیں۔
بادل اوپر سے نکل جاتے ہیں، برستے نہیں۔زمین العطش العطش پکار رہی ہے۔"(۲۲)

عہد حاضر کی سیاست میں ہندو مسلم تعصّبات کا بڑا عمل دخل ہے۔آج کی سیاست میں مسلمانوں کی حیثیت ایک مہرے کی ہے جنھیں سیاستداں ووٹ بینک کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور پھر ان کے ساتھ تعصّب بھی برتتے ہیں۔مسلمانوں کا یہ عالم ہے کہ وہ بھی موقع پرستی اور مفاد پرستی سے نہیں چوکتے۔ جس کو جس پارٹی میں اپنا مفاد نظر آتا ہے وہ اسی پارٹی سے جُڑ جاتا ہے۔ ہر پارٹی کے سیاستداں مسلمانوں کو اپنے اپنے حساب سے استعمال کرتے ہیں۔سیاست سے جُڑے کچھ مسلمانوں کا ذاتی طور پر تو بھلا ہوجاتا ہے مگر قومی سطح پر مسلمانوں کا بڑا بھاری نقصان ہوتا ہے۔ وہ دن بہ دن کمزور ہوتے چلے جاتے ہیں اور سیاست دانوں کا منشا بھی ان کو کمزور رکھنے کا ہوتا ہے۔ان پہلوؤں پر بھی افسانہ نگار نے روشنی ڈالی ہے۔

سیاست کے موضوع پر اقبال مجید کا ایک افسانہ"سڑی ہوئی مٹھائی" ہے۔اس میں اُردو زبان کے ساتھ برتے جانے والے سوتیلے پن کے سلوک کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ آزادی کے بعد ہندوستانی سیاست میں اُردو کو مسلمانوں کی تہذیبی زبان قرار دے دی گئی اور اس کے ساتھ سوتیلے پن کا سلوک کیا گیا۔اُردو زبان کے فروغ کے لیے جو مختلف اکیڈمیاں اور ادارے قائم کئے گئے اس کا مقصد بھی مسلمانوں کی طرح اُردو زبان کو ووٹ بینک کے طور پر استعمال کرنا تھا ورنہ سیاستداں کبھی اس زبان کے تئیں مخلص نہیں رہے۔اردو زبان، مسلمان اور مسلم اداروں کے تئیں سیاستدانوں کی کیا ذہنیت ہے اس کو اقبال مجید نے یوں اُجاگر کیا ہے:

"مجھے کیا کرنا ہوگا۔" شوکت نے دوٹوک لہجے میں سوال کیا۔
"یہ جو اردو اردو کا پھاڑ پھاڑ کر شور مچایا جا رہا ہے نا۔ جاؤ مسلمانوں میں جاؤ دھیرے دھیرے انھیں بتاؤ کہ کام کی بات کریں....."
"کیا شور مچایا جا رہا ہے مجھے تو کہیں دکھائی نہیں دیتا۔" شوکت جل کر بولی۔
"میں نے تو نہیں سنا کہ اردو کو لے کر کوئی ایک بھی موت ہوئی ہو۔کوئی کرفیو لگا ہو۔جیلیں بھری گئی ہوں۔"

''خیر ایسا کرنے والوں سے تو سرکار نپٹ ہی لیتی ہے۔علی گڑھ کی ڈھپلی بجانے والوں سے بھی نپٹ لے گی۔''

''آپ اردو کی بات کر رہے تھے۔علی گڑھ کہاں پہنچ گئے۔''

''ایک ہی بات ہے۔''

......اردو ہمیں کتنا فائدہ پہنچا سکتی ہے پہلے یہ دیکھنا ہوگا نہ کہ ہم اردو کو کتنا فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔''

''تو آپ کو منتری بننے کے لیے اردو اور علی گڑھ کو گالی دینا ضروری ہے؟''

....ان سالے مسلمانوں کے لیے کیا کہوں۔وہی مثل ہے کہ بدن پہ نہیں لتّہ اور پان کھائیں البتہ۔مسلمانوں کو روٹی تو مل نہیں رہی ہے اردو بولنے کی عیاشی میں مرے جا رہے ہیں۔ارے بھائی پہلے چوتڑ ڈھکنے کا پربندھ کرلو تب اردو بولتے ہوئے اچھی بھی لگے گی۔''(۲۳)

اقبال مجید کے یہاں سیاسی موضوعات پر اور بھی کئی دلچسپ افسانے ملتے ہیں۔اس موضوع پر لکھتے ہوئے وہ بڑی خوبصورتی سے سیاست کی مکاریوں اور عیاریوں کا پردہ فاش کرتے ہیں اور طنز کے تیکھے نشتر بھی چلاتے ہیں۔حیدر طباطبائی لکھتے ہیں:

''ان کے یہاں جب بھی سیاسی موضوع پر کہانی ملتی ہے تو قدرے بہتر ہوتی ہے لیکن دوسرے موضوعات میں وہ اکثر مایوس کرتے ہیں۔البتہ انھوں نے معاشی ناہمواریوں اور سماجی ناانصافیوں کے خلاف بھی شدومد سے لکھا ہے۔آج کے دور میں سیاست اور مذہب کے ٹھیکیدار، مکار عناصر ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے سرگرداں ہیں،فرقہ وارانہ فسادات کی تباہ کاریاں جن کا نشانہ بھی بالعموم سماج کا غریب طبقہ ہی بنتا ہے اور حکومت کے اہل کار اپنے مقاصد کے برآنے کے لیے نت نئی چالیں چلتے ہیں،ان حالات کی عکاسی بھی اقبال مجید کے افسانوں میں نمایاں ملتی ہے۔''(۲۴)

اقبال مجید کے افسانوں میں ان کا سماجی، سیاسی، معاشی اور تہذیبی شعور کافی پختہ اور نکھرا ہوا نظر آتا ہے اور حیات و کائنات کا عمیق مشاہدہ دکھائی دیتا ہے۔انھوں نے اپنے افسانوں میں ہم عصر سماجی مسائل کو فنکارانہ کمال کے ساتھ پیش کیا ہے۔ان کے افسانوں میں عصری حسّیت پورے شدومد کے ساتھ پائی جاتی ہے اور ایجاز و اختصار اور زبان و بیان کی خوبیاں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔انھوں نے اپنے افسانوں میں

جو زبان استعمال کی ہے وہ صاف ستھری اور موضوع سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں اشاروں، استعاروں اور تمثیلی پیرایوں سے بھی کام لیا ہے اور علامتوں کے استعمال کے ساتھ ساتھ کہانی پن کو بھی برقرار رکھا ہے۔ ان کا لب ولہجہ نرم ہے مگر ہم عصر مسائل کی سنگینی کو پیش کرتے ہوئے اس میں سختی اور تلخی بھی آجاتی ہے۔ انھوں نے طنزیہ اسلوب کا استعمال بڑے سلیقہ سے کیا ہے۔ مختصر یہ کہ انھوں نے اپنی فکری وفنّی بصیرت کے سبب جدید افسانہ نگاروں میں اپنی منفرد شناخت بنائی ہے اور اپنی تخلیقات سے اردو کے افسانوی ادب میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ ان کا شمار جدید دور کے قد آور افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''میں اقبال مجید کو اپنے زمانے کے سب سے زیادہ قوت مند اور معنی خیز فکشن نگاروں میں شمار کرتا ہوں۔'' (۲۵)

جیلانی بانو

اقبال متین کے معاصر افسانہ نگاروں میں جیلانی بانو بھی منفرد شناخت رکھتی ہیں۔ وہ ۱۴/ جولائی ۱۹۳۶ء کو بدایوں، اتر پردیش کے پردہ نشیں ماحول میں پیدا ہوئیں۔ ایسے ماحول میں پروان چڑھنے کے باوجود وہ ترقی پسند خیالات سے بے حد متاثر ہیں۔ انھوں نے اپنا تخلیقی سفر بطور افسانہ نگار ۱۹۵۴ء میں شروع کیا۔ افسانہ کے علاوہ انھوں نے ناول بھی لکھے۔ ''نروان''، ''سچ کے سوا''، ''روشنی کے مینار''، بات پھولوں کی''، پرایا گھر''، ''تریاق''، ''یہ کون ہنسا'' ان کے افسانوی مجموعے اور ''ایوان غزل'' ان کا مشہور ناول ہے۔

جیلانی بانو اردو ادب میں ناول نگار اور افسانہ نگار دونوں حیثیت سے جانی جاتی ہیں۔ جہاں تک ان کی افسانہ نگاری کا تعلق ہے تو ان کا شمار حقیقت پسند افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے گرد وپیش کے حالات اور عام انسانی زندگی کے نشیب وفراز اور اس کے گونا گوں مسائل کو بڑے سلیقہ سے اپنی کہانیوں میں پیش کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں حقیقت پسندی اور سیاسی وسماجی شعور کی پختگی کا بھرپور احساس ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں حیدرآباد کے ٹوٹتے بکھرتے جاگیردارانہ نظام اور

اس کی مخصوص تہذیب وثقافت، جاگیردارانہ ظلم وستم، سیاسی وسماجی بیداری، عورتوں کی سماجی حیثیت، ان کے حالات ومسائل، تلنگانہ تحریک کی انقلابی جدّ وجہد اور بدلتے ہوئے عصری حالات کی موثر عکاسی کی ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں سماج میں پائی جانے والی مختلف بُرائیوں مثلاً ضعیف الاعتقادی، مذہبی ریاکاری اور فرسودہ رسم ورواج کو بھی بے نقاب کیا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے مشترکہ تہذیب وکلچر، نئی اور پرانی تہذیبوں کی کشمکش، مظلوموں کے استحصال، استحصالی نظام کے بطن سے پیدا ہونے والی نئی قوتوں اور ان کی بغاوت کی بھی تصویر کشی کی ہے۔ اس ضمن میں ''عجائب گھر''، ''پنکھا''، ''روز کا قصہ''، ''چوری کا مال''، ''اجنبی چہرے''، ''ایش ٹرے میں سلگتا سگریٹ''، ''کلچرا کیڈمی''، ''پھر نہیں پیدا ہوں گی''، ''سونا آنگن''، سوکھی ریت'' اور ''پرامس'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان افسانوں میں جیلانی بانو نے مختلف سماجی مسائل کو اپنے قلم کی گرفت میں لیا ہے اور ان مسائل کو انھوں نے نہایت ہی فنکارانہ مہارت سے بیان کیا ہے۔ انوار احمد اپنی کتاب ''اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ'' میں ان کی افسانہ نگاری پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''جیلانی بانو کے افسانے سماجی حقیقت نگاری کا بھرپور اظہار کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کے زیادہ تر افسانوں کا پس منظر حیدرآباد کا مخصوص جاگیردارانہ نظام ہے، ان کی سماجی حقیقت نگاری پر پریم چند کا رنگ غالب ہے، آئینہ کی بوڑھی ماں معاشی بدحالی کے نتیجے میں پیدا شدہ بے حسی اور اخلاقی کمزوری کے غلبے میں اپنے بیمار پوتے کی غذا چرا کر اپنا پیٹ بھر لیتی ہے لیکن مادھو اور گھیسو (کفن) کی طرح اس کے دل وذہن کے کسی بھی دروازے پر جرم کے احساس کی کوئی دستک نہیں ہوتی۔ ڈریم لینڈ، نروان، چھٹکارا، چھمیا، رات کے مسافر، چوری کا مال، ستی ساوتری اور تلچھٹ سماجی حقائق نگاری کے عکاس افسانے ہیں۔'' (۲۶)

جیلانی بانو کے یہاں عورت کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ ان کے بیشتر افسانوں میں عورت مرکزی کردار کے روپ میں نظر آتی ہے۔ اس ضمن میں انوار احمد رقم طراز ہیں:

> ''گھریلو سیاست کا شکار متوسط طبقے کی عام عورت جیلانی بانو کے افسانوں کا مرکزی کردار ہے، جو مختلف زمانوں میں اپنی بنتی مٹتی شناخت کے حصول کی تگ ودَو میں مصروف ہے، ایک طرف ایسی عورت ہے جو اپنی بے بسی اور

> لاچاری کا رونا روتی نظر آتی ہے اور دوسری طرف ظلم کے خلاف آواز اُٹھانے والی اشتراکی نظریات کی حامل عورت بھی ہے۔ان کا افسانہ 'اسکوٹر والا' عورتوں کے توہمات اور منتشر نظریات کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ذہنی خلفشار کو خوبی سے بیان کرتا ہے۔''(۲۷)

جیلانی بانو نے اپنے افسانوں میں عورتوں سے متعلق مختلف مسائل مثلاً مرد اساس معاشرہ میں عورتوں کا جنسی اور ذہنی استحصال، ان کے ساتھ کی جانے والی سیاسی وسماجی ناانصافی ونابرابری وغیرہ کو فنکارانہ مہارت کے ساتھ پیش کیا ہے۔اس ضمن میں ''موم کی مریم''، ''پیاسی چڑیا'' اور ''کتاب الرائے'' وغیرہ ان کے قابل ذکر افسانے ہیں۔''موم کی مریم'' اور ''پیاسی چڑیا'' میں جیلانی بانو نے مسلم متوسط گھرانے کی لڑکیوں کے دردناک حالات کو دکھایا ہے۔''موم کی مریم'' کی مرکزی کردار قدسیہ ہے۔اس کا تعلق مسلم متوسط گھرانے سے ہے۔ وہ اپنے والدین کی دسویں اولاد ہے جس کی خواہش کسی کو بھی نہیں تھی۔اہلِ خانہ اور والدین جب اس سے بے توجّہی برتتے ہیں تو اس کی زندگی نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو جاتی ہے۔ایسے میں وہ سماج کی روایتی زنجیروں کو توڑ کر خودداری و بے باکی کا شیوہ اپناتی ہے۔اس کی وجہ سے وہ خاندان میں مغرور اور خودسر کہلائی جانے لگتی ہے۔ وہ حد درجہ انفرادیت پسند بھی ہے۔اپنی انفرادیت کی بنا پر جب وہ اپنے ماں باپ کے طے کئے ہوئے رشتوں کے بجائے اپنی پسند کا آدمی تلاش کرنا چاہتی ہے تو اس کے ماں باپ اس کے سخت مخالف ہو جاتے ہیں اور اس کے مرنے کی بھی دعائیں کرنے لگتے ہیں۔ اپنی پسند کے رشتے کی تلاش میں قدسیہ کی تین شادیاں ہوتی ہیں۔ ریاض ماسٹر صاحب، شمیم اور اطہر کی شکل میں تین مرد اس کی زندگی میں آتے ہیں مگر کسی سے وہ مطمئن نہیں ہو پاتی ہے کیوں کہ کسی سے نہ تو اس کی ذہنی ہم آہنگی قائم ہو پاتی ہے اور نہ اسے وہ اپنائیت، قربت اور محبت ملتی ہے جس کی ایک عورت اپنے شوہر سے خواہاں ہوتی ہے۔ بالآخر ایک دن وہ موت کی آغوش میں چلی جاتی ہے۔مرنے کے بعد اس کے عزیز و اقارب اور گھر، خاندان والوں میں سے کوئی اسے معاف نہیں کرتا۔ اس افسانہ میں جیلانی بانو نے متوسط مسلم معاشرہ کی اس قبیح صورت کو دکھانے کی کوشش کی ہے کہ اس معاشرہ میں خوددار، بے باک، اور آزاد خیال لڑکیوں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ایسی لڑکیوں کو ان کے ماں باپ، عزیز و اقارب اور خاندان والے، سب نفرت وحقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔دُکھ کی بات یہ

ہے کہ ایسی لڑکیوں کی زندگی میں داخل ہونے والے مرد بھی ان سے اچھا سلوک نہیں کرتے کیوں کہ وہ ان کے جسم سے تو پیار کرتے ہیں مگر روح سے نہیں۔ ایسی لڑکیوں کو سماج میں کہیں بھی عزّت، محبت، قربت اور اپنائیت نہیں مل پاتی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی زندگیاں تنہائیوں، محرومیوں اور مایوسیوں کی المناک داستان بن کر رہ جاتی ہیں۔ ایسی ہی کیفیت ''پیاسی چڑیا'' میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ ''پیاسی چڑیا'' کی ثریّا اپنی بدصورتی کی وجہ سے احساس کمتری میں مبتلا ہے۔ کالج کی زندگی میں کوئی اس کے قریب نہیں آتا۔ جب وہ مضمون نگار بنتی ہے تو ہر کسی کی زبان پر اس کا نام خود بخود آ جاتا ہے۔ اب لڑکے ان سے قریب ہونے لگتے ہیں تو وہ ہر کسی کے رومان میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ ان حرکتوں کی وجہ سے اس کے اہلِ خانہ اس کی موت کی دعائیں مانگنے لگتے ہیں۔ سبھی اس کا وقتی استعمال کرتے ہیں اور پھر اپنے اپنے راستے پر ہو لیتے ہیں۔ اس کے مقدر میں تنہائی، اداسی اور محرومی رہ جاتی ہے جسے ہزار چاہتوں کے باوجود وہ اپنی زندگی سے الگ نہیں کر سکتی:

> ''اپنے آنسوؤں کا سیلاب روک کر اس نے اوپر نگاہ اٹھائی۔ اس کے سر کے قریب دیوار پر جو تختی لگی تھی اس پر لکھا ہوا تھا TO LET۔ یہ خالی گھر شاہد نے بڑی مشکل سے ڈھونڈا تھا جمال کے لئے، مگر ثریّا کو یوں لگا جیسے یہ تختی اس کے ماتھے پر چپکی ہوئی ہے۔ وہ بھی ایک خالی گھر ہے۔ اسے جن بھوتوں کا مسکن سمجھ کر سب چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ اب اس کے در و دیوار پہ سبزہ اگ رہا ہے اور جگہ جگہ سے پلستر اکھڑ چکا ہے۔ اس صحن میں آنکھ مچولی کھیلنے والے بچے کیوں نہیں آتے۔ یہاں ابھی تک کسی نے چراغ کیوں نہیں جلایا۔ وہ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتی پھر رہی ہے۔ چیخ چیخ کر پکار رہی ہے مگر کوئی نہیں سنتا۔'' (۲۸)

افسانہ ''کتاب الرائے'' میں جیلانی بانو نے سماج کی بیوہ عورتوں کے مسائل کو بے نقاب کیا ہے۔ وہ کیسی بے کسی کے عالم میں زندگی گزارتی ہیں اور کس کیفیت سے لمحہ لمحہ دوچار ہوتی ہیں، ان باتوں کو ''شاملا'' کے حوالے سے قاری کے سامنے لایا گیا ہے۔ عہدِ قدیم میں ستی کا رواج عام تھا مگر اب بیوہ عورتوں کو منحوس قرار دے کر انھیں ہر روز صلیب دی جاتی ہے۔ اس افسانہ میں جیلانی بانو تمثیلی انداز میں خواتین کی حالتِ زار کو یوں بیان کرتی ہیں:

''کچھ عورتیں سنہری جلد کی کتابیں ہوتی ہیں، کسی قدردان کی ملکیت، جو انھیں شیشے کی الماری میں مقفل کر کے رکھتا ہے۔ انھیں اپنے محبت بھرے ہاتھوں سے کھول کر پڑھتا ہے مگر کچھ عورتیں ایسی کتاب ہوتی ہیں جن کا عنوان دیکھ کر ہی پڑھنے والا پھینک دے۔ اس کے ماتھے پر مصنف کو نصیحتیں اور گالیاں لکھ کر پٹک دیتا ہے۔ بیکار لوگ انھیں پڑھ کر اپنا وقت گزارنا چاہتے ہیں۔ کوئی گشتی لائبریری دو پیسے روز پر انھیں ہاتھوں ہاتھ گھماتی ہے اور ایک روز پنساری ان کی پڑیا بنا ڈالتا ہے۔ بے چاری کتابوں کی قسمت پھوٹ جاتی ہے۔ انھوں نے آہ بھر کر کہا۔ کہیں کتابوں کی بھی قسمت ہوتی ہے۔ مجھے ہنسی آرہی تھی۔ کتابیں نہ ہوئیں عورتیں ہوگئیں۔'' تو کتابوں اور عورتوں میں کیا فرق سمجھتے ہیں آپ'' انھوں نے بڑے سکون سے کہا! ''دونوں کو شروع سے آخر تک پڑھے بنا کوئی خریدنا پسند نہیں کرتا لیکن پڑھی ہوئی کہانیوں کو دوبارہ سننا بھی پسند نہیں۔'' (۲۹)

یہاں کتاب کی تمثیل سے جیلانی بانو نے خواتین کی سماجی حیثیت اور ان کے دردناک حالات و کیفیات کو بڑے موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ فضیل جعفری اس افسانہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ان چند جملوں میں بانو نے ہم عصر سماج میں عورتوں کے مرتبے کے بارے میں علامتی اور بالواسطہ طور پر وہ سب کچھ کہہ دیا ہے جسے کہنے کے لیے دوسرے افسانہ نگاروں کو دسیوں صفحات درکار ہوتے ہیں۔'' (۳۰)

مشہور فکشن ناقد محمد حمید شاہد اپنی کتاب 'اُردو افسانہ: صورت و معنی' میں جیلانی بانو کے تعلق سے رقم طراز ہیں:

''میں مانتا ہوں کہ جیلانی بانو نے شہرت کے حصول کے لیے ''سیلی ہوئی آتش بازی'' نہیں چلائی مگر یوں بھی نہیں ہے کہ قاری کو اپنا بنالینے کے لیے اُس نے اپنی نثر کو محض سادہ بیانی تک محدود رکھا ہو۔ بلاشبہ کہانی کا دامن وہ مضبوطی سے گرفت میں رکھتی ہے مگر ساتھ ہی ساتھ کہانی کے بیانیے اور ڈھنگ میں حسبِ ضرورت تبدیلیاں بھی کرتی جاتی ہے۔ موضوعات کے تنوع کے ساتھ یہ تبدیلیاں اس کی کہانیوں کی تاثیر اکثر اوقات بڑھاتی رہی ہیں۔'' (۳۱)

جیلانی بانو کے افسانوں کی ایک نمایاں خصوصیت ان کی حسّاس کردار نگاری ہے۔ انھوں نے

کرداروں کو ان کی حسیّت اور جزئیات کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کے افسانوں میں نسائی کردار بڑی اہمیّت رکھتے ہیں۔ یہ نسائی کردار کہیں آزادی کے لیے تڑپ رہے ہیں تو کہیں مردوں کی بالادستی پر احتجاج کرتے نظر آتے ہیں۔ کہیں معاشی بدحالی کا قضیہ ہے تو کہیں ازدواجی زندگی میں عدم مساوات اور ایک دوسرے سے فوقیت کا مسئلہ، کہیں خاتونِ خانہ کی اُلجھنیں ہیں تو کہیں آزادانہ زندگی کا المیہ۔ غرض ان کے افسانوں میں خواتین کے کرداروں کی مختلف شکلیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ کمال کی بات یہ ہے کہ وہ ان تمام شکلوں کو پیش کرنے میں کامیاب رہی ہیں۔

جیلانی بانو نے روایتی طرزِ اظہار اور جدید انداز بیان دونوں سے کام لیا ہے۔ انھوں نے سیدھے سادے انداز میں بھی افسانے لکھے ہیں اور علامتی اور تمثیلی انداز میں بھی۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں اپنے عہد کی ناہمواریوں اور اپنے سماج کے مختلف مسائل کو اس خوبی اور ہنرمندی سے بیان کیا ہے کہ ان کے افسانوں میں ان کا عہد اور ان کا معاشرہ جیتا جاگتا نظر آتا ہے۔ انھوں نے اپنی فکری اور فنّی صلاحیت سے اپنا مخصوص لب ولہجہ اور اسلوب تراشا جس سے جدید اردو افسانہ نگاروں میں ان کی منفرد شناخت قائم ہوئی۔ ''موم کی مریم''، ''پتھر کا جگر''، ''مٹی کی گڑیا''، ''دیوداسی''، پیاسی چڑیا''، ''تلچھٹ''، ''ستی ساوتری''، ''قبل مرگ بیان''، ''اپنے مرنے کا دکھ''، ''بہار کا آخری گلاب''، ''وہ آرہا ہے''، ''ایمان کی سلامتی''، ''ایک دن کیا ہوا''، ''روشنی کے مینار''، ''انتقام' وغیرہ ان کے نمائندہ افسانے ہیں جن سے ان کی فنّی پختگی، زبان وبیان اور افسانوی تکنیک پر ان کی مضبوط گرفت کا پتہ چلتا ہے۔

جیلانی بانو کی افسانہ نگاری کے جائزے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ انھوں نے اپنی فکری اور فنّی صلاحیت سے اپنا مخصوص لب ولہجہ اور اسلوب وضع کیا اور جدید افسانہ نگاروں میں اپنی منفرد وممتاز شناخت قائم کی۔ ان کی افسانوی تخلیقات اردو کے افسانوی سرمائے میں بیش بہا اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں اور انھیں ایک نمائندہ اور قد آور افسانہ نگار کی شکل میں سامنے لاتی ہیں۔

رتن سنگھ

اقبال متین کے معاصر افسانہ نگاروں میں رتن سنگھ کا نام بھی سرفہرست ہے۔ وہ ۱۹۲۷ء میں پاکستان کے شمال مشرق میں واقع ''قصبہ داؤد' تحصیل نارووال، ضلع سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے اپنی ادبی

زندگی کا آغاز پنجابی شاعری سے کیا۔۱۹۵۲ء میں ان کی پہلی پنجابی نظم شائع ہوئی جواب دستیاب نہیں ہے۔ان کی افسانہ نگاری کا آغاز ان کی پہلی کہانی ''ممی تم ایک دیوار ہو'' سے ہوا۔ یہ کہانی ۱۹۵۳ء میں ''راہی'' دہلی سے شائع ہوئی۔ان کے پانچ افسانوی مجموعے ''پہلی آواز''، ''پنجرے کا آدمی''، ''مانک موتی''، ''کاٹھ کا گھوڑا'' اور ''پناہ گاہ'' شائع ہوکر منظر عام پر آچکے ہیں۔اس کے علاوہ بھی ان کے افسانے وقتاً فوقتاً مختلف رسائل کی زینت بنتے رہتے ہیں۔انھوں نے شاعری اور تراجم میں بھی اپنی دلچسپی کا مظاہرہ کیا ہے مگر اردو ادب میں ان کی شناخت افسانہ نگار کی حیثیت سے ہے۔

رتن سنگھ کا شمار آزادی کے بعد کے نمائندہ افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ان کی فکری و ادبی تربیت ترقی پسندوں کے زیر اثر ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ترقی پسند تحریک اور اشتراکی نظریہ سے متاثر نظر آتے ہیں۔ان کے یہاں کرشن چندر، بیدی، منٹو کا اثر بھی دکھائی دیتا ہے۔دوسرے ترقی پسندوں سے وہ ان معنوں میں مختلف ہیں کہ ان کے یہاں کسی نظریہ کا وہ غلبہ نہیں ہے جو دوسروں کے یہاں ہے۔ترقی پسند ہوتے ہوئے بھی انھوں نے جدید رجحانات کو اپنایا۔انھوں نے اپنے افسانوں میں روایت اور جدّت کے درمیان ایک صحت مند توازن کو برقرار رکھا اور انسان کے ذاتی مسائل کے ساتھ ساتھ کائنات کے عصری مسائل کو بھی سمونے کی کوشش کی۔ان کے افسانوں کا کینوس نہایت وسیع ہے۔دراصل انہیں اپنی ملازمت کے سلسلے میں ہندوستان کے مختلف خطّوں میں جانے اور مشاہدہ کرنے کے مواقع فراہم ہوئے جس کے سبب انہیں انسانی زندگی کو زیادہ بہتر طور پر سمجھنے کا موقع ملا اور ان کے تجربات میں وسعت آئی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں بڑا تنوّع ملتا ہے۔انھوں نے انسانی زندگی کے مختلف گوشوں کو اپنے فن کے احاطے میں سمیٹا ہے۔غریبی، بے روزگاری، بھوک، افلاس، تعصّب و تنگ نظری، ظلم و استحصال اور بہت سے دوسرے سیاسی، سماجی، معاشی، مذہبی اور اخلاقی مسائل پر انھوں نے اثر انگیز افسانے لکھے ہیں۔

رتن سنگھ کا افسانوی سفر چھ دہائیوں سے زیادہ عرصہ پر محیط ہے۔انھوں نے ڈیڑھ سو سے زیادہ افسانے لکھے ہیں۔''خوشبوؤں کے بنجارے''، ''جنگل''، ''ایک گاتھا''، ''پکشی نہیں لوٹا''، ''چھلنی کے چھید''، ''پنجرے کا آدمی''، پہلی آواز''، ''کاٹھ کا گھوڑا''، ''پناہ گاہ'' وغیرہ ان کے نمائندہ افسانے ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں انسانی زندگی سے متعلق مختلف مسائل کی موثر انداز میں ترجمانی کی ہے۔

دیکھئے انھوں نے افسانہ ''تلخ حقیقت''میں موجودہ عہد کی مضحکہ خیز سیاست پر کیسا تیکھا طنز کیا ہے:

''جیل کے باہر سے جے جے کار کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ''یہ کس کی جے جے کار ہو رہی ہے؟'' اس نے اپنا دھیان بٹانے کے لئے مسخرے قیدی سے پوچھا۔ ''وہی نیتا چھوٹ کر جا رہا ہے۔ اسی کی جے جے کار ہے۔ ہولاں بھن تے گنے چوپ۔''

''ہزاروں آدمیوں کو مروانے والا تو چھوٹ کر جا رہا ہے اس کی جے جے کار ہو رہی ہے اور ایک دو آدمیوں کے قاتل کو عمر قید۔ ہولاں بھن تے گنے چوپ۔''(۳۲)

رتن سنگھ کے بارے میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ وہ فکری لحاظ سے ترقی پسند ہیں۔سماجی نابرابری کا مسئلہ ترقی پسندوں کا محبوب موضوع رہا ہے۔ رتن سنگھ نے بھی اس موضوع پر ''بیسویں صدی کا بازار'' کے عنوان سے افسانہ لکھا ہے۔اس میں انھوں نے اس حقیقت سے پردہ اُٹھایا ہے کہ دنیا کی دولت چند مٹھی بھر لوگوں کے ہاتھوں میں سمٹ کر آ گئی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ بیسویں صدی کے بازار میں سائنس وٹکنالوجی کی بدولت آرام وآسائش کی انواع واقسام کی جو چیزیں دستیاب ہیں، ان تک اسی خاص طبقہ کی رسائی ہے۔ جب کہ عام لوگ ضرورت کی بنیادی چیزوں سے بھی محروم ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ان کے پاس پیسہ نہیں ہے۔ دیکھئے رتن سنگھ نے غریب طبقے کی محرومیوں کی تصویر کشی کس موثر انداز میں کی ہے۔

''بازار میں بک تو سب کچھ رہا تھا اور وہ خریدنا بھی چاہتا تھا لیکن جب بھی وہ کسی چیز پر انگلی دھرتا یا نظر ٹکاتا تو اسے پتہ چلتا کہ اس چیز کے دام بھاری ہیں اور اس کی جیب ہلکی۔ایسا شروع سے ہو رہا تھا۔یعنی جب سے اس نے اس بازار میں قدم رکھا تھا۔ ہر تمنا کے جاگتے ہی اس کا وجود لہولہان ہو رہا تھا۔اس کی کیفیت میٹھے اور صاف وشفاف پانی کے دریا میں سے گزرتے ہوئے اس شخص کی سی تھی جس کی قسمت میں اس امرت کی ایک بھی بوند نہیں تھی۔''(۳۳)

اس افسانہ میں اس بات کا احساس دلایا گیا ہے کہ ایسے سماج کو مبنی بر انصاف ہرگز نہیں کہا جاسکتا جہاں ضرورت کی چیزیں موجود ہوتے ہوئے بھی انسان محرومی ولاچاری کی زندگی گزار رہا ہو۔ آج کے زمانہ کی یہ ایک بڑی سچائی ہے کہ آج دنیا کی دولت اور چیزوں پر چند مٹھی بھر سرمایہ داروں کا قبضہ ہے اور

عام غریب لوگ سسک سسک کر زندگی گزار رہے ہیں۔ اس المیہ کو رتن سنگھ نے فن کارانہ مہارت سے اُجاگر کرنے کی سعی کی ہے۔

رتن سنگھ پریم چند سے خاصے متاثر تھے۔ ان کے مشہور افسانہ ''کفن'' سے متاثر ہو کر انھوں نے ایک افسانہ ''چھلنی کے چھید'' کے عنوان سے لکھا ہے۔ اس میں سرکاری بدعنوانی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ 'کفن' کی طرح اس افسانہ میں بھی کفن کا مسئلہ درپیش ہے۔ سرکار نے غریبوں کے کفن دفن کے لیے پانچ ہزار روپئے کا انتظام کیا ہے مگر یہ پانچ ہزار روپئے غریب تک پہنچتے پہنچتے صرف پانچ سو رہ جاتے ہیں۔ اس میں سے بھی صرف سو روپئے ہی اس غریب کے ہاتھ میں آتے ہیں:

''اب گیسو کے پاس دو گڈیاں بچی تھیں۔ سرپنچ نے گیسو کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ دیکھ سکھ دکھ آنی جانی چیز ہے۔ موت پر کسی کا بس نہیں چلتا تو پھر بھی خوش قسمت ہے کہ سرکار تیری مدد کو آ گئی نہیں تو تمہاری بہو کی لاش تمہاری جھونپڑی میں پڑی سڑتی رہتی۔ تمہیں اس کے لئے سرکار کا شکریہ ادا کرنا چاہئے۔ گیسو منہ سے تو کچھ نہ بول پایا۔ پھر بھی اس نے سرکار کی طرف یوں دیکھا جیسے ان کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہو۔

''ارے بٹ بٹ کیا دیکھ رہا ہے اس میں سے ایک گڈی سرکار کو آنے جانے کے خرچ کے لئے دے دے۔ پھر ضرورت پڑنے پر کام آئیں گے۔'' اور اس نے خود ہی اٹھ کر ایک گڈی اٹھا کر سرکار کو دے دی۔

گیسو کو فکر ہوئی کہ آخر پانچ ہزار ہوتا کتنا ہے۔ دریافت کرنے پر اسے پتہ چلا کہ اس ایک گڈی کی طرح پورے پچاس گڈیاں ہونی چاہیے، تو وہ بوکھلایا۔

''لیکن ان سسروں نے تو مجھے پانچ ہزار کے نام پر صرف پانچ گڈیاں ہی دی تھیں.... بات یہ ہے گیسو! سمندر سے چھلنی میں پانی بھر کر ریگستان کی طرف لے جانے کی کوشش کی جائے تو باقی کیا بچے گا۔ تم تو جانتے ہی ہو۔ چھلنی میں بہت سے چھید ہوتے ہیں۔ گیسو کا جیسے سارا نشہ ہرن ہو گیا۔'' (۳۴)

رتن سنگھ کا ایک محبوب موضوع ماضی کی بازیافت ہے۔ ۱۹۴۷ء کی تقسیم کے نتیجہ میں جب انھیں اپنا آبائی وطن چھوڑنا پڑا تو ان کے دل و دماغ پر اس کا بڑا گہرا اثر پڑا۔ وہ جسمانی طور پر اگرچہ ہندوستان منتقل ہو گئے مگر ذہنی و روحانی طور پر وہ اپنے آبائی وطن میں ہی رہے۔ انھوں نے اپنے کئی افسانوں میں اپنے

آبائی وطن، اپنے بچپن کے دوست اوراحباب سے جدائی کے کرب کو دردمنداور پُراثر انداز میں پیش کیا ہے۔ایسے افسانوں میں ’’پناہ گاہ‘‘، ’’مت جاؤ‘‘، ’’لاجو‘‘، ’’سیالکوٹ کالاڑا‘‘، ’’نور محمد کی بہشت‘‘ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ رتن سنگھ نے زندگی کی افراتفری، تشکیک، سماجی اور اخلاقی اقدار کی شکست وریخت، سائنسی اور تکنیکی ترقی کی خامیوں پر بڑے دلچسپ افسانے لکھے ہیں۔ ’’حالات کے قیدی‘‘، ’’ایک مجذوب کی کہانی‘‘، ’’لہولہوراستے‘‘، ’’بیسویں صدی کا بازار‘‘ وغیرہ کا شمار ایسے ہی افسانوں میں ہوتا ہے۔ رتن سنگھ نے عشق ومحبّت کے موضوع پر بھی افسانے لکھے ہیں۔عورت کے متعلق ان کا نظریہ مثبت اور ہمدردانہ ہے۔ وہ اسے ایثار ومحبّت کا مجسّمہ تصوّر کرتے ہیں۔ ’’پیار کی جیت‘‘، ’’چھوٹی سی خوشی‘‘، ’’داستاں در داستاں‘‘، ’’گڑیا کی ڈالی‘‘، ’’ذراسی بات‘‘، ’’عمر کا حسن‘‘ وغیرہ افسانوں میں ان کا یہی تصوّر اُبھرتا ہے۔

رتن سنگھ کو تقسیم اور ہجرت کے کرب سے بھی گزرنا پڑا ہے۔ ہجرت کے دوران انھوں نے بڑے پیمانہ پر فرقہ وارانہ فسادات، اس کے نتیجہ میں لاکھوں مظلوموں کے بہتے ہوئے خون، ہر طرف پھیلے ہوئے خوف ودہشت کا ماحول، انسانوں کی شکل میں خونی درندوں کا تانڈو ناچ دیکھا اور بھوک اور لاچاری کے عالم میں مرتے اور تڑپتے لوگوں کو پایا۔ ان دردناک واقعات کو بھی انھوں نے اپنی فکر میں تحلیل کر کے کہانی کی صورت میں پیش کیا ہے۔انھوں نے تقسیم کے موضوع پر جو افسانے لکھے ہیں اس میں ’’جنگل اداس ہے‘‘، ’’دیوار‘‘، اور ’’پکشی نہیں لوٹا‘‘ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ’’پکشی نہیں لوٹا‘‘ ایک ایسا افسانہ ہے جس کو پڑھتے ہوئے منٹو کے افسانہ ’’ٹوبہ ٹیک سنگھ‘‘ کا خیال آتا ہے۔اس کا موضوع تقسیم ہند سے پیدا ہونے والا المیہ ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار ٹوبہ ٹیک سنگھ کی ہی طرح بشیر نام کا ایک پاگل ہے۔ ایک پرندے کے اپنے گھونسلے سے بچھڑنے کی خبر سن کر اس کی روح تڑپ جاتی ہے۔ پکشی نہیں لوٹنے کی خبر سن کر اس پر ایک جنونی کیفیت طاری ہوجاتی ہے اور وہ پھر گردش کرتے کرتے بے ہوش ہوکر گر جاتا ہے۔ اس کے بعد جب وہ ایک انسان کو اپنے وطن سے ہمیشہ کے لئے بچھڑتا ہوا دیکھتا ہے تو وہ حواس باختہ ہوکر اس کے گھر کی دیوار سے اپنا سر ٹکرا ٹکرا کر خود کو زخمی کر لیتا ہے۔ اس افسانہ میں افسانہ نگار نے پاگل اور باشعور افراد کا موازنہ کرتے ہوئے یہ دکھانے کی سعی کی ہے کہ ہجرت اور تقسیم کے دردناک واقعہ نے پاگل لوگوں تک کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا جب کہ اس واقعہ کو انجام دینے والے قوم کے دانشور حضرات تھے۔ یہاں

افسانہ نگار نے ایک پاگل کے ذریعے اس المیہ کا احساس کرا کے باشعور اور دانشور لوگوں کی عقل پہ ماتم کیا ہے اور ان کے شعور و حس پر طنز کیا ہے۔

رتن سنگھ ترقی پسند ضرور تھے مگر انھوں نے صرف غریبوں اور مظلوموں کی زندگی ہی تک اپنے افسانوں کو محدود نہیں رکھا بلکہ انھوں نے پوری انسانیت کے دکھ درد کو سمونے کی کوشش کی۔ چاہے وہ درد مرد کا ہو یا عورت کا، کسان مزدور کا یا جاگیر دار طبقہ کا۔ جاگیر دار طبقہ کی کسمپرسی کی زندگی پر بھی رتن سنگھ نے افسانے لکھے ہیں۔ جاگیر داری کے خاتمہ کے بعد اس طبقے کو جس سماجی اور معاشی بحران سے گذرنا پڑا اور جس نفسیاتی کرب کا شکار ہونا پڑا، اسے رتن سنگھ نے شدّت سے محسوس کیا اور بڑی درد انگیزی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ دیکھیئے افسانہ ''ایک بڑا آدمی'' میں انھوں نے جاگیر دار طبقہ کی تباہی و بربادی اور اس کی قابل رحم حالت کی تصویر کشی کس فن کاری سے کی ہے۔

> ''اس بڑی حویلی میں بھیک مانگنے کے لئے وہ پچھلے تیس برسوں سے آ رہا تھا۔ ان پرانے وقتوں میں بڑی موج رہتی تھی۔ اس گھر سے ہی اس کی خالی جھولیاں اتنی بھر جاتی تھیں کہ اسے اور کہیں سے مانگنے کی ضرورت ہی نہیں رہ جاتی۔ وقت نے مزاج بدلا اور پھر اس حویلی کی ساری روشنی تاریکی میں بدل گئی۔ اب نہ ہی اس میں وہ چمک اور کشش رہی جو پہلے تھی نہ نوکر نہ چوکیدار۔ جہاں سے فقیروں کو جھولی بھر بھر اناج ملتا تھا اب وہی دانے کو ترسنے لگے۔ جو دوسروں کو نئے کپڑے اور اونی کمبل بانٹتے تھے وہی پھٹے کپڑوں میں گزر اوقات کرنے پر مجبور ہو گئے۔.....اور پھر ایک دن جب اس نے صدا لگائی تو حویلی کا پھاٹک بند کا بند ہی رہا۔ پھر ایک اور صدا لگا کر اس نے ڈرتے ڈرتے پھاٹک کے سوراخ میں سے اندر جھانک کر دیکھا جو تختے کے اور ٹوٹ جانے سے زیادہ بڑا ہو گیا تھا۔ اس نے دیکھا۔ مالکن ایسے کپڑے پہنی ہوئی تھی جیسے کبھی اس حویلی کے نوکروں نے بھی نہ پہنے تھے۔ مالکن اداس اداس سی سر نیچا کیے پتہ نہیں کن سوچوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ فقیر کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ اس کا کلیجہ درد سے کراہ اٹھا۔ اور وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر اپنے خدا سے دعا مانگنے لگا۔ یا خدا اس سوکھی ہوئی بیل کو دوبارہ ہرا کر دے۔ اس گھر میں پھر پہلی سی برکت آ جائے۔ اتنے سچے دل سے کبھی اس نے اپنے لیے بھی دعا نہ مانگی تھی۔'' (۳۵)

رتن سنگھ کے افسانوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ افسانہ نگاری کے فنّی رموز سے اچھی طرح واقف ہیں۔ موضوع کی وسعت، فن وتکنیک کا تنوع، روایت کی پاسداری، جدّت کا لحاظ، دونوں کے درمیان خوبصورت توازن، عصری حسیّت، زندگی کے ٹھوس حقائق اور پے چیدہ مسائل کا فن کارانہ اظہار، مواد اور ہیئت کے درمیان گہرا توازن، مناسب وموزوں تکنیک کا استعمال اور اختصار وارتکاز ان کے افسانوں کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ انھوں نے جدید رویّوں کو بھی اپنے افسانوں میں برتا ہے۔ تکنیک کے لحاظ سے ان کے افسانوں میں بیانیہ انداز پایا جاتا ہے اور تمثیلی اور علامتی طرزِ اظہار بھی ملتا ہے۔ ''سب غلط ہوگیا''، ''جنگل اداس ہے''، ''دیوار''، ''گھبرائے ہے جیا''، ''جھوٹی بھی سچی بھی'' جیسے افسانے انھوں نے تمثیلی انداز میں لکھے ہیں۔ ''لہولہو راستے''، ''مت جاؤ''، ''آؤ لاہور چلیں''، ''تیری میری سب کی بات'' وغیرہ علامتی انداز میں لکھے گئے ان کے افسانے ہیں۔ ان کے بیشتر افسانے مختصر ہیں جو سادہ وسلیس اور عام فہم اسلوب میں لکھے گئے ہیں۔ انھوں نے اپنے کچھ افسانوں میں داستانوں کے اساطیری طرز کو بھی اپنایا ہے۔ ''ایک گاتھا'' اسی قسم کا افسانہ ہے۔ اس میں عصری مسائل کو داستانوی قالب میں ڈھال کر پیش کیا گیا ہے۔ ان کے افسانوں کی اہم خوبی یہ ہے کہ ان میں داخلیت وخارجیت اور رومانیت وحقیقت کا ایک حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ ان کے افسانوں کی ایک بڑی خصوصیت نازک جذبات واحساسات اور انسانی نفسیات کی فن کارانہ عکّاسی ہے۔ انھوں نے اپنے کئی افسانوں میں انسانی نفسیات کا بڑا گہرا مطالعہ پیش کیا ہے اور لطیف سے لطیف اور نازک سے نازک جذبات واحساسات کی تصویر کشی بڑی ہنرمندی سے کی ہے۔ اس ضمن میں ''پناہ گاہ''، ''ایک لمحے کا خدا''، ''سنی سنائی بات''، ''عمر کا حسن''، ''روپ متی کی گپھائیں'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ عابد سہیل ان کے افسانوں کی امتیازی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے ان کے افسانوی مجموعہ ''پہلی آواز'' کے سرورق پر لکھتے ہیں۔

> ''رتن سنگھ کا فن اختصار سے عبارت ہے۔ کم سے کم الفاظ، چھوٹے چھوٹے جملوں اور افسانوں کے محدود کینوس میں لامحدود باتیں کہنے کا انہیں فن آتا ہے۔ افسانے کی معذوریوں کا جیسا درک انہیں ہے اس گروپ کے افسانہ نگاروں میں جنہوں نے ان کے ساتھ یا تھوڑا آگے پیچھے لکھنا شروع کیا کسی کو نہیں۔ اس لئے رتن سنگھ اپنے موضوع کے لئے زندگی کے کسی ایک گوشہ یا

کسی ایک واقعہ کو ہی منتخب کرتے ہیں۔ پیچ در پیچ افسانے انھوں نے نہیں لکھے۔ افسانہ شروع کرتے وقت مصنف کا نام ذہن میں ضرور رہتا ہے۔ لیکن چند سطروں کے بعد افسانہ کے کردار اور فضا پڑھنے والوں کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں اور مصنف نہایت خوبصورتی سے غائب ہو جاتا ہے۔ وہ قاری کی انگلی پکڑ کر اسے کسی منزل یا نتیجہ پر نہیں پہنچاتے بلکہ پڑھنے والا جب اس نتیجے پر پہنچتا ہے تو وہاں مصنف کو از خود دوبارہ دریافت کرتا ہے۔ رتن سنگھ کی نرم مزاجی، سبک لہجہ، ہمدردی، انسان دوستی ہر افسانے میں روشنی بکھیر دیتی ہے۔ وہ مذہبی رواداری، فرقہ وارانہ ہم آہنگی، ہندو مسلم اتحاد کے سخت قائل ہیں۔'' (۳۶)

رتن سنگھ کے افسانے جدید معاشرے کے عکاس ہیں جو جاذبیت و دلکشی سے پُر ہیں۔ ان کے انداز میں توانائی اور تیکھا پن ہے۔ ان کی افسانہ نگاری کا ایک خاص وصف اختصار اور کفایت لفظی ہے۔ وہ چند جملوں میں ساری اہم تفصیلات بیان کر دیتے ہیں اور ایسے لطیف اشارے کرتے ہیں کہ قاری کا ذہن ان تفصیلات تک آسانی سے پہنچ جاتا ہے۔ ان کے افسانوں کی زبان سادہ، سلیس اور دلکش ہے۔ مختصر یہ کہ ان کے افسانوں میں وہ تمام فکری و فنّی خوبیاں ہیں جو انھیں ایک نمائندہ اور اہم افسانہ نگار کے روپ میں سامنے لاتی ہیں۔

عابد سہیل

معاصر اردو افسانہ میں عابد سہیل ایک اہم نام ہے۔ وہ حساس ذہن کے مالک ادیب ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں واقعات کے ساتھ ساتھ افسانوں کے کرداروں کی نفسیات کو نہایت دلچسپ انداز میں اجاگر کرنے کا فن جانتے ہیں۔ انھوں نے اردو افسانے کی کلاسیکی روایت سے کبھی بغاوت نہیں کی۔ ان کے یہاں پلاٹ، کردار، وحدت تاثر، کہانی پن اور زماں و مکاں کا تصور ملتا ہے۔ وہ اپنے کرداروں کے نازک سے نازک جذبات کی عکاسی کرتے ہیں۔ اس لیے ان کی کہانیاں بیانیہ اسلوب میں ہونے کے باوجود بار بار پڑھنے کا تقاضہ کرتی ہیں۔ ''منیر کی اماں'' اور 'بفاتن'' میں عورتوں کی نفسیات اور ان کی حرکات و سکنات کا گہرا مطالعہ کیا گیا ہے۔ ان کے بعض افسانوں میں اصلاحی پہلو بھی کارفرما ہوتا ہے۔

مثلاً ''مدد کا خواستگار''، ''نیا سفر''، ''دو نقش ایک تصویر''، ''وغیرہ۔ فسادات کے موضوع پر ''سوا نیزے پر سورج'' اور ''روح میں لپٹی ہوئی آگ'' ان کے جاندار افسانے ہیں۔

عابد سہیل نے اپنے ادبی سفر کے دوران پچاس سے زائد افسانے لکھے مگر ان کی پہچان ''سب سے چھوٹا غم''، ''نوحہ گر''، ''جینے والے''، ''دوسرا آدمی''، ''وہ ایک لمحہ'' اور ''میں اور میں'' کے ذریعے بنی۔ ان افسانوں میں عابد سہیل نے رشتوں کی نزاکت، تہہ داری اور احساسات کو بڑے نرم اور دھیمے لہجے میں باریک بینی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ محمد مثنیٰ رضوی لکھتے ہیں:

> ''عابد سہیل انسانی رشتوں کے نبض شناس ہیں، وہ انسانی رشتے جنہیں روزمرہ کی زندگی کے دکھوں اور غموں نے اٹوٹ بنا دیا ہے۔ ان کی کہانیاں آنسوؤں کی لو سے اندھیروں میں چراغ جلاتی ہیں۔ موضوعات میں اتنے تنوع اور کرداروں میں اتنے ابعاد کے باوجود انسان دوستی اور دردمندی کا رشتہ ایک ہی سر میں باندھے رکھتا ہے۔ زمینی سچائی سے جڑی ہوئی یہ کہانیاں عابد سہیل کے فنی شعور اور چابکدستی کی بدولت منفرد شناخت اور اہمیت کی مالک بن گئی ہیں۔ انہیں کہانیاں کہنے کا سلیقہ ہے۔ ان کی بیشتر کہانیاں شروع ہوتے ہی قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں اور پھر تجسس کا ایک سلسلہ اس گرفت کو مضبوط کرتا جاتا ہے اور آخر میں اس کا اختتام اس انداز میں شکل پذیر ہوتا ہے کہ وہ نامیاتی اکائی کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔'' (۳۷)

عابد سہیل کو کہانی کہنے کا فن آتا ہے۔ وہ ڈرامائی انداز سے اپنی کہانی کا آغاز نہیں کرتے مگر وہ بے تکلفی سے اس انداز میں کہانی شروع کرتے ہیں کہ شروع سے آخر تک تجسس اور دلچسپی قائم رہتی ہے۔ ان کی کہانی پڑھتے ہوئے قاری کو ہر آنے والے جملے کا شدت سے انتظار رہتا ہے۔ محمد حسن عابد سہیل کی افسانہ نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں:

> عابد سہیل کو قصہ گوئی کا فن آتا ہے، ان کے افسانوں میں دلچسپی آخر جملے تک قائم رہتی ہے۔ افسانے کے دروبست میں وہ آغاز کی ڈرامائیت پر زور نہیں دیتے۔ افسانہ اس بے تکلفی سے شروع ہو جاتا ہے کہ ڈرامائیت کی سنسنی خیزی سے اس کا کوئی تعلق قائم نہیں کیا جا سکتا پھر بھی ہے یہ ڈرامائیت کہ پڑھنے والا اپنے کو اچانک ایک ایسے شگفتہ اور شاداب ماحول میں محسوس کرنے لگتا ہے جہاں اسے ہر آنے والے جملے کا شدت سے انتظار رہتا

ہے۔ کوئی بہت بڑا واقعہ ہونے والا نہیں ہے لیکن ان چھوٹے چھوٹے جملوں سے، چھوٹے معمولی اور حقیر واقعات سے کہانی کچھ اس طرح بنتی چلی جاتی ہے کہ اگلے موڑ کا اشتیاق بڑھتا ہی جاتا ہے اور وہ موڑ آ بھی جاتا ہے اور ذہن کے سامنے کیفیات اور مضمرات کا ایسا سلسلہ چھوڑ جاتا ہے جو کچھ دیر تک ہمارے ذہن کو اپنے طور پر اس افسانے کا تتمہ فراہم کرنے پر آمادہ کرتا رہتا ہے۔"(۳۸)

عابد سہیل اپنی کہانی میں کوئی بات بے دلی سے نہیں کہتے ہیں۔ وہ معمولی سے معمولی واقعہ کو بھی اس دلچسپ انداز میں بیان کرتے ہیں کہ ان کی کہی ہوئی بات قاری کو اہم معلوم ہوتی ہے۔ نیر مسعود عابد سہیل کی افسانہ نگاری کے اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"عابد سہیل کوئی بھی بات نہ تو بے دلی سے کہتے ہیں نہ شد و مد سے۔ وہ اپنے جذبات کو چھپاتے نہیں لیکن شدید جذباتی ردعمل سے بھی ان کو اجتناب ہے۔ بظاہر انہیں اس کا احساس بھی نہیں معلوم ہوتا کہ وہ کوئی اہم بات کہہ رہے ہیں لیکن قاری کو ان کی بات اہم ضرور معلوم ہوتی ہے۔ تحریر میں یہ کیفیت آسانی سے نہیں لائی جاسکتی، لیکن اگر آپ افسانہ نگار کو اس کے ریاض کی داد نہ دینا چاہتے ہوں تو اسے اس کا فطری لہجہ اور غیر ارادی اسلوب کہہ لیجیے۔"(۳۹)

عابد سہیل نے مٹتے ہوئے سماج اور مٹتی ہوئی تہذیب کی کہانیاں بھی لکھیں اور حال کے واقعات کا بھی جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے ماضی اور حال دونوں پر نظر رکھی ہے۔ یہ ان کی انفرادی شناخت ہے۔ ابوالخیر کشفی عابد سہیل کی افسانہ نگاری پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"عابد سہیل ایک ایسے دور کا افسانہ نگار ہے جب بہت سی کہانیاں جو معاشرے نے کہی تھیں، انسانوں نے لکھی تھیں غائب ہو رہی ہیں، مٹ رہی ہیں۔ وہ ان ہی کہانیوں کا نوحہ گر بھی اور تہذیبی محافظ بھی۔ عابد سہیل ایسی غائب ہونے والی کہانیوں کی بازآفرینی کے تہذیبی عمل میں مصروف ہے۔ یہی بات افسانہ نگاروں کے ہجوم میں اس کی شناخت ہے۔ عابد سہیل لمحۂ موجود میں ماضی اور مستقبل دونوں سمتوں میں دیکھ سکتا ہے۔"(۴۰)

عابد سہیل نے اپنی کہانیوں میں عہد حاضر کے پیچیدہ مسائل، عام انسانوں کے دکھ درد، اخلاقی و

انسانی قدروں کے زوال، سماجی انتشار اور مٹتی ہوئی تہذیب کی عکاسی اس فنکارانہ انداز میں کی ہے کہ عہد حاضر کے معاشرہ کا پورا منظر نامہ نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ان کے افسانوں میں آج کے سماج اور فرد دونوں کی تصویریں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ان کے افسانوں کے جائزہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ انھوں نے فکری ندرت اور فنکارانہ نزاکت دونوں کا خیال رکھا ہے۔ وہ اردو افسانہ نگاری میں اپنے مخصوص و متوازن اور دلکش اسلوب کی بنا پر اپنی منفرد وممتاز شناخت رکھتے ہیں۔

اقبال متین

معاصر افسانہ نگاری میں اقبال متین ایک اہم نام ہے۔وہ کثیر الجہات شخصیت کے حامل قلم کار تھے۔ انھوں نے ادب کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔انھوں نے شاعری کی، ناولٹ، یادیں، خاکے لکھے اور مضامین بھی رقم کیے۔انھوں نے شاعری تفنن طبع کے طور پر کی۔یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں وہ فکری وفنی خوبیاں اور ادبی حلاوت و چاشنی نہیں ہے جو انھیں بطور شاعر متعارف کراسکے۔شاعری کے برعکس ان کے ناولٹ، یادیں، خاکے اور مضامین ادبی اعتبار سے اہم ہیں۔ان تحریروں میں ان کا خلوص اور موضوع سے ان کی لگن صاف طور پر نظر آتی ہے۔انھوں نے ''چراغ تہہ داماں' کے عنوان سے ہم جنسی جیسے انتہائی نازک موضوع پر ایک ناولٹ لکھا ہے۔اس موضوع کو انھوں نے اس فنکارانہ خلوص وصداقت سے برتا ہے اور اپنی فکری وفنی مہارت کا ایسا خوبصورت مظاہرہ کیا ہے کہ اس کی بنیاد پر ہی وہ ہم عصر ناولٹ نگاری میں منفرد وممتاز ناولٹ نگار کے روپ میں سامنے آتے ہیں۔ان کے بعض خاکے، یادداشت پر مبنی مضامین اور دیگر تاثراتی مضامین بھی ادبی اعتبار سے بڑے دلچسپ ہیں جو انھیں منفرد اور اچھے نثر نگار کی حیثیت سے سامنے لاتے ہیں۔ان تحریروں کی بنیاد پر بھی اقبال متین ادب میں توجہ کے مستحق نظر آتے ہیں مگر اصل میں جو تحریر ادب میں انھیں اہمیت وانفرادیت کی مالک بناتی ہے، وہ ان کی افسانہ نگاری ہے۔

اقبال متین اردو کے جانے مانے افسانہ نگار ہیں۔انھوں نے پہلا افسانہ ''چوڑیاں'' کے عنوان سے ۱۹۴۳ء میں لکھا جب وہ نویں جماعت کے طالب علم تھے۔یہ افسانہ ۱۹۴۵ء میں اردو کے معروف رسالہ ''ادبِ لطیف''، میں شائع ہوا جس کے ایڈیٹر مشہور افسانہ نگار احمد ندیم قاسمی تھے۔اس افسانہ کے بعد ان

کے چند اور ابتدائی افسانے اردو کے موقر جریدوں ''ادبی دنیا''، ''نگار'' اور ''نیا دور'' کی زینت بنے۔ اقبال متین نے افسانہ لکھنا تو آزادی سے پہلے شروع کیا مگر افسانوی افق پر وہ پوری آب و تاب کے ساتھ ۱۹۶۰ء کے بعد اس وقت جلوہ گر ہوئے جب ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''اُجلی پرچھائیاں'' شائع ہوا۔ ان کے کل سات افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں شامل افسانوں کی تعداد ایک سو بارہ پندرہ ہے۔

اقبال متین ترقی پسند تحریک سے وابستہ قلم کار تھے۔ ان کی ادبی وفکری تربیت مخدوم محی الدین جیسے ترقی پسند شاعر کے زیر اثر ہوئی تھی۔ وہ ترقی پسند تحریک اور اس کی فکر سے متاثر بھی تھے اور اس تحریک کے سرگرم کارکن بھی۔ ترقی پسند تحریک کے زوال کے بعد جن افسانہ نگاروں نے ترقی پسند فکر کو وسعت دی، ان میں ان کا نام نمایاں ہے۔ ترقی پسند تحریک اور اس کے فکری دھارے سے وابستہ ہونے کے باوجود انھوں نے اپنے آپ کو اسی تک محدود نہیں رکھا اور نہ اپنے فن کو کسی مخصوص نظریہ کا شکار ہونے دیا۔ انھوں نے خود کو نام نہاد جدیدیت سے بھی محفوظ رکھا اور کبھی فیشن کے وہ شکار نہیں ہوئے۔ دراصل وہ ادب میں کسی ازم کے قائل نہیں تھے بلکہ ہمیشہ فن کو ملحوظ رکھتے تھے۔ اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے سلیمان اریبؔ لکھتے ہیں:

> ''اقبال متین فکر کے لحاظ سے رومانی اور عقیدے کے لحاظ سے ترقی پسند ہے لیکن وہ ادب میں کسی ازم کا قائل نہیں۔ اس کا خیال ہے کہ ادب کو پہلے ادب ہونا چاہئے پھر سب کچھ اور جو اچھا ادب ہوگا وہ کسی ''رنگ'' کا ہوتے ہوئے بھی سب کے لیے قابلِ قبول ہوگا۔ اس میں دردمندی بھی ہوگی اور انسان دوستی بھی اور اس میں غم ذات سے لے کر غم کائنات تک ہر غم کے لیے گنجائش ہوگی۔ اگر ادب کی متذکرہ بالا تعریف کی تائید میں اقبال متین کی کوئی کہانی پیش کی جائے گی تو آپ کو اس میں اچھے ادب کی بہت سی خوبیاں مل جائیں گی۔'' (۴۱)

جیلانی بانو رقم طراز ہیں:

> ''اقبال متین کے فن کی اہم خصوصیت یہی ہے کہ وہ کسی ازم کا پرچار کئے بغیر ایک صحت مند نقطۂ نظر کے حامی ہیں۔ ان کی کہانیاں پڑھنے کے بعد جہاں

انسان کی جدوجہد پر یقین ملتا ہے وہاں ان کی فنکارانہ خوبیوں کا بھی معترف ہونا پڑتا ہے۔'' (۴۲)

اقبال متین کبھی کسی رجحان سے غیر ضروری طور پر متاثر نہیں ہوئے اور نہ انھوں نے کسی ''ازم'' کے پرچار کو اپنا مطمح نظر بنایا بلکہ ہمیشہ اعتدال و توازن کو برقرار رکھا اور قدیم و جدید کی آمیزش سے ایک ایسی راہ نکالی جس نے نوجوان افسانہ نگاروں پر اپنے اثرات مرتب کیے۔ جیسا کہ قمر رئیس کا خیال ہے:

''قرۃ العین حیدر، اقبال متین، جوگندر پال، اور اقبال مجید نے جس جادۂ اعتدال کو اپنایا۔ موضوع اور تکنیک میں جس ہم آہنگی پر زور دیا۔ علامتی اظہار میں جس چابکدستی کا رویہ اختیار کیا اور افسانہ میں افسانویت کے جوہر کو مختلف وسائل سے جس طرح قائم رکھا وہی جدید افسانہ کی صحیح سمت تھی اور آخر آخر ان کے اس رویے نے نوجوان افسانہ نگاروں کو متاثر کیا اور وہ ارادی ابہام کی ''شب خونی'' ڈگر سے ہٹ کر صحیح راستے پر آئے۔'' (۴۳)

اقبال متین کا شمار اردو کے ان باکمال افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے فکر و فن کے نئے دریچے کھولے اور فن افسانہ نگاری میں وسعت پیدا کی۔ ان کے افسانوں میں ان کا سماجی، سیاسی، معاشی اور تہذیبی شعور کافی پختہ اور نکھرا ہوا نظر آتا ہے اور حیات و کائنات کا عمیق مشاہدہ بھی دکھائی دیتا ہے۔ ان کے افسانوں کے موضوعات کا دائرہ خاصا وسیع ہے۔ حیدرآباد کا زوال پذیر جاگیردار معاشرہ، اس کی مخصوص تہذیب، ظالمانہ، جارحانہ اور استحصالی رویّہ اور اس کی ٹوٹتی بکھرتی قدریں، متوسط اور نچلے طبقات کے مسائل، کسی عزیز کے بچھڑنے کا دُکھ درد اور غم والم، انسانی نفسیات، جنسی پیچیدگیاں، مامتا کا جذبہ، عشق کی ناکامی کا المیہ، معاشی محرومی، عصر حاضر کا جبر، قدروں کی شکست و ریخت، پے چیدہ اور سنگین حالات کے شکار عام انسانوں کی بے بسی، مجبوری و محرومی، جدید شہروں کو تباہ و برباد کرنے والی مادّی تہذیب اور اس کے مختلف مظاہر، شریف آدمیوں کا دوسروں اور خود اپنے قریب ترین رشتہ داروں کے ہاتھوں استحصال، خود غرضی، مفاد پرستی، تملق و چاپلوسی، سماجی ابتری، معاشرتی، تہذیبی و اخلاقی قدروں کا زوال، انسانی بے حسی، سنگدلی، بے ضمیری، بے رحمی، فساد اور اس کے نتیجہ میں ہونے والی قتل و غارت گری، حیوانیت و درندگی، یہ اور اس طرح کے مختلف مسائل کو انھوں نے اس خوبی اور ہنرمندی سے بیان کیا ہے کہ ان کے افسانوں میں ان کا عہد اور ان کا معاشرہ جیتا جاگتا نظر آتا ہے۔

اقبال متین کی ایک خاص بات یہ ہے کہ انھوں نے بہت سوچ سمجھ کر اور فنی آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے

افسانے لکھے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کچھ کمزور افسانوں سے قطع نظر ان کے بیشتر افسانے غیر معمولی فنی مہارت اور قصہ گوئی پر ان کی فن کارانہ گرفت کا پتہ دیتے ہیں۔ ان کے افسانوں کو پڑھ کر آمد کا احساس ہوتا ہے جو تقلید سے آزاد اور اپنے منفرد لب و لہجہ کی وجہ سے دور سے پہچان لیے جاتے ہیں۔ ان کے افسانوں کا ایک خاص وصف اختصار اور کفایت لفظی ہے۔ وہ لفظوں کی حرمت کا شدید احساس رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں لفاظی اور چرب زبانی نہیں ملتی۔ انھوں نے روایتی طرز اظہار اور جدید انداز بیان دونوں سے کام لیا ہے مگر ان کے یہاں شدت پسندی نہیں پائی جاتی ہے۔ انھوں نے نہ تو نامانوس انداز بیان اپنایا اور نہ تکنیک کے غیر ضروری تجربات میں پھنس کر اپنے افسانوں کو معمہ بننے دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے کبھی ترسیل کے المیہ اور غیر ضروری ابہام کا شکار نہیں ہوئے۔ ان کے افسانے نثر کی بنیادی صفت ابلاغ کی منطق پر پورے اترتے ہیں۔

اقبال متین کو اردو افسانہ میں جو چیز منفرد بناتی ہے اور انھیں بلند مقام پر فائز کرتی ہے، وہ موضوع کے ساتھ ان کا برتاؤ، متوازن، ٹھہرا ہوا انداز، نرم رواں اور مدھم اسلوب ہے جو دھیرے دھیرے قاری پر اثر کرتا ہے اور اسے مکمل طور پر اپنی گرفت میں لیتا ہے۔ ان کے ٹھہرے ہوئے انداز اور نرم رواں افسانوی اسلوب کی تعریف بیشتر ناقدین نے کی ہے۔ پروفیسر محمد حسن لکھتے ہیں:

> ''اقبال متین نے افسانہ نگاری میں ایک ٹھہرے ہوئے انداز کو برقرار رکھا ہے۔ 'نچا ہوا البم' میں ماضی ایک نرم اور سبک اور لطیف سی لہر ہے جو قاری کو چھوتی ہوئی گذر جاتی ہے۔ ''زمین کا درد'' میں بھی ماضی ایک واضح مگر لطیف غیر مرئی سا وجود رکھتا ہے جو لفظوں کے معنی اور کرداروں کی نوعیت بدل کر رکھ دیتا ہے۔ پھر ''گٹھری'' ہے جو متوسط طبقے کے مٹنے کی دردناک کہانی کو نزاکت، لطافت اور مدھم درد کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ اقبال متین اسی نرم دردمندی کے افسانوں سے پہچانے جاتے ہیں۔'' (۴۴)

پروفیسر عتیق اللہ اقبال متین کے اسلوب کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> ''اقبال متین کے اسلوب میں بھی افسانہ کہنے کا فن قائم ہے۔ ان کے اظہار کی منطق لفاظی اور چرب زبانی سے کوئی نسبت نہیں رکھتی اور نہ ہی ان کے کرداروں میں دانشورانہ کلیوری ہے۔ پچھلے دس بارہ سال کے انتہائی

آزمائشی عرصہ میں بھی انھوں نے اپنے اسلوب کو علامت بازی سے محفوظ رکھا۔ وہ جدید افسانے میں اسلوبیاتی قطعیت کی ایک قابل قدر مثال ہیں۔ انھوں نے علامتوں کے جنگل پروان نہیں چڑھائے اور نہ ہی علامتی اور استعاراتی اسلوب اختیار کیا۔ تب بھی ان کا افسانہ ایک ایسی تراش مہیا کرتا ہے جو اپنے آپ میں منفرد اور جدید حسّیت کا حامل ہے۔'' (۴۵)

مجتبیٰ حسین لکھتے ہیں:

''لفظ ان کے مخصوص اسلوب میں ایک نئے انداز سے ابل ابل پڑتے ہیں اور معنی کی دھیمی دھیمی آنچ پڑھنے والے کو موم میں تبدیل کرتی چلی جاتی ہے۔ ایک انوکھا اور اچھوتا درد، جس کی کسک ذاتی بھی ہے اور آفاقی بھی، ان کے افسانوں کو منفرد مرتبہ عطا کرتی ہے۔'' (۴۶)

اثر فاروقی رقم طراز ہیں:

''اقبال متین کا طرز اسلوب سادہ ہے۔ اور ان کی اسی سادگی کا نتیجہ ہے کہ ان کے افسانوں کی قرأت کے دوران کہیں بھی بوجھل پن کا احساس نہیں ہوتا۔ ان کی کہانیوں میں دریا کے بہاو کے بجائے ایک چھوٹے سے جھرنے کی روانی کی مترنم موسیقی کو صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔'' (۴۷)

ڈاکٹر محمد علی اثر لکھتے ہیں:

''وہ نہ صرف دنیائے ادب کے ایک نامور ادیب اور صف اول کے کہانی نویس ہیں بلکہ اس صنف میں انھوں نے ادب کے معاصر رجحانات، فنی لوازم، موضوع اور ٹیکنیک میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی اور اسلوب بیان اور طرز تحریر میں جو شعریت اور افسانویت کا حسین امتزاج پیدا کیا ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔'' (۴۸)

افتخار ندیم کا کہنا ہے:

''اقبال متین کے افسانوں میں معاشرے کا کرب اور کسک ہے۔ الفاظ، لب ولہجہ، اسلوب بیان نہایت ہی معیاری ہے۔ قاری جب پڑھنا شروع کرتا ہے تو اختتام تک کہانی کا حصہ بن جاتا ہے۔'' (۴۹)

قیصر سرمست لکھتے ہیں:

''اقبال متین کو دور جدید کے دوسرے افسانہ نگاروں میں جو بات انفرادیت

بخشتی ہے وہ ہے اس کا اسلوب اور انداز بیان۔ان کے افسانوں میں ایسا بہاؤ
ہوتا ہے کہ قاری بہتا چلا جاتا ہے اور وہ افسانے کے انجام کے متعلق کوئی آئیڈیا
قائم نہیں کر سکتا اور نہ ہی سوچ سکتا ہے افسانہ کیا کروٹ بدلے گا۔‘‘(۵۰)

ادباء و ناقدین کی ان مذکورہ آراء سے اردو افسانہ نگاری میں اقبال متین کی انفرادیت بھی اجاگر ہوتی ہے اور ان کی اہمیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

اقبال متین کے افسانوں کے مطالعہ سے کئی باتیں سامنے آتی ہیں۔ ان کے افسانوں میں موضوعات کا تنوع اور فن کا گہرا شعور پایا جاتا ہے۔ان کے افسانے دیگر معاصرین کی بہ نسبت آسانی سے سمجھ میں آجاتے ہیں اور ذہن و دل پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ان کے افسانے عام فہم ہونے کے باوجود یک رخے اور سپاٹ نہیں ہوتے بلکہ اس میں تہہ داری ہوتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو دہراتے نہیں ہیں بلکہ ان کے ہر افسانہ میں کوئی نہ کوئی نئی بات پیش کی جاتی ہے جو زندگی کے ہی کسی پہلو کی ترجمانی کرتی ہے۔اس کے علاوہ ان کے افسانوں میں روایت اور جدّت کی حسین آمیزش، توازن و اعتدال، عصری حسّیت، زندگی کے ٹھوس حقائق اور پے چیدہ مسائل کا فنکارانہ اظہار، مواد اور ہیئت کے درمیان گہرا توازن، مناسب و موزوں تکنیک کا استعمال، چونکانے والے تجربوں سے گریز، لفظ کی حرمت کا احساس اور زبان کا خلاّقانہ استعمال نظر آتا ہے۔ان کے افسانوں میں پلاٹ اور کردار نگاری کا بھی فنکارانہ اہتمام ملتا ہے جو کہانی پن اور وحدت تاثر کو قائم رکھتا ہے۔

اردو افسانہ نگاری میں اقبال متین کی اہمیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے اس وقت اردو افسانہ کی آبرو کو بچائے رکھا جب نام نہاد جدیدیت کے زیر اثر بے جا علامت نگاری، ابہام، پے چیدہ لسانی و تکنیکی تجربات کے چکر میں پھنس کر اردو افسانہ اپنا صنفی وقار ’’کہانی پن‘‘ کھو رہا تھا۔ایسے وقت میں اقبال متین نہ تو پوری طرح روایت کے اسیر ہوئے اور نہ جدت پسندی کے زعم میں مبتلا ہوئے، بلکہ انہوں نے اپنے او پر قابو رکھا اور افسانہ کے فنی آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے فنی اعتبار سے مضبوط، بلند اور معیاری افسانے اردو کو دیے۔انھوں نے ہمیشہ اپنے پاؤں کو زمین پر جمائے رکھا، اپنے گرد و پیش کے مسائل پر گہری نظر رکھی، باطنی کشمکش اور ذات کی بھول بھلیوں میں غوطہ زنی کے بجائے اپنے فن کو اجتماعی زندگی کا ترجمان بنایا۔ان کا فن برابر ارتقا پذیر رہا اور دور رس اثرات کا حامل بھی۔ان کے افسانوں میں ان کا عہد، ان کا

معاشرہ، اس معاشرہ میں سانس لیتے لوگ، ان کی چھوٹی چھوٹی آرزوئیں، امنگیں، جینے کی للک اور تہذیب کی جھلک، یہ تمام چیزیں موجود ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں جس فکری وفنی مہارت کا مظاہرہ کیا ہے، اس کی بنا پر وہ ایک منفرد وممتاز اور اہم افسانہ نگار کے روپ میں سامنے آئے ہیں۔ اردو افسانہ میں ان کی انفرادیت اور اہمیت کا اعتراف معتبر ناقدین نے کیا ہے۔ اردو کے معتبر ناقد شمس الرحمان فاروقی نے اقبال متین کی فنی خوبی کا اعتراف اس طرح کیا ہے۔

''اقبال متین کی نفسیاتی گرفت اس قدر سچی اور مضبوط ہے کہ ان کے افسانوں کے کرداروں کی داخلی زندگی آئینہ ہوکر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔''(۵۱)

ڈاکٹر مثنیٰ رضوی نے اقبال متین کی انفرادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

''اقبال متین اردو کے ان افسانہ نگاروں میں سے ہیں جنھوں نے موضوعات کے تنوع اور اسلوب کی تازہ کاری سے اپنی کہانیوں کو ایک منفرد شناخت اور الگ مزاج کا حامل بنادیا ہے۔''(۵۲)

نورالحسنین نے اقبال متین کی انفرادیت واہمیت کو یوں اجاگر کیا ہے:

''اردو افسانہ نگاروں کی وہ نسل جو رام لال، اقبال متین، غیاث احمد گدی، قاضی عبدالستار، رتن سنگھ، اقبال مجید، جوگیندر پال اور جیلانی بانو وغیرہ پر مشتمل ہے، ان میں اقبال متین کی شناخت قدرے مختلف ہے۔ کیوں کہ ان کے افسانے نہ تو محض داخلیت کی بھول بھلیوں میں گردش کرتے ہیں اور نا ہی تجربات کی بھٹی میں جھلس جھلس کر قاری سے اس کی قابلیت کا امتحان لیتے ہیں۔ البتہ ان کے افسانے نہاں خانۂ دل کے تاروں کو چھیڑتے ہیں، روح کی گہرائیوں میں اتر آتے ہیں۔ عصری آگہی کے ویرانوں میں اس پہاڑ کی مانند جل اُٹھتے ہیں جس کا دھواں تو نظر نہیں آتا لیکن روشنی کی ایک لکیر بن کر احساسات کو خیرہ کردیتے ہیں۔''(۵۳)

پروفیسر قمر رئیس نے اقبال متین کی فنی مہارت کا اعتراف اس طرح کیا ہے:

''اقبال متین کی کہانیاں انسانی دکھ درد کے رشتوں سے گوندھی ہوئی حکایتیں ہیں۔ یہ آج کی پُرآشوب زندگی کے کینوس پر اتاری ہوئی ایسی بے لاگ تصویریں ہیں جو اپنی کربناکی سے قاری کے دل کو خون کردیتی ہیں۔ ہم

جانتے ہیں کہ سرخ رنگوں میں زندگی اور فطرت کی مصوری آسان ہوتی ہے لیکن پانی جیسے ہلکے کم نما رنگوں میں زندگی کی سچائیوں کی پیکر تراشی مشکل بہت مشکل ہوتی ہے۔اس کے لیے ماہر فن مصور کا موقلم درکار ہوتا ہے۔اقبال متین کی کہانیوں میں اسی بے مثل مہارت کا احساس ہوتا ہے۔''(۵۴)

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید نے اردو افسانہ میں اقبال متین کی اہمیت اور ان کے مقام و مرتبہ کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:

''پریم چند کے بعد اردو کے ممتاز فکشن نگاروں کی فہرست مرتب کی جائے تو اس میں ایک نام اقبال متین کا بھی رہے گا، خواہ یہ فہرست کتنی ہی مختصر ترین کیوں نہ ہو۔اقبال متین ایسے فن کاروں میں شامل ہیں جنہوں نے صحت مند روایات سے استفادہ کیا اور عصری مسائل اور میلانات پر بھی نظر رکھی۔ ان کے فکشن میں ان کا معاشرہ چلتا پھرتا محسوس ہوتا ہے۔ یہ ان کی جاگتی عصری حسّیت ہے کہ وہ اپنے اطراف و اکناف کی ترجمانی کرتے ہیں۔ انہوں نے اردو فکشن کی صحت مند اقدار کو مستحکم کیا اور ان کے فروغ میں اپنا حصہ ادا کیا۔اردو فکشن کی تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ تابندہ رہے گا۔''(۵۵)

اردو کے معتبر ناقدین کی ان آراء اور اقبال متین اور ان کے معاصرین کے فن پر بحث کی روشنی میں یہ بات پوری طرح واضح ہوجاتی ہے کہ اقبال متین اپنے معاصرین میں ایک منفرد و ممتاز اور اہم افسانہ نگار کی حیثیت رکھتے ہیں۔انھوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعے اردو کے افسانوی ادب میں جو بیش بہا اضافہ کیا ہے اس کی وجہ سے وہ ہم عصر اردو افسانہ نگاری میں نمایاں مقام کے مستحق ہیں۔

حوالے

(۱) مرزا حامد بیگ،اُردو افسانے کی روایت، ناشر، عالمی میڈیا پرائیویٹ لمیٹڈ،نئی دہلی،۲۰۱۴ء،ص:۱۰۲۵۔

(۲) وہاب اشرفی، پال فن اور شخصیت، مشمولہ، جوگندر پال، ذکر،فکر،فن،مرتب، ارتضیٰ کریم،موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی،۱۹۹۹ء،ص:۱۵۸۔

(۳) جوگندر پال،افسانہ،بُو، مشمولہ،نمائندہ اُردو افسانے،مرتّب، پروفیسر قمر رئیس،اُردو اکادمی، دہلی،۲۰۱۴ء،ص:۱۸۰۔

(۴) جوگندر پال،افسانہ،رسائی، مشمولہ،افسانوی مجموعہ،رسائی،نصرت پبلشرز،لکھنو،۱۹۶۹ء،ص:۱۹۰۔

(۵) ایضاً،ص:۱۸۹۔

(۶) وزیر آغا، جوگندر پال کا فن، مشمولہ، جوگندر پال، ذکر، فکر، فن، ص:۴۴۔
(۷) پروفیسر قمر رئیس، جوگندر پال کا فنی اسلوب، مشمولہ آج کل، (جوگندر پال نمبر) نئی دہلی، جنوری، ۱۹۹۷ء، ص:۲۸۔
(۸) م.م. راجندر، جوگندر پال۔ایک مطالعہ، مشمولہ، ماہنامہ پروازِ ادب، پنجاب، گوشۂ جوگندر پال، جلد ۱۶، شمارہ:۱۲۔۹ستمبر، دسمبر۱۹۹۴ء، ص:۱۴۹۔
(۹) اقبال متین، باتیں ہماریاں، گونج پبلیکیشنز، اردو گھر، احمدی بازار، نظام آباد، ۲۰۰۵ء، ص:۱۲۰۔
(۱۰) مرزا حامد بیگ، اُردو افسانے کی روایت، ص:۱۰۳۴۔
(۱۱) شاہد تسلیم، تعارفی خاکے، مشمولہ، نمائندہ اُردو افسانے، مرتّب، پروفیسر قمر رئیس، ص:۴۲۰۔
(۱۲) غیاث احمد گدّی، افسانہ، پرندہ پکڑنے والی گاڑی، مشمولہ، برصغیر میں اردو افسانہ، مرتب، خالد اشرف، ناشر، مرتب، ۲۰۱۰ء، ص:۶۸۳، ۶۸۴۔
(۱۳) ایضا ص:۶۸۹، ۶۹۰۔
(۱۴) حسین الحق، استعارہ ساز گدّی، مشمولہ، اردو فکشن ہندوستان میں، (جلد اوّل) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۴ء، ص:۱۰۶، ۱۰۷۔
(۱۵) قاضی عبدالستار، افسانہ، پیتل کا گھنٹہ، مشمولہ، آئینہ ایام، قاضی عبدالستار کے بہترین افسانے، مرتبہ، محمد غیاث الدین، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۵ء، ص:۵۵۔
(۱۶) قاضی عبدالستار، افسانہ، مالکن، مشمولہ، آئینہ ایام، قاضی عبدالستار کے بہترین افسانے، مرتبہ، محمد غیاث الدین، ص:۹۹۔
(۱۷) ایضاً ص:۱۰۲۔
(۱۸) قاضی عبدالستار، افسانہ، ایک دن، مشمولہ، آئینہ ایام، قاضی عبدالستار کے بہترین افسانے، مرتبہ، محمد غیاث الدین، ص:۴۹۔
(۱۹) شمس الرحمن فاروقی، بحوالہ، مقدمہ، آئینہ ایام، قاضی عبدالستار کے بہترین افسانے، مرتبہ، محمد غیاث الدین، ص: ۱۴۔۱۵۔
(۲۰) شاہد تسلیم، تعارفی خاکے، مشمولہ، نمائندہ اُردو افسانے، مرتبہ، پروفیسر قمر رئیس، ص:۴۰۷۔
(۲۱) اقبال مجید، افسانہ، جنگل کٹ رہے ہیں، مشمولہ: برصغیر میں اردو افسانہ، مرتب، خالد اشرف، ص:۶۳۶، ۶۳۷۔
(۲۲) ایضاً ص:۶۴۰، ۶۴۱۔
(۲۳) اقبال مجید، افسانہ، سڑی ہوئی مٹھائی، مشمولہ، شہر بدنصیب، معیار پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۱۹۹۷ء، ص:۱۳۲ تا ۱۳۶۔

(۲۴) حیدر طباطبائی، نا آشنائے کعبہ و بت خانہ، مشمولہ، ارتقا، کراچی، اپریل تا جون، ۲۰۰۰ء، ص: ۲۲۶۔

(۲۵) شمس الرحمٰن فاروقی، شہر بد نصیب، کے فلیپ پر۔

(۲۶) انوار احمد، اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ، ناشر، براؤن بک پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۲۰۱۴ء، ص: ۴۵۰۔

(۲۷) ایضاً۔

(۲۸) جیلانی بانو، افسانہ، پیاسی چڑیا، مشمولہ، نروان، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی، ۱۹۶۳ء، ص: ۲۱۲۔

(۲۹) جیلانی بانو، افسانہ، کتاب الرائے، مشمولہ، نروان، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی، ۱۹۶۳ء، ص: ۵۳، ۵۴۔

(۳۰) فضیل جعفری، سہ ماہی، ذہن جدید، دہلی، مارچ تا مئی، ۱۹۹۸ء، ص: ۴۳۔

(۳۱) محمد حمید شاہد، اُردو افسانہ: صورت و معنیٰ نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۰۶ء، ص: ۱۱۲۔

(۳۲) رتن سنگھ، افسانہ، ایک تلخ حقیقت، مشمولہ، پناہ گاہ، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۲۰۰۰ء، ص: ۱۴۸۔

(۳۳) رتن سنگھ، افسانہ، بیسویں صدی کا بازار، مشمولہ، پناہ گاہ، ص: ۱۴۹۔

(۳۴) رتن سنگھ، افسانہ، چھلنی کے چھید، مشمولہ، پناہ گاہ، ص: ۳۳۱۔

(۳۵) رتن سنگھ، افسانہ، ایک بڑا آدمی، مشمولہ، پہلی آواز (افسانوی مجموعہ)، نصرت پبلشرز، لکھنو، ۱۹۶۹ء، ص: ۲۰۔

(۳۶) عابد سہیل، سرورق، پہلی آواز، (افسانوی مجموعہ)، رتن سنگھ۔

(۳۷) محمد مثنی رضوی، عابد سہیل فن اور فنکار، غیر مطبوعہ۔

(۳۸) محمد حسن، یہ افسانے، مشمولہ، سب سے چھوٹا غم، عابد سہیل، نصرت پبلشرز، لکھنو، ۱۹۹۴ء، ص: ۱۴۔

(۳۹) نیر مسعود، سب سے چھوٹا غم (تبصرہ)، مشمولہ، نیا دور، لکھنو، ۱۹۷۹ء، ص: ۴۸۔

(۴۰) ابوالخیر کشفی، تحریر فلیپ کے پشت پر، بحوالہ سب سے چھوٹا غم، عابد سہیل، نصرت پبلشرز، لکھنو، ۱۹۹۴ء۔

(۴۱) سلیمان اریب، دیباچہ، چہرہ نما، مشمولہ، اقبال متین کے افسانے (جلد دوم)، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۰ء، ص: ۱۳۔

(۴۲) جیلانی بانو، اُجلی پرچھائیاں: ایک جائزہ، مشمولہ، اقبال متین سے انسیت، ص: ۱۶۵۔

(۴۳) قمر رئیس، بیسویں صدی کا افسانوی ادب، کتابی دنیا، دہلی، ۲۰۰۴ء، ص: ۱۸۶۔

(۴۴) پروفیسر محمد حسن، ساتویں دہائی کا افسانہ، مشمولہ، عصری ادب، نئی دہلی، دسمبر، ۱۹۷۵ء، ص: ۱۴۴۔

(۴۵) پروفیسر عتیق اللہ، قدر شناسی، ادارہ اشاعت اردو، ۱۹۷۸ء، ص: ۹۴۔

(۴۶) مجتبیٰ حسین، روزنامہ سیاست، حیدرآباد، اتوار، ۲۰، دسمبر، ۲۰۰۹ء، ص: ۶

(۴۷) اثر فاروقی، اقبال متین کا فن، مشمولہ، قومی محاذ، اورنگ آباد، (خصوصی اشاعت) اکتوبر، ۲۰۰۴ء، ص: ۳۰۔

(۴۸) ڈاکٹر محمد علی اثر، اقبال متین: شخصیت اور فن کے چند زاویے، مشمولہ، اقبال متین سے انسیت، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۲ء، ص: ۲۸۴۔

(۴۹) افتخار ندیم، بحوالہ قرطاس وقلم کے ساتھی، مرتبہ: صائمہ اقبال، اردو بک ڈپو، انجمن ترقی اردو، حیدرآباد، ۲۰۱۵ء، ص: ۵۲۵۔

(۵۰) قیصر سرمست، اشکوں سے بجھا ہوا آدمی، مشمولہ، اقبال متین سے انسیت، ص: ۲۷۰۔

(۵۱) شمس الرحمٰن فاروقی، بحوالہ، اقبال متین کے افسانے (جلد اول) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۹ء، ص: ۱۷۱۔

(۵۲) ڈاکٹر مثنیٰ رضوی، اقبال متین کے تین افسانے: ایک مختصر تجزیہ، مشمولہ، اقبال متین سے انسیت، ص: ۱۸۰۔

(۵۳) نورالحسنین، میں اقبال متین ہوں، مشمولہ، اقبال متین سے انسیت، ص: ۹۔

(۵۴) پروفیسر قمر رئیس، اقبال متین کا شہر آشوب، مشمولہ، اقبال متین سے انسیت، ص: ۶۹۔

(۵۵) پروفیسر سلیمان اطہر جاوید، اقبال متین، مشمولہ، اقبال متین سے انسیت، ص: ۲۹۸، ۲۹۹۔

ماحصل

ماحصل

اردو کے عصری منظرنامے پر جن ادیبوں اور تخلیق کاروں کو اعتبار و وقار حاصل ہے، ان میں اقبال متین کا نام نہایت اہم ہے۔ان کی تخلیقی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ وہ ایک صاحب طرز ادیب ہیں۔ انھوں نے اپنی فکر و نظر کے ذریعے ادب کی متعدد اصناف کو جلا بخشی۔ انھوں نے فکشن کے علاوہ خاکہ نگاری، یادنگاری، مضمون نگاری اور شاعری میں بھی اپنی خلاقانہ صلاحیت کا فطری مظاہرہ کیا ہے لیکن ان کی بنیادی شناخت افسانہ نگار کی حیثیت سے ہے۔ وہ اردو کے منفرد و ممتاز اور نمائندہ افسانہ نگار ہیں۔ ''اجلی پرچھائیاں''''نچا ہوا البم''''خالی پٹاریوں کا مداری''''آ گہی کے ویرانے''''مزبلہ''''میں بھی فسانہ تم بھی کہانی''اور''شہر آشوب''اقبال متین کے وہ افسانوی مجموعے ہیں جو افسانوی ادب میں بیش بہا اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اقبال متین حیدرآباد کے محلّہ رام کوٹ، فرحت منزل میں پیدا ہوئے۔ سرٹیفکٹ کے مطابق ان کی تاریخ پیدائش ۲/فروری ۱۹۲۹ء ہے۔ان کا اصل نام سید مسیح الدین خاں، عرف 'اقبال' اور تخلص 'متین' تھا لیکن ادبی دنیا میں وہ اقبال متین کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ انھوں نے میڈل اسکول کی تعلیم مدرسہ وسطانیہ بشیر آباد اور مدرسہ فوقانیہ، چیتاپور میں حاصل کی اور دسویں کا امتحان سٹی ہائی اسکول، حیدرآباد سے پاس کیا۔ان کے والد تعلقدار اور تحصیلدار کے عہدے پر فائز تھے۔اس لیے ان کے تبادلوں کے ساتھ اقبال متین کی تعلیم گاہیں بھی بدلتی رہیں۔ کچھ دنوں تک ان کی تعلیم ایم۔اے۔او۔انسٹی ٹیوٹ، عابڈس، حیدرآباد، سٹی کالج حیدرآباد اور دارالعلوم کالج، حیدرآباد میں ہوئی۔ انٹرمیڈیٹ انھوں نے چادرگھاٹ کالج، حیدرآباد سے پاس کیا۔ان تعلیمی اداروں میں انھیں مخدوم محی الدین اور محی الدین قادری زور

جیسے اساتذہ کی سرپرستی حاصل رہی۔ یہاں انھیں ایسے رفقاء بھی میسّر آئے جو ستھرے ادبی ذوق کے مالک تھے۔ان اساتذہ اور رفقاء کی صحبت نے ان کے ادبی شعور کو جلا بخشنے میں اہم رول ادا کیا۔

اقبال متین کا تعلق ادبی خانوادے سے رہا ہے۔ان کے والد سید عبدالقادر ناصر اور دو چچا سید قادر الدین تمکین سرمست اور نسیم قاسمی شاعر تھے۔ایک چچا دستگیر الدین ڈرامہ نویس تھے۔ان کے گھر پر شعری محفلیں منعقد ہوتی تھیں۔ایسے ماحول میں ان کے شعری وادبی ذوق کی آبیاری ہوئی تھی۔

اقبال متین کو شعر وادب سے طبعی مناسبت تھی۔ان کے والد انھیں انگریزی اور نصاب کی کتابیں پڑھنے کی تاکید کرتے تھے مگر اپنی فطری مناسبت کی وجہ سے وہ اپنے والد سے چھپ چھپ کر ادبی رسائل زیادہ دلچسپی سے پڑھتے تھے۔ادب سے ان کی فطری دلچسپی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ جب وہ کالج پڑھنے جاتے تھے تو کالج چھوڑ کر دن دن بھر مقامی لائبریری میں ادبی کتابیں پڑھتے تھے۔انھوں نے نوعمری ہی میں اردو کے اہم افسانہ نگاروں منٹو، اختر اورینوی، بیدی، کرشن چندر اور عصمت چغتائی وغیرہ کا مطالعہ کرلیا تھا۔اقبال متین نے اپنی طالب علمی کے زمانہ سے بچوں کے لیے ہلکی پھلکی نظمیں، کہانیاں اور مضامین بھی لکھنا شروع کر دیا تھا۔شعر وادب میں بہت زیادہ منہمک ہونے کی وجہ سے اقبال متین کا تعلیمی سفر خاطر خواہ جاری نہ رہ سکا۔انٹرمیڈیٹ کے بعد جب انھیں کوئی ملازمت نہیں ملی تو انھوں نے گھر والوں کی مخالفت کے باوجود پان کی دکان کھولی۔ یہ دکان زیادہ دنوں تک نہ چل سکی۔اسی دوران محکمہ آبکاری میں انھیں ملازمت مل گئی۔ پولیس ایکشن کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہوگیا تو حیدرآباد کے جاگیر ایڈمنسٹریشن میں وہ ملازم ہوئے۔ یہاں ان کا تقرر کلرک کی حیثیت سے ہوا تھا۔جب جاگیر ایڈمنسٹریشن، محکمہ بندوبست میں ضم ہوگیا تو اقبال متین کی خدمات محکمہ مال کے سپرد کردی گئیں۔ یہاں ترقی کر کے وہ نائب تحصیل دار کے عہدے پر فائز ہوئے اور اسی عہدے پر خدمات انجام دیتے ہوئے سبکدوش ہوئے۔

اقبال متین کے ادبی سفر کا آغاز شاعری سے ہوا مگر کہانیوں سے طبعی مناسبت کی وجہ سے وہ بہت جلد اس کی طرف مائل ہوگئے۔ انھوں نے پہلا افسانہ ''چوڑیاں'' کے عنوان سے ۱۹۴۳ء میں لکھا جب وہ نویں جماعت کے طالب علم تھے۔ یہ افسانہ ۱۹۴۵ء میں اردو کے معروف رسالہ ''ادبِ لطیف'' میں شائع ہوا جس کے ایڈیٹر احمد ندیم قاسمی تھے۔ان کا دوسرا افسانہ ''سنہری لکیریں'' ''ادبی دنیا'' میں چھپا۔ تیسرا افسانہ

''مرگھٹ'' ''ادبِ لطیف'' میں اور چوتھا افسانہ ''تانبہ اور پانی'' ''نیا دور'' میں شائع ہوا۔ ایسے موقر ادبی جریدوں میں اپنے ابتدائی افسانوں کی اشاعت سے انھیں بڑا حوصلہ ملا۔ اقبال متین نے افسانہ لکھنا تو آزادی سے پہلے شروع کیا مگر باضابطہ افسانہ نگار کی حیثیت سے وہ ۱۹۶۰ء کے بعد اس وقت سامنے آئے جب ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''اُجلی پرچھائیاں'' چھپ کر منظر عام پر آیا۔ اس مجموعے کے علاوہ ان کے چھ اور افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن کے نام اس طرح ہیں۔ ''نچا ہوا البم'' (۱۹۷۲ء)، ''خالی پٹاریوں کا مداری'' (۱۹۷۷ء)، ''آگہی کے ویرانے'' (۱۹۸۰ء)، ''مزبلہ'' (۱۹۸۹ء)، ''میں بھی فسانہ تم بھی کہانی'' (۱۹۹۳ء)، ''شہر آشوب'' (۲۰۰۳ء)۔

اقبال متین ذہنی طور پر ترقی پسند فکشن نگار تھے لیکن وہ تحریک کی شدت پسندی اور حد سے بڑھی ہوئی مقصدیت سے کبھی مرعوب نہ ہوئے۔ ساتھ ہی انھیں جدیدیت کی بے جا داخلیت اور پیچیدگی سے بھی سخت اعتراض تھا۔ بحیثیت فن کار اقبال متین نے ہمیشہ ہی ادب کی جمالیاتی و فنی قدروں کو اہمیت دی اور دوسرے نمائندہ افسانہ نگاروں کی طرح فن افسانہ کی بنیادی شناخت مثلاً بیانیہ اور کہانی پن کو متوازن انداز میں برتا۔ ان کا شمار آزادی کے بعد ان ممتاز افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنہوں نے اردو افسانے کو صحیح سمت و رفتار دینے کی کوشش کی۔ وہ ایک حساس طبیعت اور کھلے ذہن کے افسانہ نگار تھے۔ انھوں نے کبھی دوسرے فن کاروں کی تقلید کرنا گوارا نہیں کیا بلکہ انھیں ہمیشہ ہی نئے دریچوں اور فکر و فن کی نئی جہتوں کی تلاش و جستجو رہی۔ انھوں نے اردو افسانے کی صحت مند روایات سے استفادہ کیا اور جدید رویّوں کو بھی ملحوظ رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں روایت اور جدّت کا حسین امتزاج نظر آتا ہے اور ان کے افسانے موضوعات اور اس کی پیش کش کے لحاظ سے تازگی اور ندرت کا احساس دلاتے ہیں۔

اقبال متین حقیقت پسند افسانہ نگار ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں کی بنیاد آس پاس کے ماحول اور گرد و پیش کی پھیلی ہوئی زندگی پر رکھی۔ اقبال متین کے افسانوں میں ان کا سماجی، معاشی اور تہذیبی شعور کافی پختہ اور نکھرا ہوا نظر آتا ہے اور حیات و کائنات کا عمیق مشاہدہ دکھائی دیتا ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں ہم عصر مسائل کو فنکارانہ کمال کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں عصری حسّیت پورے شدّ و مد کے ساتھ پائی جاتی ہے۔ اقبال متین کے افسانوں کا کینوس مخصوص موضوعات تک محدود نہیں

ہے بلکہ ان کے یہاں مختلف طرح کے موضوعات ومسائل نظر آتے ہیں۔ان کے بیشتر افسانے متوسط طبقے کے مسائل سے متعلق ہیں۔اس طبقے کی افلاس زدہ زندگی، معاشی تنگدستی، مجبوری ومحرومی، اس کے دبے کچلے جذبات واحساسات اور درد وکرب کو انھوں نے شدّت سے محسوس کیا ہے جن کی موثر عکّاسی ان کے افسانوں ''مسدود راستے''، ''درد کا رشتہ''، ''زمین کا درد''، ''ننگے زخم''، ''بوند بوند لہو''، ''چوتھا دن'' اور ''تین پتھر ڈھونے والا مسافر'' وغیرہ میں ہوئی ہے۔اقبال متین نے اپنے افسانوں میں نچلے طبقے کو بھی موضوع بنایا ہے۔''آنگن میں سہاگن'' اور ''پو پھٹنے تک'' ایسے ہی افسانے ہیں۔''آنگن میں سہاگن'' میں بمبئی کی جھگی جھونپڑیوں میں رہنے والے لوگوں کی غربت زدہ زندگی اور ان کی محرومیوں کی عکاسی کی گئی ہے۔''پو پھٹنے تک'' میں حیدرآباد کے مضافات میں آباد ایک مفلوک الحال تلنگی خاندان کا نقشہ پیش کیا گیا ہے جس کی غربت و افلاس کے باعث عزت و آبرو بھی محفوظ نہیں رہ پاتی۔ان افسانوں میں اقبال متین نے جھگی جھونپڑیوں میں گزر بسر کرنے والے لوگوں کے مطابق مناسب زبان استعمال کی ہے اور ان کی رہائش، طور طریقوں، جذبات واحساسات اور نفسیاتی کیفیات کی ترجمانی فنی انداز میں کی ہے۔ایسا لگتا ہے کہ وہ برسوں ان کے ساتھ رہے ہوں۔یہ ان کی فنکارانہ مہارت کا ثبوت ہے۔

اقبال متین کے افسانوں کا ایک اہم موضوع حیدرآباد کا زوال پذیر جاگیردارانہ معاشرہ ہے۔اقبال متین نے ریاست حیدرآباد میں جس عہد میں ہوش سنبھالا، وہ جاگیردارانہ ماحول ومعاشرے کے زوال کا دور تھا۔ اس دور کو انھوں نے بہت قریب سے دیکھا اور جاگیردار طبقے کی زندگی، بودوباش، عادات واطوار، اخلاق و کردار اور اس کی خوبیوں اور خامیوں کا گہرا مشاہدہ کیا تھا جسے انھوں نے اپنے افسانوں میں پیش کیا۔ایسے افسانوں میں ''ملبا''، ''گرتی دیواریں''، ''کتاب سے کتبے تک''، ''آدمی اور آدمی''، ''اندھیروں کی لاج'' اور ''پانی کے چراغ'' قابل ذکر ہیں۔یہ افسانے اس اعتبار سے منفرد ہیں کہ ان میں اقبال متین جذباتی ہوئے ہیں، نہ انہوں نے جانبدارانہ رویّہ اپنایا ہے، بلکہ حقیقت پسندانہ انداز اختیار کیا ہے۔ان افسانوں میں انھوں نے جاگیردارانہ معاشرہ کے جبر واستبداد کے ماحول، اس ماحول میں غریب وبے بس خواتین کی حالت زار، ان کے جنسی استحصال، لٹے پٹے جاگیردار طبقے کی بے بسی، مٹتی تہذیب اور جھوٹی شان وشوکت کی موثر عکاسی کی ہے۔اقبال متین کی ان تحریروں میں بگڑی نواب زادیوں کی تنک مزاجی، اخلاقی پستی، بگڑے نواب

زادوں کی بے عملی اور رعونت پسندی کی جھلک بھی دیکھنے کو ملتی ہے، اس کے علاوہ انھوں نے نوابوں کی جنسی بے راہ روی، ریا کاری، منافقت، شرافت اور خلوص و محبت کی ناقدری، انسانیت کی تذلیل و تحقیر، شریف نواب زادوں کا ذہنی و جذباتی استحصال، ان کا دردناک انجام، اور چند دوسرے پہلوؤں کو اس چابکدستی سے بیان کیا ہے کہ جاگیردارانہ معاشرہ کا پورا منظر نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ ان افسانوں کے ذریعے اقبال متین نے جاگیردارانہ سماج کی متحرک، جاندار اور اثر انگیز تصویریں پیش کی ہیں جو ان کے سماجی اور تہذیبی شعور اور فن کارانہ بصیرت کی بیّن دلیل ہے۔

اقبال متین ایک نہایت ہی حساس افسانہ نگار ہیں۔ انھیں سماجی ناہمواریوں، زندگی کی نارسائیوں اور تہذیب کی کجی کا شدّت سے احساس ہے۔ اپنے افسانوں میں انھوں نے اس جانب بلیغ اشارے کیے ہیں۔ اس ضمن میں ''چھت''، ''ہمزاد''، ''زبوں آثار''، ''سنگ صدا''، ''کینڈل کالونی''، ''گٹھری''، ''کاٹا ہوا نام''، ''آگہی کے ویرانے''، ''یہ کس کی تصویر ہے؟''، ''برہان قاطع''، ''چھگن چاچا''، ''دھوپ''، ''سنگ پشت'' اور ''ایک سوال'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان افسانوں میں اقبال متین نے سماج میں بڑھتی ہوئی مادیت پرستی، معاشرتی پستی، تہذیبی قدروں کی شکست و ریخت، سماجی انتشار، رشتوں کی بے معنویت، شریف اور باضمیر انسانوں کا استحصال، خودغرضی، مفاد پرستی، تملق و چاپلوسی، انسانی بے حسی، سنگدلی، بے ضمیری، جدید عہد کی زندگی کی ویرانی و شکستگی، عام انسانوں کی بے بسی، مجبوری و محرومی، ان تمام مسائل کو موثر انداز میں پیش کیا ہے۔

اقبال متین نے فساد کے موضوع پر بھی افسانے لکھے ہیں۔ ''شہر آشوب'' اور ''اونچ نیچ'' اسی موضوع پر لکھے گئے افسانے ہیں۔ ان افسانوں میں اقبال متین نے فرقہ وارانہ فساد کی وجہ سے پیدا ہونے والی المناک صورت حال، قتل و غارت گری اور حیوانیت و درندگی کو اس طرح پیش کیا ہے کہ ان کے بیان میں کہیں بھی جذباتیت، سطحیت اور سپاٹ پن کا احساس نہیں ہوتا۔ اس اعتبار سے یہ افسانے اس موضوع پر لکھے گئے دیگر افسانوں سے منفرد ہیں۔ ان افسانوں میں ایمائی اور اشاراتی انداز میں سیاست اور مذہب پر طنز بھی کیا گیا ہے اور سچویشن کو اس طرح اُبھارا گیا ہے کہ آج کے فساد کا منظرنامہ قاری کے ذہن پر پوری طرح نقش ہو جاتا ہے۔

اقبال متین ایک ایسے افسانہ نگار ہیں جن کی ذاتی زندگی انتہائی رنج والم کا شکار رہی ہے۔ ان کے تین

بیٹوں کا نوعمری میں یکے بعد دیگرے انتقال ہوگیا جن کے غم میں وہ زندگی بھر مبتلا رہے۔اس ذاتی درد وغم کو انھوں نے اپنے کئی افسانوں میں پیش کیا ہے۔''دریدہ''،''اتھل پانیوں کے سودائی''،''گنجا مسیح''،''جھوٹی سچائی''،''بے دلی اپنا پتہ پوچھے ہے''،''گریزپا''اور''تارتار'' جیسے افسانوں میں اقبال متین نے اپنی ذاتی زندگی کی اداسی اور تلخی کو اس پر اثر انداز میں بیان کیا ہے کہ ان کا یہ غم ذاتی نہ رہ کر آفاقی صورت میں ڈھل گیا ہے اور ان کے یہ افسانے ہر دکھی دل اور مغموم باپ کی کہانی بن گئے ہیں۔ان موضوعات کے علاوہ اقبال متین نے انسانی نفسیات، رومانی اور عشقیہ کیفیات، عورتوں کے مسائل و معاملات اور ان کے نازک اور پیچیدہ جذبات واحساسات کو بھی اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔انھوں نے زندگی کی چھوٹی چھوٹی حقیقتوں اور چھوٹے چھوٹے پہلوؤں کو بھی اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے اور اپنے دلکش انداز بیان کی وجہ سے اس میں رنگ بھر دیا ہے۔اس طرح اقبال متین نے ہم عصر زندگی کے معمولی مسائل سے لے کر اہم مسائل و موضوعات تک کا احاطہ کیا ہے اور انھیں اپنے منفرد تخلیقی انداز میں پیش کر کے ہم عصر سماج کی ترجمانی کرنے کی کوشش کی ہے جس میں وہ بڑی حد تک کامیاب رہے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں زندگی رواں دواں نظر آتی ہے اور عہد حاضر کا معاشرہ سانس لیتا اور جیتا جاگتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

اقبال متین کے افسانوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی کہانیوں میں پر تصنع داخلیت، بے جا ابہام، فیشن زدہ تجریدیت اور علامت نگاری کے قائل نہیں ہیں۔وہ اینٹی اسٹوری قسم کی کہانی لکھنے سے گریز کرتے ہیں۔وہ اپنی کہانیوں میں علامت اور تجرید کا استعمال بہت سوچ سمجھ کر کرتے ہیں اور ہر حال میں کہانی میں کہانی پن کو ملحوظ رکھتے ہیں۔کیوں کہ ان کے نزدیک کہانی کی پہلی شرط اس کا کہانی پن ہے۔

اقبال متین کے افسانوں کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے بہت غور وفکر کر کے اور فنی آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے افسانے لکھے ہیں۔جہاں تک ان کے افسانوں میں پلاٹ کی تشکیل کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں انھوں نے اصول وضوابط کا پورا خیال رکھا ہے۔واقعات کے انتخاب میں سلیقے سے کام لیا ہے اور افسانے میں انھیں مناسب وموزوں جگہ استعمال کیا ہے۔انھوں نے پلاٹ سازی کے سلسلے میں روایتی اور جدید انداز دونوں سے کام لیا ہے۔ان کے ابتدائی افسانوں میں پلاٹ ڈھیلے ڈھالے نظر آتے ہیں۔ان کے بعد کے کچھ افسانوں میں بھی یہ صورت دیکھنے کو ملتی ہے۔جیسے''اجلی پرچھائیاں''،''پیر صاحب''،''مورنی''،

''پچھلا دروازہ'' اور ''دام ہر موج'' وغیرہ۔ان افسانوں میں غیر ضروری واقعات کی شمولیت کی وجہ سے پلاٹ کا گٹھاؤ ڈھیلا پڑ گیا ہے۔ان تخلیقات سے قطع نظر، ان کے بیشتر افسانوں میں پلاٹ چست و مربوط اور وسعت و جامعیت کے حامل ہوتے ہیں۔ان کے کچھ افسانوں میں پلاٹ کا غیر معمولی فنکارانہ اہتمام ملتا ہے۔ ایسے پلاٹ مرکوز افسانوں میں ''ملبا''، ''آدمی اور آدمی''، ''مسدود راستے''، ''زمین کا درد''، ''درد کا رشتہ''، ''کاٹا ہوا نام'' اور ''آنگن میں سہا گن'' قابل ذکر ہیں۔اقبال متین کے یہ افسانے اپنے دلچسپ پلاٹ کی وجہ سے جانے جاتے ہیں۔ مذکورہ افسانوں کی خوبی اور دلکشی پلاٹ کی جدت وندرت اور اس کی فنکارانہ تعمیر و تشکیل میں ہے۔پیش نظر افسانوں کے پلاٹ کی بنت میں اہم اور ضروری واقعات سے مدد لی گئی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان افسانوں میں وحدت تاثر پوری طرح پایا جاتا ہے۔ان افسانوں کی تخلیق اور واقعات کی ترتیب میں اقبال متین نے جس فنی مہارت کا مظاہرہ کیا ہے اس کی مثال خال خال نظر آتی ہے۔

کردار نگاری کے اعتبار سے بھی اقبال متین کے افسانے قابل قدر ہیں۔انھوں نے اردو افسانے کو مختلف النوع کردار دیئے ہیں جن میں متمول افراد، جاگیردار، زمیندار، متوسط اور نچلے طبقے کے لوگ، ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، مرد، عورت، بوڑھے، جوان، بچے، مزدور، سرمایہ دار، ڈاکٹر، مریض، پڑھے لکھے اور جاہل، غرض معاشرے سے تعلق رکھنے والے ہر طرح کے افراد شامل ہیں۔ان کے افسانوں میں حالات کے جبر اور معاشی زبوں حالی کے شکار عام انسانوں کے کردار خصوصیت سے پائے جاتے ہیں۔ ''درد کا رشتہ''، ''زمین کا درد''، ''مسدود راستے''، ''تین پتھر ڈھونے والا مسافر'' اور ''روزن در'' میں ایسے ہی کردار دیکھنے کو ملتے ہیں۔ان کے افسانوں کا ایک اہم کردار، اس باضمیر انسان کا کردار ہے جو آج کے مادیت پرستانہ معاشرے میں گھٹ گھٹ کر اور سسک سسک کر زندگی جینے پر مجبور ہے۔اس کردار کو ان کے افسانوں ''چھت''، ''زبوں آثار''، ''ہمزاد''، ''بوند بوند لہو''، ''چوتھا دن'' اور ''گریز پا'' وغیرہ میں دیکھا جاسکتا ہے۔ان کے علاوہ ان کے افسانوں میں سوانحی کردار بھی ملتے ہیں۔ یہ سارے کردار گوشت پوست کے انسان ہیں جو زندہ اور متحرک معلوم ہوتے ہیں۔کردار نگاری میں اقبال متین کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے کردار کو کسی بھی طرح سے اپنے خیالات کا پابند نہیں بناتے، بلکہ اسے کھلی فضا میں آزادانہ طور پر

سانس لینے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں جو افسانے میں فطری اور حقیقی انداز میں سامنے آتے ہیں اور واقعات کو آگے بڑھانے میں مدد دیتے ہیں۔ اقبال متین نے اچھے، بُرے ہر طرح کے کردار خلق کیے ہیں۔ ان کے کردار اعلیٰ اقدار کے حامل ہیں اور پست اقدار کی بھی عکاسی کرتے ہیں۔ اقبال متین اپنے کرداروں کے وسیلے سے فلسفیانہ انداز میں عصری حقائق زندگی کی ترجمانی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کے کرداروں میں زندگی کی ہمہ جہتی نظر آتی ہے۔ وہ اپنے کرداروں کے ذریعے سیاسی وسماجی حالات پر طنز بھی کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں مشاہدے کی گہرائی اور تجرباتی وسعت کا اثر ان کے کرداروں پر نمایاں ہوتا ہے۔ ان کے یہاں کرداروں میں زندگی کا سوز بھی ہے اور معاشرتی بصیرت کے نمایاں نقوش بھی۔

اقبال متین کے بعض افسانوں میں کردار پرچھائیں کی شکل میں نظر آتے ہیں۔ ''آگہی کے ویرانے'' اور ''کس کی تصویر ہے؟'' میں یہی صورت دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان افسانوں میں کردار کے نقوش نمایاں نہیں ہو پاتے بلکہ کردار تھوڑی دیر کے لیے آتے ہیں اور قاری کے ذہن پر کوئی تاثر چھوڑے بغیر ہمیشہ کے لیے غائب ہو جاتے ہیں۔ ان افسانوں کے علاوہ ان کے بعض ابتدائی اور دوسرے افسانوں میں بھی کردار کے خدوخال واضح نہیں ہو پاتے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال متین کرداروں کی تخلیق اور اس کی فنی پیش کش میں بعض جگہ تو کامیاب رہے ہیں لیکن بعض جگہ ناکام بھی۔ اقبال متین پریم چند، منٹو، بیدی اور عصمت چغتائی وغیرہ کی طرح لافانی کردار تو نہیں تخلیق کر سکے ہیں لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ قاری کے ذہن پہ نقش ہو جانے والے کردار بالکل پیش نہیں کر سکے ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں بعض ایسے کردار تخلیق کیے ہیں جو قاری پر دیرپا تاثرات چھوڑ جاتے ہیں۔ ایسے کرداروں میں 'شیبا'، 'رابی اپیا'، 'جھگن چاچا'، 'برہان قاطع'، 'واصف، رام دیال'، 'رضیہ چچی'، 'منور میاں' نیا ماسٹر، ابا، 'نواب صاحب'، 'خان صاحب'، 'بیگم' اور 'اپئی' وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں جو بڑے ہی جاندار اور توانا کردار ہیں۔ ان کرداروں کو فنی ہنرمندی سے تراشا گیا ہے اور ان کی شخصیت، جذبات واحساسات، نفسیاتی کیفیات، ان کی خوبیوں، خامیوں اور حالات ومسائل کو ان کے تہذیبی وسماجی پس منظر میں مختلف واقعات اور ضمنی کرداروں کی مدد سے اس خوبی سے بیان کیا گیا ہے کہ یہ کردار بھرپور انداز میں سامنے آتے ہیں اور قاری کے ذہن پر اپنا گہرا نقش چھوڑ جاتے ہیں۔ ان کرداروں کی تخلیق اور ان کی پیش کش میں اقبال متین نے جس چابکدستی کا

مظاہرہ کیا ہے، وہ کردار نگاری میں ان کی فن کارانہ گرفت کا پتہ دیتا ہے۔

کردار نگاری کے علاوہ اقبال متین کی افسانہ نگاری کا ایک اہم وصف ان کا مخصوص اسلوب ہے جو انہیں ایک منفرد افسانہ نگار کے روپ میں سامنے لاتا ہے۔ ان کا اسلوب شفاف، رواں مگر لوچدار ہے جو قاری پر ایک عجیب طرح کی کیفیت طاری کر دیتا ہے۔ وہ اپنی بات ڈرامائی یا چونکانے والے انداز میں شروع نہیں کرتے، بلکہ دھیمے سُروں میں کچھ اس انداز سے اپنی بات کا آغاز کرتے ہیں کہ قاری پوری طرح ان کے ذہنی سفر میں شریک ہو جاتا ہے۔ اقبال متین اپنے افسانوں میں آرائشی اور رنگین اسلوب اختیار نہیں کرتے جو نفس مضمون تک پہنچنے میں رکاوٹ ہو، بلکہ افسانے کے ماحول کے مطابق مناسب و موزوں اسلوب اپناتے ہیں۔ ان کے اسلوب کا ایک نمایاں وصف ایجاز و اختصار ہے۔ وہ چند جملوں میں کسی واقعہ اور منظر کو ایسی چابکدستی سے بیان کرتے ہیں کہ اس کی ہو بہو تصویر کھینچ دیتے ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں قاری کو ایک فضا اور ماحول سے آشنا کرنے کے لیے جزئیات نگاری، منظر نگاری پر خاص توجہ دیتے ہیں لیکن بے جا تفصیلات سے افسانے کو بوجھل نہیں بناتے بلکہ ضرورت کے مطابق ہی وہ تفصیلات اور جزئیات سے کام لیتے ہیں۔

اقبال متین نے اپنے افسانوں میں عموماً سیدھے سادے بیانیہ اسلوب کو اپنایا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے ایمائی اور اشاراتی اسلوب اور رومانی انداز بیان سے بھی کام لیا ہے۔ اس طرح اقبال متین کسی ایک بندھے ٹکے اسلوب کے پابند نہیں ہیں بلکہ موضوع و مواد کے مطابق انھوں نے مختلف اسالیب کو برتا اور اس پر اپنی گرفت کا خوبصورت مظاہرہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے اسلوب، مزاج، طرز اظہار، انتخاب الفاظ اور جملوں کی ساخت اور ان کی ترتیب کی وجہ سے اپنی انفرادی شان اور الگ شناخت رکھتے ہیں جو قاری کو ان کی تخلیقات کے مطالعہ پر آمادہ کرتی ہے۔

اقبال متین کے ابتدائی افسانوں میں ان کے اسلوب کی انفرادیت نظر نہیں آتی۔ اقبال متین نے کچھ افسانے مجبوری کے تحت معاوضے کے حصول کے لیے لکھے ہیں۔ ایسے افسانوں میں بھی ان کا اسلوب ڈھیلا ڈھالا ہے۔ اقبال متین کے افسانوں کا مطالعہ کرتے ہوئے کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کا غیر ضروری احتیاط اور حد سے بڑھی ہوئی کفایت لفظی صورت حال کو صاف صاف ظاہر ہونے نہیں دیتی لیکن یہ صورت صرف چند مقامات پر ہی ہے۔ بحیثیت مجموعی اقبال متین کی فن کارانہ چابکدستی ان کے

اسلوب میں نمایاں ہوکران کی اہمیت اور انفرادیت کو اجاگر کرتی ہے اور ان کو ایک صاحب طرز افسانہ نگار کے منصب پر فائز کرتی ہے۔

اقبال متین کے افسانوں کی ایک خوبی ان کی سادہ اور شگفتہ زبان ہے۔ زبان کے معاملے میں اقبال متین بے حد حساس ہیں۔ وہ ایک ایک لفظ سنبھال سنبھال کر اس فطری انداز میں استعمال کرتے ہیں اس میں ایک طرح کا لطف پیدا ہو جاتا ہے۔ زبان کے اسی تخلیقی استعمال کا نتیجہ ہے کہ وہ جب کسی واقعہ کو بیان کرتے ہیں تو اسے زندہ کر کے ہمارے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ اقبال متین نے مقامی الفاظ کا استعمال بھی بڑے سلیقے سے کیا ہے جس سے ان کے افسانوں میں گہرا مقامی رنگ، زور اور اثر پیدا ہو گیا ہے۔

اقبال متین کے افسانوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے سارے افسانے فکری و فنی اعتبار سے یکساں نوعیت کے نہیں ہیں۔ ان کے ابتدائی افسانوں ''چوڑیاں''، ''سنہری لکیریں''، ''تانبہ اور پانی'' وغیرہ میں پلاٹ ڈھیلا ڈھالا ہے، کردار کا نقش بھی پوری طرح نہیں ابھرتا اور اسلوب اور زبان و بیان کی انفرادیت بھی نمایاں نہیں ہو پاتی۔ یہ صورت ان کے ان افسانوں میں بھی دیکھنے کو ملتی ہے جو انھوں نے مجبوری میں معاوضے کے لیے لکھے تھے۔ ان کے یہاں کچھ افسانے فنی اعتبار سے اوسط درجے کے ہیں۔ ان افسانوں سے قطع نظر، اقبال متین نے چھ دہائیوں سے زیادہ عرصہ پر محیط اپنے طویل افسانوی سفر میں کئی نمائندہ افسانے اردو کو دیے۔ ایسے افسانوں میں ''ملبا''، ''گریو یارڈ''، ''برہان قاطع''، ''چھگن چاچا''، ''دریدہ''، ''شیبا''، ''کاٹا ہوا نام''، ''مسدود راستے''، ''آگہی کے ویرانے''، ''کینڈل کالونی''، ''میں بھی فسانہ تم بھی کہانی''، ''اجنبی''، ''مزبلہ''، ''درد کا رشتہ''، ''ماں''، ''شہر آشوب''، ''بے دلی اپنا پتہ پوچھے ہے''، ''کٹھری''، ''زمین کا درد''، ''گرتی دیواریں''، ''چھت''، ''یہ کس کی تصویر ہے؟''، ''آنگن میں سہاگن'' وغیرہ قابل ذکر ہیں جن سے ان کی فنی پختگی، زبان و بیان اور افسانوی تکنیک پر ان کی مضبوط گرفت کا پتہ چلتا ہے اور جدید افسانہ نگاری میں ان کی منفرد شناخت قائم ہوتی ہے۔ اقبال متین کے یہ افسانے جدید افسانہ نگاری میں خوشگوار اضافہ ہیں۔ ان افسانوں کی بنیاد پر وہ ایک ممتاز اور باکمال افسانہ نگار قرار پاتے ہیں۔

اقبال متین ایک اہم اور ممتاز افسانہ نگار کے علاوہ ناولٹ نگار کی حیثیت سے بھی مشہور و معروف ہیں۔ ''چراغِ تہہِ داماں'' ان کا مشہور ناولٹ ہے۔ اقبال متین نے اپنے اس ناولٹ میں ہم جنسیت اور

مردطوائف کے موضوع کو پیش کیا ہے۔ یہ انتہائی حسّاس اور نازک موضوع ہے۔ اس حساس موضوع کو اردو ادب میں پہلی بار اقبال متین نے اپنے ناولٹ میں فنکارانہ صداقت کے ساتھ برتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ اردو کا منفرد ناولٹ ہے۔

اس ناولٹ میں اقبال متین نے ایک معصوم اور جذباتی عورت کوشلیا کی عبرتناک زندگی کی داستان بیان کی ہے۔ کوشلیا اپنے عاشق کے فریب کا شکار ہوکر گھر سے بھاگ جاتی ہے اور طوائف بن جاتی ہے۔ وہ مجبوری میں طوائف کا پیشہ تو اختیار کرلیتی ہے لیکن اپنے اندر کی عورت کو ختم نہیں کر پاتی ہے۔ محبت و رفاقت اور ماماتا کے جذبہ سے پُر کوشلیا چاہتی ہے کہ کوئی اس کا ہاتھ تھام لے اور اسے اس غلیظ زندگی سے نکال لے مگر کوئی اسے نہیں اپناتا۔ کوشلیا کی امیدوں کا آخری مرکز اس کا بیٹا شانوجہ ہوتا ہے جسے وہ اپنا سہارا بنانا چاہتی ہے مگر شانوجہ اپنی ماں کا سہارا بننے کے بجائے ایک پیشہ ور طوائف بن جاتا ہے جس کا کوشلیا کو اس قدر رنج ہوتا ہے کہ مارے غم کے وہ اپنی زندگی ہی سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہے۔ اس ناولٹ میں کوشلیا کے المناک حالات، دردناک کیفیات اور غم زدہ جذبات و احساسات کو ناولٹ نگار نے اس موثر انداز میں بیان کیا ہے کہ قاری اسے محسوس کیے بغیر نہیں رہتا۔

’چراغ تہہ داماں‘ فنی و تکنیکی اعتبار سے بھی اہم ناولٹ ہے۔ اس کا پلاٹ انتہائی گٹھا ہوا ہے۔ اس کے بیشتر کردار حقیقی اور جاندار ہیں۔ اس میں منظرنگاری کے خوبصورت نمونے موجود ہیں۔ اسلوب اور زبان و بیان کے اعتبار سے بھی یہ ایک دلچسپ ناولٹ ہے۔ اس میں ناولٹ نگار نے پیچیدہ اور مشکل زبان سے قطع نظر، صاف ستھری، شائستہ اور موضوع کے مطابق خوبصورت اور پُر اثر زبان استعمال کی ہے۔ اس کی وجہ سے ناولٹ میں روانی اور دلکشی کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔

خاکہ نگاری کے ذیل میں بھی اقبال متین کی تخلیقی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ ’’سوندھی مٹی کے بُت‘‘ ان کے شخصی مضامین اور خاکوں کا مجموعہ ہے۔ اقبال متین نے اپنے خاکوں میں مخدوم محی الدین، سلیمان اریب، شاذ تمکنت، ڈاکٹر سید عبدالمنان، حسن چشتی، مولانا ابراہیم ہارون سیٹھ، زاہد صاحب، صابر دت، کشمیری لال ذاکر، علامہ اعجاز فرخ، سروجنی نائیڈو اور خواجہ الطاف حسین حالی جیسی اہم علمی و ادبی شخصیات کو موضوع بحث بنایا ہے۔ اقبال متین کے ان خاکوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے

سارے خاکے یکساں نوعیت کے نہیں ہیں۔ ان کے بعض خاکے معیاری ہیں جیسے ڈاکٹر سید عبدالمنان، سلیمان اریبؔ، شاذؔ تمکنت، حسن چشتی، پروفیسر یوسف سرمست اور راشدآزرؔ کی شخصیت پر لکھے گئے خاکے۔ ان مضامین میں شخصیت کو اس دلکش انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ اس کی تصویر نگاہوں کے سامنے گھوم جاتی ہے۔ ان تحریروں میں فنِ خاکہ نگاری کی بیشتر خصوصیات نظر آتی ہیں۔ ان خاکوں کے علاوہ اقبال متین کے کچھ خاکے تاثراتی مضمون معلوم ہوتے ہیں جیسے زاہد علی خاں، صابر دت، ابراہیم شفیق اور لطیف ساجد کے خاکے۔ ان تحریروں میں فنی خامیاں پائی جاتی ہیں اور شخصیت کی تصویر واضح نہیں ہو پاتی ہے۔ اقبال متین اردو ادب میں خاکہ نگار کی حیثیت سے شناخت تو نہیں رکھتے لیکن انھوں نے اس صنف میں بھی فنی مہارت کا مظاہرہ کیا ہے اور فنی اعتبار سے کچھ اچھے خاکے اردو کو دیئے ہیں جو زبان و بیان کے اعتبار سے دلچسپ ہیں۔ ان خاکوں کی بنیاد پر وہ خاکہ نگار کی حیثیت سے بھی سامنے آتے ہیں اور اس میدان میں بھی توجہ کے مستحق نظر آتے ہیں۔

اقبال متین نے یادیں بھی لکھی ہیں۔ ''باتیں ہماریاں'' ان کی یادوں کا مجموعہ ہے جو سترہ مضامین پر مشتمل ہے۔ ان مضامین میں اقبال متین نے اپنی ذاتی زندگی کی روداد قلمبند کی ہے اور اپنے ہم عصر ادیبوں، دوستوں اور احباب کو یاد کیا ہے۔ انھوں نے جن شخصیتوں کو یاد کیا ہے، وہ کامریڈ محمود مشیر، لیڈر جواد رضوی، صفی اورنگ آبادی، علی اختر، مولانا فخرالدین، مخدوم محی الدین، شاہد حسینی، قاضی عبدالستار، غیاث احمد گدّی، باقر مہدی، مغنی تبسم، ہاشم علی اختر ان کی بیگم وحید بی بی، حسن چشتی اور کشمیری لال ذاکر ہیں۔ ان شخصیتوں پر اپنے تاثرات قلمبند کرتے ہوئے، درمیان میں انھوں نے اپنے دوستوں، عزیزوں اور دوسری ہستیوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ ان شخصیتوں کی سیرت وسوانح، ان کے کارناموں، خوبیوں اور خامیوں پر انھوں نے اس چابکدستی سے روشنی ڈالی ہے کہ یہ تمام شخصیتیں اپنی منفرد خصوصیات کے ساتھ قاری کی نگاہوں کے سامنے آتی ہیں۔

اقبال متین نے مضامین بھی رقم کیے ہیں۔ ''اعتراف وانحراف'' ان کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ مضامین انھوں نے اپنے ہم عصر ادبی شخصیتوں قاضی عبدالستار، عابد سہیل، قاضی سلیم، ناصر بغدادی، محبوب حسین جگر، صابر دت، بانو سرتاج، بلراج ورما اور خالد رحیم پر قلم بند کئے ہیں۔ ان تحریروں میں

اقبال متین نے مذکورہ ادبی ہستیوں کی شخصیت وفن کے تعلق سے اپنے دلچسپ تاثرات وخیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان مضامین میں کہیں کہیں تاثراتی تنقید اور عملی تنقید کے نقوش پائے جاتے ہیں اور کہیں کہیں شخصی مضامین اور خاکے کے عناصر بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ انھوں نے بعض اوقات طنزیہ ومزاحیہ اندازِ بیان سے بھی کام لیا ہے۔ یہ مضامین نثر کے بہتر نمونے پیش کرتے ہیں۔

اقبال متین نے نثر کے علاوہ شاعری کو بھی اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے۔ ''صریرجاں'' ان کا شعری مجموعہ ہے۔ جس میں غزلیں اور نظمیں دونوں شامل ہیں۔ ان کی شاعری کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے شاعری تفنن طبع کے طور پر کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بطور شاعر وہ اپنی شناخت قائم کرنے میں ناکام رہے ہیں۔

مذکورہ مباحث کی روشنی میں یہ واضح ہوجاتا ہے کہ اقبال متین نے ادب کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے لیکن ادبی دنیا میں انھیں اعتبار ووقار افسانہ نگاری کی وجہ سے حاصل ہوا۔ اپنی افسانہ نگاری کے ذریعے انھوں نے افسانوی ادب کی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ افسانہ کے علاوہ، خاکہ، یادوں اور مضامین کے ذریعے بھی انھوں نے نثر کے بہتر نمونے پیش کیے ہیں۔ مختصر یہ کہ اقبال متین اپنی جملہ ادبی خدمات کی بنیاد پر اردو ادب میں نمایاں مقام کے مستحق ہیں جن کے تخلیقی کارناموں کے ذکر کے بغیر اردو کی ہم عصر ادبی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔

کتابیات

بنیادی ماخذ (Primary Sources)

متین اقبال: ''اجلی پرچھائیاں'' حیدرآباد؛ سب رس کتاب گھر ایوان اردو، ۱۹۶۰ء

متین اقبال: ''نچا ہوا البم'' حیدرآباد؛ سب رس کتاب گھر ایوان اردو، ۱۹۷۲ء

متین اقبال: ''خالی پٹاریوں کا مداری'' لکھنؤ؛ نصرت پبلشرز، ۱۹۷۷ء

متین اقبال: ''آ گہی کے ویرانے'' نظام آباد؛ گونج پبلی کیشنز اردو گھر، احمدی بازار، ۱۹۸۰ء

متین اقبال: ''مزبلہ'' نظام آباد؛ گونج پبلی کیشنز اردو گھر، احمدی بازار، ۱۹۸۹ء

متین اقبال: ''میں بھی فسانہ تم بھی کہانی'' حیدرآباد؛ اعجاز پرنٹنگ پریس، ۱۹۹۳ء

متین اقبال: ''شہر آشوب'' حیدرآباد؛ سب رس کتاب گھر ایوان اردو، ۲۰۰۳ء

متین اقبال: ''باتیں ہماریاں'' نظام آباد؛ گونج پبلی کیشنز اردو گھر، احمدی بازار، ۲۰۰۵ء

متین اقبال: ''چراغ تہہ داماں'' حیدرآباد؛ ریاض پرنٹرس، ۲۰۰۵ء

متین اقبال: ''اعتراف وانحراف'' حیدرآباد؛ کل ہند اردو ریسرچ اسکالرس کونسل، ۲۰۰۶ء

متین اقبال: ''صریر جاں'' حیدرآباد؛ کل ہند اردو ریسرچ اسکالرس کونسل، ۲۰۰۶ء

متین اقبال: ''اجالے جھروکے میں'' حیدرآباد؛ کل ہند اردو ریسرچ اسکالرس کونسل، ۲۰۰۸ء

متین اقبال: ''اقبال متین کے افسانے'' (جلد اوّل) دہلی؛ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۹ء

متین اقبال: ''اقبال متین کے افسانے'' (جلد دوم) دہلی؛ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۰ء

متین اقبال: ''سوندھی مٹی کے بت'' دہلی؛ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۰ء

ثانوی مآخذ (Secondary Sources)

احمد، انوار: اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ، دہلی؛ براؤن بک پبلی کیشنز،۲۰۱۴ء

اختر، جمیل محبی: فلسفۂ وجودیت اور جدید اردو افسانہ، دہلی؛ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۲۰۰۲ء

اختر، سلیم: افسانہ حقیقت سے علامت تک، الہ آباد؛ اردو رائٹرس گلڈ،۱۹۸۰ء

اسلم، فوزیہ: اردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجربات، دہلی؛ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۲۰۰۹ء

اشرف، خالد: برصغیر میں اردو افسانہ، دہلی؛ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۲۰۱۰ء

اشرفی، وہاب: اردو فکشن اور تیسری آنکھ، دہلی؛ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۱۹۹۴ء

افراہیم، صغیر: اردو افسانہ ترقی پسند تحریک سے قبل، علی گڑھ؛ ایجوکیشنل بک ہاؤس،۱۹۹۱ء

افراہیم، صغیر: اردو فکشن تنقید اور تجزیہ، علی گڑھ؛ ایجوکیشنل بک ہاؤس،۲۰۰۳ء

افراہیم، صغیر: اردو کا افسانوی ادب، علی گڑھ؛ ایجوکیشنل بک ہاؤس،۲۰۱۰ء

افضال، حسین: قاضی، صنفیات، علی گڑھ؛ ایجوکیشنل بک ہاؤس،۲۰۱۶ء

اقبال، صائمہ: (مرتبہ) قرطاس وقلم کے ساتھی، حیدرآباد؛ اردو بک ڈپو،۲۰۱۵ء

اکرام، صبا: جدید افسانہ چند صورتیں، کراچی؛ زین پبلی کیشنز،۲۰۰۱ء

بانو، جیلانی: نروان (افسانوی مجموعہ) دہلی؛ مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ،۱۹۶۳ء

بغدادی، ناصر: ضرب تنقید، کراچی؛ بادبان پبلی کیشنز،۲۰۰۸ء

بیگ، حامد مرزا: اُردو افسانے کی روایت، دہلی؛ عالمی میڈیا پرائیویٹ لمیٹیڈ،۲۰۱۴ء

پال، جوگندر: رسائی (افسانوی مجموعہ) لکھنؤ؛ نصرت پبلشرز،۱۹۶۹ء

جعفر سیدہ: اُردو مضمون نگاری، دہلی؛ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۱۹۷۲ء

جعفر، مہدی: اردو افسانہ بیسویں صدی کی روشنی میں، گیا؛ دی کلچرل اکیڈمی،۲۰۰۲ء

جعفر، مہدی: نئی افسانوی تقلیب، گیا؛ دی کلچرل اکیڈمی،۱۹۹۹ء

جعفر، مہدی: نئے افسانے کا سلسلۂ عمل، گیا؛ دی کلچرل اکیڈمی،۱۹۸۹ء

چھتاری، طارق: جدید افسانہ اردو ہندی، علی گڑھ؛ ایجوکیشنل بک ہاؤس،۱۹۹۲ء

حسین الحق: اردو فکشن ہندوستان میں (جلد اول)، دہلی؛ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۲۰۱۴ء

حنفی، شمیم: آزادی کے بعد دہلی میں اُردو خاکہ (مرتبہ) دہلی؛ اُردو اکادمی، ۲۰۰۹ء
خان، نگہت ریحانہ: اردو مختصر افسانہ: فنی وتکنیکی مطالعہ، دہلی؛ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۶ء
رضوی، سید احمد مہدی: اردو میں ناولٹ نگاری: فن اور ارتقا، مظفر پور؛ کتابستان، ۲۰۰۴ء
رضوی، وضاحت حسین: اردو ناولٹ کا تحقیقی وتنقیدی تجزیہ، لکھنؤ؛ نصرت پبلشرز، ۲۰۰۱ء
رفعت، فیاض: اردو افسانے کے ابتدائی نقوش، ممبئی؛ مہاراشٹر اردو اکادمی، ۱۹۸۹ء
رئیس، قمر: نمائندہ اُردو افسانے (مرتبہ) دہلی؛ اردو اکادمی، ۲۰۱۴ء
رئیس، قمر: نیا افسانہ مسائل اور میلانات (مرتبہ) دہلی؛ اردو اکادمی، ۱۹۹۲ء
صدیقی، عظیم الشان: افسانوی ادب تحقیق وتجزیہ، دہلی؛ نیو پبلک پریس، ۱۹۹۵ء
سعید، صابرہ: اردو ادب میں خاکہ نگاری، علی گڑھ؛ ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۱۳ء
سعید، طارق: چراغ تہہ داماں: تفہیم وتعبیر (مرتبہ) دہلی؛ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۳ء
سنگھ، رتن: پہلی آواز (افسانوی مجموعہ) لکھنؤ؛ نصرت پبلشرز، ۱۹۶۹ء
سنگھ، رتن: پناہ گاہ (افسانوی مجموعہ) دہلی؛ موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۰ء
سہیل، عابد: سب سے چھوٹا غم (افسانوی مجموعہ) لکھنؤ؛ نصرت پبلشرز، ۱۹۹۴ء
شاہد، محمد حمید: اُردو افسانہ: صورت ومعنیٰ، اسلام آباد؛ نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۰۶ء
صلاح الدین: دلّی والے (مرتبہ) دہلی؛ اردو اکادمی، ۱۹۸۶ء
علوی، وارث: جدید افسانہ اور اس کے مسائل، دہلی؛ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۴ء
عظیم، وقار: داستان سے افسانے تک، علی گڑھ؛ مکتبہ الفاظ، مسلم یونی ورسٹی، ۱۹۸۰ء
عظیم، وقار: فن افسانہ نگاری، دہلی؛ چمن بک ڈپو، ۱۹۶۹ء
غیاث الدین، محمد: قاضی عبدالستار کے بہترین افسانے (مرتبہ) دہلی؛ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۵ء
فاروقی، شمس الرحمٰن: افسانے کی حمایت میں، دہلی؛ مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، ۲۰۰۶ء
فاروقی، نثار احمد: دید ودریافت، دہلی؛ آزاد کتاب گھر، ۱۹۶۴ء
فاطمہ، عزیز: اردو افسانہ، لکھنؤ؛ نصرت پبلشرز، ۱۹۸۰ء
فتح پوری، فرمان: اردو نثر کا فنی ارتقا، دہلی؛ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۵ء
فتح پوری، فرمان: اردو افسانہ اور افسانہ نگار، دہلی؛ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۸۲ء
فتح پوری، فرمان: اردو فکشن کی مختصر تاریخ، دہلی؛ ایم۔آر۔پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء

فتح پوری، فرمان: اردو کا افسانوی ادب، ملتان؛ بیکن بکس، ۱۹۸۸ء
قاسمی، ابوالکلام: آزادی کے بعد اردو فکشن (مرتبہ) دہلی؛ ساہتیہ اکادمی، ۲۰۰۱ء
قدوائی، شافع: فکشن مطالعات پس ساختیاتی تناظر، دہلی؛ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۰ء
کریم، ارتضیٰ: جوگندر پال، ذکر، فکر، فن (مرتبہ) دہلی؛ موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۹ء
لعل، رام: اردو افسانے کی نئی تخلیقی فضا، دہلی؛ سیمانت پرکاشن، ۱۹۸۵ء
مجید، اقبال: شہر بدنصیب (افسانوی مجموعہ) دہلی؛ معیار پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء
مضمر، مجید: اردو کا علامتی افسانہ، دہلی؛ کتاب گھر، ۱۹۷۵ء
منظر، شہزاد: جدید اردو افسانہ، کراچی؛ منظر پبلشرز، ۱۹۸۲ء
منظر، شہزاد: علامتی افسانے کے ابلاغ کا مسئلہ، کراچی؛ پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء
نارنگ، گوپی چند: اردو افسانہ روایت اور مسائل، دہلی؛ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۱ء
نارنگ، گوپی چند: بیسویں صدی میں اردو افسانہ (مرتبہ) دہلی؛ ساہتیہ اکادمی، ۲۰۰۲ء
نارنگ، گوپی چند: فکشن شعریات: تشکیل و تنقید، دہلی؛ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۹ء
نارنگ، گوپی چند: نیا اردو افسانہ انتخاب تجزیے اور مباحث، دہلی؛ اردو اکادمی، ۱۹۸۸ء
نورالحسنین، سید: اقبال متین سے اُنسیت (مرتبہ) دہلی؛ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۲ء
ورک، اشفاق احمد: موقف، لاہور؛ کتاب سرائے پبلشرز، ۲۰۰۸ء

رسائل

آجکل، نئی دہلی، ستمبر، ۱۹۹۵ء
آج کل، (جوگندر پال نمبر) نئی دہلی، جنوری، ۱۹۹۷ء۔
ارتقا، کراچی، اپریل تا جون، ۲۰۰۰ء۔
بادبان (اقبال متین نمبر) کراچی، مدیر ناصر بغدادی، جولائی تا ستمبر ۲۰۱۰ء
پروازِ ادب، پنجاب، (گوشۂ جوگندر پال)، ستمبر، دسمبر ۱۹۹۴ء۔
تمہید (اقبال متین نمبر) نظام آباد، جنوری ۲۰۱۳ء
تمہید، نظام آباد، جولائی ۲۰۱۳ء

ذہن جدید، نئی دہلی، مارچ تا اگست، ۲۰۱۵ء

ذہن جدید، دہلی، مارچ تا مئی، ۱۹۹۸ء۔

عصری ادب (افسانہ نمبر) دہلی، جنوری تا اپریل، ۱۹۸۹ء

قومی زبان (اقبال متین نمبر) حیدرآباد، مدیر پروفیسر ایس۔ اے۔ شکور اکتوبر ۲۰۱۲ء

قومی محاذ (اقبال متین نمبر) اورنگ آباد، مدیر اثر فاروقی، اکتوبر ۲۰۰۴ء

مباحثہ، پٹنہ، جنوری تا مارچ، ۲۰۰۷ء

IQBAL MATEEN KI ADABI KHIDMAT KA TANQEEDI MUTALA

(A CRITICAL STUDY OF IQBAL MATEEN'S LITERARY CONTRIBUTION)

Thesis submitted to the Jawaharlal Nehru University
in partial fulfilment of the requirement
for the award of the Degree of

DOCTOR OF PHILOSOPHY

by

AHMAD ALI JAUHER

Under the Supervision of

PROF. MOINUDDIN A. JINABADE

Centre for Indian Languages
School of Language, Literature and Culture Studies
Jawaharlal Nehru University
New Delhi -110067

2017